سیرتِ مصطفیٰ ﷺ سے متعلقہ منضبط علمی تحقیقات
اور ان کی روشنی میں حاصل ہونے والے اصول و احکام اور پند و نصائح

مؤلف
ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی
مترجم
مولانا حافظ محمد عمران انور نظامی
فاضل دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف

ناشر
فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار، لاہور

تصحیح : حافظ محمد اکرم ساجد
مطبع : رومی پبلیکیشنز اینڈ پرنٹرز لاہور
الطبع الاوّل : شوال 1430ھ / ستمبر 2009ء
قیمت : -/350 روپے

Farid Book Stall
Phone No:092-42-7312173-7123435
Fax No.092-42-7224899
Email:info@faridbookstall.com
Visit us at:www.faridbookstall.com

فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار لاہور
فون نمبر ۰۹۲۔۴۲۔۷۳۱۲۱۷۳۔۷۱۲۳۴۳۵
فیکس نمبر ۰۹۲۔۴۲۔۷۲۲۴۸۹۹
ای میل: info@faridbookstall.com
ویب سائٹ: www.faridbookstall.com

فہرس

فقہ السیرۃ

نذرانۂ عقیدت و الفت

سیّد المرسلین، خاتم النبیین، شفیع المذنبین، انیس الغریبین، رحمۃ للعٰلمین، راحۃ العاشقین، سیّد الاوّلین والآخرین، شمس العارفین، سراج السالکین، حبیبِ رب العالمین، احمدِ مختار حضرت سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

شیخ المشائخ، مظہر کمالاتِ محمدیہ، حاملِ حقائقِ قرآنیہ، مفسرِ قرآن، نابغہ روزگار سیرت نگار، سیدی ومرشدی واستاذی حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازھری الہاشمی رحمۃ اللہ علیہ، جن کی نظرِ عنایت سے بندہ اس قابل ہوا۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

نحمدہٗ ونصلی ونسلم علٰی رسولہ الکریم

عرضِ مترجم

تمام تعریفیں اُسی خالق و مالک کے لیے ہیں جس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے کائناتِ ہست و بُود کو تخلیق فرمایا اور انسان کو احسن تقویم میں پیدا فرمایا' خالقِ ارض و سماء نے انسان کو اس دنیا میں بھیج کر شترِ بے مہار کی طرح یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کی تعلیم و تربیت' رُشد و ہدایت اور فوز و فلاح کے لیے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو وقتاً فوقتاً مبعوث فرمایا' جنہوں نے اپنے اپنے محدود دائرے اور مخصوص ماحول میں انسانیت کی رہنمائی کا اہم فریضہ سرانجام دیا۔

لیکن نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ جس طرح تمام عالمین کے لیے رحمت بن کر تشریف لائے' ایسے ہی آپ ﷺ ساری کائنات کے لیے نبی و رسول بن کر مبعوث ہوئے۔ آپ ﷺ ایک آفاقی اور عالمگیر رسول ہیں جن کی نبوت و رسالت کا سلسلہ قیامت تک جاری و ساری ہے۔ اسی بناء پر آپ ﷺ کا اسوہ بھی قیامت تک ساری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔

آج تک دنیا کی جو تاریخ معلوم ہے' اس کے وسیع دائروں پر نظر دوڑائیں تو اس میں ہمیں طرح طرح کے نفوسِ قدسیہ اور مصلحین دکھائی دیتے ہیں لیکن کوئی ہستی بھی جملہ صفات و کمالات کی جامع اور ہر لحاظ سے کامل نظر نہیں آتی' کہیں عفو و درگزر تو نظر آتا ہے لیکن اندازِ حکمرانی نہیں ملتا' کہیں شریعت کی ظاہری سختی تو موجود ہے لیکن روحانی پہلو موجود نہیں' کہیں شاہی زندگی بھرپور انداز میں تو موجود ہے لیکن فقر کا پہلو کم نظر آتا ہے' کہیں تجرد تو پایا جاتا ہے لیکن عائلی زندگی کا عملی نظام نظر نہیں آتا' کہیں جاہ و جلال تو ہے لیکن عفوِ عام کا صفحہ خالی ہے۔ علٰی ہذا القیاس

یہی وجہ تھی کہ ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اسی لیے عالمِ

انسانیت اپنی جملہ صفات وکمالات کی تکمیل کے لیے ایک ایسی جامع و کامل شخصیت کا محتاج رہا جو انفرادی و اجتماعی لحاظ سے انسان کے ظاہر و باطن کو یکسر بدل ڈالے۔ جو ذات صاحبِ شمشیر بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، جو فرمانروا بھی ہو اور فقر کا پیکر بھی، جو شب زندہ دار بھی ہو اور میدان کا غازی بھی، جو دریا دل سخی بھی ہو اور قناعت کی عملی تصویر بھی، بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم ہو اور ہر پہلو سے کامیاب و کامران اور ہر اعتبار سے مکمل انسان ہو، جو دوسروں کے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں عملی نمونہ ہو، ایسی ذاتِ گرامی صرف اور صرف رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ جن کے بارے میں رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱)
بے شک اللہ کے رسول (ﷺ) کی حیات میں تمہارے لیے حسین نمونہ ہے۔

کوئی بھی ذات اور ہستی اُس وقت تک مکمل مشعلِ راہ اور مطاع نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر ہر حرف، اس کی حرکات و سکنات سے جنم لینے والی اک اک ادا، اس کے وجود اور حلیہ کا ایک ایک خط و خال محفوظ نہ کر لیا جائے، تاکہ زندگی کے جملہ مراحل میں جہاں جہاں ضرورت پیش آئے اس سے رہنمائی حاصل کی جا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے نبیٔ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی تمام تر جزئیات کو محفوظ کر لیا، یہ بات رسولِ محتشم ﷺ کی بے پایاں عظمت و شان اور آپ کے لازوال چشمۂ ہدایت ہونے کا زندہ و جاوید ثبوت ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مقدسہ کی ہر ہر ادا ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے موجود ہے۔

آپ ﷺ کا ایمانی و اخلاقی، شخصی و ذاتی، انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی اور ملکی و بین الاقوامی کردار، آپ ﷺ کی رحمت، شفقت، عبادت، سخاوت، شجاعت، عدالت، صداقت، دیانت، فراست، متانت، صبر و استقامت، اخلاص و محبت، ایثار و قربانی، احساسِ ذمہ داری، عاجزی و انکساری، تواضع و خودداری، ثابت قدمی، تحمل و بردباری، الغرض عملی زندگی کے ہر پہلو کے عملی نمونے ہمارے پاس محفوظ ہیں، تمام قسم کے تعلقات و معاملات کا جو بہترین نقشہ ہمیں سیرتِ طیبہ میں دکھائی دیتا ہے، ایسا کہیں اور نہیں ملتا۔

خالقِ کائنات نے قرآن پاک میں جا بجا اپنی اطاعت اور اپنے رسول ﷺ کی

اطاعت کا حکم دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ. (محمد:۳۳)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم) کی۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو اطاعتوں کا ذکر فرمایا لیکن ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کو بھی رسول اللہ ﷺ کی ہی اطاعت قرار دیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. (النساء:۸۰)

جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سارے کا سارا دین حضور ﷺ کی اداؤں ہی کا نام ہے۔

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اس کو خوبصورت انداز میں یوں بیان فرمایا:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر با و نرسیدی تمام بولہبیست

(آپ ﷺ کی ذات مبارکہ ہی مکمل دین ہے، اگر آپ کی پہچان اور آپ تک رسائی حاصل نہ ہوئی تو ہر طرف ابولہب جیسا کفر ہوگا)

حضور نبی رحمت، شفیع اعظم ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور سنتِ مطہرہ پر عمل پیرا ہونا ہی دنیا و آخرت میں کامیابی اور رب تعالیٰ کی محبوبیت کے مقام پر فائز ہونے کی ضمانت ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا O (الاحزاب:۷۱)

اور جو شخص حکم مانتا ہے اللہ اور اس کے رسول کا تو وہی شخص حاصل کرتا ہے بہت بڑی کامیابی O

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

(اے محبوب!) آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری

ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○ (آل عمران:۳۱)

پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے○

جو لوگ بھی محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو گئے' وہ خدا تعالیٰ کے محبوب بن گئے۔

؎ کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ۔ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُس وقت تک کامل اطاعت ممکن نہیں جب تک کسی انسان کے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی محبت اور عشق پیدا نہ ہو' کیونکہ محبتِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہی کامل الایمان ہونے کی علامت ہے۔

؎ محمد کی محبت دینِ حق کی شرطِ اول ہے ۔ اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

؎ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ۔ مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

جس خوش نصیب کو محبت و عشقِ مصطفیٰ کی دولت نصیب ہو جائے' وہی حقیقی فوز و فلاح کا مستحق ہے۔

؎ ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست ۔ بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

لیکن افسوس! آج اسلام دشمن شیطانی و سامراجی طاقتیں منظم ہو کر مسلمانوں کے دلوں سے عشقِ مصطفیٰ کی شمع کو بجھانے کے لیے علمی' فکری اور عملی انداز میں کوششیں کر رہی ہیں کیونکہ اغیار جانتے ہیں کہ جب مسلمانوں کے دل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے خالی ہو جائیں گے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں اپنی عظمتِ رفتہ واپس نہیں دلا سکتی۔

مغربی استعمار کی اسی سازش کی طرف علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے یوں اشارہ فرمایا:

؎ یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا ۔ روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات ۔ اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

اس مقصد کے حصول کے لیے مغربی استعمار نے مسلمانوں کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کے لیے مختلف ادوار میں مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے۔ مسلمانوں میں ایسی کئی فرقہ وارانہ عملی

مباحث چھیڑ دی گئیں جن کا ہدف حضور ﷺ کی عظمت و تعظیم اور آپ کے فضائل و کمالات اور معجزات کا انکار تھا' اور بالآخر بات گستاخانہ خاکوں تک آن پہنچی تاکہ امت میں اہانتِ رسالت اور گستاخیٔ نبوت کا فتنہ پیدا ہو۔

کبھی مسلمانوں کی مذہبیت اور دینداری کو جنونی پن سے تعبیر کیا اور ''ملا ازم'' کو ایک ہوا بنا کر پیش کیا گیا اور پھر مذہب پر عمل پیرا ہونے والوں کے لیے فنڈا مینٹلسٹ/ بنیاد پرست کی اصطلاح استعمال کی گئی اور اب اسی کو دہشت گردی کا نام دے دیا گیا۔

تاکہ مسلمان دینِ اسلام اور بانیٔ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کو اپنے لیے باعثِ عار سمجھیں۔

دوسری طرف یہ فکری میدان ''جدید اسلامی تحقیق'' کے نام سے متعصب یہودیوں اور عیسائی مستشرقین کے سپرد کر دیا گیا' جنہوں نے اسلامی تعلیمات اور بانیٔ اسلام کی شخصیت اور سیرتِ مطہرہ پر اس انداز میں کتب تصنیف کیں کہ اگر کوئی سادہ لوح مسلمان ان کتابوں کا مطالعہ کرے تو اس کے دل سے حضور ﷺ کی محبت اور آپ کا ادب و احترام ختم ہو کر رہ جائے۔

اس کے علاوہ بعض مسلم مفکرین نے بھی نادانستہ طور پر ایسا ہی کام سرانجام دیا جس میں حضور ﷺ کی شخصیت کو ایک فلسفی اور عبقری کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور آپ ﷺ کا نبوی پہلو اُجاگر نہ کیا گیا جس سے سیرتِ مطہرہ کماحقہٗ لوگوں کے سامنے نہ آ سکی۔

خالق و مالک نے ہماری ہدایت و رہنمائی کے لیے دو ذرائع پیدا فرمائے' ایک قرآن مجید اور دوسرا اسوۂ رسول ﷺ۔

قرآنِ پاک کتابی صورت میں ہے تو حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی قرآنِ ناطق ہے' قرآنِ مجید لاریب و بے مثال ہے تو رسولِ اکرم کی ذات بھی بے مثل و بے مثال ہے۔ قرآن شریف کی ہدایت جامع و کامل ہے تو رسول اللہ ﷺ کا اسوہ بھی جامع و کامل ہے اور قرآن پاک کے احکام کی اگر کوئی عملی تصویر دیکھنا چاہے تو وہ آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات کو دیکھ لے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کے متعلق پوچھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہا نے نہایت جامع جواب دیتے ہوئے فرمایا:

کان خلقه القرآن. (صحیح مسلم) آپ ﷺ کا خلقِ جمیل قرآن تھا۔

؎ لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی کا راز حضور ﷺ کی کامل اطاعت و اتباع میں ہی پوشیدہ ہے، جو لوگ صاحبِ خلقِ عظیم کی پیاری پیاری اداؤں کو اپنائیں گے وہی لوگ جنت میں آپ ﷺ کے قرب کی منزلوں پر فائز ہوں گے۔

عاشقانِ رسول نے آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر مختلف انداز میں لاتعداد کتابیں تحریر کیں۔ آج دنیا کی ہر زبان میں سیرتِ مقدسہ کی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کی زندگی کے متعلق بھی میسر نہیں۔

جن لوگوں نے بھی سیرتِ طیبہ پر قلم اٹھایا، وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، انہوں نے جتنا کچھ لکھا اور جو کچھ لکھا بالآخر وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

؎ زندگیاں ختم ہوئیں اور قلم ٹوٹ گئے تیرے اوصاف کا اک باب بھی پورا نہ ہوا

کیونکہ سرورِ عالم نورِ مجسم ﷺ کی ذاتِ گرامی تو وہ ذاتِ اقدس ہے جن کی تعریف و توصیف خود رب تعالیٰ بھی فرماتا ہے، جس کی دلیل پورا قرآنِ مجید ہمارے سامنے موجود ہے۔

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت الشاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی ترجمانی یوں فرماتے ہیں۔

؎ اے رضا! خود صاحبِ قرآں ہے مداحِ حضور تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

سیرتِ نبویہ پر مختلف اقسام کی کتابیں تحریر کی گئیں، کئی کئی جلدوں پر ضخیم کتابیں بھی تحریر کی گئیں اور مختصر کتابیں بھی لکھی گئیں، ہر زمانے میں مختلف انداز میں اس موضوع پر کام ہوا۔

موجودہ دور میں سیرت نگاروں نے منفرد انداز اپناتے ہوئے ایسی کتابیں تحریر کیں کہ جن میں واقعاتِ سیرت کو مختصر الفاظ میں بیان کر کے پھر ان واقعاتِ سیرت سے عبر وعظات اور دروس و نتائج اخذ کیے ہیں، جو عصرِ حاضر میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں، تاکہ سیرتِ مصطفویہ کا مطالعہ کرنے والا ہر قاری یہ محسوس کرے کہ اس واقعۂ سیرت میں میرے لیے کیا درس اور کیا سبق ہے؟

اسی انداز کو اپناتے ہوئے زیرِنظر کتاب' ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی نے تحریر فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب ملکِ شام کے جلیل القدر علماء و محققین میں سے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مدظلہ العالی کی اسلامی تعلیمات پر متعدد دیگر کتابیں بھی موجود ہیں لیکن سیرتِ طیبہ پر یہ کتاب جو تحریر فرمائی ہے جس کے ترجمہ کی سعادت بندۂ ناچیز کو حاصل ہوئی' یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔ عوام و خواص ہر دو طبقات میں اس کتاب کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جناب سیّد محسن اعجاز شاہ صاحب نے بندہ کو اس کتاب کے ترجمہ کی ذمہ داری سونپی تو بندہ نے اپنی سعادت سمجھتے ہوئے احسن انداز میں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔

تا کہ بندہ کا نام بھی اُن خوش بختوں میں شامل ہو جائے جنھوں نے سیرتِ طیبہ کی خدمت کی۔

زیرِنظر کتاب چند خصوصیات کی بناء پر سیرت کی دیگر کتب سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے:

(۱) علمی وفکری یلغار کرنے والے مستشرقین اور ان کے ہم نواؤں نے ''دینی اصلاح'' کے نام پر اپنی تحریروں کے ذریعے سیرتِ طیبہ کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کر رکھی تھیں' زیرِنظر کتاب کے مطالعہ سے وہ غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔

(۲) بہت سے مسلم اہلِ علم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو ایک عظیم قائد' ایک زیرک اور عبقری انسان یا ایک تجربہ کار مصلح کی حیثیت سے پیش کیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبوی پہلو کو نظر انداز کیا گیا' زیرِنظر کتاب میں اس کا بھی تدارک کیا گیا ہے۔

(۳) بعض مفکرین اور محققین نے عیسائیت کی طرح اسلام کے حقائق کو بھی مادی و سائنسی اصولوں اور نئی ایجادات کے معیار پر پرکھنا چاہا اور اس صورتِ حال میں جن جن امورِ غیبیہ تک سائنسی اصول و ضوابط کی رسائی ممکن نہ ہوئی انہیں وہ ردّ کرنے لگے' اس طرح وہ معجزات کا بھی انکار کرنے لگے۔ زیرِنظر کتاب میں معجزات کی حقانیت کو واضح کیا گیا ہے۔

(۴) مصنف نے اس کتاب میں ہر واقعۂ سیرت قلم بند کرنے کے بعد اس سے اصولی و

فروعی/فقہی مسائل کا بھی استنباط کیا ہے' جو جمہور کے مسلک کی عکاسی کرتے ہیں۔

(۵) بعض مسائل جن میں بعض علماء کا اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کا وسیلہ اختیار کرنا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار سے تبرک حاصل کرنا' آپ کی تعظیم کرنا اور قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنا وغیرہ' مصنف مدظلہ العالی نے سیرتِ طیبہ کے مستند حوالہ جات دے کر ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

یہ کتاب اپنی بے شمار خصوصیات کی وجہ سے عصرِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق ہے' ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کے لیے یہ کتاب سودمند ہے اور ہدایت و رہنمائی کا باعث ہے۔

اللہ عزوجل کا بے حد و بے حساب شکر ہے کہ جس نے بندہ کو اس کتاب کے ترجمہ کی توفیق عطا فرمائی۔

دورانِ ترجمہ والدین گرامی کی شفقتیں اور دعائیں شاملِ حال رہیں تو بندہ اس قابل ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں دین و دنیا کی سعادتیں نصیب فرمائے۔

خالق و مالک کی بارگاہ میں نہایت عاجزی وانکساری سے دعا ہے کہ یہ کتاب انسانیت کے لیے نفع کا باعث بنے' اس کتاب کو تحریر فرمانے والے' اس کا ترجمہ کرنے والے' اس کے پبلشر' اس کے مصحح اور اس کام میں جملہ معاونین کی اس مساعیٔ جلیلہ کو حق تعالیٰ قبولیت کے شرف سے نوازے۔ آمین! بجاہ حبیبك المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

طالب دعا:

محمد عمران انور نظامی

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینِ اسلام کے فہم میں سیرتِ نبوی کی اہمیت

سیرتِ نبوی کے مطالعہ اور تفہیم سے نہ تو محض تاریخی واقعات کا بیان مقصود ہے اور نہ ہی اُن حالات و واقعات کے اطراف واکناف کی وضاحت مطلوب ہے۔ اس لیے کہ ہم صرف تاریخی واقعات سے سیرتِ نبوی کی سمجھ حاصل نہیں کر سکتے' تاریخی واقعات کی وجہ سے سیرتِ نبوی یا تو ایک حکمران کی تاریخ بن جائے گی یا محض ایک گزشتہ تاریخی عہد کی تاریخ بن کر رہ جائے گی۔

بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ اس کے بنیادی قواعد اور احکام ذہن میں رکھ کر ایک مسلمان آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی عملی تصویر میں حقیقتِ اسلام کی صورت ملاحظہ کرے۔ یعنی سیرتِ نبوی کے مطالعہ سے ایسا تطبیقی عمل مراد ہے جس سے حقیقتِ اسلام کا مکمل ڈھانچہ سامنے آئے جس کی سب سے افضل و اعلیٰ مثال حضرت محمد ﷺ کی ذات ہے۔

جب ہم اس مقصد کے حصول کے لیے کچھ اہداف متعین کر کے ان کو تصنیف کی شکل دینا چاہتے ہیں تو اس کی تفصیلی وضاحت مندرجہ ذیل اہداف کی روشنی میں ممکن ہے:

(۱) آپ ﷺ کی ظاہری زندگی اور اُس وقت کے ظاہری حالات کے برعکس آپ ﷺ کی شخصیت کو نبوت کے اعتبار سے سمجھنا۔

تا کہ یہ بات متحقق ہو سکے کہ آپ ﷺ کی ذات محض اس عبقری انسان کی طرح نہیں جس کی عبقریت اس کو اپنی قوم میں بلند کر دیتی ہے بلکہ آپ ﷺ اپنی تمام بے مثل خصوصیات سے پہلے اللہ کے محبوب رسول ہیں جن کی تائید اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے وحی اور مدد کی صورت میں نازل فرمائی۔

(۲) یہ کہ انسان اپنے سامنے کامیاب زندگی کے جملہ مراحل کی اعلیٰ مثالی صورت پائے تا کہ اُس سے انسان ایک دستور مرتب کرے جس پر انسان کاربند رہ سکے اور اس کے

مطابق زندگی گزار سکے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان جب بھی جملہ شعبہ ھائے زندگی کی اعلیٰ مثال تلاش کرتا ہے تو وہ یہ سب کچھ رسول اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں بدرجۂ اتم و بدرجۂ کمال پالیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات کو ساری انسانیت کے لیے ماڈل اور قابل عمل نمونہ قرار دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (الاحزاب:۲۱)　بے شک تمہاری رہنمائی کے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے۔

(۳) یہ کہ انسان' رسول اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے ایسی راہنمائی حاصل کرے جو اُس کے لیے قرآن پاک کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہو' اور قرآن پاک کی روح کو سمجھنے میں معاون ہو۔

کیونکہ قرآن پاک کی بے شمار ایسی آیات ہیں جن کی تفسیر و تشریح ان واقعات سے ہوتی ہے جو رسول اکرم ﷺ کے ساتھ پیش آئے۔

(۴) یہ کہ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے مسلم امہ کے لیے اسلامی ثقافت کی اعلیٰ اقدار اور صحیح اسلامی روایات کا مجموعہ سامنے آئے جو عقائد' احکامِ شریعت اور اخلاقِ عالیہ سب سے متعلق ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اسلام کے جملہ مبادی و احکام کی روشن و منور عملی تصویر ہے۔

(۵) یہ کہ ایک معلم اور داعی اسلام کے لیے تعلیم و تربیت کا زندۂ جاوید نمونہ حاصل ہو' جس کے مطابق تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری کیا جا سکے' بے شک آپ ﷺ بہترین خیر خواہ' معلم اور عظیم مربّی ہیں' جنھوں نے تعلیم و تربیت کے کامیاب طریقوں سے اسلام کو پھیلانے کے لیے جدوجہد کی اور اس میں ذرا سی کوتاہی بھی نہیں کی۔

ان مذکورہ بالا اہداف کی روشنی میں حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں غور و فکر کرنے کی صورت میں جو مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں ان میں جو سب سے اہم بات سامنے آتی ہے' وہ یہ

ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے جملہ اُمور و معاملات پر حاوی ہے اور مشعلِ راہ ہے۔ چاہے وہ شخص مستقل بالذات فرد ہو یا وہ معاشرے کا ایک فعال عضو ہو' آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے ایک نوجوان کی زندگی کا بلند پایہ نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنے کردار میں پختہ اور صاف ہو' اپنی قوم اور اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ امانت دار ہو' اسی طرح ایک ایسے داعی کا بہترین نمونہ سامنے آتا ہے جو لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت سے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے' اور اپنے پیغام کے ابلاغ کے لیے اپنی پوری جدوجہد صرف کرتا ہے۔ ایک ایسے سربراہِ مملکت کا نمونہ واضح ہوتا ہے جو پوری حکمت اور باریک بینی سے اپنے اُمور سرانجام دیتا ہے' ایک ایسے مثالی خاوند کا نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنے اہل کے ساتھ حسنِ معاملہ سے پیش آتا ہے' ایک ایسے باپ کا نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنی اولاد سے شفقت اور عاطفت کا سلوک کرتا ہے' اور اپنی زوجہ اور اولاد کے جملہ حقوق کو بجالاتا ہے' ایک ماہر فوجی سپہ سالار اور سچے سیاست دان کا نمونہ سامنے آتا ہے' ایک مسلمان کی اُس جامع اور مکمل زندگی کا نمونہ سامنے آتا ہے جو دقت و عدل سے اپنے رب کی عبادت گزاری اور اس کی طرف یکسوئی کے ساتھ اپنے اہل و عیال اور اصحاب کے ساتھ بھی پرلطف زندگی گزارتا ہے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ سیرتِ نبوی کے مطالعے سے انسانی زندگی کے یہ تمام پہلو اعلیٰ نمونے اور کامل ترین صورت میں عملی طور پر ہمارے سامنے ظاہر ہو گئے۔

مطالعۂ سیرتِ نبوی کا ارتقاء اور آج اس کو سمجھنا کیسے ضروری ہے؟

سیرتِ نبوی اور تاریخ

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت نے عظیم تاریخ کی تحریک کے لیے اساسی بنیاد فراہم کی جس سے مسلمان اپنی زبانوں اور علاقوں کے اختلاف کے باوجود دنیا میں سربلند ہوئے۔

اسی سیرت کی بنیاد پر مسلمانوں نے تاریخ مدوّن کی کیونکہ مسلم ادباء نے سب سے پہلے

جن تاریخی حالات وواقعات کی تدوین کی' وہ سیرتِ نبوی ہی کے واقعات ہیں' پھر اسی بنیاد پر تاریخی حالات کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے حتیٰ کہ دورِ جاہلیت کی وہ تاریخ جو اسلام کے آنے سے پہلے کئی ادوار میں پھیلی ہوئی تھی' مسلم مؤرخین نے اس کو اکٹھا کرنے کی طرف توجہ دی اور اس کو بھی مدوّن کیا' اسلام کی روشنی پھیلنے سے پہلے کے دور کو دورِ جاہلیت کا نام دیا اور افضل الرسل حضرت محمد ﷺ کی ولادت باسعادت اور آپ کی حیاتِ طیبہ کو تاریخ کا روشن دور قرار دیا گیا۔

تب سیرتِ نبوی نے ایک مرکز ومحور کی شکل اختیار کی جس کے اردگرد پوری تاریخ اسلام کی تدوین گھومتی ہے' بلکہ سیرتِ نبوی کی تدوین کا عمل ایسا گراں قدر کارنامہ تھا جس نے سب سے پہلے جزیرۂ عرب میں اپنے اثرات مرتب کیے اور دوسرے نمبر پر پورے عالم اسلام کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا' مسلمانانِ عرب وعجم کے ہاں تاریخی واقعات کی روایت کے فن نے' علمی معیار کا وہ درجہ اختیار کر لیا کہ جس پر دوسرے واقعات کی صحت وعدم صحت کو پرکھا جاتا تھا' یہ مقام کسی دوسری قوم کو حاصل نہ ہو سکا' حالانکہ مؤرخین نے اس فن کو اپنی کتابوں میں تاریخی کسوٹی کے طور پر نہیں لکھا لیکن اس کے باوجود یہ فن روایت سیرتِ نبوی کی وجہ سے بلند پایہ علمی وتاریخی معیار قرار پایا' کیونکہ سیرتِ نبوی کی تدوین کو مؤرخین نے دینی ضرورت سمجھا اور نہایت احتیاط سے صحیح روایات کو جمع کیا تاکہ اس میں جھوٹ اور اختلاط کا شائبہ تک نہ رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت اور سنت ہی قرآن مجید کے فہم کی اوّلین بنیاد ہیں' اور پھر یہ دونوں بلند پایہ قابل عمل نمونے ہیں' جن پر عمل پیرا ہونا فلاحِ دارین کے حصول کا باعث ہے۔

اس فن کی ترقی اور صحت کا دارومدار اس بات پر بھی ہے کہ مؤرخین ومدوّنین' رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان رکھتے اور قرآن مجید کو کلامِ الٰہی مانتے تھے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ان سے جواب طلبی ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کام میں لغزش پر اُن سے بہت سخت حساب لے گا' اس یقین کی بنیاد پر مؤرخین نے سیرتِ نبوی اور سنتِ مصطفوی کے حقائق تک رسائی حاصل کرنے میں اپنی پوری کوشش اور جدوجہد صرف کی اور ان کو محفوظ بنایا۔

اس مقصد تک رسائی کے لیے کئی علوم مرتب ہوئے' علم جرح وتعدیل مرتب کیا گیا'

اصطلاحِ حدیث کے قواعد وضع کیے گئے تاکہ سیرت وسنت نبوی کی تدوین ہر شک وشبہ سے پاک ہو۔ یہ علوم پہلے سنت مطہرہ کی خدمت کے لیے استعمال ہوئے جو لامحالہ پوری سیرتِ نبوی کو عام تھے' اس کے بعد پھر یہ عمومی تاریخ کے لیے منہج کے طور پر استعمال ہونا شروع ہو گئے اور واقعات کی صحت کو پرکھنے کے لیے کسوٹی قرار پائے۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ سیرتِ نبوی کی تدوین ایک ایسا وسیع وعریض باب تھا جس میں سے مسلم مؤرخین عمومی تاریخ کے مطالعے اور تدوین کی طرف داخل ہوئے' اور وہ علمی و اصطلاحی قواعد جن سے انہوں نے اخبار و روایات کو جمع کرنے میں مدد حاصل کی' وہ قواعد مسلمانوں نے خود وضع کیے' اس ضرورت کے پیش نظر کہ مصادرِ اسلام کو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک رکھا جائے اور کسی قسم کی جھوٹی روایت اس میں داخل نہ ہونے پائے۔

سیرتِ نبوی کی تدوین کیسے شروع ہوئی اور کس طرح پروان چڑھی؟

زمانی ترتیب کے لحاظ سے سنت نبوی کی نسبت سیرتِ نبوی کی تدوین دوسرے نمبر پر ہے' بے شک سنت نبوی یعنی حدیثِ طیبہ کو سب سے پہلے تحریر کیا گیا اور اس کے بعد عمومی سیرتِ نبوی کی تدوین ہوئی۔ جس طرح یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ہی حدیث شریف لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کا حکم دیا۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ ﷺ کو اپنے صحابہ پر پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ وہ قرآن پاک کے معجزانہ اسلوب اور حدیث طیبہ کے بلیغانہ طرز میں واضح فرق کر سکتے ہیں' پس اب کبھی بھی ان دونوں میں التباس نہ ہوگا' اس طرح سنت کی تدوین کا آغاز آپ کی حیاتِ طیبہ میں ہی ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت ومغازی کی باقاعدہ تدوین' سنت کی تحریر کے بعد شروع ہوئی' اگرچہ اس سے پہلے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سیرت ومغازیٔ رسول کا ذکر زبانی کلامی کرتے رہتے تھے۔

سب سے پہلے سیرتِ نبوی کے موضوع پر کتاب لکھنے کا اہتمام حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (۹۲ھ) نے کیا' پھر ابان بن عثمان (۱۰۵ھ) نے' پھر وہب بن منبہ (۱۱۰ھ) نے' پھر شرحبیل بن سعد (۱۲۳ھ) نے' پھر ابن شہاب الزہری (۱۲۴ھ) نے اس موضوع پر

لکھا۔ یہ اصحاب جن کے نام اوپر لکھے گئے ہیں' یہ لوگ سیرتِ نبوی کی تدوین کا اہتمام کرنے والے سب سے پہلے خوش نصیب ہیں' ان کی کتابوں کو بھی اس عظیم علمی کام کا مطلع اوّل شمار کیا جاتا ہے بلکہ عمومی تاریخ کی تدوین میں یہ کتابیں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں' قطع نظر اس کے کہ آپ ﷺ کی سیرت کے واقعات کتاب اللہ میں بھی موجود ہیں' حدیث کی کتابوں میں بھی موجود ہیں جن سے شریعت کے احکام اخذ کیے جاتے ہیں' لیکن باقاعدہ طور پر سیرت نگاری کا فن' کتابت حدیث کے بعد شروع ہوا۔

مذکورہ بالا سیرت نگاروں نے جو کچھ لکھا وہ اگرچہ زمانے کے تغیرات سے تلف ہو گیا اور اس میں سے ہم تک کوئی چیز نہ پہنچی سوائے ان چند بکھری ہوئی روایات کے جن میں سے بعض طبری نے روایت کی ہیں' اور کہا جاتا ہے کہ دیگر سیرت نگاروں نے بھی جو کچھ لکھا وہ بھی وہب بن منبہ کے مجموعے سے لیا گیا تھا' جس کا کچھ حصہ جرمنی کے شہر ہائیڈلبرگ میں محفوظ ہے۔

لیکن اس کے بعد سیرت نگاروں کا ایک ایسا طبقہ آیا جنہوں نے پہلے طبقے کی روایات کو اپنی کتابوں میں بہتر انداز میں مدوّن کیا جو بحمد للہ نہایت بہترین اسلوب میں ہم تک پہنچا' اس بعد میں آنے والے سیرت نگاروں کے طبقہ میں سرفہرست محمد بن اسحاق (المتوفی ۱۵۲ھ) ہیں۔ محققین اس بات پر جمع ہیں کہ محمد بن اسحاق نے سیرت کے موضوع پر جو کچھ لکھا وہ اس دور میں سب سے زیادہ ثقہ و معتبر شمار کیا جاتا ہے [1]

اگرچہ ان کی کتاب ''المغازی'' من وعن ہم تک نہیں پہنچی مگر ابو محمد عبد الملک المعروف ابن ہشام جو ان کے بعد آئے' انہوں نے سیرت کے موضوع پر ایک مدلّل کتاب مرتب کی جو اب بھی موجود ہے۔ یہ کتاب محمد بن اسحاق کی کتاب کے تقریباً پچاس سال بعد مرتب کی گئی۔

ابن خلکان کہتے ہیں:

یہ ابن ہشام وہی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو ابن اسحاق کی کتاب ''المغازی'' اور ''السیر'' سے جمع کیا اور اس کی تلخیص و ترتیب کی' یہی وہ کتاب ہے جو ''سیرت

[1] ابن اسحاق کی سوانح حیات کے بارے میں دیکھیے: ابن سید الناس کی کتاب ''عیون الاثر'' کا مقدمہ۔

ابن ہشام'' کے نام سے لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

(وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۹۰' المطبعۃ المیمنیۃ' مصر)

بہر حال سیرتِ نبویہ کے مصادر جن پر مختلف طبقات کے تمام سیرت نگاروں نے اعتماد کیا ہے' وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) قرآن مجید' یہ وہ پہلا مصدر ہے جس پر حضور ﷺ کی عمومی زندگی کی معرفت اور سیرتِ طیبہ کی معرفت اور سیرتِ طیبہ کی اجمالی پہچان کے لیے اعتماد کیا جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان کا بیان قرآن کے کس اسلوب میں کیا گیا ہے۔

(۲) کتب احادیث' یہ وہ کتابیں ہیں جنہیں اُن ائمۂ حدیث نے مرتب کیا جن کی صداقت و دیانت سب پر عیاں ہے۔ مثلاً صحاح ستہ' موطأ امام مالک' مسند امام احمد وغیرہ' اگرچہ ان کتابوں کے مرتب کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور افعال کو احکامِ شرعیہ کے طور پر بیان کیا جائے' تاریخ کی تدوین اس کا مقصد نہیں تھا' اسی لیے ان حدیث کی کتابوں میں اکثر احادیثِ طیبات کو فقہی ابواب کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے اور بعض احادیث کو ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسماء کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے' جن صحابہ کرام نے ان احادیث طیبات کو روایت کیا' اس میں بھی تاریخی اور زمانی ترتیب کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔

(۳) وہ راوی جنہوں نے حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو عمومی طور پر روایت کرنے کا اہتمام کیا۔ کافی صحابہ کرام نے اس طرح کی روایات نقل کی ہیں بلکہ جو صحابی بھی کسی خاص موقع پر آپ ﷺ کی معیت میں تھا اور کوئی خاص بات ملاحظہ کی تو اُس صحابی نے وہ بات دیگر صحابہ کرام تک متعدد بار پہنچائی' لیکن کسی صحابی نے بھی اُن واقعات کو خاص ترتیب سے جمع کرنے اور مدون کرنے کا اہتمام نہیں کیا' میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس بنیادی سے فرق کی طرف بھی آپ کی توجہ دلاؤں کہ عمومی طور پر سیرت نگاری کیا ہے اور خصوصی طور پر اس کی تالیف و تدوین کیا ہے؟ پس عمومی طور پر سیرت نگاری سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سنت کا ذکر جو متعدد کتابوں میں غیر مرتب موجود ہے اور خصوصی طور پر سیرت نگاری سے مراد یہ ہے کہ علیحدہ طور پر آپ ﷺ

کی حیاتِ طیبہ کو ایک کتابی شکل میں مرتب کرنا' یہ کام بعد میں کیا گیا جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

سیرتِ نبوی کی روایت کا علمی طریقہ

یہ بات عیاں ہے کہ سیرت نگاری کا علم تاریخ نویسی کے عموم میں داخل ہے۔ اگرچہ سیرتِ نبوی جیسا کہ ہم نے پیچھے وضاحت کر دی' تاریخ مرتب کرنے کی بنیاد تھی۔ اسی کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل اور بعد کے واقعات اور احداث کو بھی مرتب کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔

لیکن سیرت نگاروں نے تاریخ مرتب کرنے اور کتب مدوّن کرنے میں کس طریقہ پر اعتماد اور اعتبار کیا؟ انہوں نے اس ضمن میں علمی اصول وقواعد کی بنیاد پر ایک معتمد اور معتبر طریقہ اپنایا جسے آج تاریخ نویسی کی اصطلاح میں ''المذہب الموضوعی'' کہا جاتا ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ سیرت نگاروں اور علماء سیرت نے سیرت کے ہر واقعہ کو اصول و قواعد کی کسوٹی پر پرکھا' اصول وقواعد کی یہ علمی کسوٹی اصطلاحاتِ حدیث کے قواعد پر مشتمل تھی جس میں سند ومتن' جرح وتعدیل اور رواۃ کے احوال پر مبنی اصول وضوابط موجود ہوتے۔

جب ان قواعد علمیہ پر وہ واقعات اور اخبار کو پرکھ لیتے تو پھر اس پر توقف کرتے اور اس کو مدوّن کر لیتے' ان واقعات کی تدوین میں وہ فکری تصورات' نفسانی ہیجانات اور معاشرتی رجحانات کو بالکل داخل نہ ہونے دیتے۔

ان کا خیال تھا کہ ان انتہائی دقیق اور نازک علمی قواعد کی کسوٹی پر اتر کر جو تاریخی واقعہ معلوم ہوتا ہے' وہ ایک مقدس حقیقت ہے' اسے اپنی اصلی صورت میں ہی لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آنا چاہیے۔ اسی طرح ان کا خیال یہ بھی تھا کہ یہ ایک بد دیانتی اور ناقابل معافی جرم ہے کہ ذاتی تجزیات' نفسانی خواہشات جو اکثر ماحول کا انعکاس ہوتی ہیں اور تعصب کا ثمر ہوتی ہیں' ان کو اپنے اوپر ایسے مسلط کر لیا جائے کہ ان کی بنیاد پر جو چاہے لکھ دیا جائے اور جو چاہے پوشیدہ کر دیا جائے۔

ان قواعد علمی اور تاریخ کے اس معروضی (آبجیکٹیو) نظریہ کی بنیاد پر سیرتِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہم تک پہنچی ہے' جس کی ابتداء آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے ہوتی ہے' سیرت کے

ان مضامین میں آپ ﷺ کا نسب مبارک، بچپن، لڑکپن، جوانی کے جملہ واقعات کا ذکر منقول ہے، اسی طرح آپ ﷺ کے بچپن اور جوانی میں جو خارقِ عادت اُمور ارہاصات کی شکل میں بعثت تک رونما ہوتے رہے، ان کا ذکر بھی کیا گیا۔ آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ اور صدق و امانت کا تذکرہ بھی موجود ہے، اسی طرح نبوت کے اعلان کے بعد آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک پر جو خارقِ عادت کام اور معجزات اللہ تعالیٰ نے جاری فرمائے ان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے آپ ﷺ نے دعوت کے جن مراحل کو طے کیا، اس دوران صلح، دفاع، جہادِ عام اور دعوت الی اللہ کے جن چیلنجز کا سامنا کیا ان کا ذکر بھی موجود ہے، یہ سب کچھ قرآن اور اس کی تشریح و تبیین کرنے والی احادیث کے ذریعے ہم تک پہنچا۔

حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے اس سلسلے کی نسبت تاریخی عمل محفوظ ذریعے سے ہم تک منتقل ہوا، اس سلسلے میں روایات کی تحریر، اسناد و اتصال کی درستگی پوری امانت داری سے عمل میں لائی گئی۔ اس ضمن میں راویوں کے حالات، متن کی صحت، واقعہ کی درستگی، اور اس میں پائے جانے والے شذوذ کو مدنظر رکھتے ہوئے سب کچھ مرتب کیا گیا۔ جہاں تک ان واقعاتِ سیرت کو مکمل طور پر قبول کر لینے کے بعد ان سے نتائج، احکام اور مبادی و معانی مستنبط کرنے کا تعلق ہے تو یہ ایک دوسرا علمی کام ہے جس کا تاریخ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اس میں ایک حالت کو دوسری حالتوں میں نہیں ملایا جائے گا۔

واقعاتِ سیرت سے احکام مستنبط کرنے کا جو عمل ہے یہ ایک بالکل علیحدہ علمی کام ہے اور اپنی ذات میں یکسر مستقل ہے، جو علیحدہ طریقے اور قواعد وضوابط پر قائم ہے۔ اس علم کے ذریعے واقعات سے نتائج اور اصول و مبادی مستنبط کر کے انہیں ایک ایسے علمی قالب میں بیان کیا جاتا ہے جس میں وہم اور نفسانی خواہش کا کوئی عمل دخل نہ ہو، جسے ولیم جیمس جیسے افراد ''ارادۃ الاعتقاد'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان قواعد میں قیاس استقرائی، مختلف اقسام کے قانونِ التزام اور مختلف انواع کی دلالات وغیرہ شامل ہیں۔

سیرتِ نبوی کے واقعات سے ان قواعد کے مطابق بہت سے احکام مستنبط کیے گئے ہیں، ان میں سے کچھ عقیدہ و یقین سے متعلق ہیں اور کچھ شریعت و قانون سازی سے متعلق

ہیں' اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم اس بات کو بہ خوبی جانیں کہ یہ قواعد' تاریخ و تدوین اور اس کے معنی و مضمون سے علیحدہ ہیں۔ یہ اُس علمی کاوش کا نتیجہ ہیں جو علمی قواعد پر مبنی تاریخی عمارت کی حدود میں اُبھرے' جن کا ذکر ہم نے پیچھے کر دیا۔

تاریخ نویسی کے جدید مذاہب کی روشنی میں سیرتِ نبویؐ کا مقام

انیسویں صدی میں تاریخ کی تدوین و ترتیب کے مختلف طریقے ظاہر ہوئے جن میں ایک معروضی طریقہ بھی ہے جسے سائنسی طریقہ بھی کہتے ہیں۔ ان جملہ طریقوں میں مشترک چیز جو سامنے آتی ہے اس پر ''نظریۂ ذاتی'' کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے' اس نظریہ کے بڑے داعیوں میں ''فرویڈ'' سب سے بڑا شمار کیا جاتا ہے جو اس کے لیے خوب سرگرم ہے۔

اس نظریے کے بڑے بڑے داعی اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتے کہ مؤرخ تاریخی واقعات واحداث کی تفسیر و تشریح کے دوران اپنے فکری' دینی یا سیاسی رجحانات میں سے کوئی چیز شامل کر دے' بلکہ یہ اسے مؤرخ کی ذمہ داری سمجھتے ہیں' ان کے خیال میں مؤرخ کا کام محض خبریں دینا اور واقعات کو جمع کرنا ہی نہیں۔

یہ طریقہ تاریخ کی تدوین کو محض ایک فنی عمل بنا دیتا ہے جس میں اس کا علمی دقیق عمل دب کر رہ جاتا ہے۔

ہم یہاں پر ان تاریخی مذاہب اور ان پر تنقید کے بارے کچھ نہیں کہتے' بلکہ ہم اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ سائنس کا زمانہ جس میں سائنسی اصول وضوابط کو بہت معتبر سمجھا جاتا ہے' اس زمانہ میں بھی اس نظریے کے داعی اور اس کو ماننے والے موجود ہیں۔ یہ نظریہ اُن تمام حقائق اور واقعات کو بالکل تبدیل کر دیتا ہے جنہیں زمانہ اپنے قدیم ہیکل قدسی میں سمیٹے ہوئے ہوتا ہے اور مختلف نسلوں کے درمیان جو محفوظ رہتا ہے۔ اس جدید نظریہ کے مطابق ان محفوظ تاریخی واقعات میں ذاتی خواہشات' تعصب اور فکری تخیلات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ تو اس طرح اس خیالی' وہمی اور ظالم نظریہ کی رُو سے کتنے ہی حقائق کو مسخ کر دیا گیا ہوگا' کتنے واقعات تبدیل کر دیئے گئے ہوں گے' کتنی عظمتیں خاک میں ملا دی گئی ہوں گی اور کتنے بے گناہوں پر ظلم کیا گیا ہوگا۔

کیا اس جدید نظریہ نے سیرت نگاری اور اس کے طریقۂ تحلیل کو بھی متاثر کیا ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نویسی کا یہ جدید نظریہ محققین کے ایک گروہ کے نزدیک سیرتِ نبوی کے مطالعے کے لیے ایک جدید مکتب فکر کی بنیاد بن گیا ہے۔ یہ مکتب فکر کیسے پروان چڑھا؟ اس کے پروان چڑھنے کے کیا عوامل ہیں؟ اور آج اس کا کردار کیا ہے؟

اس مکتب فکر کی بنیاد مصر پر برطانوی تسلط کے دور میں رکھی گئی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اُس وقت مصر عالم اسلامی کا مرکز تھا' جب بھی اسلام کے بارے میں کوئی چیز معلوم کرنی ہوتی تو ان کی فکر و دانش سے استفادہ کیا جاتا' جس طرح حج یا نماز کا ارادہ ہو تو کعبۃ اللہ کا رخ کیا جاتا ہے۔

ایک جانب مسلسل یہ بہت بڑی آواز تھی اور دوسری جانب عالم اسلامی مسلسل خاموش ہمہ تن گوش تھا' جس نے برطانوی سامراج کو چین اور سکون سے بیٹھنے نہ دیا۔

اگرچہ برطانیہ نے آگ و آہن کی قوت سے مصر پر اپنی حکمرانی قائم کر لی لیکن یہ وقتی غلبہ تھا جس سے وہ مطمئن نہیں تھے کیونکہ جب تک یہ زندہ قیادت جامعۃ الازھر کے ہاتھ تھی' اس وقت تک برطانیہ کو مکمل غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے برطانوی سامراج کے لیے دو میں سے ایک حل پر عمل کرنا ضروری ہو گیا تھا' اس کے علاوہ کوئی تیسرا حل نہیں تھا۔

اوّل: یہ کہ جامعۃ الازھر سے امتِ مسلمہ کا تعلق توڑ دیا جائے' اس طرح کہ امت مسلمہ پر اس کا کوئی اثر نہ رہے۔

دوم: یہ کہ خود جامعۃ الازھر کے عملی مرکز قیادت تک رسائی حاصل کر لی جائے اور اس کی قیادت کا رخ اُس ڈگر پر موڑ دیا جائے جس سے برطانیہ کے تسلط کے مصالح پورے ہوں اور اس تسلط کو قائم رکھنے کے لیے اطمینان اور استقرار حاصل ہو سکے۔

برطانیہ نے اس مسئلے کے لیے دوسرا حل اختیار کرنے میں ذرا تردد نہ کیا' اس وجہ سے کہ یہ راستہ اختیار کرنے میں منزل تک رسائی آسان تھی اور اس سازش کے بے نقاب ہونے کی وجوہات کم تھیں[1]

جامعۃ الازھر کی علمی اور فکری قیادت کے اندر گھسنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ امت مسلمہ کے کمزور اور دردناک نکتے کی طرف توجہ مرکوز کی جائے' جس سے پوری امت مسلمہ بشمول

[1] دیکھیے: مذاکراتِ لارڈ کرومر اور ''الاتجاھات الوطنیۃ فی الادب الحدیث'' ڈاکٹر محمد حسین

مصر کے احساسات مجروح تھے' وہ احساس یہ تھا کہ مسلمان جو ایک جانب کمزوری' تفرقے اور انتشار کا شکار ہیں اور دوسری جانب وہ مغرب کی فکری' علمی اور تہذیبی میدانوں میں عجیب ترقی اور پروان دیکھ رہے ہیں' مسلمان اُس دن کو جھانک جھانک کر دیکھ رہے ہیں جس میں وہ اپنے اوپر پڑے ہوئے بھاری بوجھوں سے نجات حاصل کریں گے اور دوسری اقوام کے ساتھ وہ تہذیب وتمدن اور جدید علوم کی ترقی کے سفر میں شریک ہوسکیں گے۔

اس سرگوشی کے ذریعے بلکہ اس استعماری سازش کے ذریعے وہ مصر کے بعض فکری قائدین کے دلوں میں گھس گئے' اس ذریعہ سے ان مفکرین کو سمجھا دیا گیا کہ مغرب نے اپنی بیڑیوں سے اُسی وقت آزادی حاصل کی جب انہوں نے دین کو سائنسی پیمانوں کے تابع کر دیا' دین ایک چیز ہے اور سائنس دوسری چیز ہے' اور ان دونوں کے درمیان مطابقت و موافقت اُسی صورت میں ہوسکتی ہے جب پہلے کو دوسرے کے تابع کر دیا جائے' اور اگر عالم اسلامی واقعی اسی طرح کی آزادی کا طلب گار ہے تو اسے بھی یہی راستہ اختیار کرنا ہوگا' عالم اسلام کو دین اسلام اُسی طرح سمجھنا ہوگا جس طرح وہاں مغرب میں عیسائیت کو سمجھا گیا۔ یہ بات اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تھی جب تک کہ فکر اسلامی ان تمام اعتقادی غیبیات سے چھٹکارا نہ حاصل کر لے' جو نا قابل فہم ہیں یا یہ کہ یہ تمام عقائد غیبیہ جدید سائنسی پیمانوں کے تابع نہیں ہو جاتے۔

اس سرگوشی کو بہت جلد اُن لوگوں نے قبول کر لیا جن کی نگاہیں یورپی جدید ترقی کے سامنے چندھیا گئی تھیں' یہ ایسے مسلمان مفکرین تھے جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان کے حقائق راسخ نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ان کے ذہنوں میں جدید علوم کے حقائق کی کوئی واضح تصویر تھی۔ انہوں نے ہر اُس عقیدۂ غیبیہ سے براءت کا اظہار کر دیا جس تک جدید سائنسی دریافتوں کی رسائی نہیں ہوئی تھی یا جو تجربہ اور انسانی مشاہدے میں نہ آ سکا۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے' ان کو انہوں نے ''دینی اصلاح'' کا نام دے دیا۔ متعدد اُمور میں انہوں نے یہ اصلاحات کیں' سیرت نگاری اور اس کی تفہیم کے شعبے میں بھی انہوں نے اصلاحات کیں' اس شعبے میں انہوں نے سیرت کے تجزیہ وتحلیل کے حوالے سے ایک ایسا جدید منہج اپنایا جو ان کے مقصد سے متفق تھا۔ وہ یہ کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق غیبیات اور

خوارق کے ساتھ تھا اور وہ جدید سائنس کے موافق نہیں تھی اور نہ ہی قابلِ فہم تھی' اس کو انہوں نے چھوڑ دیا۔

ایسے (کمزور ایمان والے) لوگوں کے لیے تاریخ نویسی کا یہ "نظریۂ ذاتیت" بہتر پناہ گاہ بنا' اس طرح انہوں نے اپنے مقصد کے مطابق تحقیق کے طریقے کو ڈھالا۔

سیرتِ نبوی کے موضوع پر ایسی کتابیں آنے لگیں جن میں روایت' سند' قواعد و شروطِ حدیث کا معیار قائم کرنے کی بجائے ذاتی طریقۂ استنباط اور دلی خواہش کے طریقے کو اپنایا گیا' اور اس میں مؤلف کی ذاتی رغبت' مخصوص اغراض و مقاصد اور مذہبی رجحان بھی شامل ہو گیا۔ اس طریقہ پر چل کر ان مؤرخین اور ادباء نے سیرتِ نبوی میں سے ان معجزات اور خارقِ عادت اُمور کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو عادت اور مشاہدے کے مخالف تھے۔

انہوں نے حضور ﷺ کے لیے عبقریت' عظمت' شجاعت اور اس جیسی دوسری صفات کا تذکرہ کثرت سے کر دیا تاکہ قاری کا ذہن آپ ﷺ کی انہی ظاہری صفات میں مشغول رہے اور آپ ﷺ کی ذات سے وابستہ امتیازی صفات نبوت' وحی' رسالت اور اس جیسی دیگر صفات جو آپ ﷺ کی شخصیتِ نبوی سے متعلق ہیں' ان کی طرف قاری کی توجہ مبذول نہ ہو۔

سیرت نگاری کے اس رجحان کا بہترین نمونہ حسین ھیکل کی کتاب "حیاتِ محمد" ہے۔ مصنف اپنے اس نقطۂ نظر کا اظہار واشگاف الفاظ میں فخر کے ساتھ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

بے شک کتبِ سیرت اور کتبِ حدیث میں جو کچھ لکھا گیا ہے میں نے اس میں سے اخذ نہیں کیا بلکہ میں نے اس بات کو ترجیح دی کہ میں یہ بحث علمی طریقہ کے مطابق پیش کروں۔

سیرت نگاری اور اس کی تفہیم کے اس جدید طریقے کا ایک نمونہ محمد فرید وجدی مرحوم کا وہ سلسلۂ مقالات ہے جو مجلۃ "نور الاسلام" میں "السیرۃ المحمدیۃ تحت ضوء العلم والفلسفۃ" (سیرتِ محمدی' سائنس اور فلسفہ کی روشنی میں) کے عنوان کے تحت شائع ہوا' اس میں ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:

ہمارے قارئین نے دیکھا ہوگا کہ ہم سیرت نگاری کے حوالے سے چاہتے ہیں کہ ہم اعجاز اور معجزے کو بیان کرنے کے سلسلے میں بہت زیادہ تفصیل میں نہ جائیں جب تک اس کی

تعلیل عام اسباب سے بغیر کسی تکلف کے ممکن ہو۔

اسی جدید طریقہ کی سیرت نگاری کا نمونہ وہ بہت سی کتابیں بھی ہیں جو مستشرقین نے حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے متعلق تحریر کیں' ان کی یہ تحریریں اُن تاریخی کتب کے مطابق ہیں جو اس نظریۂ ذاتیت پر قائم ہیں' جس نظریہ کا ذکر ہم نے تھوڑی دیر پہلے کیا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ لوگ حضرت محمد ﷺ کی عظمت و بزرگی بیان کرتے ہیں اور آپ کی شان اور آپ کی صفاتِ حمیدہ کے متعلق بھی بات کرتے ہیں لیکن آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں سے وحی اور نبوت کے پہلو کو بیان کرنے سے کوسوں دور رہتے ہیں تاکہ قاری کی توجہ اس طرف نہ ہو' اسی طرح یہ لوگ اسناد اور روایات لکھنے کا بھی اہتمام نہیں کرتے کیونکہ اس طرح انہیں ایسے واقعات پر بھی یقین کرنا پڑے گا جن پر اعتماد کرنا یا ان کو بیان کرنے کا اہتمام کرنا ان کے مفاد میں نہیں۔

اس طرح اس نئے مکتبۂ فکر کے داعیوں کو تاریخ نویسی میں نظریۂ ذاتیت کی پیروی میں ایک وسیع میدان ملا' جس میں وہ سیرتِ نبوی کے اُن حقائق کو پسِ پشت ڈال سکتے ہیں جو انہیں پسند نہیں' اگرچہ یہ حقائق' علم و یقین کے کتنے ہی مضبوط دلائل رکھتے ہوں۔ انہوں نے اپنے ذاتی میلانات' خواہشات اور اغراض و مقاصد کو تاریخ کے حقائق اور اس کے پس پردہ عوامل کے تجزیے کے ضمن میں معیار اور کسوٹی بنالیا' اور کسی روایت کو قبول کرنے یا رد کرنے کے سلسلے میں اپنی ذاتی خواہشات کو حکم مطلق بنالیا۔

اس سلسلے میں ہم نے دیکھا کہ انہوں نے تمام خارقِ عادت واقعات' جو سنت متواترہ یا واضح طور پر قرآن پاک سے ثابت تھے' ان کی ایسی تاویل کی کہ جس سے یہ واقعات بالکل روزمرہ کے عام واقعات شمار ہونے لگے۔ ان واقعات کی تاویل میں انہوں نے نہایت تکلف کا بھی مظاہرہ کیا' مثلاً ''ابابیل پرندے'' والی سورۂ فیل کی آیت جو اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے اس کی تاویل انہوں نے ''چیچک کے مرض'' سے کی۔

''اسراء'' ''معراج' جس کا ذکر قرآن پاک میں بالکل واضح ہے اس کی تاویل انہوں نے ''روحانی سفر اور خواب دیکھنے'' سے کی۔ اسی طرح غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے جو مدد نازل فرمائی' اس کی تاویل کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ

تعالیٰ کی محض معنوی مدد تھی۔

اسی طرح کی عجیب وغریب اور مضحکہ خیز تاویلات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت و نبوت' آپ پر صحابہ کے ایمان لانے اور عمومی اسلامی فتوحات کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے یہ تاویل کی ہے کہ یہ سب کچھ دائیں بازو کے خلاف بائیں بازو کی بغاوت تھی' جسے اقتصادی تنازعات' حصولِ رزق اور وسعت پسندی نے بھڑکایا' اور اغنیاء کے خلاف فقراء کے ردِعمل نے اس کو ہوا دی۔

سیرتِ نبوی کے مطالعے کے اعتبار سے خصوصی طور پر اور تاریخ اسلامی کے اعتبار سے عمومی طور پر یہ جدید طریقہ ایک خطرناک سازش تھی' جو بعض عام مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہی جب کہ منافقین اور خواہش نفس کے پجاریوں نے اسے پسند کیا اور بہ خوشی قبول کیا۔

ان سادہ لوحوں کی آنکھوں سے یہ بات پوشیدہ رہ گئی کہ مسلمانوں کو جس چیز کی دعوت دی جا رہی ہے جسے انہوں نے ''اسلامی عقیدہ کے معاملات میں اصلاحی انقلاب'' کا نام دیا ہے' یہ ایک استعماری سازش تھی' جس کا مقصد حقیقت میں اس عقیدۂ اسلامی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا۔ ان لوگوں سے یہ بات پوشیدہ رہ گئی کہ اسلام کو اس کے غیبی حقائق سے خالی کر دیا جائے تو اس خلا کو پُر کرنے کے لیے ایسی چیزوں کی ضرورت ہوگی جو اس کو ختم کر کے رکھ دیں۔

اس لیے کہ وحیٔ الٰہی جو اسلام کا سرچشمہ ہے' یہ تمام خوارق اور حقائقِ غیبیہ میں سرفہرست ہے' جو شخص سیرتِ نبوی میں خارقِ عادت چیزوں کا انکار اس وجہ سے کرتا ہے کہ یہ خارقِ عادت چیزیں قوانین فطرت اور جدید سائنس کے تجربات سے میلان نہیں رکھتیں' ایسا شخص بالکل اسی دلیل کی وجہ سے وحیٔ الٰہی اور اس کے ضمن میں آنے والی حشر ونشر' حساب کتاب اور جنت ودوزخ سے متعلق خبروں کو بھی ماننے سے انکار کر دے گا' اسی طرح اُن سے یہ بات بھی پوشیدہ رہ گئی کہ جو دین بذاتِ خود صالح ہو' اس کو کسی زمانے میں بھی کسی مصلح یا کسی اصلاح کی ضرورت وحاجت نہیں ہوتی۔

یہ تمام چیزیں ان لوگوں سے پوشیدہ رہ گئیں' حالانکہ ان کا ادراک' سائنس کے عمومی

تقاضوں میں سے تھا' بہ شرطیکہ یہ لوگ اس کی حقیقت اور اس کی منطقیت سے آشنا ہوتے' لیکن ان کی آنکھیں یورپ کی جدید ترقی اور نشاۃ ثانیہ سے خیرہ ہو چکی تھیں اور سائنس والفاظ کے سحر میں لپٹ چکی تھیں' اس لیے وہ علم ومنطق کے ظاہری عناوین ومحسوسات کے علاوہ ان کے حقائق تک نہ پہنچ سکے' حالانکہ انہیں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ وہ ان ظاہری عناوین سے آگے ان کے حقائق کی مکمل سمجھ حاصل کرتے' اور ان کے مفاہیم کو صحیح طریقے سے ہضم کرتے۔

انہوں نے اس سے کوئی اثر نہ لیا بلکہ ان کی فکر پر ایک ایسی "اصلاحی" تحریک کا خیال چھایا رہا جو اسلامی عقیدہ میں اُسی طرح کا انقلاب برپا کرے جو وہاں یورپ میں عیسائی عقیدہ میں برپا ہوا۔

اسی طرح یہ جدید مکتبۂ فکر جس کی طرف تھوڑی دیر پہلے ہم نے مختصراً اشارہ کیا' ایک جذباتی اشتعال ہی تھا' جو ایسی کوئی سائنسی حقیقت نہ تھی جو عقل کو گرویدہ کر لیتی۔

موجودہ زمانے میں اس مکتبۂ فکر کا انجام

حقیقت یہ ہے کہ سیرت نگاری اور اس کے فہم کے ضمن میں اس جدید مکتبۂ فکر کو جو پذیرائی ملی تھی اور بعض کی طرف سے جس جذباتی انداز میں اس مکتبۂ فکر کو اپنایا گیا تھا' یہ ایک تاریخی موڑ تھا جو گزر چکا۔

اس ٹیڑھے راستے پر چلنا اُن لوگوں کی مجبوری تھی' جیسا کہ ہم نے کہا کہ ان لوگوں نے جب طویل غفلت اور سُستی کے بعد آنکھیں کھولیں تو ان کے سامنے یورپ کی سائنسی ترقی تھی' یہ ایک فطری بات ہے کہ روشنی پر جب پہلی نظر پڑتی ہے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اشیاء کی حقیقتیں واضح دکھائی نہیں دیتیں اور نہ ہی بعض مماثل اشیاء میں کوئی فرق اور تمیز نظر آتی ہے' حتیٰ کہ جب کچھ دیر گزر جاتی ہے اور آنکھیں روشنی کی عادی ہو جاتی ہیں تو یہ آنکھیں پھر چیزوں میں فرق اور تمیز کرنے لگتی ہیں اور حقائق واضح اور بین ہو جاتے ہیں جن میں کچھ بھی پوشیدگی اور التباس نہیں رہتا۔

اس عمل میں بھی بالکل ایسا ہی ہوا' آج کے اِس دور میں باشعور اور تعلیم یافتہ نئی نسل کی آنکھوں کے سامنے سے اس طرح کے سب پردے ہٹ گئے ہیں اور سب کچھ اپنی حقیقت

اور جوہر کے ساتھ واضح نظر آنے لگا ہے، جب کہ پچھلے لوگوں نے سائنس کے صرف الفاظ پکڑے ہوئے تھے اور اس کے ظاہری محسوسات کے دھوکے میں آئے ہوئے تھے۔

پھر بالآخر حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور اب انہوں نے باخبر محقق اور آزاد مفکر کی بصیرت پر یقین رکھتے ہوئے اس بات کو مان لیا ہے کہ خوارقِ عادت اُمور اور معجزات میں سے کوئی چیز بھی اپنے جوہر میں سائنس کے حقائق اور معیارات کے منافی اور متصادم نہیں۔

خلافِ عادت کاموں کو اسی لیے خوارق کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ یہ لوگوں کے عام مشاہدے میں نہیں آتے۔ روز مرہ کے عام اور عادت کے کام کوئی ایسا سائنسی معیار نہیں جس کی بناء پر ممکن اور غیر ممکن کا تعین کیا جا سکے۔ آج اس دور میں سائنس اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ صرف وہی چیزیں ممکن الوقوع ہیں جنہیں دیکھنے کی انسانی آنکھیں عادی اور مانوس ہوں اور اسی طرح یہ بھی سائنسی تقاضا نہیں کہ وہ چیزیں جو آنکھوں کے لیے نامانوس ہوں وہ ممکن الوقوع نہیں۔ آج کے زمانے میں ہر محقق اور تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ اس ضمن میں سائنس دان کی جدید تحقیق یہ ہے کہ اسباب اور ان کے مسببات کے درمیان جو تعلق ہم دیکھتے ہیں یہ مسلسل مشاہدے میں آنے والا تعلق ہے جسے تحلیل و تعلیل سے گزار کر اس سے ایک قانون مستنبط کیا جاتا ہے اور یہ قانون اس تعلق کے ظہور کے تابع ہوتا ہے، اس کے برعکس نہیں ہوتا۔

اگر تم سائنسی قانون سے پوچھو کہ خارق عادت کام اور معجزۂ الٰہی کے بارے میں اس کی رائے کیا ہے؟ تو وہ زبانِ حال سے کہے گا: جسے ہر صاحبِ علم بلکہ عصری ثقافت سے شناسا ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ خوارق اور معجزات میرے موضوعِ بحث اور اختصاص سے تعلق نہیں رکھتے۔ میں اس پر کوئی حکم نہیں لگا سکتا، لیکن اگر کوئی خارقِ عادت کام میرے سامنے پیش آتا ہے تو وہ اُسی وقت ایک ایسا موضوع بن جائے گا جس پر غور و فکر اور جس کا تحلیل و تجزیہ کرنا ہو گا، پھر اُس خارقِ عادت سے ایک قانون مستنبط ہو گا۔[1]

بلاشبہ وہ زمانہ بیت گیا کہ جب بعض سائنس دان یہ خیال کرتے تھے کہ یہ طبعی اسباب کا اثر ان کے مسببات پر حتمی ہوتا ہے اور اس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا، اس سلسلے میں حق اُس

---

[1] اس موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھیے: مؤلف کی کتاب "کبریٰ الیقینیات الکونیہ" ص ۳۲۹، اور مابعد

وقت واضح ہوا' جب علماء اسلام نے عمومی طور پر اور حضرت امام غزالی نے خصوصی طور پر اس کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اسباب اور مسببات کے درمیان تعلق محض یکجائی سے زیادہ نہیں ہوتا' اس کے احکام اور قوانین میں علم ایک دیوار کی مثل ہے جو محض اس یکجائی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے' اس یکجائی کا راز کیا ہے؟ تو اس کا علم اُس عظیم خدا کے پاس ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو تخلیق فرمایا اور اُسے راہنمائی عطا فرمائی۔

ہم نے دیکھا کہ مشہور سائنس دان ''ڈیوڈ ہیوم'' (DAVID HUME) نے کیسے اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔

جی ہاں! ہر عقل مند انسان جو عقل اور حقیقت کا احترام کرتا ہے' وہ کسی بھی خبر کو قبول کرنے کے لیے ایک شرط رکھتا ہے' خواہ وہ خبر خارقِ عادت امر میں سے ہو یا روزمرہ کے معمولی معاملات میں سے ہو' اور وہ شرط یہ ہے کہ وہ خبر اُس شخص تک کسی محفوظ علمی راستے سے پہنچی ہو جو روایت واسناد کے قواعد اور جرح وتعدیل کے تقاضوں پر پوری اترتی ہو۔

اس طرح کہ اُس سے جزم ویقین حاصل ہو' ان عظیم علمی معیارات کی تفصیل کے لیے طویل بحث درکار ہے' جو ابھی یہاں ممکن نہیں۔

بے شک آج ایک صاحب علم شخص کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حسین ھیکل جیسے آدمی نے اپنی کتاب ''حیاتِ محمد'' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''میں نے اپنی کتاب میں سیرت اور حدیث کی کتابوں سے اخذ نہیں کیا بلکہ میں نے اس بات کو ترجیح دی کہ میں اپنی اس بحث کو علمی انداز میں پیش کروں''۔

یعنی وہ آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ انہوں نے عظمتِ علم کی پاسداری کرتے ہوئے بخاری ومسلم کی ثابت شدہ صحیح روایات کو بھی قبول نہیں کیا! گویا کہ امام بخاری نے احادیث و اقوال کو روایت کرنے میں جو بے مثال علمی احتیاط اپناتے ہوئے جن عجیب اور دلکش قواعد و ضوابط کو ملحوظ رکھا ہے' یہ جادۂ علم سے انحراف کے مترادف ہے! اُس وقت جب استنتاج' حدس' تخمین اور توسم جیسے علمی ذرائع تحقیق کو بروئے کار لایا جا رہا ہو تو ان حالات میں علم کی عظمت' پاسداری اور اس کے جادہ ومیزان کے التزام کا تقاضا بڑھ جاتا ہے' ان حالات میں بھی اگر ان چیزوں کو قبول نہ کیا جائے تو کیا یہ علم پر بہت بڑی آفت نہیں؟

قواعد وضوابط کی روشنی میں ہم سیرتِ نبوی کا مطالعہ کیسے کریں؟

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا جب جزیرۂ عرب میں ظہور ہوا تو آپ ﷺ نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساری انسانیت کے لیے ایک نبی مرسل کی حیثیت سے پیش کیا تاکہ اُن لوگوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کریں جس کے ساتھ گزشتہ انبیاء مبعوث ہوئے' اور یہ کہ جو ذمہ داریاں سابقہ انبیاء نے اپنی اقوام پر ڈالیں' آپ ﷺ نے ان لوگوں پر واضح کر دیا کہ آپ سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی ہیں' پھر آپ ﷺ نے مزید اپنا تعارف کرواتے ہوئے ان پر واضح کیا کہ آپ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں جس پر انسانیت کے جملہ احکام لاگو ہوتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرم فرماتے ہوئے دوسروں کے مقابلے میں وحی کی وساطت سے مختص کرتے ہوئے اس بات کا آپ کو امین بنایا ہے کہ آپ تمام انسانوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیں تاکہ یہ لوگ اپنی شخصیات کی حقیقت سے آشنا ہو جائیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ مملکت الٰہی کے نقشے میں زمان و مکان کے اعتبار سے اس دنیوی زندگی کا کیا مقام ہے؟ اور یہ کہ موت کے بعد ان کا انجامِ کار کیا ہوگا؟ اسی طرح ان کی نظر اس طرف بھی مبذول ہو کہ ان کے اختیاری اعمال کا ان کی شخصیات سے ملا ہوا ہونا ضروری ہے' جس سے کوئی مفر نہیں' یعنی اُن پر لازم ہے کہ وہ اپنے ایمان و یقین اور اپنے اختیاری عمل میں اللہ تعالیٰ کے بندے بن کر رہیں جیسے کہ یہ عبودیت اور بندگی اُن میں اضطراری طور پر پائی جاتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اُن پر ہر طریقے سے واضح کیا ہے کہ آپ اس پیغامِ رسالت کے مضمون میں جسے تمام انسانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اُن پر ڈالی ہے' کوئی کمی بیشی یا تبدیلی نہیں کر سکتے' بلکہ خود ارشادِ باری تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ○ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ○ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ○ (الحاقۃ: ۴۷-۴۴)	اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا ○ تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے ○ پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگِ دل ○ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا ○

حضرت محمد ﷺ نے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے سیاسی لیڈر، قومی رہنما، کسی مکتبہ فکر کے بانی، یا معاشرتی مصلح کی حیثیت سے پیش نہیں کیا، بلکہ آپ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ میں کسی ایسے رویے کا اظہار نہیں ہوتا جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ آپ نے ان میں سے کسی چیز کے حصول کے لیے ذاتی جدوجہد اور کوشش کی ہو۔ جب معاملہ یہ ہے تو عقل و منطق ہم پر یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ کسی ایسے شخص کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس کی پوری عمومی زندگی کا مطالعہ اس کے اس تشخص کو سامنے رکھ کر کریں جس کی بنیاد پر اُس نے اپنی ذات کو دنیا کے سامنے پیش کیا، تاکہ ہم اس کی صداقت یا عدمِ صداقت کے دلائل کو اسکے اقوال کے مطابق پرکھ سکیں!

یہ چیز ہم پر لازم کرتی ہے کہ بغیر کسی شک وشبہہ کے ہم اس کی زندگی کے تمام انسانی اور شخصی پہلوؤں کا مطالعہ کریں، لیکن اس شرط پر کہ ہم پر اس مطالعہ سے ایسے رہنما اصول مرتب ہوں جن کے ذریعے علمی و معروضی دلائل کے ساتھ اس تشخص کی حقیقت کو ظاہر کیا جائے جس کی بناء پر اُس شخصیت نے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

جی ہاں! ہم اس بات پر مجبور نہیں کہ ہم اپنے افکار واذہان کو آپ ﷺ کی شخصیت کے نبوت و رسالت کے ان معانی پر غور وفکر کرنے میں مشغول کریں جن کی طرف آپ ﷺ نے لوگوں کو متوجہ کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، لیکن یہ بات اُس وقت تھی کہ اگر یہ معاملہ ہمارے انجام سے متعلق نہ ہوتا اور اس کا ہماری آزادی اور ہمارے طرزِ عمل سے بھی کوئی تعلق نہ ہوتا، لیکن جب یہ معاملہ ہماری ذاتوں سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اس سے علم و معرفت اور طرزِ عمل کے لحاظ سے ہم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کی انجام دہی کے لیے اگر ہم کوشش نہ کریں تو ہم پر بدبختی، محرومی اور ہلاکت مسلط ہو جائے گی تو اس صورت حال میں یہ چیز بڑی خطرناک ہوگی کہ ہم اس مسئلے کو اپنی ذات سے متعلق تصور نہ کریں یا اس پر سے صرفِ نظر کرتے ہوئے گزر جائیں!

اُس وقت یہ بات کتنی بے معنی ہوگی کہ جس وقت ہم رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے اُس پہلو کے مطالعہ سے تو اعراض کریں جس کو آپ ﷺ نے خود دنیا کے سامنے پیش کیا اور آپ کی شخصیت کے دیگر اُن پہلوؤں میں غور وفکر شروع کر دیں، جن کا ہماری زندگی سے کوئی

تعلق نہ ہو اور نہ ہی آپ ﷺ کے تشخص سے اس کا کوئی تعلق ہو۔

جی ہاں! یقیناً اس سے بڑی کوئی عجیب بات کیا ہوگی کہ جب ایک شخص ہمارے سامنے کھڑا ہو کر اپنی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے بتائے کہ میں محمد بن عبداللہ ہوں' پھر اپنے پورے یقین سے ہمیں خبردار کرتے ہوئے کہے: اللہ کی قسم! جس طرح تم سوتے ہو ایسے ہی تم مر جاؤ گے' اور جس طرح تم نیند سے بیدار ہوتے ہو ایسے ہی تمہیں مرنے کے بعد اٹھایا جائے گا' اور اللہ کی قسم! پھر ہمیشہ کے لیے یا تو جنت ہے یا ہمیشہ کے لیے جہنم' لیکن پھر ہم اس کی شخصیت اور اس کے کلام پر دھیان دینے کی بجائے اس کی عبقریت' فصاحت و بلاغت اور حکمت و دانش میں غور و فکر کرنے لگ جائیں؟ کیا اس کی مثال ایسی نہیں کہ آپ چوراہے پر کھڑے ہوں' اس دوران آپ کے پاس ایک شخص آئے اور آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچنے والے سیدھے راستے کے متعلق راہنمائی کرے اور ہلاکت میں گرانے والے راستے سے ڈرائے' مگر آپ اس کی باتوں کی طرف دھیان دینے کی بجائے اس کی شکل و صورت' اس کے کپڑوں کے رنگ اور اُس کے اندازِ گفتگو کی طرف ہی توجہ دیں اور پھر ان کے تجزیہ و تحلیل میں مستغرق ہو جائیں؟

عقل و منطق کا تو یہ تقاضا ہے کہ ہم سیدنا محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے حوالے سے آپ کی نشو و نما' اخلاقِ عالیہ' آپ کی ذاتی اور خانگی زندگی' آپ کے صبر و تحمل اور جدوجہد' جنگ اور امن کے معاملات' دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ آپ کے برتاؤ' دنیا اور اس کی خواہشات و لذات کے بارے میں آپ کے مؤقف سے متعلقہ جیسے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتے ہوئے ایسا معروضی مطالعہ کریں جو سچائی اور باریکی کی بنیاد پر علمی نہج پر ہو' جس میں روایت و اسناد کے قواعد اور صحتِ شروط کو مدنظر رکھا گیا ہو۔

اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ بے شک عقل و منطق تو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم ان سب چیزوں کا مطالعہ کریں لیکن اس ساری تحقیق میں شرط یہ ہو کہ ہم صحیح اور درست نتیجے پر پہنچیں تاکہ ہم آپ ﷺ کی نبوت اور آپ کی حیاتِ طیبہ میں حقیقت وحی سے پوری طرح آگاہی حاصل کر سکیں حتی کہ جب ہم کسی خواہشِ نفس اور تعصب کے بغیر معروضی انداز سے بحث و تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچیں تو ہم پر انکشاف ہو کہ آپ ﷺ نے جو شریعت

اور احکام ہمیں دیئے' انہیں اپنی طرف سے نہیں گھڑا بلکہ انہیں پوری امانت داری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منشاء و رضا کے مطابق ہم تک پہنچا دیا۔ جب ہم یقین کے ساتھ یہ بات جان لیں گے تو اُس وقت ہمیں پتا چلے گا کہ شریعت اور احکام کی حفاظت اور ان کو نافذ کرنے کے سلسلے میں ہم پر کتنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

پھر وہ شخص جو سیرتِ نبوی کے محض انسانی پہلوؤں کا ہی جائزہ لینے تک محدود ہو جائے اور آپ کی شخصیت کا وہ پہلو بالکل نظر انداز کر دے جس کی بنیاد پر نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تو ایسا شخص اپنے سامنے ایسی مشکلات اور پیچیدگیاں پائے گا جن کو سلجھانا کسی طرح بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

مثلاً وہ اُن اسلامی فتوحات کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران و پریشان ہو جائے گا کہ وہ چند پرانی تلواریں جو پہلے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتی تھیں' آج انہی تلواروں نے جادوئی انداز میں ایرانی تہذیب کے قلعوں اور رومی جاہ وجلال کو روند ڈالا ہے۔ اسی طرح وہ اُس قانون کی حکمرانی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جائے گا جو جزیرۂ عرب میں سب سے پہلے اُس زمانے میں تکمیل پا چکا تھا' جب ابھی وہاں پر کوئی ثقافت نمودار نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی تہذیب وتمدن وہاں تک پہنچی تھی۔ جزیرۂ عرب کو اُس وقت ایک مکمل قانون ملا جب ابھی وہ علم ومعرفت' تہذیب وثقافت اور پیچیدہ اجتماعی زندگی کی جدوجہد کے ابتدائی مرحلے میں تھا۔

یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا جب کہ سماج ومعاشرت کے ماہرین کے نزدیک بدیہی امر تو یہ ہے کہ کسی قوم کی زندگی میں مکمل قانون اس وقت وجود میں آتا ہے جب اس کی تہذیب و ثقافت میں پختگی پیدا ہو جائے اور اس کا اجتماعی ڈھانچہ ترقی کے مراحل طے کر لے!

یہ ایسی پیچیدہ اور گنجلک باتیں ہیں کہ کوئی بھی شخص آپ ﷺ کی نبوت کا اعتبار اور اس کا خیال کیے بغیر عام مساوی اسباب وتعلیلات کے دائرے میں ان کو کسی طرح حل نہیں کر سکتا۔ ہم نے اس قسم کے کئی محققین کو دیکھا ہے کہ جو ان گتھیوں کو سلجھانے کی بجائے اپنے افکار میں دائیں بائیں الجھ کر رہ جاتے ہیں' اور حیرت کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حیرت سے نکلنے کا راستہ آسان بھی ہے' وہ راستہ یہ ہے کہ ہم سیرت نبوی کے مطالعہ

کے سلسلہ میں منطقی اور معروضی طریقہ اپنائیں' اور آپ کی عمومی حیاتِ طیبہ کے مطالعہ کے لیے آپ کے اُس تشخص کو مرکز ومحور بنائیں جس امتیازی حیثیت سے آپ ﷺ نے خود کو متعارف کرایا' جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا۔

اس طریقۂ کار کو اپنانے سے ہمیں یقین ہو جائے گا کہ بے شک آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہیں' آپ ﷺ کی شانِ نبوت میں غور وفکر کرنے سے ہم اس حیرت اور ان پیچیدگیوں سے نجات حاصل کرنے کا راز پا سکتے ہیں' کیونکہ یہ بات لازمی اور ضروری ہے کہ نبی صادق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس نے اُسے بھیجا ہے' پوری تائید حاصل ہو اور ضروری ہے کہ قرآن بطورِ وحی اُس کی طرف سے اس پر نازل ہو' تو اس طرح یہ مکمل قانون اُس ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ اور لاگو کیا ہوا ہے' یہ کسی ناخواندہ قوم کی طرف سے تالیف کردہ نہیں کہ اس پر تعجب اور حیرت ہو۔

یہی خدا تعالیٰ اپنے اس محکم کلام میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ (آل عمران: ۱۳۹)

اور نہ (تو) ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تمہیں سربلند ہو گے اگر تم سچے مؤمن ہو۝

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۝ (القصص: ۵)

اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں اور بنا دیں انہیں (فرعون کے تاج وتخت کا) وارث۝

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ۝ (الانفال: ۹)

یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اُس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا:) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے

در پے آنے والے ہیں O

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ O (الانفال:۱۰)

اور نہیں بنایا فرشتوں کے نزول کو اللہ نے مگر ایک خوش خبری اور تا کہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی طرف سے بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے O

ان آیاتِ بیّنات کے پیشِ نظر وہ سارا ابہام دور ہو جاتا ہے' اس کا حل نکل آتا ہے اور تمام حجابات دور ہو جاتے ہیں اور معاملہ اپنے طبعی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ قوت وقدرت والا خالق اپنے اُن مؤمن بندوں کی ضرور مدد فرماتا ہے جو اس کے بتائے ہوئے راستے کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں اور خالق و مالک انہیں جس پر چاہتا ہے' فتح و نصرت بھی عطا فرماتا ہے' بلکہ حیرت کی بات تو اُس وقت ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے جس نصرت کا وعدہ اپنے رسول اور جس تائید کا وعدہ اپنے مؤمن بندوں سے کیا ہوا تھا' نصرت و تائید کا یہ معجزہ رونما نہ ہوتا۔

جزیرۃ العرب کو اسلام کا گہوارا بنانے کا راز

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر گفتگو کرنے اور جزیرۃ العرب جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش ہوئی اور اس خطے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت و رسالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہی جو منتخب کیا' ان سب چیزوں پر روشنی ڈالنے سے قبل ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اس میں حکمت کیا تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت دنیا کے دیگر خطوں کی بجائے اس خطہ میں ہوئی اور دعوتِ اسلامی کی ترویج دوسری قوموں سے قبل عربوں کے ہاتھوں ہوئی۔

اس کی وضاحت سے قبل ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ اسلام کی آمد سے قبل عربوں کے خصائص اور طبائع کیا تھے؟ اور جس سرزمین پر آپ رہتے تھے' وہاں کا اور اس کے اردگرد کا جغرافیائی محلِ وقوع کیا تھا؟ اور جزیرۃ العرب کے اردگرد جو دیگر اقوام تھیں مثلاً ایرانی' رومی' یونانی اور ہندو وغیرہ ان کی عادات واطوار' طبیعتیں اور تہذیبی خصائص کیا تھے؟

اس مختصر وضاحت کی ابتداء ہم اُن اقوام کے ذکر سے کرتے ہیں جو جزیرۃ العرب کے اردگرد اسلام کی آمد سے تھوڑا پہلے آباد تھیں۔

اُس وقت دنیا میں دو سلطنتیں عروج پر تھیں' متمدن دنیا انہی دو سلطنتوں میں منقسم تھی' ان میں سے ایک سلطنت فارس تھی اور دوسری سلطنت روم تھی۔ ان دونوں کے بعد یونان اور ہندوستان کا درجہ آتا ہے۔

ایران: سلطنت ایران اُس وقت آپس میں متصادم' مختلف فلسفیانہ دینی نظریات کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک مذہب زرتشت تھا جسے حکمران طبقہ قبول کیے ہوئے تھا' اس مذہب کے فلسفہ میں آدمی کا اپنی ماں' اپنی بیٹی یا اپنی بہن سے نکاح کرنا باعث فضیلت سمجھا جاتا تھا' حتیٰ کہ یزدگرد دوم جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہاں حکمران تھا' اس نے اپنی بیٹی سے شادی کر لی' اس کے علاوہ دیگر بہت سی خرافات اور مختلف بداخلاقیاں بھی تھیں' جن کے تذکرے کی یہاں جگہ نہیں۔

یہاں ایک دوسرا مذہب ''مزکیہ'' تھا' جس کے بارے میں امام شہرستانی کہتے ہیں کہ اس میں دوسرا فلسفہ تھا' وہ یہ کہ اس میں عورتوں اور دوسرے اموال کی ملکیت میں ایک آدمی کو دوسرے آدمی کا ایسے ہی شریک ٹھہرایا گیا تھا جس طرح آگ' پانی اور چارے میں وہ ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں' اس دعوت کو ہوا و ہوس کے پجاریوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔ (الملل والنحل' الشہرستانی' ج ۲ ص ۸۶-۸۷)

روم: سلطنت روم پر اُس وقت استعماری روح کا غلبہ تھا' اس میں ایک طرف اندرونی دینی اختلافات تھے اور دوسری طرف شام اور مصر کے عیسائیوں سے اختلافات چل رہے تھے۔ یہ عیسائی سلطنت اُس وقت اپنی لامحدود خواہشات اور مخصوص مقاصد کی تکمیل اور مسیحیت کی حسب منشاء ترویج کے سلسلے میں اپنی عسکری قوت اور استعماری خواہش پر اعتماد کرتی تھی۔

یہ سلطنت اخلاقی و تہذیبی بے راہ روی کے حوالے سے کسی طور بھی سلطنت ایران سے کم تر نہ تھی' بھاری ٹیکسوں اور تاوانوں کی وجہ سے لوگ اقتصادی ظلم اور انحطاط کا شکار تھے۔

یونان: خطۂ یونان اُس وقت کلامی اور فلسفیانہ خرافات اور موشگافیوں میں غرق تھا' جن سے نہ کوئی ترقی ہونے والی تھی اور نہ کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی توقع تھی۔

ہندوستان: جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں جیسے کہ استاذ ابوالحسن ندوی نے کہا: مؤرخین کا اس کی تاریخ کے متعلق اس بات پر اتفاق ہے کہ جو دور چھٹی صدی

عیسوی سے شروع ہوتا ہے' اس دور میں دینی' اخلاقی اور اجتماعی اعتبار سے یہ سلطنت پستی کا شکار رہی اور اردگرد کے ہمسایہ ممالک میں جو اجتماعی اور اخلاقی انحطاط تھا' ہندوستان اس میں برابر کا شریک تھا۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے زوال کا اثر' ص ۴۸)

یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ مختلف اقوام میں پائی جانے والی شقاوت' اضطراب اور بے راہ روی میں قدرِ مشترک اور بنیادی سبب ان کا تہذیب وتمدن تھا۔ یہ تہذیب وتمدن محض مادی اقدار پر مبنی تھا۔ اس تہذیب وتمدن کو سیدھے اور صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرنے والی کوئی اعلیٰ قدر موجود نہ تھی' اس لیے کہ تہذیب کے مختلف عناصر اور مظاہر محض وسیلہ اور سبب کی حیثیت رکھتے ہیں' اگر کوئی قوم صحیح فکر اور اعلیٰ مثال سے محروم ہو تو تہذیب ایسی قوم کو بدبختی اور اضطراب کے گہرے گڑھے میں گرانے کا ذریعہ بنتی ہے' لیکن اگر وہ قوم عقل سلیم کے اعلیٰ معیار کی حامل ہو جو صرف دین اور وحیِ الٰہی کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے تو پھر تہذیب وتمدن کی تمام قدریں مختلف انواع ومظاہر کی کامل ترین سعادت تک پہنچانے کا خوب صورت اور آسان ذریعہ بنتی ہے۔

جزیرۃ العرب: یہ خطہ اُس وقت پرسکون حالت میں تھا' یہ ان تمام اضطرابات کے مظاہر سے دور بلکہ علیحدہ تھا۔ یہاں کے رہنے والے لوگ ایرانیوں جیسی تہذیب وتمدن اور عیش وعشرت نہیں رکھتے تھے کہ جس کی بنیاد پر یہ فحاشی وآوارگی کو اختیار کر سکیں اور اباحیت واخلاقی پستی کے فلسفہ کو دین کے قالب میں ڈھال سکیں' اسی طرح انہیں رومیوں کی طرح عسکری طاقت بھی حاصل نہ تھی کہ جس کی بنیاد پر یہ اپنے اردگرد کے علاقوں پر تسلط قائم کر سکیں اور ان کے پاس یونانی فلسفہ وجدل بھی نہ تھا کہ جس کی وجہ سے یہ خرافات اور اساطیر کی قباحتوں کو اپنا سکتے۔

ان کی طبیعتیں اُس خام مواد کی طرح تھیں' جنہیں ابھی تک کسی سانچے میں نہیں ڈھالا گیا تھا۔ ان کی طبیعتوں میں صاف شفاف انسانی فطرت نظر آتی تھی اور اعلیٰ انسانی اوصاف مثلاً وفاداری' ہمدردی' جود وکرم' خودداری اور عفت وپاکیزگی کی طرف ان کی طبیعتیں مائل تھیں۔ ان کے پاس وہ معرفت اور راہنمائی نہیں تھی جو ان کو منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ منکشف کر دے۔

یہ لوگ کھلی جہالت اور اولین فطری حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے' اسی سبب سے یہ

لوگ کس راستے سے بھٹک گئے تھے' جو اعلیٰ انسانی اقدار تک پہنچاتا ہے۔ جس وجہ سے یہ لوگ اپنے نسبی شرف اور اپنے آپ کو ہر ذلت سے محفوظ رکھنے کے جذبہ کے تحت اپنی اولاد کو قتل کر دیتے اور اپنی سخاوت اور فیاضی کے جذبہ کے تحت اپنے ضروری اموال تک لٹا دیتے اور اپنی انا، وخودداری اور باہمی قبائلی ہمدردی کے جذبہ کے تحت ان کے درمیان خون ریز جنگیں ہوتیں۔

یہی وہ حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو ضلال یعنی گمراہی اور راہِ راست سے بھٹکے ہونے سے تعبیر فرمایا اور اس بارے میں فرمایا:

وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ○ اور اگرچہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے○ (البقرہ:۱۹۸)

اس حالت کا موازنہ اُس وقت کی دیگر اقوام سے کیا جائے تو اہل عرب تہذیب وتمدن اور شعور وآگہی سے دور ہونے کی وجہ سے معذور سمجھے جاتے ہیں۔ دوسری اقوام تہذیب وتمدن اور ثقافت کی روشنی ہونے کے باوجود گمراہیوں اور انحرافات میں پڑی ہوئی تھیں' گویا وہ فہم و بصیرت' فکر وتدبر اور منصوبہ بندی سے قطع نظر' فساد کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھیں۔

پھر جغرافیائی اعتبار سے جزیرۂ عرب ان اقوام کے بالکل درمیان میں واقع ہے جس کے اردگرد یہ قومیں ترقی کر رہی تھیں۔

استاذ محمد المبارک لکھتے ہیں: آج بھی ایک دیکھنے والا یہ ملاحظہ کرتا ہے کہ یہ جزیرۃ العرب کیسے دو مختلف تہذیبوں کے درمیان واقع ہے۔ ایک طرف مغرب کی مادی تہذیب ہے' جس نے انسان کی ناقص تصویر کشی کی ہے' جس کا حقیقت سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں۔ جب کہ دوسری طرف انتہائے مشرق میں ایک خیالی اور روحانی تہذیب ہے جو ہندوستان اور چین اور اس کے اردگرد پائی جانے والی تہذیب کے مشابہ ہے۔

(الامۃ العربیۃ فی معرکۃ تحقیق الذات ص ۱۴۷)

جب ہم اسلام سے قبل جزیرۂ عرب کے باشندوں اور اس کے اردگرد دیگر مختلف اقوام کے حالات کا تصور کریں تو ہمیں بہ آسانی حکمتِ الٰہی کا یہ منشاء معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت اور بعثت کے لیے خصوصی طور پر جزیرۂ عرب ہی کو یہ شرف کیوں بخشا گیا'

اور اہل عرب ہی کو پوری دنیا میں دعوتِ اسلامی کا علم بلند کرنے کے لیے کیوں ہراول دستہ بنایا گیا' جس کے نتیجے میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک انسانوں کی بڑی تعداد اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرنے لگی۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حکمت الٰہی یہ تھی کہ باطل مذاہب اور کھوٹی تہذیبوں کے علم برداروں کا علاج اور ان کی ہدایت مشکل ہوتی ہے کیونکہ جو ان میں فساد و بگاڑ ہوتا ہے وہ ان کے لیے باعثِ افتخار ہوتا ہے' اس لیے کہ وہ اسے اچھی چیز سمجھتے ہیں جب کہ وہ لوگ جو ابھی بحث و تحقیق کے مرحلے سے گزر رہے ہوں یہ نہ تو اپنی جہالت کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی علم و معرفت اور تہذیب و تمدن کا دعویٰ کرتے ہیں' ایسے لوگ اپنی کوتاہیوں کا علاج کرنے اور ہدایت حاصل کرنے پر زیادہ آمادہ ہوتے ہیں (اس لیے جزیرۂ عرب کو اس مقصد کے لیے چنا گیا)۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ حکمت الٰہی کا یہ تقاضا نہیں تھا' اس قسم کا تجزیہ و تحلیل اُن لوگوں پر صادق آتا ہے جن کی قدرت و صلاحیت محدود اور طاقت و قوت معمولی ہو اور یہ لوگ آسان اور مشکل میں فرق کر کے آسان چیز کو اپنی راحت و آرام کے لیے منتخب کر لیتے ہوں اور مشکل چیز کو دشواری کی وجہ سے چھوڑ دیتے ہوں۔

اگر یہ بات کہی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں نہ ارادہ فرمایا کہ دعوتِ اسلامیہ کو فارس' روم یا ھند کے علاقے میں سے ظاہر کرے اور ان علاقوں میں دعوت کی کامیابی کے اسباب بھی مہیا فرما دیتا جو کچھ جزیرۂ عرب میں دعوت کے لیے مہیا کیا گیا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے لیے کوئی مشکل نہ تھی' کیونکہ وہ تو ہر چیز کا خالق اور ہر وسیلہ اور سبب کا پیدا کرنے والا ہے تو ایسا کیوں نہ کیا گیا۔

لیکن جزیرۂ عرب کو اس مقصد کے لیے اختیار کرنے کی حکمت اُسی نوعیت کی تھی کہ جس حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو ''اُمّی'' بنا کر بھیجا۔ جس نے اس دنیا میں نہ کوئی کتاب پڑھی ہو اور نہ کچھ تحریر کیا ہو' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا' تا کہ لوگوں کو آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نہ رہے اور آپ کی دعوت کی سچائی میں شکوک و شبہات کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

اس حکمت الٰہی کا تتمہ یہ تھا کہ جس ماحول میں آپ کی بعثت ہو وہ ماحول بھی اردگرد کی اقوام

کے مقابلے میں اُمی ہو یعنی قرب و جوار کی تہذیبوں کا یہاں کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ جس سے ان کے فکری پیمانے اردگرد کے گمراہ کن فلسفوں سے آلودہ نہ ہوئے ہوں۔

جس طرح لوگوں کے دلوں میں شک پیدا ہونے کا اندیشہ تھا کہ جب وہ نبی اکرم ﷺ کو پڑھا لکھا، سابقہ کتابوں پر مطلع، قدیم اقوام کی تاریخ سے آگاہ اور قرب و جوار کی تہذیبوں سے واقف دیکھتے۔ اسی طرح اس صورتِ حال میں بھی دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے، جب یہ لوگ دعوتِ اسلامی کا ظہور کسی ایسی قوم میں دیکھتے جو تہذیب و تمدن اور فلسفہ و تاریخ میں ایک مقام رکھتی ہو جیسے ایران، یونان یا روم کی سلطنتیں تھیں، ایسی صورت میں کوئی فتنہ انگیز جھوٹا یہ خیال کر سکتا تھا کہ یہ تو تہذیبی تجربات اور فلسفیانہ افکار کا ہی سلسلہ ہے جس نے بالآخر اس بے مثال تہذیب اور کامل شریعت کو وجود بخشا ہے۔

قرآن کریم نے اس حکمت کو صریح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍO (الجمعہ:۲)	وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا اُمیوں میں سے ایک رسول انہیں میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان (کے دلوں) کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھےO

اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا رسول ''اُمی'' ہو اور وہ جس قوم میں ظاہر ہو اس قوم کی غالب اکثریت بھی اُمی ہو، تاکہ نبوت کا معجزہ اور شریعتِ اسلامیہ ذہنوں میں پوری طرح واضح ہو جائے، جس وجہ سے اس دعوت اور دیگر مختلف انسانی دعوتوں کے درمیان کچھ التباس نہ رہے۔ اس ساری بات سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر عظیم رحم و کرم تھا۔

جزیرۂ عرب کو دعوتِ اسلامی کا مرکز بنانے کی دیگر حکمتیں بھی ہیں جو کسی محقق پر پوشیدہ نہیں، ہم ذیل میں مختصراً بیان کرتے ہیں:

(۱) یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت الحرام کو لوگوں کا مرکز اور امن کی جگہ بنایا ہے' اور یہ وہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے عبادت اور شعائر دینی کے انجام دینے کے لیے بنایا گیا۔ اسی وادی میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت وقوع پذیر ہوئی' اس کا لازمی تقاضا اور خلاصہ یہی تھا کہ یہ مبارک خطہ جو ملت ابراہیمی کی صورت میں دعوتِ اسلامی کا مرکز بنا' اسی خطے میں خاتم الانبیاء کی بھی ولادت اور بعثت ہو' ایسا کیسے نہ ہوتا کیونکہ آپ ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔

(۲) جزیرۃ العرب کی جغرافیائی حالت بھی اس جیسی دعوت کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار تھی' اس لیے کہ جیسا کہ ہم نے کہا کہ جزیرۂ عرب اپنے اردگرد آباد مختلف قوموں کے بالکل درمیان میں واقع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں سے پھوٹنے والی دعوتِ اسلامی کی کرنیں اطراف واکناف میں تمام اقوام اور ممالک تک آسانی سے پھیل گئیں۔ جب ہم صدرِ اسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں دعوتِ اسلامی کی رفتار پر نظر دوڑاتے ہیں تو اس بات کی بالکل واضح طور پر تصدیق ہوتی ہے۔

(۳) حکمت الٰہی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربی زبان ہی دعوتِ اسلامی کی ترویج وتبلیغ کی زبان ہو اور یہی زبان کلامِ الٰہی کی اوّلین ترجمان اور اس کے ہم تک ابلاغ کا ذریعہ ہے۔

زبانوں کی خصوصیات کا اگر ہم جائزہ لیں اور ان کے درمیان موازنہ کریں تو پتا چلے گا کہ عربی زبان کو ایسے ممتاز خصائص حاصل ہیں' جن کے وجود سے دوسری زبانیں محروم ہیں' اس لیے اسی زبان کو یہ حق تھا کہ یہ مختلف علاقوں اور ملکوں میں مسلمانوں کی اوّلین زبان قرار پائے۔

حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین اور آپ کی دعوت کا سابقہ آسمانی دعوتوں سے تعلق

حضرت محمد ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں، یہ ایسا عقیدہ ہے جس پر تمام اہل اسلام کا اجماع ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسے ہے کہ جس طرح کسی شخص نے ایک عمارت تعمیر کی اور اس کی خوب تزئین و آرائش کی ہو، لیکن اس عمارت کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو، پس لوگ اس عمارت کے اردگرد گھومیں اور اس کی خوب صورتی پر تعجب کا اظہار کریں اور کہیں کہ یہ ایک اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی؟ پس میں وہ (قصرِ نبوت میں آخری) اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

(متفق علیہ، الفاظ مسلم کے ہیں)

پس آپ ﷺ کی دعوتِ حق اور دیگر سابقہ انبیاء کرام کی دعوات کا جو تعلق ہے، یہ بھی تکمیل و تتمیم کی بنیاد پر قائم ہے، یعنی آپ ﷺ کی دعوت سابقہ انبیاء کرام کی دعوتوں کی نسبت مکمل ہے، جس طرح حدیث مذکور میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ ہر نبی کی دعوت دو بنیادوں پر قائم رہی ہے:

پہلی بنیاد: عقیدہ، دوسری بنیاد: شریعت و اخلاق۔

پس جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے تو اس کا مضمون حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ تک ایک ہی رہا ہے، اس عقیدے کے مبادیات یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھنا، اس کو ہر عیب اور نقص سے پاک اور منزہ جاننا اور یوم آخرت پر، حساب کتاب پر اور جنت و دوزخ پر ایمان رکھنا۔

ہر نبی اپنی قوم کو انہی اُمور پر ایمان کی دعوت دیتا رہا، اور ہر نبی اپنے سے سابقہ نبی کی

دعوت کی تصدیق کرتا رہا اور اپنے بعد میں آنے والے نبی کی بعثت کی خوش خبری دیتا رہا' اسی طرح جملہ انبیاء کرام جو مختلف اقوام کی طرف آئے' ان سب نے ایک ہی طرح کی دعوت کو پیش کیا اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی تلقین کی۔ وہ دعوتِ حق یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کے آگے ہی سر تسلیم خم کیا جائے' یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ. (الشوریٰ:۱۳)

اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف اور جس کا ہم نے حکم دیا تھا ابراہیم' موسیٰ' عیسیٰ (علیہم السلام) کو کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور تفرقہ نہ ڈالنا اس میں۔

اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عقیدے کے ضمن میں انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوات مختلف ہو سکتی ہیں' کیونکہ یہ بات عقل سے ماوراء ہے کہ ایک نبی کو اس لیے مبعوث کیا گیا ہو کہ وہ لوگوں کو یہ تبلیغ کرے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ تین خداؤں میں سے ایک ہے (جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے' اور پھر دوسرا نبی دوسری جگہ پر مبعوث کیا گیا ہو اور وہ یہ تبلیغ کرے کہ اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' اس طرح عقیدے کے ضمن میں مختلف باتیں کیسے صحیح ہو سکتی ہیں' بلکہ حقیقت یہی ہے کہ ہر نبی اور پیغمبر ایک ہی عقیدے کی تبلیغ کرتا رہا ہے اس میں کوئی فرق نہیں رہا۔

مذکورہ بالا بحث عقیدے کے بارے میں تھی' پس جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تو شریعت سے مراد یہ ہے کہ کسی معاشرے کی اجتماعی و انفرادی زندگی کے نظم و نسق کی بہتری کے لیے کچھ احکام لاگو کرنا۔

اس لیے زمانے کے حالات کی ترقی اور اقوام و اُمم کا اختلاف شرعی احکام میں تغیر و تبدل کا باعث بنتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ شریعت کی اصل بنیاد لوگوں کے دنیوی و اُخروی مصالح پر مبنی ہوتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کسی نہ کسی خاص امت اور قوم کی طرف ہوئی' کسی نبی کی بعثت تمام انسانیت کے لیے عام نہ تھی' جس وجہ سے احکامِ شریعت ہر قوم اور ہر امت کے خاص حالات کے متقاضی رہے۔

مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے اور بنی اسرائیل کے اُس وقت کے حالات کے مطابق ان کی شریعت سخت تھی' جو رخصت کی بجائے عزیمت کی بنیاد پر قائم تھی' پھر جب کئی اَدوار گزرے اور بنی اسرائیل میں ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہ شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہ نسبت بہت آسان اور نرم تھی' جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب فرماتے ہیں' قرآن کریم نے آپ کے اس ارشاد کو یوں بیان کیا:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ. (آل عمران:٥٠)

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتاب تورات کی اور تاکہ میں حلال کر دوں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر۔

اس بیان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے واضح فرمادیا کہ عقیدے کے متعلق جو اُمور ہیں اس کی وضاحت جو تورات میں آتی ہے' میں اس کی تصدیق وتائید کرتا ہوں' لیکن شرعی احکام اور حلال وحرام سے متعلق جو اُمور ہیں ان میں کچھ تغیر وتبدل کیا گیا ہے اور کچھ احکام جن میں شدت اور سختی تھی' ان میں آسانی اور سہولت پیدا کی گئی ہے۔

اس بناء پر ہر رسول کی بعثت' عقیدہ اور شریعت دونوں اُمور کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے تھی' پس عقیدے کا جہاں تک تعلق ہے تو ہر نبی اور رسول اس سلسلے میں اپنے سے سابقہ انبیاء و رسل کی بغیر کسی تغیر وتبدل کے تصدیق وتائید کرتا رہا ہے۔

لیکن تشریعی احکام میں ہر رسول کی شریعت' سابقہ شریعت کی ناسخ رہی ہے سوائے ان احکام کے جن کی تائید کی گئی یا جن کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی۔

بحث مذکورہ میں جو کچھ گزر چکا' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سماوی ادیان مختلف و متعدد نہیں

رہے بلکہ ہر دور میں دین سماوی ایک ہی رہا ہے جب کہ سماوی شریعتیں مختلف و متعدد رہی ہیں جو بعد میں آنے والی سابقہ شریعتوں کی ناسخ رہیں حتیٰ کہ آخری سماوی شریعت جو ہر لحاظ سے مکمل ہے' نبی آخرالزمان حضرت محمد ﷺ کی شریعت مطہرہ ہے۔

پس دین حق ایک ہی ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء ورسل جس کی دعوت دیتے رہے بے شک وہ دین اسلام ہی ہے۔

حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل اور حضرت یعقوب علیہم السلام یہی دین لے کر آئے'

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَO اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَO وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرَاهِيمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَO (البقرہ:۱۳۲۔۱۳۰)

اور کون روگردانی کر سکتا ہے دین ابراہیم سے بجز اس کے جس نے احمق بنا دیا ہوا اپنے آپ کو اور بے شک ہم نے چن لیا ابراہیم کو دنیا میں اور بلاشبہ وہ قیامت کے دن نیکوکاروں میں سے ہوں گےO اور یاد کرو جب فرمایا اس کو اس کے رب نے: (اے ابراہیم!) گردن جھکا دو' عرض کی: میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنےO اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لیے یہی دین' سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہوO

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہی دین اسلام لے کر بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے'

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فرعون کے جادوگر کہتے ہیں:

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَO وَمَا

وہ بولے: (پرواہ نہیں) ہم تو اپنے

تَنْقِمُ مِنَّا اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ O (الاعراف:۱۲۶-۱۲۵)

رب کی طرف جانے والے ہیں O اور تو کیا ناپسند کرتا ہے ہم سے بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے اپنے رب کی آیتوں پر جب وہ آ گئیں ہمارے پاس' اے ہمارے رب! انڈیل دے ہم پر صبر اور وفات دے ہمیں اس حال میں کہ ہم مسلمان ہوں O

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی دین اسلام کے ساتھ مبعوث ہوئے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ O (آل عمران:۵۲)

پھر جب محسوس کیا عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کفر (تو) آپ نے کہا: کون ہیں میرے مددگار اللہ کی راہ میں؟ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی' ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور (اے نبی!) آپ گواہ ہو جائیو کہ ہم (حکمِ الٰہی کے سامنے) سر جھکائے ہوئے ہیں O

یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ لوگ جو اپنی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں' انہوں نے اُس عقیدۂ توحید سے ہٹ کر کیوں اپنے لیے کچھ عقائد مختص کر لیے ہیں جو عقیدۂ توحید سابقہ انبیاء کرام لے کر مبعوث ہوئے؟ یا وہ لوگ جو اپنی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں' انہوں نے خالص عقیدہ کہاں سے لیا ہے؟

اس کے جواب میں قرآن مجید کی وہ آیات پیش کی جاتی ہیں' جن میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی دین کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ

بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور نہیں جھگڑا کیا جن کو

بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ. (آل عمران:۱۹)	دی گئی تھی کتاب مگر بعد اس کے کہ آ گیا تھا ان کے پاس صحیح علم (اور یہ جھگڑا) باہمی حسد کی وجہ سے تھا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورۂ شوریٰ میں ارشاد فرمایا:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ. (الشوریٰ:۱۳)	اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِن بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ○ (الشوریٰ:۱۴)	اور نہ بٹے وہ فرقوں میں مگر اس کے بعد کہ آ گیا ان کے پاس (صحیح) علم، (یہ تفرقہ) محض باہمی حسد کے باعث تھا اور اگر یہ فرمان پہلے نہ ہو چکا ہوتا آپ کے رب کی طرف سے کہ انہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دی جائے گی تو فیصلہ ہو چکا ہوتا ان کے درمیان اور جو لوگ وارث بنائے گئے تھے کتاب کے ان کے بعد وہ اس کے متعلق ایسے شک میں مبتلا ہیں جو قلق انگیز ہے○

تمام انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین اسلام ہی کے ساتھ مبعوث کیے گئے اہل کتاب وحدتِ دین کو بھی جانتے ہیں اور اس بات سے بھی واقف ہیں کہ جملہ انبیاء کرام علیہم السلام اسی ایک دین کے ساتھ مبعوث ہوئے اور ہر نبی دوسرے نبی کی تصدیق کرتا رہا، ان کو عقائدِ باطلہ سے تفرقہ نہیں ڈالنا چاہیے تھا، لیکن صحیح علم و معرفت کے آ جانے کے باوجود انہوں نے باہمی حسد اور تعصب کی بناء پر اختلاف پیدا کیا اور تفرقہ ڈالا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف وہ باتیں منسوب کیں جو انہوں نے نہیں فرمائی تھیں۔

دورِ جاہلیت اور اس میں حنیفیت کے بقایا جات

یہ بھی ایک اہم موضوع ہے' سیرت کے ابواب میں غوطہ زن ہونے سے پہلے اس پر ایک نظر ڈالنا بھی ضروری ہے' یہ ایک حقیقت ہے کہ دشمنانِ اسلام نے اس موضوع کو چھیڑ کر دین اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے۔

اس حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ بے شک دین اسلام اُسی نرم اور آسان شریعتِ حنیفیہ کا تسلسل ہے جو ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام لے کر مبعوث ہوئے' اس کی تصریح رب تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہوں پر فرمائی ہے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا. (الحج:۷۸)

اور (سرتوڑ) کوشش کرو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے اس نے چن لیا ہے تمہیں اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی' پیروی کرو اپنے باپ ابراہیم کے دین کی اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ○ (آل عمران:۹۵)

آپ کہہ دیجئے: سچ فرمایا ہے اللہ نے' پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو ہر باطل سے الگ تھلگ تھے اور (بالکل) نہ تھے وہ شرک کرنے والے○

ہر شخص اس سے واقف ہے کہ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں' ان کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن تعلیمات کے ساتھ مبعوث ہوئے' وہ ان کو وراثت میں ملی تھیں' جن میں توحید' عباداتِ الٰہی' اللہ تعالیٰ کی حدود کی پاسداری' حرمات کی تقدیس' بیت اللہ کی تعظیم' شعائر اللہ کا احترام اور خانہ کعبہ کی خدمت و دربانی وغیرہ شامل تھیں۔

جب کئی صدیاں بیت گئیں اور کافی عرصہ گزر چکا تو عربوں کی اس وراثتِ علمی و دینی

میں باطل اور گمراہ کن رسومات گھس آئیں' جس طرح ہر قوم اور ہر قبیلے کا یہ مسئلہ رہا ہے کہ مرورِ زمانہ سے جب ان میں جہالت و گمراہی در آئی اور جب ان کی صفوں میں گمراہ اور بُرے لوگ گھس آئے تو ان میں شرک جیسا بُرا عقیدہ داخل ہوا اور وہ بتوں کی پوجا کرنے لگے اور ان میں باطل رسومات اور فحش اخلاق نے جنم لیا' اسی طرح اولادِ اسماعیل میں بھی اسی طرح کی بدعقیدگی پھیلنے لگی جس کی وجہ سے وہ توحید کے نور اور دینِ حنیف کے راستے سے دور ہونے لگے اور ان میں جاہلیت عام ہونے لگی' پھر حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے یہ جہالت و گمراہی اور بدعقیدگی کے سارے اندھیرے کافور ہوئے۔

وہ پہلا شخص جس نے عربوں میں شرک اور بتوں کی پوجا کو عام کیا' وہ عمرو بن لحی بن قمعۃ ہے۔

ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو اکثم بن جون الخزاعی سے فرماتے ہوئے سنا' آپ نے فرمایا: اے اکثم! میں نے عمرو بن لحی کو جہنم میں اپنی انتڑیاں گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے' اُس سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والے تم ہو' اکثم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا اس کی مشابہت میرے لیے نقصان دِہ ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں! تم صاحبِ ایمان ہو جب کہ وہ کافر تھا' سب سے پہلے اُسی نے دینِ اسماعیل کو بدلا' اُس نے بت نصب کیے اور بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام مقرر کیے[1]

(سیرۃ ابن ہشام ج ا ص ۷۶)

---

[1] یہ حدیث معمولی فرق کے ساتھ بخاری و مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے عمرو بن لحی بن قمعۃ بن خندف کو جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتے ہوئے دیکھا۔

بحیرہ: اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جسے اہلِ عرب بتوں کے نام پر اس کا کان چیر کر چھوڑ دیتے۔

سائبہ: اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جسے کوئی کام ہو جانے پر بہ طورِ شکرانہ بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا۔

وصیلہ: اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے پہلے دو بچے مادہ ہوں' اس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا۔

حام: اُس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا پوتا بچے دینے کے قابل ہو جائے' ایسے بوڑھے اونٹ کو بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا' اس پر سواری نہ کی جاتی اور نہ ہی اسے باربرداری کے لیے استعمال کرتے۔

ابن ہشام نے اُس کیفیت کا ذکر کیا جس طرح عمرو بن لحی نے عربوں میں بتوں کی پوجا کو رواج دیا کہ ایک دفعہ عمرو بن لحی مکہ سے شام کی طرف کسی غرض سے گیا' جب وہ ارضِ بلقاء کے ''مآب'' نامی مقام پر پہنچا جہاں عملاق یا عملیق بن لاذ وبن سام بن نوح کی اولاد قومِ عمالیق آباد تھی' تو اُس نے اس قوم کو بتوں کی پرستش کرتے ہوئے دیکھا تو اُن سے پوچھا: یہ کیسے بت ہیں جن کی میں تمہیں عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم ان بتوں کی عبادت کر کے ان سے بارش طلب کرتے ہیں تو یہ ہم پر بارش برسا دیتے ہیں اور ہم ان سے مدد طلب کرتے ہیں تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں' تو اس پر عمرو بن لحی نے اُن سے کہا کہ کیا تم ایک بت مجھے نہیں دیتے کہ میں اس کو عرب کی سرزمین میں لے جاؤں اور اہل عرب اس کی عبادت کریں؟ پس انہوں نے اس کو ھبل نامی بت دے دیا' جسے لے کر وہ مکہ پہنچا اور یہاں نصب کر دیا اور لوگوں کو اس کی عبادت اور تعظیم کا حکم دیا۔

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۷۷' نیز دیکھئے: کتاب الاصنام' ابن الکلبی' ص ۹۔۸)

اس طرح جزیرۂ عرب میں بتوں کی عبادت کا تصور اور شرک پھیلا' پس اس سبب سے وہ اپنے آبائی عقیدۂ توحید سے دور ہو گئے اور حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے دین کو بدل دیا تو ان کا انجام بھی وہی ہوا جو دوسری قوموں کا ہوا کہ ان میں بھی گمراہی' بدعقیدگی اور قبیح افعال پیدا ہو گئے' وہ اہم چیز جس نے ان کو اپنے مرکز سے ہٹایا وہ ان کی جہالت و گمراہی اور اردگرد کے قبائل کی بُری رسومات کا اثر تھا۔

لیکن اس کے باوجود بھی ان میں تھوڑی تعداد میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو ابھی تک عقیدۂ توحید اور دینِ حنیفیہ سے پوری طرح وابستہ تھے۔ یہ بعث بعد الموت' روزِ حشر کی تصدیق کرتے اور یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اطاعت گزار کو اجر و ثواب عطا کرتا ہے اور گناہ گار کو جزاء و سزا سے ہمکنار کرتا ہے' اور عربوں میں پائی جانے والی بت پرستی اور فکری و دینی گمراہی کو ناپسند کرتے تھے۔

دینِ حنیف پر کاربند رہنے والے ان چند لوگوں میں قس بن ساعدۃ الایادی' رئاب الشنی اور بحیرا راھب ہیں اور دیگر کئی لوگوں کو بھی شہرت حاصل ہوئی۔

اسی طرح عربوں کی بہت سی عادات و اطوار عہد ابراہیمی کے بقایا اور دینِ حنیف کے

بنیادی اصول و اخلاق میں سے تھیں اگرچہ مرورِ زمانہ سے ان عادات و رسوم میں کمزوری اور دھندلاہٹ آتی جا رہی تھی عربوں کی جاہلیت کسی حد تک شعائر حنیفیت اور اس کے اصولوں کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اگرچہ ان شعائر و مبادی کا اظہار ان کی زندگیوں میں بگڑی ہوئی شکل میں موجود تھا۔ ان شعائرِ حنیفیت میں سے بیت اللہ کی تعظیم اس کا طواف حج و عمرہ وقوف عرفات اور قربانی کے جانور مقرر کرنا شامل تھیں۔ یہ تمام چیزیں جائز تھیں اور حضرت ابراہیم کے زمانہ سے چلی آ رہی تھیں لیکن عربوں نے ان شعائر میں اپنی طرف سے بغیر وجہ کے کچھ تبدیلیاں کر لیں اور ان میں کچھ چیزوں کا اضافہ بھی کر دیا جو ان میں سے نہیں تھیں مثلاً حج و عمرہ کے دوران جو تلبیہ پڑھا جاتا ہے اس میں قبیلہ کنانہ اور قریش نے کچھ اضافہ کر دیا اور وہ یوں تلبیہ پڑھتے:

لبیك اللھم لبیك لبیك لا شریك الا شریك ھولك تملك وما ملك.

اے اللہ! میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں! تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جو تیرا ہے تو اس کا مالک اور تو ان چیزوں کا بھی مالک ہے جن کا وہ مالک ہے۔

جیسا کہ ابن ہشام نے نقل کیا کہ وہ پہلے تو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرتے اور پھر اپنے بتوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ شریک بنا لیتے لیکن وہ اللہ تعالیٰ ہی کو ان سب کا مالک بناتے۔

خلاصہ

بے شک عربی تاریخ اُنہی شعائرِ حنیفیت کے زیر اثر پروان چڑھی جن شعائر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام لے کر مبعوث ہوئے۔ عربوں کی زندگیاں عقیدۂ توحید اور ایمان و ہدایت کے نور سے معمور تھیں پھر عرب اس حق سے آہستہ آہستہ دور ہوتے چلے گئے وقت گزرنے اور زمانہ بیتنے کے ساتھ ساتھ یہ شرک کے اندھیروں کفر کی گمراہیوں اور جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گھستے چلے گئے۔ ان کے پاس قدیم دینِ حق کے جو اصول و مبادی تھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن میں بھی آہستہ آہستہ ضعف اور کمزوری آتی گئی۔ اس طرح

ان میں اس حق کے جو معاون لوگ تھے ان کی تعداد بھی کم ہو گئی۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے ساتھ ہی دینِ حنیفیت کا وہ شعلہ نئے سرے سے روشن اور منور ہوا تو وحیٔ الٰہی نے ان کی گمراہیوں اور ضلالات کی کثافت کو مٹا دیا اور اس کی جگہ ایمان اور توحید کی شمعیں روشن کیں اور عدل و انصاف اور حق کے بنیادی اصول فراہم کیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو اصول و مبادی لے کر آئے اور دیگر الٰہی شریعتوں میں سے جو تعلیمات اس وقت تک صحیح حالت میں باقی رہ گئی تھیں، وحی الٰہی نے ان کی بھی تاکید و تائید کی اور دوبارہ ان کی طرف دعوت دی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا' یہ بالکل معروف اور بدیہی امر ہے' جس پر ہر وہ شخص مطلع ہے جو تاریخ کو جانتا ہے اور یہ چیزیں اس کے لیے بھی بدیہی طور پر ثابت ہیں جو دینِ اسلام کے متعلق تھوڑی سی بھی معلومات رکھتا ہے' لیکن اس کے باوجود آج کے دور میں ہم دوبارہ اُن واضح اور بدیہی چیزوں کو ثابت کرنے میں اپنا بہت سا وقت ضائع کرنے میں مجبور ہو جاتے ہیں' کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ محض اپنے دلوں میں بعض خواہشات اور ارادوں کے پیدا ہونے سے ہی اپنے اعتقاد کو کمزور کر لیتے ہیں۔

جی ہاں! اس نوعیت کے لوگ زندہ ہیں جو اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ انہوں نے اپنی عقلوں کو فکری غلامی کی بیڑیوں میں جکڑ رکھا ہے۔

اس بات میں کتنا بڑا فرق ہے کہ آپ کا ارادہ آپ کے عقیدے کے تابع ہو یا آپ کا عقیدہ آپ کے ارادے کے تابع ہو!

ان دونوں کے درمیان بلندی و پستی اور عزت و انحطاط کے لحاظ سے کتنا بڑا واضح فرق ہے۔

ہم نے جو کچھ اوپر بداہت اور واضح دلائل سے ذکر کیا' اس سب کے باوجود بعض لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی بعثت سے تھوڑا قبل جاہلی معاشرے میں مثالی بیداری پیدا ہو گئی تھی جو قابل تقلید تھی۔ اور عربوں کے مفکرین میں شرک' بتوں کی پوجا کے مظاہر اور ان سے منسلک دیگر خرافاتِ جاہلیہ سے بیزاری پیدا ہو گئی تھی اور اس بیداری میں عروج' حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور آپ کی دعوت سے پیدا ہوا۔

اس مذکورہ بالا دعوے کا مطلب جو کہ پوشیدہ نہیں' یہ ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جاہلی تاریخ میں توحید کے حقائق کی آگاہی بڑھتی گئی اور نورِ ہدایت میں اضافہ ہوتا رہا' یعنی وہ جوں جوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے دور ہوتے گئے اور ان کے اور اُن کے درمیان جتنی صدیاں حائل ہو رہی تھیں' یہ عرب اتنا ہی آپ ﷺ کی دعوت اور مبادی کے قریب ہوتے جا رہے تھے حتیٰ کہ یہ قرب اُس وقت اپنی انتہاء کو پہنچ گیا جب آپ ﷺ کی بعثت ہوئی!

کیا تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے؟ یا تاریخ اس کے بالکل برعکس ثابت کرتی ہے؟

ہر شخص جو آزادانہ غور و فکر کرنے والا اور تحقیق کرنے والا ہے وہ جانتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے' یہ زمانہ دورِ جاہلیت کے دوسرے زمانوں کی بہ نسبت سب سے زیادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات سے دور ہٹا ہوا تھا۔ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں میں حنیفیت کی جو تقالید باقی رہ گئی تھیں' مثلاً بتوں سے کراہت' ان کی پرستش سے اجتناب اور بعض فضائل و مکارم کی طرف رغبت جنہیں دین اسلام نے باقی رکھا' یہ شعائر و اقدار چند صدیاں پہلے جس طرح واضح طور پر ان میں موجود تھے' اب اس کا دسواں حصہ بھی باقی نہ تھا' اس لیے اگر ان لوگوں کی بات مان لی جائے تو اس صورت میں آپ ﷺ کی بعثت کئی صدیاں اور کئی نسلیں پہلے ہونی چاہیے تھی۔

البتہ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ عربوں کے ہاں جو رسوم و رواج' تقالید' روایات اور عقائد غیبیہ معروف تھے جب محمد ﷺ ان کو پوری طرح ختم نہ کر سکے تو ان کو دین کے رنگ میں رنگ دیا اور ان کا اظہار اس طرح کیا گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی یہ حکم آیا ہے۔ (معاذ اللہ)

دوسرے لفظوں میں حضرت محمد ﷺ نے عربوں میں پائے جانے والے عقائدِ غیبیہ کو ختم کرنے کی بجائے ایک ایسے خدا کی ذات کو متعارف کروایا جو ہر چیز پر قادر ہے' جو چاہتا ہے کرتا ہے' اسی لیے عرب کے باشندے اسلام کے آ جانے کے بعد بھی جادو' جن اور ان سے مماثلت رکھنے والے دیگر عقائد پر کاربند رہے' جس طرح یہ اسلام کی آمد سے قبل خانہ

کعبہ کے طواف' اس کے تقدس اور اس کے شعائر و مناسک ادا کرنے پر کار بند تھے۔

یہ لوگ اپنے اس دعویٰ کو دو مفروضوں کی صورت پیش کرتے ہیں اور ان میں غلطی کا تصور بھی کرتے ہیں۔

پہلا مفروضہ کہ حضرت محمد ﷺ نبی نہیں تھے' دوسرا مفروضہ یہ کہ عہد ابراہیمی کے باقی ماندہ جن شعائر کو ہم نے پیچھے بیان کیا' یہ سب شعائر و تقالید عربوں نے خود ایجاد کی تھیں' اور زمانہ گزرنے کے ساتھ انہوں نے خود ہی گھڑ لئے تھے' پس خانہ کعبہ کا احترام' اس کی تقدیس یہ حضرت ابو الانبیاء ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے آثار میں سے نہیں تھے جیسا کہ ان کے رب نے انہیں حکم دیا' بلکہ یہ چیز عربی ماحول کی پیداوار تھی اور یہ اُن جملہ تقالید میں سے تھی جو عربوں کی خود ساختہ تھیں۔

ان دونوں (من گھڑت) مفروضوں کو ہر قسم کے ضعف اور کمزوری سے محفوظ رکھتے ہوئے یہ لوگ ان تمام دلائل اور بڑے بڑے تاریخی حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو ان کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں یا ان کا بطلان و فساد ظاہر کرتے ہیں۔ جب کہ یہ ایک معلوم بات ہے کہ حقیقت تک رسائی اُس وقت ممکن نہیں ہوتی جب کوئی محقق اپنے ذہن میں پہلے سے ہی کوئی مفروضہ قائم کر کے بحث کا آغاز کرے' بے شک یہ واضح ہے کہ اس قسم کی تحقیق بے کار اور مضحکہ خیز ہے۔

اس لیے ہمارے لیے اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم ہر عقلی دلیل یا تاریخی واقعہ کا کلی اعتبار کریں' اگر ہم کسی بھی حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں اور ہمارا مقصود نفسِ حقیقت ہے چاہے وہ کیسی ہی ہو' اس صورت میں ہمارا دوسروں کے سامنے جھوٹ گھڑ کر پیش کرنا اور محض تعصب کی بناء پر اور آزاد تحقیق کے نام پر لوگوں کو ایک مخصوص فکر' خواہ وہ کیسی ہی ہو اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہ ہو' قبول کرنے پر مجبور کرنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔

پس ہمارے لیے کسی طور بھی یہ ممکن نہیں کہ ہم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے مختلف دلائل مثلاً وحی' معجزۂ قرآن' آپ ﷺ کی اور دیگر سابقہ انبیاء کی دعوتوں میں مطابقت اور آپ کے اخلاق و اوصاف سے چشم پوشی کر لیں' محض اس مفروضہ کو تسلیم کرنے کے لیے کہ حضرت محمد ﷺ نبی نہیں تھے۔

اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ اس تاریخ سے ہی صرف نظر کر لیں کہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی طرف سے وحی کے مطابق کی تھی اور اس حقیقت سے انکار کر دیں کہ تمام انبیاء نے یکے بعد دیگرے جن عقائد مثلاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت' اس پر ایمان اور حشر ونشر کے متعلق مغیبات اور جنت ودوزخ پر ایمان لانے کی جو دعوت دی جیسا کہ تمام کتب سماویہ سے معلوم ہوتا ہے اور جس کی تصدیق تاریخ' ادوار اور نسلیں کرتی ہیں' اس سب کو محض یہ مفروضہ تسلیم کرنے کے لیے رد کر دیں کہ عہد جاہلیت میں پائی جانے والی عادات و اطوار جن کو ہم ''بقائے عہد ابراہیم'' کہتے ہیں' درحقیقت عربوں کے ایجاد کردہ رسوم تھے' جنہیں حضرت محمد ﷺ نے دین کے رنگ میں رنگ دیا۔

اس سلسلے میں یہ بات جاننا ضروری ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کا خیال رکھتے اور دعویٰ کرتے ہیں' وہ اپنے اس دعویٰ پر کسی نوعیت کی کوئی دلیل پیش نہیں کرتے' ایسے لوگ محض اس قسم کے تصورات بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے' خوب صورت عبارات میں بیان کرتے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں!

میں نے جو کچھ پیش کیا اگر آپ مجھ سے اس پر کوئی مثال طلب کرتے ہیں تو آپ اس سلسلے میں مشہور انگریز مستشرق گب کی کتاب ''مذہبی فکر کی بنیاد'' پڑھ لیں۔ آپ ملاحظہ کریں گے کہ اندھی تقلید ان لوگوں پر کتنا اثر چھوڑتی ہے۔ اس عجیب وغریب عصبیت کا شکار جو شخص بھی ہو جاتا ہے وہ شرافت وکرامت کی خصوصیات سے تہی دامن ہو جاتا ہے اور عظیم دلائل اور روشن حقائق کے سامنے اندھا بہرا بن جاتا ہے تاکہ اسے ان دلائل وبراہین کے سامنے جھٹلانا نہ پڑے۔ گب کی نظر میں اسلام کی فکری بنیاد عربوں کے پرانے عقائد اور افکار غیبیہ (احیائے عربیہ) پر قائم ہے' پھر جب آپ ﷺ تشریف لائے تو آپ نے ان میں غور وفکر کیا اور ان میں سے جن میں کچھ تغیر وتبدل کر سکے انہیں تبدیل کیا اور باقی ماندہ عقائد وافکار کو دین اسلام کا لبادہ اوڑھا دیا اور انہی کی مناسبت سے کچھ دیگر افکار اور مذہبی رسومات ایجاد کر لیں۔ اس وقت سب سے بڑی مشکل جو آڑے آئی' وہ یہ تھی کہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ اس مذہبی زندگی کا نمونہ نہ صرف عربوں کے لیے ہو بلکہ تمام اقوام وقبائل کے لیے بھی یہ قابل

عمل ہو، چنانچہ انہوں نے اس زندگی کو قرآن کے طریقہ پر استوار کیا۔

یہ ہے گب کی مذکورہ کتاب میں پائے جانے والے افکار کا خلاصہ۔ اس کتاب میں شروع سے آخر تک آپ ایسے ہی افکار کا مطالعہ کریں گے لیکن وہ اپنے کسی دعوی پر کوئی دلیل نہیں پیش کرے گا، اس نے جو افکار پیش کیے آپ اس میں جب غور و فکر کریں گے تو آپ کو اس بات کا ذرا سا بھی شک نہیں رہے گا کہ مصنف جس جگہ بیٹھ کر یہ کتاب لکھ رہا تھا، اس نے اپنی عقلی صلاحیتوں کو وہاں سے گزرنے تک نہیں دیا بلکہ ان عقلی صلاحیتوں کے بدلے دیگر اوہام و خیالات کو جگہ دی اور انہی اوہام و خیالاتِ فاسدہ کی روشنی میں گب اپنے خیالات و افکار مرتب کرتا رہا۔

یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ گب جس وقت اپنی اس کتاب کے عربی ترجمے پر مقدمہ لکھ رہا تھا، تب اس نے خیال کیا کہ قارئینِ اسلام کے بارے میں اس کے ان خیالات کو حقارت کے ساتھ رد کر دیں گے تو وہ پھر معذرت کرنے لگا۔

وہ معذرت خواہانہ لہجے میں لکھتا ہے: بے شک وہ افکار جو ان فصول میں بیان کیے گئے ہیں یہ مؤلف کے دماغ کی اختراع نہیں ہیں بلکہ مجھ سے پہلے مفکرین کی ایک جماعت اور بڑے بڑے مسلمان قلم کار اس قسم کے افکار پیش کر چکے ہیں جن کے ناموں کا احاطہ کرنا یہاں طوالت کا باعث ہو گا، پس میں یہاں پر بہ طورِ مثال ان میں سے ایک نام ذکر کرنے پر ہی اکتفاء کرتا ہوں اور وہ ہیں: شیخ کبیر شاہ ولی اللہ دہلوی۔

پھر گب نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ج ا ص ۱۲۲ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ کوئی بھی قاری اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتے ہوئے اصل کتاب سے نہ رجوع کرے گا اور نہ ہی اس حوالے کی تصدیق و تاکید کرے گا، اسی لیے اس نے حسبِ منشاء اس عبارت میں تحریف کی اور اس نے صرف اتنی ہی عبارت پر اکتفاء کیا کہ جس سے معنی اور مقصد بدلا جا سکتا تھا، حتیٰ کہ اس نے شاہ ولی اللہ کی طرف وہ بات منسوب کر دی جس کے آپ متحمل نہ تھے اور آپ کی طرف سے وہ بات کہہ دی جس سے آپ بالکل بری تھے۔

وہ عبارت جو اس نے قطع و برید کر کے نقل کی، وہ مندرجہ ذیل ہے:

نبی اکرم ﷺ کی بعثت' دو بعثتوں پر مشتمل تھی' آپ کی پہلی بعثت بنو اسماعیل کی طرف تھی' اس بعثت کا تقاضا تھا کہ آپ کی شریعت کی بنیاد اُن شعائر' عبادات اور معاملات کی طرز پر ہو جو ان کے ہاں پائے جاتے ہیں کیونکہ شریعت ان کے ہاں پائی جانے والی عبادات و عادات کی اصلاح کا نام ہے نہ کہ ان کو بالکل غیر معروف چیزوں کے مکلف کرنے کا۔

(دیکھیے: مُحب کی کتاب مذہبی فکر کی بنیاد ص ۸۹)

جب کہ "حجۃ اللہ البالغۃ" میں مکمل عبارت جو بغیر قطع و برید کے موجود ہے' وہ مندرجہ ذیل ہے:

جانو کہ آپ ﷺ حنیفیتِ اسماعیلیہ کے ساتھ مبعوث ہوئے تاکہ اس میں پیدا ہونے والی کمی کو دور کریں' اس میں پائی جانے والی تحریف کا ازالہ کریں اور اس شریعت کے نور کی اشاعت کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ. (الحج:۷۸) پیروی کرو اپنے باپ ابراہیم کے دین کی۔

جب معاملہ اسی طرح ہے تو لازم ہے کہ اس ملت کے اصول مسلمہ اور سنن و طرق مقرر ہوں۔ نبی اکرم ﷺ جب ایک ایسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے جس میں سنت راشدہ کے بقیہ جات موجود تھے تو ان میں کسی تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش نہ تھی' بلکہ انہیں باقی رکھنا واجب تھا کیونکہ یہ چیز ان کے نفوس سے زیادہ مانوس تھی اور ان کے لیے بہت مضبوط حجت کے طور پر قائم تھی۔ بنو اسماعیل اپنے باپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے طریقے پر قائم تھے اور ان کی شریعت پر عمل پیرا تھے یہاں تک کہ عمرو بن لحی نے اپنی فاسد و کاسد رائے کو اس میں داخل کر دیا جس سے وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ اس نے بتوں کی پوجا کو رواج دیا' بتوں کے نام پر جانور چھوڑنے اور ان کے کان چیرنے کے طریقے کو رائج کیا' اس وقت دین میں فساد اور بطلان پیدا ہوا۔ صحیح اور غلط چیزیں خلط ملط ہو گئیں اور ان پر جہالت' شرک اور کفر کا غلبہ ہو گیا' پس ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تاکہ آپ ﷺ ان کی کجی کو درست کر دیں اور ان کے فساد کی اصلاح کر دیں' پس آپ ﷺ نے ان کی شریعت کو دیکھا' اس میں جو چیزیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے طریقے

کے موافق تھیں یا جو چیزیں شعائر اللہ میں سے بچ گئی تھیں ان کو باقی رکھا اور جن چیزوں میں تحریف اور فساد پیدا ہو چکا تھا یا جو چیزیں شرک اور کفر کے شعائر میں سے تھیں ان کو باطل قرار دیا اور ان کے باطل ہونے پر مہر ثبت کر دی۔

مذکورہ بالا بحث ہم نے اس قسم کے محقق اور اس کی تحریف سے متعلق نہیں کی تاکہ اس میں بحث و مناقشہ کیا جائے کیونکہ اس جیسی لغو باتوں میں مباحثہ و مناقشہ بے فائدہ ہے۔

بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم قاری کو یہ دکھائیں کہ اندھی عصبیت آدمی کو کہاں پہنچا دیتی ہے' ایسے ہی ہم یہ بھی دکھانا چاہتے ہیں کہ بعض لوگ اہل مغرب کے علمی طریقۂ بحث اور معروضیت کا جو ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اس کی کیا حقیقت ہے؟ پھر ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مغرب کی اندھی اور ذلت آمیز تقلید نے بعض مسلمانوں کو کہاں لا کھڑا کیا ہے!

اس ساری بحث سے آپ نے اس بات کا ادراک کر لیا ہو گا کہ ظہورِ اسلام سے قبل عربوں میں پائی جانے والی جاہلی فکر اور اسلام کے درمیان تعلق کی حقیقت کیا تھی' اسی طرح آپ اس بات کو بھی جان گئے ہوں گے کہ زمانۂ جاہلیت اور ملتِ حنیفیہ جس کو لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے' ان دونوں کے درمیان کیا تعلق پایا جاتا ہے۔

اس سے آپ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب عربوں میں رائج ساری عادات و اطوار کو لغو قرار دیا اور وہ ان کے خلاف حالتِ جنگ میں تھے تو آپ ﷺ نے اُن میں سے بہت سی عادات و اطوار اور اصول و مبادی باقی رکھے' اس کا سبب کیا تھا۔

ہم نے ان تمہیدی مباحث میں جو کچھ پیش کرنے پر اکتفاء کیا' یہ سب کچھ سیرتِ نبوی کے گہرے مطالعے اور اس سے حاصل ہونے والے احکام و نتائج کے استنباط سے قبل ضروری ہے۔

آئندہ آنے والی تمام بحثوں میں آپ مزید دلائل و براہین پائیں گے' جن سے ہماری وضاحت مزید پختہ ہو گی' اس کے نکھار میں اضافہ ہو گا اور اس کی حقیقت مزید کھل کر سامنے آئے گی۔

باب دوم: ولادت سے بعثت تک

آپ ﷺ کا نسب مبارک' ولادت اور رضاعت

نسب مبارک

حضور ﷺ کا نسب مبارک یہ ہے:

محمد ﷺ بن عبد اللہ بن عبد المطلب (آپ کو شیبۃ الحمد کہا جاتا تھا) بن ہاشم بن عبد مناف (آپ کا نام مغیرہ ہے) بن قصی (آپ کا نام زید ہے) بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ عدنان تک نسب شریف پر سب کا اتفاق ہے' اس سے آگے مختلف فیہ ہے' اُس پر اعتماد نہیں کیا جاتا لیکن اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں کہ عدنان' حضرت اسماعیل بن حضرت ابراہیم علیہما السلام کی اولاد سے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ عزوجل نے آپ ﷺ کا انتخاب سب سے بہترین قبائل' سب سے افضل بطون اور سب سے زیادہ پاک پشتوں سے فرمایا' جس وجہ سے آپ ﷺ کا پورا نسب مبارک دورِ جاہلیت کی ہر قسم کی آلائشوں سے محفوظ رہا۔

امام مسلم نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو چنا اور کنانہ سے قریش کو چنا اور قریش سے ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم سے مجھے مختص فرمایا۔

ولادتِ باسعادت

آپ ﷺ کی ولادت باسعادت سب سے زیادہ راجح قول کے مطابق عام الفیل بروز پیر' ربیع الاوّل کی بارہ تاریخ کو صبح صادق کے وقت ہوئی۔ عام الفیل سے مراد وہ سال ہے جب ابرہہ الاشرم اپنے ہاتھیوں کے لشکر کو لے کر کعبہ کو ڈھانے کے لیے مکۃ المکرمہ پر

حملہ آور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو تباہ و برباد کر دیا' اس کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ الفیل میں ہے۔ آپ ﷺ اپنے والد گرامی کی وفات کے بعد پیدا ہوئے' آپ کے والد گرامی حضرت عبداللہ کی وفات کے وقت آپ کی والدہ محترمہ دو مہینے کی حاملہ تھیں۔ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے آپ کے جملہ اُمور کی نگرانی کا ذمہ اٹھایا اور اُس وقت کی عرب روایات کے مطابق آپ کی رضاعت کے لیے قبیلہ بنو سعد بن بکر کی حلیمہ بنت ابوذؤیب نامی خاتون کو مختص فرمایا۔

جملہ سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ اُن دنوں بنو سعد کا علاقہ قحط سالی کا شکار تھا' ان کے جانوروں کے دودھ خشک ہو چکے تھے اور ان کی کھیتیاں ویران ہو چکی تھیں' پس کیا ہوا کہ جب حضرت محمد ﷺ نے حضرت حلیمہ کے گھر میں قدم مبارک رکھا اور حضرت حلیمہ کی گود میں تشریف فرما ہوئے تو خوش بختی اور خوش حالی کا دور دورہ ہو گیا' حضرت حلیمہ کی بکریاں جب شام کو گھر لوٹتیں تو وہ خوب سیر ہوتیں اور ان کے تھن بھی دودھ سے بھرے ہوئے ہوتے۔ آپ ﷺ ابھی قبیلہ بنو سعد میں ہی تھے کہ آپ کے ساتھ یہیں پر شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا۔[1]

پھر جب آپ ﷺ کی عمر مبارک پانچ برس ہوئی تو آپ کو اپنی والدہ محترمہ کے پاس مکہ میں بھیج دیا گیا۔

جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چھ برس ہوئی تو آپ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کا انتقال ہو گیا' اب آپ کی کفالت آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے اپنے ذمہ لی' حتیٰ کہ جب آپ ﷺ کی عمر مبارک آٹھ برس ہوئی تو حضرت عبدالمطلب بھی وفات پا گئے اور آپ ﷺ اپنے چچا حضرت ابوطالب کی کفالت میں آ گئے۔

اسباق و نصائح

آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے اس مذکورہ باب سے ہمیں جو بنیادی اسباق و نصائح حاصل ہوتے ہیں' ہم انہیں اجمالاً ذکر کرتے ہیں:

[1] قبیلہ بنو سعد میں آپ ﷺ کی پرورش' رضاعت اور شقِ صدر کے واقعات کے لیے دیکھیے: صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰۱-۱۰۲' نیز سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۴

(۱) آپ ﷺ کے نسب شریف کے متعلق جو بحث کی گئی وہ اس بات پر واضح دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت میں سے عرب قوم کو شرف بخشا اور عرب قبائل میں سے قبیلہ قریش کو فضیلت عطا کی' یہ بات اُس حدیث طیبہ سے بھی واضح ہے جو ہم نے نسب شریف کی بحث میں امام مسلم کے حوالے سے روایت کی' اس کے علاوہ ترمذی نے بھی ایک حدیث طیبہ نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: میں کون ہوں؟ صحابہ کرام نے جواب دیا: آپ اللہ کے رسول ہیں' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: میں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہوں' بے شک اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو پیدا فرمایا' پھر ان کے دو حصے کیے' مجھے ان میں سے بہترین حصے میں رکھا' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے قبائل بنائے تو مجھے بہترین قبیلہ میں رکھا' پھر ان کے گھر بنائے تو مجھے ان میں سے بہترین گھر میں اور بہترین لوگوں میں رکھا۔

(ترمذی ج۹ ص۲۴۶' کتاب المناقب)

حضور ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اُس قوم اور اُس قبیلے سے بھی محبت کی جائے جس میں آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی' افراد اور جنس کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس حقیقت مجردہ کی وجہ سے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اُس قبیلے کو شرف عطا فرمایا' وہ یہ ہے کہ اُس قوم اور قبیلے کی نسبت آپ ﷺ سے ہے۔

حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ عرب اور قریش میں سے بہت سے لوگ اللہ عزوجل کے صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گئے اور اس کے پسندیدہ دین اسلام سے بیزار ہوئے' ان کو یہ شان وعظمت حاصل نہ ہوئی کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت کی وجہ سے تھی جس کا کسی صورت بھی انکار ممکن نہیں' لیکن اپنے انحراف وانحطاط کی وجہ سے وہ اس شرف کے انتساب سے محروم رہے۔

(۲) یہ بات کوئی حادثاتی طور پر رونما ہونے والی نہیں کہ آپ ﷺ کی ولادت اپنے والد گرامی کی وفات کے بعد ہوئی اور پھر اپنے دادا کے زیرِ تربیت بھی بہت کم رہے' آپ ﷺ کی ابتدائی نشو ونما اپنے والد گرامی کی تربیت اور نگرانی کے بغیر اور اپنی والدہ ماجدہ کی شفقت ومحبت سے دور ہوئی' بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے یہ سارا معاملہ اپنی

حکمت باہرہ سے مصلحت کے طور پر ایک پروگرام کے تحت کیا۔ شاید وہ مصلحت یہ ہے کہ دین میں فساد بپا کرنے والے لوگ دوسرے لوگوں کے دلوں میں یہ شکوک و شبہات نہ ڈال سکیں کہ آپ ﷺ نے جو دعوت و تبلیغ کا کام سرانجام دیا' یہ ان کے والد گرامی کی طرف سے بچپن میں ہی ان کو سکھا دیا گیا تھا یا یہ کہ آپ ﷺ کے دادا جو قوم کے سردار تھے' اور رفادۃ (حاجیوں کو کھانا کھلانا) اور سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانا)[1] کا منصب بھی آپ کے پاس تھا تو انہوں نے آپ ﷺ کی سرداری کے حصول کے لیے تربیت کی ہے۔ کیونکہ یہ ایک طبعی امر ہے کہ باپ دادا اپنی اولاد کی اُسی ڈھنگ سے تربیت کرتے ہیں جو چیز وراثت میں ان کے آباء و اجداد سے چلی آرہی ہوتی ہے۔

چنانچہ اللہ عزوجل کی حکمت نے یہی فیصلہ کیا کہ دین میں فساد پیدا کرنے والوں کے لیے کوئی راستہ نہ رہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی ابتدائی نشوونما ان کے والد' والدہ اور دادا سے دور رکھ کر کرنے کا بندوبست فرمایا' حتیٰ کہ آپ ﷺ کے ابتدائی بچپن کا زمانہ بھی اپنے خاندان سے دور قبیلہ بنوسعد میں گزرا' پھر جب آپ کے دادا جان کی وفات ہوئی اور آپ کی کفالت آپ کے چچا حضرت ابوطالب کے حصے میں آئی' جو ہجرتِ مدینہ سے تین سال قبل تک آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ حکمتِ خداوندی کا تقاضا دیکھئے کہ حضرت ابوطالب نے بھی برملا اسلام کا اظہار نہ فرمایا تا کہ آپ ﷺ کی دعوت میں حضرت ابوطالب کا کوئی عمل دخل نہ سمجھا جائے اور نہ ہی اس دعوتِ حق کو قبائلی یا خاندانی عہدے و منصب یا سرداری کا مسئلہ تصور کیا جا سکے۔

اس طرح حکمت الٰہی اسی میں تھی کہ آپ ﷺ کی پرورش ایک دُرِ یتیم کی صورت میں ہو اور صرف عنایت و شفقت الٰہی ہی ان کی نگہبان ہو اور آپ ﷺ ناز و نعم اور مال و دولت سے دور رہیں تا کہ آپ کے دل میں مال و دولت اور جاہ و منصب کا میلان پیدا نہ ہو اور یہ کہ

---

[1] رفادۃ سے مراد حاجیوں کو کھانا کھلانے کا انتظام کرنا اور سقایہ سے مراد ان کو آبِ زم زم پلانا ہے۔ قریش زمانہ جاہلیت میں آپس میں مال جمع کر کے اس سے کھانے کا سامان' کشمش اور نبیذ خریدتے اور ایامِ حج میں لوگوں کو کھلاتے پلاتے۔

آپ اپنے خاندانی وقبائلی نظام اور اردگرد کے مصنوعی ماحول سے بھی متاثر نہ ہوں تاکہ نبوت کا پاکیزہ منصب دنیوی جاہ ومنصب سے آلودہ نہ ہونے پائے اور لوگوں کی نظروں میں نبوت کا تقدس اور دنیاوی جاہ ومنصب گڈمڈ نہ ہو جائیں، حتیٰ کہ وہ یہ گمان نہ کرنے لگیں کہ آپ نے دوسری چیز (دنیوی جاہ وحشمت) کو حاصل کرنے کے لیے پہلی چیز (منصب نبوت) کو ذریعہ بنایا ہے۔

(۳) تمام سیرت نگار اس پر متفق ہیں کہ حضرت حلیمہ سعدیہ کا علاقہ جو سخت قحط سالی کا شکار تھا، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے سے خوش حالی وہریالی لوٹ آئی اور حضرت حلیمہ سعدیہ کی بوڑھی اونٹنی جو ایک قطرہ دودھ تک نہ دیتی تھی، اب وہ اتنا زیادہ دودھ دیتی کہ ضرورت سے زائد ہوتا۔ یہ سب کچھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی دوسرے بچوں کی طرح ننھے بچے تھے، اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اور مرتبہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کتنا بلند اور رفیع ہے کہ حضرت حلیمہ سعدیہ کے گھر کو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت اور سبب سے انعام واکرام سے مالا مال فرمادیا۔ یہ بات کوئی ناممکنات میں سے بھی نہیں بلکہ ہماری شریعت اسلامیہ نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ جب کافی عرصہ تک بارش نہ ہو اور بارش ہونا بند ہو جائے تو صالح لوگوں کی برکت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت اطہار کے وسیلے سے رب کی بارگاہ میں بارش کی طلب کے لیے اپنی دعاؤں کی قبولیت کی استدعا کریں تو رب تعالیٰ ان پاک لوگوں کے وسیلے سے بارش عطا فرماتا ہے، اس بات پر جملہ ائمہ وفقہاء کا اتفاق ہے[1]

جب پاکانِ امت کے سبب اور ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ مہربانی فرماتا ہے تو سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان تو سب سے ارفع واعلیٰ ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت

[1] بارش طلب کرنے کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ ہو اہل صلاح وتقوی اور اہل بیت نبوت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے وسیلہ سے دعا مانگنا مستحب ہے۔ اس پر جمہور ائمہ وفقہاء کا اجماع ہے۔

دیکھیے: فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۹، نیل الاوطار ج ۲ ص ۷، سبل السلام ج ۲ ص ۱۳۴، مغنی لابن قدامۃ الحنبلی ج ۲ ص ۲۶۵۔

حلیمہ سعدیہ کی گود میں تشریف لائیں اور ان کا دودھ نوش فرمائیں اور پھر بھی قحط سالی اور یبوست باقی رہے؟ یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سبب سے قحط سالی کو خوش حالی و ہریالی اور یبوست کو طراوت میں بدل دیا۔ بے شک ساری کائنات کا نظام اسی واحد و یکتا مسبب الاسباب خدا کے دست قدرت میں ہے لیکن برکت و کرم کے اسباب میں سرفہرست آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات ہے' کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی طرف اللہ تعالیٰ کی رحمت کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔

جس کا ذکر حق سبحانہ وتعالیٰ نے یوں فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ (الانبیاء: ۱۰۷)

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سراپا رحمت بنا کر سارے جہانوں کے لیے۝

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبیلہ بنو سعد میں موجودگی کے دوران شق صدر کا واقعہ پیش آیا' یہ واقعہ ارہاصات نبوت میں سے شمار کیا جاتا ہے' جو اس بات کی دلیل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلند پایہ منصب رسالت کے لیے چن رکھا ہے۔ یہ واقعہ سند صحیح سے متعدد صحابہ کرام سے روایت کیا جاتا ہے جیسا کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبریل آپ کے پاس آئے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پکڑا اور زمین پر لٹا دیا' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب اطہر کو چاک کیا اور باہر نکال کر اس میں سے ایک لوتھڑا نکالا اور کہا: یہ شیطان کا حصہ ہے' پھر قلب اطہر کو سونے کے طشت میں رکھ کر آب زم زم سے دھویا اور اپنی جگہ پر واپس رکھ دیا' ادھر دوسرے بچے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی ماں کی طرف دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کسی نے مار دیا ہے' پس سب دوڑتے ہوئے آئے تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ فق ہے۔[1]

(مسلم ج ۱ ص ۱۰۲-۱۰۱)

اس واقعہ کی یہ حکمت نہیں تھی (اللہ تعالیٰ سب سے بہتر جانتا ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اطہر میں کوئی غدۂ شر تھا جسے نکالا گیا' کیونکہ اگر انسان سے شر کا عمل صادر ہونے

[1] صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شق صدر کا واقعہ اکثر مرتبہ پیش آیا۔

کا سبب کوئی غدہ یا جسم کا کوئی لوتھڑا ہوتا تو پھر عمل جراحی کے ذریعے بُرے آدمی کو نیک بنانا ممکن ہوتا' بلکہ اس عمل شقِ صدر کی حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کو صغر سنی ہی سے عصمت اور وحی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے' تا کہ لوگ آپ پر بہ آسانی ایمان لے آئیں اور آپ کی رسالت کی تصدیق کریں' گویا کہ یہ معنوی تطہیر کا عمل تھا' جس کو اس مادی اور حسی شکل میں پیش کیا گیا' تا کہ لوگوں کی سماعتوں اور بصارتوں میں یہ اعلانِ الٰہی کی حیثیت اختیار کر لے۔

اس واقعہ کی جو بھی حکمت ہو' بہر کیف یہ واقعہ صحیح روایات سے ثابت ہے' اس لیے اس واقعہ کو اپنے ظاہر اور حقیقت سے پھیر کر اس کی حقیقت سے دُور پر تکلف تاویل کرنا درست نہیں۔ روایات کی صحت کے ثبوت کے باوجود اگر کوئی شخص اس طرح کی کوئی کوشش کرتا ہے تو اس شخص کا ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات پر کمزور اور ضعیف ہے۔

ہمیں جاننا چاہیے کہ کسی روایت کو قبول کرنے کا معیار روایت کی صحت اور اس کی صداقت ہے' تو جب کوئی روایت واضح طور پر ثابت ہو جائے تو اسے بسر و چشم تسلیم کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہیے۔ اُس وقت پھر اُن روایات کو عربی زبان کی دلالتوں اور قواعد وضوابط سے سمجھنا ہمارا پیمانہ ہونا چاہیے' کلام میں اصل حقیقت ہوتی ہے' اگر ہر قاری اور محقق کو اجازت دے دی جائے کہ وہ کلام کی حقیقت کو چھوڑ کر اس کے مختلف مجازی معانی اپنے سامنے رکھے اور اُن میں سے جس معنی کو چاہے اختیار کر لے اور جسے چاہے چھوڑ دے تو اس صورت میں زبان کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہے گی' اس کی دلالت ختم ہو جائے گی اور لوگ اس کے معانی میں بھٹکتے رہیں گے۔

پھر تاویل کے متعلق بحث کرنے اور حقیقت کو قبول نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟

اس کی ضرورت اُسی وقت ہو گی جب اللہ تعالیٰ پر ایمان کمزور ہو گا' اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور رسالت کی صداقت پر یقین کمزور ہو گا' اگر ایسی بات نہیں تو بہ آسانی اُس بات پر یقین کر لینا چاہیے جو روایت صحیحہ سے ہم تک پہنچی ہو' خواہ ان کی حکمت وعلت معلوم ہو یا نہ ہو۔

آپ ﷺ کا پہلا سفرِ شام اور پھر کسبِ معاش کے لیے کوشش

آپ ﷺ کی عمر مبارک جب بارہ برس ہوئی تو آپ کے چچا ابو طالب نے شام کی

طرف جانے والے ایک تجارتی قافلے میں سفر کیا اور آپ ﷺ کو بھی ساتھ لے لیا' جب یہ قافلہ ''بصریٰ'' میں ٹھہرا' وہاں یہ لوگ بحیرا نامی راہب کے پاس سے گزرے' جو انجیل کا عالم تھا اور نصرانی شریعت سے بھی واقف تھا' اُس بحیرا نامی راہب نے جب آپ ﷺ کو غور سے دیکھا تو آپ ﷺ کے بارے میں پوچھنے لگا اور آپ سے گفتگو کرنے لگا' پھر اُس نے حضرت ابوطالب سے پوچھا کہ یہ بچہ آپ کا کیا لگتا ہے؟ آپ نے جواب دیا: یہ میرا بیٹا ہے' کیونکہ حضرت ابوطالب آپ ﷺ سے شدید محبت وشفقت کی بناء پر آپ کو اپنا بیٹا کہتے تھے۔ بحیرا راہب نے کہا: یہ آپ کا بیٹا نہیں ہے کیونکہ اس بچے کا باپ زندہ نہیں ہو سکتا' پھر آپ نے جواب دیا: یہ میرا بھتیجا ہے' اُس نے کہا: اس بچے کے باپ کو کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا: اس کی ماں حاملہ تھی کہ اس کا باپ فوت ہو گیا' بحیرا نے کہا: آپ نے سچ کہا' پس آپ اسے واپس اپنے شہر لے جائیں اور یہود سے بچائیں' بخدا! یہودیوں نے اگر اس کو دیکھ لیا تو وہ ضرور اس کو تکلیف پہنچائیں گے' بے شک آپ کا یہ بھتیجا بڑی شان وعظمت والا ہے' حضرت ابوطالب وہیں سے آپ ﷺ کو لے کر واپس مکہ آ گئے[1] (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۰' الطبری ج ۲ ص ۲۸۷' اور البیہقی نے سنن میں اور ابونعیم نے الحلیہ میں اسے نقل کیا ہے)

---

[1] ان روایات کی تفصیل میں کچھ اختلاف ہے۔ اس روایت کو امام ترمذی نے دوسرے انداز سے تفصیلاً نقل کیا ہے۔ شاید اس کی سند میں کچھ کمزوری ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کو روایت کرنے کے بعد خود لکھا۔ (یہ حدیث حسن غریب ہے' ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں) اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمان بن غزوان ہے' ان کے بارے ''میزان'' میں آیا ہے کہ ان سے بعض ''منکر'' احادیث مروی ہیں' پھر کہا: ان کی سب سے زیادہ منکر حدیث وہ ہے جو انہوں نے یونس بن ابی اسحاق سے روایت کی' اور جس میں آپ ﷺ کا نوعمری میں ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر کا ذکر ہے' اور اس کے بارے میں ابن سیدالناس نے لکھا: اس حدیث کے متن میں بعض منکر چیزیں ہیں۔ (دیکھیے: عیون الاثر ج ۱ ص ۴۳) عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس سب کے باوجود شیخ ناصرالدین البانی نے شیخ غزالی کی کتاب ''فقہ السیرۃ'' کی احادیث کی تخریج کے دوران اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ انہوں نے اس پر امام ترمذی کا تبصرہ بھی نقل نہیں کیا' بلکہ ان کا یہ قول نقل کیا کہ یہ حدیث حسن ہے' حالانکہ ان کی عادت ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ صحیح حدیث کو بھی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جب آپ ﷺ نے عنفوانِ شباب میں قدم رکھا تو آپ نے رزق کی تلاش میں سعی شروع کی اور بکریاں چرانے کا پیشہ اختیار فرمایا' بعد میں آپ ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا: میں اہل مکہ کی بکریاں چند قیراط (سکوں) کے عوض چراتا تھا۔ (رواہ البخاری)

نوجوان لڑکے عالمِ شباب میں جن بُرائیوں میں ملوث ہوتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان آلائشوں سے محفوظ رکھا۔

آپ ﷺ اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

دورِ جاہلیت کے کاموں کی طرف میں نے دومرتبہ سے زیادہ توجہ نہ کی' لیکن جب بھی میں اس طرف متوجہ ہوا' اللہ تعالیٰ کی ذات میرے اور اُس کام کے درمیان حائل ہوگئی' پھر میں نے کبھی بھی اُس طرف توجہ نہ کی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے ذریعے مجھے عزت بخشی' ایک مرتبہ میں نے اپنے ساتھی کو کہا جو میرے ساتھ مکہ کی بلند جگہ پر بکریاں چراتا تھا کہ اگر تم میری بکریوں کا دھیان رکھو تو میں بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح مکہ میں رات کی مجلس میں جاؤں' پس میرے ساتھی نے کہا: ہاں! میں تمہاری بکریوں کا دھیان رکھوں گا' میں وہاں سے نکلا ابھی مکہ کے پہلے گھر کے قریب ہی پہنچا کہ میں نے گانے باجے کی آواز سنی' میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا: یہاں شادی ہے' تو میں سننے کے لیے وہاں بیٹھا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میری قوتِ سماعت سلب کرلی اور میں سو گیا' پھر صبح سورج کی حرارت نے ہی مجھے بیدار کیا' پس میں اپنے ساتھی کی طرف لوٹا' اُس نے مجھ سے رات کا حال پوچھا میں نے اُسے بتادیا' پھر ایک اور رات میں نے اپنے ساتھی سے وہی بات کہی اور میں مکہ میں داخل ہوا تو مجھ پر وہ پہلی رات والی ہی کیفیت طاری ہوگئی' پھر اس کے بعد میں نے ان اُمور کی طرف کبھی توجہ نہ کی[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بعض اوقات ضعیف قرار دے دیتے ہیں۔ اس میں اور دیگر میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ واقعہ بہت سے طریقوں سے ثابت ہے' جس سے کوئی ضعف لاحق نہیں ہوتا۔

[1] اس حدیث کو ابن اثیر اور حاکم نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے' حاکم نے لکھا ہے: یہ حدیث صحیح ہے اور مسلم کی شرط پر ہے۔ طبرانی میں یہ حضرت عمار بن یاسر سے مروی ہے۔

اسباق ونصائح

بحیرا راہب نے رسول اللہ ﷺ کے بارے جو حقائق بیان کیے' اس حدیث کو بے شمار علماء سیرت نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس ضمن میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے۔ بحیرا والی یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے پاس آپ ﷺ کی بعثت کا علم اور آپ کی نبوت کی علامات کی معرفت موجود تھی' کیونکہ تورات وانجیل میں آپ کی بعثت کی خبریں اور آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کثرت سے موجود ہے' اس پر بے شمار دلائل ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور اہم بات جسے جملہ سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے' وہ یہ کہ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل یہودی جب اوس اور خزرج قبیلے سے لڑتے تو آپ ﷺ کے وسیلہ سے فتح طلب کیا کرتے تھے اور اپنے دشمنوں کو یوں کہتے: بے شک عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے' ہم ان کی اتباع کریں گے اور پھر ان کی معیت میں ہم تمہیں قومِ عاد وارم کی طرح قتل کر دیں گے۔ جب اہل کتاب نے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝ (البقرہ:۸۹)

اور جب آئی اُن کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی اس (کتاب) کی جو اُن کے پاس تھی اور وہ اس سے پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر (اُس نبی کے وسیلہ سے) تو جب تشریف فرما ہوا اُن کے پاس وہ نبی' جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے' سو پھٹکار ہو اللہ کی (دانستہ) کفر کرنے والوں پر۝

اسی طرح جو سورۃ البقرہ کی آیت:۱۴۶ نازل ہوئی' امام قرطبی اور دیگر اس آیت کے

تحت ایک واقعہ نقل کرتے ہیں' آیت یہ ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَO (البقرہ:۱۴۶)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بے شک ایک گروہ ان میں سے چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کرO

جب یہ مذکورہ بالا آیت مبارکہ نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (جو اہل کتاب یہودیت سے اسلام میں داخل ہوئے تھے) سے پوچھا کہ کیا واقعی آپ محمد ﷺ کو ایسے ہی پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں! بلکہ اس سے بھی زیادہ پہچانتے تھے۔

اللہ نے آسمان سے اپنے امین کو زمین پر اپنے امین کے پاس بھیجا اور اس کی صفات بتائیں تو میں نے اُسے پہچان لیا' رہا میرا بیٹا تو میں نہیں جانتا کہ اس کی ماں نے کیا کیا؟

اور حضرت سلمان فارسی کے اسلام لانے کا بھی سبب یہی تھا کہ انہوں نے علماء اہل کتاب انجیل اور راہبوں سے جو آپ ﷺ کی صفات معلوم کیں' ان کی اتباع کرتے ہوئے مسلمان ہو گئے۔

آج کل کے اکثر اہل کتاب جو آپ ﷺ کی صفات اور معلومات کا انکار کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور کی جملہ اناجیل مسلسل تغیر و تبدل کے مرحلے سے گزرنے کی وجہ سے ان اخبار اور معلومات سے خالی ہو چکی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

وَمِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَO فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ وَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَO

اور ان میں کچھ اَن پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو بجز جھوٹی اُمیدوں کے اور وہ تو محض وہم و گمان ہی کرتے رہتے ہیںO پس ہلاکت ہو ان کے لیے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں: یہ نوشتہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل

(البقرہ ۲:۷۹-۷۸) کریں اس کے عوض تھوڑے سے دام سو ہلاکت ہو ان کے لیے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے لیے بوجہ اس مال کے جو وہ (یوں) کماتے ہیں O

آپ ﷺ کا اکتساب رزق کے لیے بکریاں چرانے میں مشغول ہونا تین اہم وجوہات کی بناء پر تھا:

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ میں ذوق رفیع اور احساس نازک کی صورت میں جو اوصاف جمع فرما دیئے ہیں' اس بناء پر آپ ﷺ کے چچا جناب ابوطالب اگرچہ آپ کی ہر ضرورت کو پورا کرتے اور شفقت ومحبت میں شفیق باپ کی طرح پیش آتے لیکن آپ ﷺ نے جب اپنے اندر کام کاج کرنے کی قدرت محسوس کی تو آپ ﷺ اکتسابِ معاش کے لیے جدوجہد کرنے لگے تاکہ کسی حد تک معاشی طور پر اپنے چچا کی معاونت کریں اور اخراجات میں ان کا ہاتھ بٹائیں' اگرچہ اللہ تعالیٰ نے جس بلند پایہ کام کے لیے آپ ﷺ کو مختص فرمایا تھا اس کے مقابلے میں یہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا لیکن اخلاقی اعتبار سے یہ شکر گزاری' بذلہ سنجی اور نیکی کا بدلہ چکانے کا اعلیٰ احساس تھا۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے دنیا کی جو زندگی پسند فرمائی ہے۔ قدرتِ الہیہ سے بالکل بھی یہ بعید نہیں تھا کہ وہ اپنے پیارے نبی ﷺ کے لیے آرام وسکون اور خوش حالی کے جملہ اسباب مہیا فرما دیتا جس سے آپ ﷺ کو اکتساب رزق کے لیے نہ محنت کرنا پڑتی اور نہ ہی بکریاں چرانا پڑتیں' لیکن حکمت الہیہ ہم سے اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ ہم یہ بات جانیں کہ بہترین مال وہ ہے جو قوت بازو سے کمایا ہوا ہو' جس کے کمانے میں اپنے معاشرے کی خدمت اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ بھی کارفرما ہو اور برا مال وہ ہے جس کے کمانے میں انسان کو کوئی محنت مشقت نہ کرنی پڑے اور بستر پر لیٹے مل جائے اور نہ ہی اس میں معاشرے کا کوئی فائدہ

ہو۔

تیسری وجہ: کوئی بھی صاحبِ دعوت جو لوگوں کو دعوت دینے کا کام کرتا ہے، اگر تو وہ اپنی دعوت کے ذریعے کسبِ رزق کرتا ہے یا لوگوں کی طرف سے دیئے گئے صدقات و عطیات پر ہی گزارا کرتا ہے تو اس صورت میں اُس کی اس دعوت کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اس لیے دعوتِ اسلامی کے علم بردار کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ حصولِ رزق میں اپنی ذاتی کوشش و محنت پر ہی اعتماد کرے، تا کہ اس سلسلے میں کسی بندے کا کوئی احسان اُسے نہ اٹھانا پڑے، جس وجہ سے کلمۂ حق کہنے میں کوئی مصلحت آڑے نہ آئے اور موقع کی مناسبت سے جو حق ہو اُسے بروقت بیان کر سکے۔

اس سب کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ اُس لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے ان ساری حکمتوں سے آپ ﷺ کو روشناس کیا یا نہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس نہج اور جس انداز سے آپ ﷺ کو تیار کیا، اس سے یہ حکمت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ بعثت سے قبل ایسی کوئی بات سرزد ہو جو بعثت کے بعد آپ ﷺ کی دعوت پر اثر انداز ہو سکے یا اس راستے میں کوئی رکاوٹ بن سکے۔

حضور ﷺ نے اپنے بارے میں جو یہ قصہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو لڑکپن میں اور جوانی کے ابتدائی دور میں ہر قسم کی بُرائی سے محفوظ رکھا، اس میں ہمارے لیے دو اہم حقیقتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

پہلی حقیقت: یہ کہ آپ ﷺ جملہ خصائصِ بشریت سے بہرہ ور تھے اور جس طرح دوسرے نوجوان اپنے اندر میلاناتِ فطریہ رکھتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی جبلت میں رکھے ہیں، آپ ﷺ بھی اپنے اندر وہ چیز محسوس فرماتے تھے، جس وجہ سے آپ ﷺ کا بھی نوجوانی کے عالم میں دوسرے ساتھیوں کی طرح قصہ گوئی کی محافل اور کھیل کود کی طرف میلان ہوتا تھا۔

دوسری حقیقت: جملہ فطری و جبلی میلانات اور جمیع مظاہر انحراف کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تمام آلائشوں اور مشکوک اشیاء سے محفوظ و معصوم رکھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو جب بلند منصب دعوت کے لیے تیار کر رہا تھا، یہ چیزیں اس کے لائق

نہ تھیں اگر چہ اس وقت آپ ﷺ پر نہ وحی آتی تھی اور نہ ہی آپ کسی شریعت کے مدعی تھے' جس بناء پر آپ ﷺ کے سامنے کوئی شرعی راستہ ہوتا لیکن جب بھی آپ ﷺ میں ایسا کوئی فطری میلان پیدا ہوتا' اُسی وقت حق تعالیٰ آپ ﷺ کے دل میں حق بات القاء فرما دیتا' اور جو کام آپ ﷺ کے منصب کے لائق نہ ہوتا اللہ تعالیٰ اُس سے آپ ﷺ کو روک لیتا تاکہ مکارمِ اخلاق کو مکمل کیا جا سکے اور شریعتِ اسلامیہ کے لیے راہ ہموار کی جا سکے۔

حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات میں ان مذکورہ دونوں حقیقتوں کا جمع ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہر لحہ عنایت الٰہیہ آپ ﷺ کے شامل حال رہی ہے اور رب تعالیٰ نے دوسرے ظاہری اور معروف اسبابِ تربیت سے قطع نظر اپنے حبیب ﷺ کی شروع سے ہی ہر طرح کی تربیت ونگہبانی اپنے دست قدرت سے فرمائی ہے۔ دورِ جاہلیت میں جہاں ہر طرف گمراہی اور برائی کا دَور دورہ تھا' آپ ﷺ کے رشتہ داروں' پڑوسیوں اور گھر کے افراد میں سے کون تھا جو آپ ﷺ کی تربیت کر سکتا تھا؟ وہ خود سارے عصمت وعفت سے ناآشنا تھے' یقیناً وہ خاص عنایت الٰہیہ ہی تھی جس نے آپ ﷺ کے جوانی کے نور کو دورِ جاہلیت کے اندھیروں سے محفوظ ومامون رکھا۔ یہ ساری چیزیں اُن واضح نشانیوں میں سے ہیں کہ آپ ﷺ کو منصب رسالت کے لیے پہلے دن سے ہی تیار کرنا شروع فرما دیا تھا' کیونکہ اس منصب عظیم کے لیے تکوین شخصیت اور اس کے ساتھ ساتھ ذہنی وفکری بالیدگی اور مستحکم اندازِ حیات درکار ہوتا ہے۔

یہ بھی بہت آسان تھا کہ حبیب کریم ﷺ کے دل سے پیدائشی طور پر ہی دوافعِ غریزیہ اور خواہشات وشہوات کو نکال دیا جاتا تاکہ آپ ﷺ کا فطری میلان ان کی طرف جاتا ہی نہ اور آپ ﷺ اپنی بکریاں اپنے ساتھی کے حوالے کر کے مکہ کے گھروں میں قصہ گوئی کی محافل اور کھیل کود میں شرکت کے لیے جاتے ہی نہ' لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فطری وجبلی حوالے سے مستثنیٰ نہیں رکھا' یہ فطری وجبلی چیزیں جو بشریت کا تقاضا تھیں وہ بھی رکھیں تاکہ آپ کی نفسیاتی بناوٹ معمول سے ہٹ کر نہ ہو۔ اس طرح کے نمونے ہر قوم اور ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں' اس صورت میں اس چیز کا اظہار نہ ہوتا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ

...لی پوشیدہ نگرانی میں ہیں اور اس کی عنایتِ خاص آپ کو نازیبا کاموں سے محفوظ رکھتی ہے۔
...وجودیکہ ان سب اُمور کی طرف آپ میں فطری میلانات پائے جاتے ہیں' حکمت الٰہی کا
...قاضا تھا کہ رسولِ کریم ﷺ کی اس الٰہی عنایت سے لوگوں پر ایسی حقیقتیں روشن ہوں جن
...کے ذریعے آپ کی رسالت پر ان کا ایمان لانا سہل اور آسان ہو جائے اور شک وشبہہ کے
...ندھیرے چھٹ جائیں۔

...حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال سے تجارت اور اُن سے نکاح

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا (بمطابق رواياتِ ابن الاثیر اور ابن ہشام) مال
...دار اور معزز تاجرہ خاتون تھیں' وہ کسی تاجر کے ذریعے تجارت کرتیں اور اس کے عوض ایک
...مخصوص مال اُس تاجر کو دیتیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کی سچائی' امانت داری اور حسنِ اخلاق
...کی خبر انہیں ہوئی تو انہوں نے آپ ﷺ کو اپنا مالِ تجارت ملک شام کی طرف لے جانے کا
...پیغام بھیجا اور اس کے عوض دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مال دینے اور اپنے غلام میسرۃ کو
...ساتھ بھیجنے کا عندیہ دیا' آپ ﷺ نے ان کی اس پیش کش کو قبول فرمالیا' پس آپ ﷺ
...ان کا مال اور ان کے غلام میسرہ کو ساتھ لے کر ملک شام روانہ ہوئے' اس تجارتی سفر میں اللہ
...تعالیٰ نے آپ کو کامیاب فرمایا اور آپ ﷺ کئی گنا زیادہ نفع لے کر واپس لوٹے۔ آپ
...ﷺ نے پورے کا پورا نفع ایمان داری سے حضرت خدیجہ کو ادا کر دیا' میسرہ غلام جو اس سفر
...میں آپ ﷺ کے ساتھ تھا' وہ آپ ﷺ کے خصائصِ نبوت' عظیم اخلاق اور حق گوئی کو
دیکھ کر بہت متاثر ومتعجب ہوا' اُس نے یہ سب کچھ حضرت خدیجہ سے بیان کیا۔ حضرت خدیجہ
بھی آپ ﷺ کی ایمان داری سے بہت متاثر ہوئیں اور آپ ﷺ کے سبب سے جو نفع
میں برکت ہوئی اس سے بھی بہت متعجب ہوئیں' پس حضرت خدیجہ نے اپنی سہیلی نفیسہ بنت
منیہ کے ذریعے آپ ﷺ کو شادی کا پیغام بھیجا' جس پر آپ ﷺ نے رضامندی کا
اظہار فرمایا اور اپنے چچاؤں سے بھی بات کی' پھر آپ ﷺ کے چچاؤں نے حضرت خدیجہ
کے چچا عمرو بن اسد سے رشتہ طے کیا اور آپ ﷺ کی شادی حضرت خدیجہ سے ہو گئی' اس
وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس برس تھی اور حضرت خدیجہ کی عمر چالیس برس تھی۔
آپ ﷺ کے ساتھ شادی سے قبل حضرت خدیجہ کی شادی دو مرتبہ ہو چکی تھی' پہلی

مرتبہ شادی عتیق بن عائذ التمیمی سے، پھر دوسری دفعہ ابوھالہ التمیمی (ھند بن زرارۃ) سے ہوئی ہے[1] (ابن سید الناس نے "عیون الاثر" میں اور ابن حجر نے "الاصابۃ" میں اس کو روایت کیا ہے)

اسباق ونصائح

آپ ﷺ کا حضرت خدیجہ کے مال سے تجارت کرنا اُسی عمل کا تسلسل تھا جو آپ ﷺ نے ذاتی محنت اور جدوجہد کے سلسلے میں بکریاں چرانے سے شروع فرمایا تھا، جس کی ہم نے اس سے پہلے تشریح کر دی ہے اور اس کی حکمت اور اس سے اخذ ہونے والے سبق کو بھی واضح کر دیا ہے۔

حضور ﷺ کی زندگی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی قدرومنزلت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی پوری زندگی اُن کا ذکر بہتر انداز میں فرماتے رہے۔ صحیحین کی روایت کے مطابق حضرت خدیجہ مطلقاً اپنے زمانے کی تمام عورتوں سے بہترین عورت تھیں۔

بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

مریم بنت عمران اُن عورتوں میں سے بہترین عورت تھیں اور خدیجہ بنت خویلد اِن عورتوں میں سب سے بہترین ہیں۔[2]

بخاری و مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں نبی ﷺ کی دوسری بیویوں کے مقابلے میں حضرت خدیجہ کے بارے میں

---

[1] سیرت نگاروں کا اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہ کا سب سے پہلے کس شخص سے نکاح ہوا، ابن سید الناس نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور قتادہ اور اسحاق نے بھی اسے روایت کیا ہے کہ اُن کے پہلے شوہر عتیق بن عائذ اور دوسرے ہند بن زرارۃ تھے۔

[2] مسلم کی روایت کے مطابق "اُن عورتوں" سے مراد آسمان کی عورتیں ہیں اور "اِن عورتوں" سے مراد زمین کی عورتیں ہیں۔ طیبی فرماتے ہیں: پہلی ضمیر اس امت کی طرف راجع ہے جس سے حضرت مریم کا تعلق تھا اور دوسری ضمیر اس امت کی طرف لوٹ رہی ہے۔

(دیکھئے: فتح الباری ج ۷ ص ۹۱)

زیادہ غیرت سے کام لیتی حالانکہ میں ان کے ساتھ نہیں رہی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جب بھی بکری ذبح کرتے تو فرماتے: یہ گوشت خدیجہ کے عزیز و اقرباء میں بھیج دو۔ آپ فرماتی ہیں: ایک دن مجھے غصہ آ گیا' میں نے کہا: یہ خدیجہ کیا ہے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اُس سے محبت (عطا کی گئی) ہے۔ (متفق علیہ' حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

احمد اور طبرانی نے بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگر گھر سے نکلتے تو حضرت خدیجہ کا ذکر ہو جاتا تو آپ ﷺ ان کی تعریف کرتے' ایک دن جب آپ ﷺ نے ان کا ذکر کیا تو مجھے غیرت آ گئی' میں نے کہا: کیا وہ ایک بوڑھی عورت ہی نہ تھی؟ اللہ تعالیٰ نے اب اُن سے بہتر بیویاں عطا فرمائی ہیں' تو آپ ﷺ کو یہ بات پسند نہ آئی' آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! اُس سے بہتر کوئی بیوی نہیں! وہ اُس وقت مجھ پر ایمان لائی جب لوگ مجھے نہیں مانتے تھے' اُس نے میری تعریف کی جب لوگ مجھے جھٹلاتے تھے' اُس نے اپنا مال پیش کیا جب لوگ مجھے محروم کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اُس عورت سے اولاد عطا فرمائی جو کسی دوسری عورت سے نہیں۔

آپ ﷺ کی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے جو شادی کا واقعہ ہے' اس سے کوئی بھی انسان جس پہلی چیز کا ادراک کرتا ہے' وہ یہ ہے کہ اس میں آپ ﷺ نے اپنے جسمانی فائدے اور جنسی خواہشات کی تکمیل کا اہتمام نہیں کیا' کیونکہ اگر آپ ﷺ بھی اپنے زمانے کے دوسرے نوجوانوں کی طرح جنسی خواہش کا اہتمام کرتے تو اپنے سے کم عمر لڑکی سے یا کم از کم اپنی ہم عمر لڑکی سے شادی کرتے' اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ سے نکاح' قوم میں ان کی عزت و شرافت اور پاک دامنی کی بناء پر فرمایا' حتیٰ کہ دورِ جاہلیت میں بھی آپ کو عفیفہ اور طاہرہ کے لقب سے جانا جاتا تھا۔

یہ شادی حضرت خدیجہ کی وفات تک قائم رہی' وفات کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر پینسٹھ (۶۵) برس تھی اور آپ ﷺ کی عمر مبارک تقریباً پچاس (۵۰) برس تھی۔ اس دوران آپ ﷺ نے کسی دوسری عورت یا لڑکی سے نکاح کا ارادہ نہیں فرمایا حالانکہ بیس سال اور پچاس سال کی درمیانی عمر ہی وہ زمانہ ہے جس میں جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے عورتوں کی طرف میلان اور متعدد شادیوں کی تمنا اور آرزو ہوتی ہے' لیکن آپ ﷺ نے اپنی عمر

مبارک کے اس زمانے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی دوسری عورت یا لونڈی کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تو کئی عورتوں اور کئی لونڈیوں کو اس زمانے کے رواج اور عرف کے مطابق اپنے پاس رکھ سکتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہ کے بیوہ اور عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ایسا نہیں فرمایا۔

اس طرح اُن بد طینت مستشرقین اور ان کی ڈگر پر چلنے والے ان کے زر خرید غلاموں کے مونہوں کو لگام مل گئی' ان کی مثال قرآن کے مطابق اُن چرواہوں کی سی ہے جو جانوروں کو پکارتے ہیں لیکن وہ ان کی پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے' ان کے دلوں میں اسلام کے بارے میں حسد اور کینہ بھرا ہے اور وہ طرح طرح کی بے ہودہ باتوں سے شانِ رسالت میں طعن و تشنیع کرتے ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شادی کے موضوع کو چھیڑ کر وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ دین اسلام پر کوئی قدغن لگا سکتے ہیں یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کو موردِ الزام ٹھہرا سکتے ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعددِ ازواج کو لوگوں کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (نعوذ باللہ) جنسی و شہوانی خواہشات کا رسیا قرار دینے سے بھی نہیں چوکتے۔

یہ بات معلوم اور ظاہر ہے کہ مستشرقین' اسلام کے سخت ترین دشمن ہیں۔ انہوں نے اسلام میں طعن کرنے کو پیشہ بنا لیا ہے جس سے وہ روزی کماتے ہیں' جب کہ وہ سادہ لوح مسلمان جو ان کے پیچھے چل رہے ہیں' ان کی اسلام دشمنی' سماع اور تقلید پر مبنی ہے۔ یہ کسی تحقیق یا فہم کے لیے اپنے ذہنوں کو کھولنا چاہتے ہی نہیں' بلکہ یہ آنکھیں بند کر کے دوسروں کی اتباع اور پیروی کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اسلام سے ان کی دشمنی اُس بیج کی طرح ہے جسے آدمی اپنے سینے پر محض اس مقصد کے لیے لگاتا ہے کہ اسے دیکھ کر لوگ اُسے کسی پارٹی کا رکن سمجھیں' اور یہ چیز معلوم ہے کہ بیج محض ایک علامت ہوتا ہے' اسی طرح اسلام سے ان کی دشمنی بھی علامتی ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان اپنی پہچان کرواتے ہیں کہ اُن کا اسلامی تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ ان کی وابستگی دراصل اس استعماری اور سامراجی فکر سے ہے جس کی نمائندگی فکری استعمار کے داعی مستشرقین کرتے ہیں۔

ان کا یہ کام اختیار کرنا بغیر کسی تحقیق اور فہم کے ہے' ہاں! ان کی یہ اسلام دشمنی علامتی ہوتی ہے' جس کے ذریعے وہ اپنی قوم اور اپنے اردگرد کے لوگوں میں اپنی پہچان کرواتے ہیں'

یہ اُن کا کوئی فکری عمل نہیں جس کا مقصد کوئی بحث و تحقیق ہو۔

نبی اکرم ﷺ کے نکاح کا موضوع تو ایسا آسان ترین موضوع ہے جس کی وضاحت ایک ہوش مند' دین سے آگاہ' اور اپنے نبی کی سیرت سے کچھ واقفیت رکھنے والا مسلمان بہترین انداز میں اس سے برعکس انداز میں کرسکتا ہے جس کا پروپیگنڈہ اس دین کے دشمن کرتے ہیں۔

وہ بدطینت چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی شخصیت پر ایک شہوانی اور جسمانی لذتوں میں ڈوبے ہوئے شخص کی تصویر چسپاں کریں۔

آپ ﷺ کی جملہ شادیوں کے متعلق تھوڑا سا بھی غور کریں تو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور اُن کے الزام کا بہتر طریقے سے جواب مل جاتا ہے کہ ایک جنسی شہوت کا رسیا انسان دورِ جاہلیت میں عرب کے اُس بُرے ماحول سے کیسے پچیس سال کی عمر تک پاک دامن اور عفیف النفس رہ سکتا ہے؟ جہاں ہر طرف برائی اور بدکاری کا دور دورہ تھا' اسی طرح ایک جنسی شہوت کا رسیا انسان اس کے بعد کیسے ایک چالیس سالہ عمر رسیدہ بیوہ سے نکاح کرنے پر رضامند ہوسکتا ہے اور پھر اُسی بیوہ کے ساتھ پچاس سال کی عمر تک زندگی بسر کرسکتا ہے' کسی دوسری عورت کی طرف توجہ اور دھیان کیے بغیر؟ یہاں تک کہ اس کی جوانی بھی گزر جائے اور بڑھاپے میں داخل ہو جائے' یہ ساری باتیں ایسی ہیں کہ جن سے معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے جو متعدد شادیاں کیں ان کی وجہ جنسی خواہش نہ تھی بلکہ کئی اور وجوہات تھیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنا اور پھر اس کے بعد متعدد عورتوں سے نکاح کرنے کا کوئی نہ کوئی خاص واقعہ ہے اور ان میں خاص حکمت اور سبب پایا جاتا ہے جس میں غور و فکر کرنے سے مسلمان کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور آپ ﷺ کی عظمت' رفعت شان اور کمالِ اخلاق کا پتا چلتا ہے' اس میں کوئی بھی حکمت یا سبب ہو اس سے قطع نظر کوئی بھی باشعور انسان ہرگز یہ تصور نہیں کرسکتا کہ یہ سب کچھ صرف اور صرف جنسی تسکین کے لیے کیا گیا تھا' اگر ایسی کوئی بات بھی ہوتی تو وہ نبوت کے اعلان سے پہلے ہوسکتی تھی جب آپ اپنی عمر کے اس حصے میں تھے جب خواہش کی تکمیل کا فطری وقت ہوتا ہے' خاص طور پر کہ جب آپ نبوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں سے خالی

الذہن تھے اور دعوت کے مسائل و مشاغل سے آپ کا واسطہ نہیں پڑا تھا' جو آپ کی فطری ضروریات کی تکمیل میں آڑے آتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے دفاع میں مفصل بحث کی ضرورت نہیں' جیسا کہ بہت سے محققین کرتے ہیں اس لیے کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس موضوع میں کوئی پیچیدگی ہے' جس میں غور و خوض یا تحقیق کی ضرورت ہو' اگرچہ اسلام کے دشمن ایسا گمان کرتے ہیں۔

اسلام کے ایسے بہت سے حقائق ہیں کہ جن کا اس کے دشمن ابطال تو کر نہیں سکتے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بارے میں مسلمان آپس میں بحث و مباحثہ میں اُلجھے رہیں اور دفاعی پوزیشن اختیار کر لیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعمیر کعبہ میں شرکت

خانہ کعبہ وہ پہلا گھر ہے جو اللہ وحدہٗ لاشریک کے نام پر اُسی کی ہی عبادت اور اس کی وحدانیت کے اعلان کے لیے بنایا گیا' ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی' بتوں کے خلاف جنگ اور ان کو ڈھانے کے بعد' انہوں نے اس گھر کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کے حکم سے کی تھی:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (البقرہ:۱۲۷)

اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل (علیہ السلام) بھی' اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل)' بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے○

زمانے کی آفات اور موسم کی چیرہ دستیوں سے خانہ کعبہ کی بنیادیں کمزور ہو گئیں اور دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں' بعثت سے چند سال قبل جب سخت بارشوں کے سبب مکہ میں سیل عرم نامی طوفان آیا' جس سے اس کی دیواروں میں مزید دراڑیں پڑ گئیں' اب قریش نے اس گھر کی دائمی حرمت و تقدیس کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ اس کو منہدم کر کے بلند و بالا عمارت تعمیر کی جائے کیونکہ شریعت ابراہیمی میں سے باقی رہنے والی چیزوں میں سے عربوں میں

ابھی تک احترام و تعظیم کعبہ باقی تھا۔

رسول اللہ ﷺ بعثت سے قبل خانہ کعبہ کی تعمیر نو میں عملاً شریک ہوئے' آپ ﷺ اپنے کندھوں پر پتھر اُٹھا کر لاتے' اس حالت میں کہ آپ کے جسم پر سوائے تہبند کے کوئی کپڑا نہ تھا' اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک پینتیس (۳۵) برس تھی۔

امام بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ جب خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی گئی تو آپ ﷺ اور حضرت عباس پتھر اُٹھا اٹھا کر لاتے۔ حضرت عباس نے کہا کہ آپ اپنا تہبند اتار کر اپنے کندھے پر رکھ لیں (اور تہبند پکڑ کر کھینچا جس سے وہ تھوڑا سا اتر گیا) تو آپ ﷺ (شرم وحیا کے باعث) زمین پر دراز ہو گئے اور ٹکٹکی باندھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے' تو آپ ﷺ نے فرمایا: میرا تہبند چھوڑ دیں' پس آپ نے تہبند باندھ لیا۔

پھر جب خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد حجرِ اسود نصب کرنے کا وقت آیا تو اس شرف کے حصول کے لیے قبائل کے درمیان اختلاف پھوٹ پڑا' آپ ﷺ نے اس مسئلہ کے حل کے لیے جو طریقہ اختیار فرمایا' سارے قبائل نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا' کیونکہ سارے قبائل کے نزدیک آپ ﷺ محبوب تھے اور صادق و امین مشہور تھے۔

اسباق ونصائح

آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے اس مقطع پر ہم اپنی بحث کو چار اُمور میں تقسیم کرتے ہیں:

اوّل: خانہ کعبہ کی اہمیت

زمین پر اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو جو عظمت و شرف عطا کیا اس کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اس گھر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُس کی عبادت کے لیے بنایا تا کہ یہ لوگوں کے لیے امن اور وحدت کا مظہر ہو۔

خانہ کعبہ کے گرد جو لوگ طواف کرتے ہیں یا پھر اس بیت معظم میں معتکف ہوتے ہیں' ان کے پیش نظر یہ پتھر اور گارے کا گھر نہیں ہوتا بلکہ یہ وجہ ہوتی ہے کہ یہ مقدس و عظمت والا گھر اللہ تعالیٰ کا ہے جس کی شان اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی بہت بلند و بالا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس مقصد کے لیے مبعوث کیا کہ وہ اس زمین سے بتوں کا خاتمہ کریں اور بت خانوں کو منہدم کریں تو اس کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کی حکمت کا یہ بھی تقاضا تھا کہ زمین کے اوپر کوئی ایسا گھر بھی تعمیر ہو جو توحید الٰہی کا شعار ہو اور اُس کی عبادت کے لیے خاص ہو' اور وہ گھر پوری دنیا کے لوگوں کے لیے سچے دین اور صحیح عبادت کی تعبیر کا مظہر ہو' جس سے شرک اور بتوں کی عبادت کا بطلان ثابت ہو' کیونکہ انسانیت نے زمانے کا ایک حصہ اس حال میں گزارا کہ جس میں وہ پتھروں' بتوں اور شیطانوں کی عبادت کرتے رہے اور ان کے لیے بڑے بڑے معبد تعمیر کیے' اب وہ وقت آن پہنچا تھا کہ ان باطل عقائد اور بے ہودہ رسوم و رواج اور عبادتوں کی جگہ ایک خدا وحدہٗ لاشریک کی عبادت کو عام کیا جائے۔ یہ خانہ کعبہ خالصتاً خدا وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لیے زمین پر قائم کیا گیا تھا تا کہ انسان کو یہ باور کرایا جائے کہ جب وہ اس میں داخل ہو تو خدا وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی غیر کے سامنے عبادت کرتے ہوئے نہ جھکے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس گھر کی تعمیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جو ایک خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور اس دین اسلام میں داخل ہو چکے ہوں ان کا آپس میں ایک دینی رابطہ اور تعارف ہو' اگرچہ وہ دنیا کے مختلف کونوں میں بستے ہوں یا ان میں نسلی' علاقائی اور لسانی کتنا ہی اختلاف ہو لیکن ایک دین کے پیروکار سب ایک وحدت کی شکل اختیار کریں' اور پوری دنیا ایک جسم کی مانند ہو تو اس مقصد کے لیے اس گھر سے زیادہ مناسب اور کوئی چیز نہیں جسے توحید کی علامت کے طور پر اور شرک و کفر و بت پرستی کے رد کرنے کے لیے قائم کیا گیا۔ یہ گھر باہمی رابطہ کا ذریعہ ہے جس کے احاطے میں وہ ایک دوسرے سے متعارف ہو سکتے ہیں' یہ ایک مرکز ہے جہاں وہ سب جمع ہوتے ہیں اور ان کا یہ اجتماع اس حق کے ساتھ ہوتا ہے جس کی ترجمانی کے لیے اس مقدس گھر کو تعمیر کیا گیا' یہ گھر ایک علامت ہے جس کے ذریعے روئے زمین پر مسلمان وحدت کا اظہار کرتے ہیں اور توحید و عبادتِ الٰہی کی عکاسی ہوتی ہے' جب کہ معبودانِ باطلہ تو ہر زمانے میں پائے جاتے رہے ہیں' اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی مفہوم ہے:

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ　　اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر

وَاَمْنًا وَّاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى. (البقرۃ:۱۲۵)

(خانہ کعبہ) کو مرکز لوگوں کے لیے اور امن کی جگہ اور (انہیں حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز۔

کعبۃ اللہ کا طواف کرنے والا ہر شخص یہی مفہوم اپنے پیش نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے' اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کا معنیٰ راسخ ہوتا ہے' اور وہ جانتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے جن کاموں کا اس نے حکم دیا ہے' ان کی انجام دہی کا وہ مکلف ہے' اسی بناء پر یہ گھر اس قدر مقدس ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا بلند مقام ہے اور اسی لیے اس کا حج اور طواف کیا جاتا ہے۔

دوم: خانہ کعبہ کے انہدام و تعمیر کی تاریخی اہمیت

اب تک پوری تاریخ میں چار مرتبہ خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی' اس پر سب کا اتفاق ہے' اس کے علاوہ جتنی مرتبہ تعمیر کا ذکر کیا جاتا ہے اس میں اختلاف ہے۔

پہلی مرتبہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی مرتبہ اس گھر کی تعمیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی' اس کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کا ساتھ دیا۔ قرآن وسنت سے ثابت ہے کہ انہوں نے حکم خداوندی کی تعمیل کرتے ہوئے یہ گھر بنایا۔ قرآن پاک میں ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝ (البقرۃ:۱۲۷)

اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (بنیادیں) خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (علیہ السلام) بھی' اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل)' بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۝

رہی سنت مطہرہ تو اس ضمن میں بہت سی احادیث طیبات نقل کی گئی ہیں' مثلاً اس میں امام بخاری' حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کرتے ہیں:

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے اسماعیل! بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ حضرت اسماعیل نے عرض کیا: جیسے آپ کے رب نے آپ کو حکم دیا ہے ویسا کر گزریئے' آپ نے فرمایا: کیا تم میرا ساتھ دو گے؟ عرض کی: جی ہاں! میں آپ کا

ساتھ دوں گا' آپ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں یہاں اُس کا گھر تعمیر کروں اور ایک بلند ٹیلے کی طرف اشارہ فرمایا' پھر اُن دونوں نے وہاں پر بیت اللہ کی بنیادوں کو بلند کیا' حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر لاتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو جوڑتے جاتے۔ (صحیح بخاری' کتاب احادیث الانبیاء)

زرکشی نے ازرقی کی ''تاریخ مکہ'' سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی دیواریں آسمان کی طرف سات ذراع بلند' زمین پر طول کے اعتبار سے تیس ذراع اور عرض کے اعتبار سے بائیس ذراع دراز تعمیر کیں' یہ عمارت بغیر چھت کے تھی۔

(اعلام الساجد للزرکشی ص ۴۶)

سہیلی نے روایت کیا ہے کہ ان دیواروں کی آسمان کی طرف بلندی نو ذراع تھی۔

(عیون الاثر ج ۱ ص ۵۲)

میرے خیال میں یہ روایت ازرقی کی روایت کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول ہے۔

دوسری مرتبہ: اسلام سے قبل قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی جس میں رسول اللہ ﷺ بھی شریک ہوئے' قریش نے خانہ کعبہ کی دیواروں کی آسمان کی طرف بلندی اٹھارہ ذراع رکھی اور زمین پر لمبائی میں چھ ذراع کم کر دیئے' اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے حضرت عائشہ نے روایت کیا ہے:

اے عائشہ! اگر دورِ جاہلیت ابھی جلد ہی نہ گزرا ہوتا اور تمہاری قوم کے دلوں میں اس کی یاد تازہ نہ ہوتی تو میں حکم دیتا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کیا جائے اور اس کا جو حصہ نکال دیا گیا ہے' اسے بھی میں اس میں شامل کر لیتا' اس میں ایک دروازہ مشرق کی طرف اور ایک دروازہ مغرب کی طرف لگاتا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر تعمیر کرتا۔

(متفق علیہ' الفاظ بخاری کے ہیں)

تیسری مرتبہ: جب یزید بن معاویہ کے دورِ حکومت میں شامی فوجوں کے حملے سے خانہ کعبہ جل گیا تو اس کی تعمیر نو کی گئی' اس حادثہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ۶۳ھ کے آخر میں جب یزید بن معاویہ کے حکم سے حصین بن نمیر السکونی کی قیادت میں عبداللہ بن زبیر کا مکہ میں محاصرہ کیا گیا

تو یزیدی فوجوں نے منجنیق سے کعبۃ اللہ پر سنگ باری کی' جس کے نتیجے میں خانہ کعبہ جل گیا اور کچھ منہدم ہو گیا (جب یزید کی بھیانک موت کی خبر سن کر فوجوں نے محاصرہ ختم کیا) تو حضرت عبداللہ بن زبیر حج کے موسم کے منتظر رہے' جب لوگ کعبۃ اللہ میں آئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہتے ہوئے اُن سے مشورہ طلب کیا: اے لوگو! کعبۃ اللہ کے بارے میں مجھے مشورہ دو! کیا میں اس کو منہدم کر کے نیا تعمیر کروں یا اسی کو صحیح کرا دوں؟ تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مشورہ دیا کہ یہ جیسے ہے ویسے ہی اس کی تعمیر مکمل کر دیں' اس گھر کو اور اس کے پتھروں کو جوں کا توں رہنے دیں۔

تو حضرت عبداللہ بن زبیر نے فرمایا: اگر تم میں سے کسی کا گھر جل جائے تو وہ اس کو نئے سرے سے ہی تعمیر کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے تو رب تعالیٰ کے گھر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا: میں تین دن اپنے رب سے استخارہ کرتا ہوں' پھر میں کوئی فیصلہ کروں گا' تین دن گزرنے کے بعد آپ نے باقی ماندہ کو بھی زمین تک منہدم کر دیا' پھر آپ نے اس کے اردگرد ستون بنوائے' اُن پر پردے لٹکا دیئے اور دیواروں کی تعمیر شروع کی' قریش نے جو چھ ذراع دیوار کی لمبائی کم کی تھی' آپ نے وہ بھی شامل کی اور دیواروں کی بلندی آسمان کی طرف دس ذراع تک بڑھائی' آپ نے اس گھر کے دو دروازے بنوائے' ایک داخل ہونے کے لیے اور دوسرا خارج ہونے کے لیے' آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث طیبہ کے مطابق اس اضافہ کی جرأت کی[1]

(عیون الاثر لابن سید الناس' ج ۱ ص ۵۳' اعلام الساجد للزرکشی' ص ۴۶)

چوتھی مرتبہ: حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے بعد خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی گئی۔

امام مسلم نے عطاء سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن زبیر کو شہید کر دیا گیا تو حجاج نے عبدالملک بن مروان کی طرف لکھا کہ عبداللہ بن زبیر نے جو اہل مکہ کی پرانی بنیادوں کو چھوڑتے ہوئے جن نئی بنیادوں پر کعبۃ اللہ کو تعمیر کیا ہے' یہ مکہ کے معتبر لوگوں کی

---

[1] طبری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ خانہ کعبہ میں آگ' اس کے اردگرد روشن کی جانے والی آگ سے اُڑنے والی چنگاریوں کی وجہ سے لگی تھی۔

(دیکھیے: الحدیث رواہ مسلم' باب نقض الکعبہ و بنائہا' تاریخ الطبری ج ۵ ص ۴۹۸)

Click

رائے کے مطابق ہے' پھر عبدالملک نے حجاج کو لکھا کہ ہمیں ابن زبیر کی تعمیر کردہ باقیات سے کوئی غرض نہیں' ابن زبیر نے جو چھ ذراع طول زیادہ کیا تھا' وہ کم کر دو اور جو ایک زائد دروازہ کھولا تھا اُسے بھی بند کر دو' چنانچہ حجاج نے ابن زبیر کی بنائی ہوئی عمارت کو منہدم کر کے اس کی تعمیر سابقہ بنیاد پر کی۔ (مسلم ج ۴ ص ۹۹)

مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس کے بعد ہارون الرشید نے خانہ کعبہ کو حضرت عبداللہ ابن زبیر کے نقشے کے مطابق تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت مالک ابن انس رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے منع کر دیا اور فرمایا:

اے امیر المؤمنین! میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں آپ ایسا نہ کریں' اس گھر کو اپنے بعد میں آنے والے بادشاہوں کے لیے کھلونا نہ بنائیں کہ ہر کوئی اس میں تغیر و تبدل کرتا رہے اور اپنی خواہش کے مطابق تصرف کرتا رہے' اس طرح اس کی ہیبت اور عظمت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہے گی' اس طرح انہوں نے ہارون الرشید کو اس کے ارادے سے باز رکھا[1]

مذکورہ بالا بیان کردہ چار مرتبہ جو خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی' اس پر سب کا اتفاق ہے۔

پانچویں مرتبہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر سے قبل خانہ کعبہ کی تعمیر کے متعلق جو کہا جاتا ہے' اس میں اختلاف اور شک ہے کہ کیا آپ علیہ السلام کی تعمیر سے پہلے کسی نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی یا نہ کی؟

بعض آثار و روایات میں آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے اس گھر کی تعمیر فرمائی' ان میں سب سے واضح وہ روایت ہے' جسے امام بیہقی نے عبداللہ بن عمرو سے ایک حدیث روایت کرتے ہوئے ''دلائل النبوۃ'' میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی طرف بھیجا اور ان دونوں کو

---

[1] ہارون رشید کے خانہ کعبہ کی دیواریں منہدم کرنے کا ارادہ کرنے کا ذکر امام نووی نے شرح مسلم میں اور علامہ ابن حجر نے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں کیا۔ عیون الاثر اور اعلام الساجدین میں لکھا ہے کہ ایسا ارادہ کرنے والا ابو جعفر منصور تھا۔ امام مالک دونوں کے ہم عصر تھے' اس لیے یہ ارادہ کرنے والا دونوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

حکم دیا کہ میرے لیے ایک گھر تعمیر کرو' جبریل امین نے اس کے لیے ان کو خط کھینچ دیا' حضرت آدم علیہ السلام اس کی بنیادیں کھودنے لگے اور حضرت حواء مٹی منتقل کرنے لگیں حتیٰ کہ پانی نکل آیا' وہاں نیچے سے آواز آئی: اے آدم! بس کافی ہے' پھر حضرت آدم و حواء سلام اللہ علیہما نے اس کی بنیادیں تعمیر کرتے ہوئے بلند کیں' اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اس گھر کا طواف کریں اور ان کو کہا گیا کہ آپ لوگوں میں سب سے پہلے ہیں اور یہ گھر سب سے پہلا گھر ہے' پھر کافی زمانہ گزر گیا حتیٰ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اس گھر کا حج کیا' پھر اس پر کئی صدیاں گزر گئیں (اور اس کی بنیادیں منہدم ہو گئیں) حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بنیادوں کو بلند کیا۔

امام بیہقی یہ روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں: اس روایت کی سند میں ابن لہیعہ منفرد ہیں اور یہ بات مشہور ہے کہ ابن لہیعہ ضعیف راوی ہیں' جن کی روایات سے دلیل نہیں پکڑی جاتی' اس کے علاوہ اور بھی متعدد آثار و روایات ہیں' جو اس روایت کے قریب المعنیٰ ہیں لیکن وہ ضُعف سے خالی نہیں ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام نے سب سے پہلے اس گھر کی تعمیر کی۔

اس طرح اگر ہم ان ساری روایات پر اعتماد کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری تاریخ میں پانچ مرتبہ خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی' اس کے علاوہ تعمیر کعبہ کے متعلق جو کہا جاتا ہے وہ اس کی مرمت وغیرہ ہے' البتہ اس کی تعمیر چار مرتبہ تو یقینی طور پر ہوئی اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

(۳) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کتنی حکمت و دانش سے معاملات کو سلجھا دیتے اور اختلافات و خصومات کو ختم کر دیتے' کن لوگوں کے درمیان؟ اُن لوگوں کے درمیان کہ جن میں آپس میں اگر کوئی جھگڑا ہو جاتا تو وہ خون بہائے بغیر نہ رہتے' اس حجر اسود کے معاملہ میں بھی ان کا اختلاف اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ قریب تھا کہ اُن میں جنگ چھڑ جاتی۔ بنو عبدالدار خون سے بھرا ہوا ایک پیالہ لائے' انہوں نے اور بنو عدی نے اس میں ہاتھ ڈال کر موت کا عہد کر لیا۔

قریش چار پانچ دن اسی صورتِ حال میں رہے' کسی تدبیر اور رائے سے ان کے درمیان موافقت کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے

ہاتھ مبارک پر یہ آگ ٹھنڈی ہوئی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس خصوصیت کو عبقریت اور فطری ذہانت کا نام دینے کی بجائے یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آئندہ نبوت و رسالت کے کام کے لیے منتخب فرما لیا تھا' اس لیے اس حکمت کا اظہار ہوا۔

آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ آپ رسول اور نبی ہیں' اس کے علاوہ دیگر تمام خصوصیات مثلاً عبقریت' ذہانت' دانش مندی وغیرہ اس کے بعد آتی ہیں اور اس کے ساتھ ملحقہ ہیں۔

(۴) طبقات اور درجات کے اختلاف کے باوجود آپ ﷺ کو قریش میں بہت قدرو منزلت حاصل تھی۔ قریش آپ کو ''امین'' کے لقب سے پکارتے تھے' اور سب آپ ﷺ سے محبت کرتے تھے' وہ سب کے سب آپ ﷺ کی باتوں کی سچائی میں ذرہ برابر بھی شک نہ کرتے۔ وہ آپ ﷺ کے حسن اخلاق اور آپ کے اخلاص پر اعتماد کرتے تھے۔

لیکن جب آپ ﷺ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر گئے تو یہی لوگ تھے جن کے دل بغض وعناد سے بھر گئے اور انہوں نے ہی آپ کو جھٹلایا' عناد کا اظہار کیا اور ایذاء پہنچائی۔

آپ ﷺ کا غارِ حراء میں خلوت گزیں ہونا

جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس (۴۰) برس کے قریب ہوئی تو آپ ﷺ کو خلوت وعزلت گزینی کا شوق پیدا ہونے لگا' اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل میں غارِ حراء میں خلوت نشین ہونے کی چاہت ڈالی۔

حراء: مکۃ المکرمہ سے شمال مغرب کی طرف ایک پہاڑ واقع ہے جسے حراء کہتے ہیں۔

اس پہاڑ کے ایک غار میں آپ ﷺ نے خلوت اختیار فرمائی' آپ ﷺ وہاں کئی کئی راتیں عبادت میں گزارتے' کبھی دس راتیں اور کبھی یہ تعداد مہینے تک پہنچ جاتی' پھر واپس گھر لوٹتے اور تھوڑے سے قیام کے بعد دوبارہ کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں غار میں خلوت نشینی کے لیے تشریف لے جاتے' اس طرح ایسی ہی خلوتوں کے دوران ایک دن آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی۔

اسباق ونصائح

اللہ تعالیٰ نے بعثت سے تھوڑا پہلے جو خلوت گزینی کی محبت اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب اطہر میں ڈالی' اس میں عام مسلمانوں کے لیے عام طور پر اور دعوتِ اسلامی کا کام کرنے والے مؤمنوں کے لیے خاص طور پر ہدایت ورا ہنمائی موجود ہے' وہ یہ کہ کوئی بھی مسلمان جو ہر قسم کی عبادتوں کو قائم کر کے اپنے آپ کو ان کے فضائل کے زیور سے مزین کرتا ہے' اس وقت تک اس کا اسلام پر عمل مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس میں عزلت گزینی اور خلوت نشینی کی چاشنی کو شامل نہ کرے' کیونکہ خلوت اختیار کرنے سے انسان اپنا محاسبۂ نفس کرتا ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف پوری طرح متوجہ ہوتے ہوئے مراقبہ کرتا ہے اور مظاہر کائنات میں غور وفکر کرتا ہے تو اس طرح انسان کے دل میں عظمتِ الٰہی جاگزیں ہوتی ہے۔

یہ ہر مؤمن مسلمان کے لیے نہایت اہم کام ہے لیکن وہ لوگ جو دعوتِ اسلامی کا کام کرتے ہیں یا لوگوں کی حق تعالیٰ کی طرف راہنمائی کا کام کرتے ہیں' ان کے لیے خلوت نشینی اختیار کرنا اتنا زیادہ اہم اور ضروری ہے کہ جس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔

خلوت نشینی میں حکمت یہ ہے کہ ہر انسانی نفس کے ساتھ بے شمار آفات اور شریر طاقتیں ہوتی ہیں' جن سے محفوظ رہنے کی دوا لوگوں سے دور رہ کر خلوت اختیار کرنے میں ہے تاکہ انسان دنیوی شور وغوغا سے دور ہو کر اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔

بے شک غرور وتکبر' عُجب پسندی' حسد وکینہ' ریاکاری اور دنیا کی محبت یہ سب نفس کی ایسی آفتیں ہیں جو نفس اور دل کی گہرائیوں میں اتر کر انسان پر حملہ آور ہوتی ہیں اور ظاہری نیک و صالح اعمال کے باوجود یہ آفتیں انسان کے باطن کو سیاہ کرتی رہتی ہیں' اگرچہ انسان ظاہری نیک اعمال کرتا ہو' دعوت وارشاد اور وعظ ونصیحت کا کام بھی کرتا ہو' لیکن نفس کی ان آفتوں سے چھٹکارا صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے کہ بندۂ مؤمن وقتاً فوقتاً خلوت اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ میں غور وخوض کرے' اپنی حاجات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرے' ہر کام میں اُسی خالق ومالک کی توفیق کا طلب گار رہے' اپنے مالک ومولا کے سامنے اپنی کمزوری اور انکساری کا اظہار کرے' پھر اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مظاہر میں غور کرے' یوم آخرت اور حساب کتاب کا تصور کرے' اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وبخشش کے ساتھ

ساتھ اس کے قہر و غضب کا بھی احساس کرے تو اس طرح بار بار ان اُمور میں طویل غور وفکر سے انسانی نفس کو لاحق تمام آفتیں ساقط ہوتی چلی جاتی ہیں' جس سے انسان کا دل معرفت و صفاء کے نور سے منور ہوتا ہے اور اس صاف شیشہ دل کو پھر دنیوی آفتیں مکدر نہیں کر سکتیں۔

دوسری چیز جو جملہ مسلمانوں کی زندگی میں عمومی اور ارباب دعوت و ارشاد کے لیے خصوصی طور پر اہمیت رکھتی ہے' وہ یہ کہ اس خلوت کے عمل سے دل میں محبت الٰہی کے حصول کی تربیت ہوتی ہے' یہی محبت الٰہی ہر قسم کی قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ کی اساس اور بنیاد ہے۔ محبت الٰہی صرف عقلی ایمان سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ عقلی اُمور کا دل کے احساسات سے تعلق نہیں ہوتا اور ممکن ہے عقل میں آنے والی ہر بات دل کی وجدانی کیفیت پر اثر انداز نہ ہو کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو مستشرقین اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے میں آگے ہوتے اور ان کے دل ان کی محبت سے معمور ہوتے لیکن حقیقتاً ایسی بات نہیں ہے۔

کیا کبھی یہ بات سنی گئی ہے کہ کسی سائنس دان نے کسی ریاضیاتی یا الجبراء کے کسی مسئلہ یا مشکل پر ایمان لا کر اپنی روح کو قربان کر دیا ہو؟

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد محبت الٰہی کے حصول کا ذریعہ یہی ہے کہ کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کیا جائے' اُس کی عظمت و جلالت کے مظاہر میں تامل کیا جائے' پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر زبان اور دل سے کثرت کے ساتھ کیا جائے' یہ سب کچھ اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب دنیوی مشغولیت اور شور و غوغا سے دور ہو کر بار بار خلوت و عزلت اختیار کی جائے' جب ایک مسلمان اس طریقے کے مطابق خلوت نشینی کے وظیفے کو اختیار کرتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے' جس کی وجہ سے ہر بڑی چیز اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی' ہر مغرور اور متکبر اس کے سامنے حقیر ہوتا ہے' ہر بڑی سے بڑی تکلیف اور ایذاء اس کے لیے آسان ہوتی ہے اور ہر استہزاء اور لومۃ لائم سے ماوراء ہو جاتا ہے' یہی وہ ہتھیار ہے جو ایک دعوت دینے والے کے پاس ہونا چاہیے' اللہ تعالیٰ نے یہی چیز اپنے حبیب کریم ﷺ میں پیدا فرمائی اور دعوت اسلامیہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار فرمایا۔

کیونکہ انسان کے دل میں جو خوف' محبت اور اُمید و رجاء کی وجدانی کیفیات ہیں' یہ

ایسے محیر العقول کام کر دکھاتی ہیں جو مجرد فہم وعقل نہیں کر سکتی۔

امام شاطبی علیہ الرحمۃ نے اس پر اچھی خاصی بحث کی ہے اور اس سلسلے میں عام مسلمانوں اور خواص میں پائے جانے والے محرکات میں فرق بھی کیا ہے' عام مسلمان وہ جو اپنے عمومی اسلام کے محرک سے تکالیفِ شرعیہ کے دائرے میں داخل ہوئے اور خواص وہ ہیں جنہوں نے محض تعقل اور فہم سے بڑھ کر کسی دوسری چیز کی وجہ سے ان تکالیف کو اختیار کیا ہو۔

امام شاطبی فرماتے ہیں: پہلی قسم کا حال اُس شخص کے حال کی طرح ہے جو محض اسلام کے عہد و پیمان اور ایمان کے دائرے میں رہنے کے حکم پر عمل کرتا ہے اور دوسری قسم کا حال اُس شخص کی طرح ہے جو خوف' اُمید یا محبت کے غلبہ کی وجہ سے عمل کرتا ہے' خوف ایک کوڑا ہے جو آدمی کو ہانکتا ہے' اُمید ابھارنے والی اور شوق پیدا کرنے والی ہے اور محبت بے اختیار کام پر آمادہ کرتی ہے۔ خوف رکھنے والا شخص مشقت کے باوجود عمل کرتا ہے لیکن خوف اُسے زیادہ تکلیف دِہ چیز سے کم تکلیف دِہ چیز پر صبر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اُمید رکھنے والا بھی مشقت کے باوجود عمل کرتا ہے' راحت و آرام کی اُمید اسے تھکن برداشت کرنے پر اُبھارتی ہے۔ محبت کرنے والا محبوب سے ملاقات کے شوق میں پوری طاقت صرف کر کے عمل کرتا ہے' مشکل چیز اُس کے لیے آسان ہو جاتی ہے' دُوری اس کے لیے نزدیکی بن جاتی ہے' وہ اپنی پوری قوت لگا دیتا ہے اور اس کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے محبت کا حق ادا نہیں کیا اور نعمتوں پر شکر بجا نہیں لایا۔ (الموافقات' شاطبی' ج ۲ ص ۱۴۰' اور دیکھئے: اس کتاب کے مؤلف کی کتاب ''ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ'' ص ۱۱۲-۱۱۱)

دل میں ان وجدانی محرکات کو پختہ کرنے کے لیے مختلف وسائل اختیار کرنے اور اس کی اہمیت وضرورت پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اسی چیز کو جمہور علماء محققین کے نزدیک تصوف' یا بعض لوگوں کے نزدیک احسان یا بعض دیگر ائمہ مثلاً امام ابن تیمیہ وغیرہ کے نزدیک ''علم سلوک'' کہا جاتا ہے[1]

---

[1] دیکھئے: فتاویٰ شیخ ابن تیمیہ کی دسویں جلد' آپ پائیں گے کہ امام جلیل کے نزدیک حقیقی تصوف کو کیا قدر و قیمت حاصل ہے اور آپ جانیں گے کہ وہ لوگ اُن پر کتنی بہتان تراشی کرتے ہیں' جو اپنے باطل خیالات کو ان کے نام سے جوڑنا چاہتے ہیں۔

بعثت سے کچھ عرصہ قبل آپ ﷺ کا خلوت گزینی اختیار کرنا انہی محرکات کو پختہ کرنے کی مشق تھی' لیکن خلوت کا یہ معنی نہیں لینا چاہیے جیسے بعض کم فہم لوگ خیال کرتے ہیں کہ انسانوں سے کلیۃً قطع تعلق کر کے پہاڑوں اور غاروں میں جا بسنا خلوت گزینی ہے' یہ چیز آپ ﷺ اور عام صحابہ کرام کے طریقے کے خلاف ہے' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اصلاحِ حال کے لیے دواء کے طور پر خلوت نشینی اختیار کی جائے۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا' دواء بقدرِ ضرورت اور وقتِ ضرورت ہی لینی چاہیے ورنہ یہ دیگر امراضِ موذیہ پیدا کر دیتی ہے۔ بعض صالحین کے سوانح حیات میں جو یہ آتا ہے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ خلوت نشین رہتے تھے' اس کی وجہ کوئی مخصوص حالت ہوگی' ان کا یہ عمل دیگر لوگوں کے لیے حجت نہیں۔

وحی کی ابتداء

امام بخاری حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے وحی کی ابتدائی کیفیت کے بارے روایت کرتے ہیں کہ آپ فرماتی ہیں:

ابتداء میں رسول اللہ ﷺ کو سچے خواب آنا شروع ہوئے' آپ ﷺ جو خواب دیکھتے وہ روزِ روشن کی طرح صحیح ثابت ہوتا' پھر آپ ﷺ کو خلوت کا شوق ہوا' آپ ﷺ غارِ حراء میں خلوت اختیار فرماتے اور اس میں کئی کئی راتیں تحنث (عبادت کی ایک قسم) میں گزارتے' پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس لوٹ آتے اور کھانے پینے کا سامان لے کر دوبارہ خلوت کے لیے غارِ حراء میں چلے جاتے' حتیٰ کہ غارِ حراء میں ایک دن آپ ﷺ پر وحیِ حق نازل ہوئی' ایک فرشتہ آیا' اس نے کہا: پڑھیے! آپ ﷺ فرماتے ہیں: میں نے کہا: میں نہیں پڑھتا' پس اُس نے مجھے پکڑا اور اپنے ساتھ گرم جوشی سے معانقہ کرتے ہوئے بھینچا اور میری قوتِ برداشت کم ہونے لگی' پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھیے! میں نے کہا: میں نہیں پڑھتا' پھر تیسری مرتبہ مجھے پکڑا اور اپنے ساتھ بھینچا اور مجھے چھوڑ دیا' پھر اُس نے کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَO خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍO اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُO الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِO عَلَّمَ	آپ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا فرمایاO پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سےO پڑھیے

الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْO (العلق:۵۔۱) آپ کا رب بڑا کریم ہےO جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سےO اُسی نے انسان کو سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھاO

آپ ﷺ جب یہ وحی لے کر واپس لوٹے تو آپ کے قلب اطہر پر لرزہ طاری تھا' آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا: مجھے کمبل اوڑھا دو! مجھے کمبل اوڑھا دو! انہوں نے کمبل اوڑھا دیا' جب آپ کا خوف دُور ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ کو سارے واقعہ کی خبر دی اور فرمایا: مجھے اپنی جان کا ڈر ہے' یہ سن کر حضرت بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نہیں! ہرگز نہیں! خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کبھی بھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا' آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں' دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں' محتاج کو عطا فرماتے ہیں' مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی خاطر سب کی مشکلات میں کام آتے ہیں' اس کے بعد حضرت خدیجہ آپ ﷺ کو لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ کے پاس گئیں' ورقہ بن نوفل دورِ جاہلیت میں نصرانی ہو چکے تھے اور انجیل کو عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ وہ بہت بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے' حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انہیں کہا: اے میرے چچازاد بھائی! اپنے بھتیجے کی بات سنیں! ورقہ نے آپ ﷺ سے پوچھا: اے میرے بھتیجے! بتایئے آپ نے کیا دیکھا ہے؟ حضور ﷺ نے پیش آمدہ سارا واقعہ سنا دیا' یہ سن کر ورقہ نے کہا: یہ تو وہی ناموس (جبریل امین یا وحی) ہے' جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا' اور کہا: کاش! میں اس زمانے میں تندرست جوان ہوتا! کاش! میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی' آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یہ مجھے مکہ سے نکال دیں گے؟ اُس نے کہا: ہاں! جو شخص بھی آپ کی طرح نبوت لے کر آیا' لوگ اس کے ساتھ دشمنی کرنے لگے' اگر اُس دن کو میں پالیتا تو میں آپ کی کھلی مدد کرتا' پھر ورقہ جلد ہی فوت ہو گئے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

زمانہ فترۃ الوحی (وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کا زمانہ) کی تعین میں علماء کا اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ تین سال کا عرصہ ہے' ایک قول یہ بھی ہے کہ تین سال سے کچھ کم ہے لیکن راجح قول امام بیہقی نے بیان کیا ہے کہ اس کی مدت چھ ماہ تھی۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۲۱)

پھر امام بخاری نے بھی حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کی' جس میں وہ فترۃ الوحی کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

میں راستے سے گزر رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی' میں نے اپنی نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں آیا تھا وہ زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے' میں اُس سے خوف زدہ ہو کر واپس گھر لوٹ آیا' میں نے گھر والوں سے کہا: مجھے کمبل اوڑھا دو! مجھے کمبل اوڑھا دو! تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

يَآ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُO قُمْ فَاَنْذِرْO وَرَبَّكَ فَكَبِّرْO وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْO وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْO (المدثر: ۵-۱)

اے چادر لپیٹنے والے!O اٹھیے اور (لوگوں کو) ڈرایئےO اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئےO اور اپنے لباس کو پاک رکھئےO اور بتوں سے (حسب سابق) دور رہئےO

اس کے بعد پھر وحی کا سلسلہ متواتر جاری رہا۔

اسباق ونصائح

یہ حدیث بدء الوحی' دین اسلام کے جملہ عقائد وتشریعات کے ترتیب دینے اور ان کو سمجھنے کے لیے بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتی ہے' اور اس بات پر یقین ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو غیب کی خبریں اور تشریعی اُمور بیان فرمائے ان کا ماخذ و مدخل یہی ہے۔ یہی حقیقت وحی ہی وہ واحد حدِ فاصل ہے جو ایک عام انسان اور ایک نبی مُرسل میں فرق واضح کرتی ہے۔

ایک عام انسان اپنی طرف سے غور وفکر کر کے اپنی رائے اور عقل کے مطابق اپنے لیے قوانین مرتب کرتا ہے' جب کہ وہ انسانِ کامل جس کی طرف رب کی طرف سے وحی آتی ہے' اس کی بات اٹل اور حقیقت پر مبنی ہوتی ہے جس میں تغیر وتبدل کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دین اسلام میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والے محققین کے لیے وحی الٰہی کے نزول کے اس واقعہ میں سبق ہے' جو لوگ اپنی تمام تر صلاحیتیں اس میں صرف کرتے ہیں کہ کسی طرح وحی کی حقیقت کو خلط ملط کریں' وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ معاذ اللہ اس وحی میں آپ ﷺ نے

اپنی ذاتی باتیں اور دل میں پیدا ہونے والی خواہشات اور الہام کو ملا دیا ہے حتیٰ کہ وہ وحی کو مرگی کے ساتھ خلط ملط کرنے کی کوشش کرتے ہیں' حالانکہ دشمنانِ اسلام یہ جانتے ہیں کہ وحی کی حقیقت پر مسلمانوں کا پختہ ایمان ہے اور جو وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی' وہ مسلمانوں کی شریعت کا منبع ہے۔

اگر ان شکوک وشبہات پیدا کرنے والے لوگوں کی بات کو ذرا بھی مانا جائے تو تمام عقائد واحکام کی تکفیر لازم آئے گی اور اس بات کا امکان لازم آئے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکامِ شریعت کی جو مبادیات ہمیں بتلائی ہیں' وہ (معاذ اللہ) اُن کی ذاتی فکر کا نتیجہ تھیں۔

اسی وجہ سے دین میں فکری اختلاف پیدا کرنے والے لوگ وحی کے ... کی تاویل کرنے اور اسے مؤرخین کے بیانات اور صحیح احادیث شریفہ کی تصریحات سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حقائق کو مسخ کرنے کی سعی لاحاصل کرتے رہتے ہیں' اس طرح دین دشمنی میں کئی لوگ حد سے بھی تجاوز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (معاذ اللہ) غور وفکر کرتے رہتے اور وقتاً فوقتاً جو خیالات آپ پر منکشف ہوتے رہتے ان کو عقیدہ بنا لیتے۔ کوئی اس بات کی اشاعت کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحیرا راہب سے قرآن اور مبادیاتِ اسلام کی تعلیم حاصل کی اور کوئی یوں ہرزہ سرائی کرتا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذہنی' اعصابی مرض یا مرگی کے مرض میں مبتلا تھے۔

(دیکھئے: حاضر العالم الاسلامی ج ا ص ۳۹۔ ۳۸)

جب ہم اس طرح کی عجیب وغریب اور من گھڑت باتیں دیکھتے ہیں جن کو کوئی صاحب عقل اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتا کہ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار ہے تو ہم ان سب باتوں کا جواب اُس وحی کی ابتداء والی حدیث طیبہ میں پاتے ہیں' جو امام بخاری نے روایت کی ہے' وحی الٰہی کی ابتداء کے جو واقعات ہیں اُن میں حکمتِ الٰہی کے جو جلوے نظر آتے ہیں وہ ان سب قسم کے شکوک وشبہات کو زائل کر دیتے ہیں' ان میں غور وفکر کریں تو ساری حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

پہلی مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبریل امین کو اپنی سر کی آنکھوں سے کیوں دیکھا؟ حالانکہ وحی پسِ پردہ بھی ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب اطہر میں فرشتے کا ڈر' خوف

اور حیرت کیوں ڈالی؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو جو اپنے رسول سے محبت تھی' اُس کا تقاضا تو یہی تھا کہ بغیر کسی خوف و ہراس کے اپنے رسول ﷺ کے دل میں نرمی اور سکون سے اپنی بات القاء فرما دیتا۔

آپ ﷺ غارِ حراء میں پیش آمدہ واقعہ سے اپنی جان کا خوف کیوں محسوس کرنے لگے؟ حالانکہ جبریل امین کوئی جن بھوت نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے فرشتے تھے؟ اور پھر پہلی وحی کے بعد ایک طویل مدت کے لیے وحی کا سلسلہ کیوں منقطع ہو گیا؟ اور آپ ﷺ اس فترۃ الوحی کے زمانے میں پہاڑوں میں جا کر رویا کرتے تھے' جیسا کہ امام بخاری نے روایت کیا۔ آپ کوشش کرتے کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا لیں۔

یہ وہ بنیادی اور طبعی سوالات ہیں جو وحی کی ابتداء کے حوالے سے کیے جا سکتے ہیں اور جب ہم ان سوالوں کا جواب تلاش کرتے ہیں تو حکمت باہرہ کھل کر سامنے آ جاتی ہے' اسی طرح اگر کوئی مفکر کھلے ذہن سے بغیر کسی تعصب کے ان سوالات کے جوابات میں غور و خوض کرتا ہے تو یہ حقیقت کھل کر اُس کے سامنے آ جاتی ہے کہ جو لوگ بھی اس حقیقت وحی کا انکار کرتے ہیں وہ سراسر جھوٹے اور مکار ہیں' اور وہ ان فکری یلغار کرنے والوں کے خود ساختہ خیالات' کے بچھائے جال میں نہیں پھنسے گا۔

غارِ حراء میں حضرت جبریل امین کا اچانک آپ ﷺ کے سامنے آنا اور آپ کا اس کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھنا اور حضرت جبریل کا یہ کہنا: ''اقرأ'' ان ساری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کا یہ سلسلہ کوئی ذاتی اور باطنی نہ تھا کہ جس کو دل کی بات کہا جا سکے بلکہ یہ ایک خارجی حقیقت تھی جس کا القاء آپ ﷺ پر ہوا' جس کا دل اور خیال سے تعلق نہیں۔

پھر فرشتے نے آپ ﷺ کو اپنے ساتھ چمٹایا اور تین مرتبہ ''اقرأ'' کہا' اس سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ وحی پہلی مرتبہ خارج سے آئی تھی جس سے آپ ﷺ پہلے مانوس نہ تھے' یہ کوئی اندرونی خیال نہ تھا۔

حالانکہ آپ ﷺ داخلی طور پر خوف اور رُعب محسوس کر رہے تھے' جیسا کہ ہم نے حدیث طیبہ میں پڑھا حتیٰ کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے غارِ حراء کی خلوت کو چھوڑ دیا اور خوف محسوس کرتے ہوئے کانپتے ہوئے گھر لوٹ آئے' یہ بات ہر دانشور اور مفکر پر یہ واضح

کرتی ہے کہ آپ ﷺ رسالت ونبوت کے امیدوار نہ تھے' کیونکہ جو وحی نازل ہوئی یہ آپ ﷺ کے ذاتی خیالات اور تفکرات کا تسلسل نہ تھی بلکہ یہ تو خلافِ توقع اچانک ایسا واقع ہوا جس سے آپ ﷺ خوف محسوس کرنے لگے' اس سے پتا چلا کہ وحی کا تعلق آپ ﷺ کی ذاتی سوچ اور فکر سے نہیں تھا کہ جس کو آپ نے عقیدہ بنالیا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ احکامات ہیں۔

پھر یہ جو کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) یہ وحی میں سب کچھ آپ ﷺ کا ذاتی الہام' دل کی بات' روحانی کشف یا علوی فکر ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان صورتوں کے ذہن میں پیدا ہونے کے وقت خوف' ڈر اور لرزہ کا احساس یا رنگ متغیر نہیں ہونا چاہیے تھا' کیونکہ غور وفکر کا خوف وڈر سے کوئی تعلق نہیں۔ خوف وڈر تو اُس چیز سے واقع ہوتا ہے جو خلافِ توقع اچانک واقع ہو۔ ورنہ پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کیا جملہ مفکرین اور دانشور غور وفکر کرتے وقت خوف' ڈر اور لرزہ محسوس کرتے ہیں؟

سب اس بات سے واقف ہیں کہ خوف' ڈر' لرزہ اور رنگ کا متغیر ہونا ان سب کا تعلق غیر اختیاری اُمور سے ہوتا ہے۔ جب کہ جس کام کو سال ہا سال تک غور وفکر کرنے کے بعد اختیار کیا جائے تو اس میں خوف وڈر نہیں پایا جاتا۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی' آپ ﷺ نے اپنی ذاتی خواہشات کو اس میں نہیں ملایا' کیونکہ آپ ﷺ بعثت سے قبل صادق اور امین کے لقب سے جانے جاتے تھے تو کیا بعثت کے بعد (معاذ اللہ) یہ صداقت وامانت ختم ہوگئی اور کیا آپ نے دھوکا دینا چاہا؟ غارِ حراء میں پیش آنے والے واقعہ سے ایک اور بات کھل کر سامنے آتی ہے' وہ یہ کہ جب اچانک ایک فرشتہ آپ ﷺ کے سامنے آ گیا جس نے آپ کو اپنے ساتھ چمٹایا اور بات کی اور پھر غائب ہوگیا تو آپ ﷺ اس کو جن خیال کر رہے تھے' یہی وجہ تھی کہ جب آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو فرمایا: میں اپنی جان کا خوف محسوس کر رہا ہوں' یعنی جنات سے' لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو مطمئن کیا کہ آپ کے اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ حمیدہ کی وجہ سے کوئی شیطان یا جن آپ کو تکلیف اور ایذاء نہیں دے سکتا۔

اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ وہ آپ ﷺ کے دل میں یہ بات ڈال دیتا کہ یہ کوئی جن وغیرہ نہیں بلکہ یہ تو فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو آپ کو آپ کی رسالت کی خبر دینے کے لیے آیا تھا' لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے آپ ﷺ کی شخصیت کا واضح فرق کھول کر رکھا جائے کہ بعثت سے قبل اور بعثت کی بعد والی زندگی اور طور اطوار میں واضح فرق پیدا ہوا ہے' اور یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ عقائد اسلام اور شریعتِ اسلامیہ کے جن ارکان کی طرف رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی' یہ آپ ﷺ کے ذہن میں پہلے سے ہی سوچے ہوئے نہ تھے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ آپ ﷺ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں اور سارا واقعہ اُن پر پیش کیا' یہ بھی اس بات پر ایک اور تاکید ہے کہ اچانک جو واقع درپیش ہوا یہ وحی الٰہی تھی' جو آپ ﷺ سے قبل دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر بھی نازل کی گئی' اس طرح آپ کا خوف دور ہو گیا اور ذہن میں آنے والے خدشات کافور ہو گئے اور التباس کے بادل چھٹ گئے۔

پھر اس کے بعد چھ ماہ یا باختلاف روایت اس سے زائد وحی کا سلسلہ منقطع رہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ وحی معجزۂ الٰہیہ تھا اور اس میں واضح طور پر اُن لوگوں کا رد بھی موجود ہے جو وحی نبوی پر فکری یلغار کرتے ہوئے اس کو ذاتی اور خیالی بات تصور کرتے ہیں۔

اس بات میں بھی حکمت الٰہی واضح تھی کہ جس فرشتے کو آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا' اللہ تعالیٰ نے طویل مدت کے لیے اُس فرشتے کو آپ سے اوجھل کر دیا' اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ میں اس کی تشویش اور جستجو بڑھ گئی کہ یہ کیا تھا؟ کون تھا؟ پھر اسی قلق و جستجو کے باعث آپ ﷺ میں خوف اور ڈر پیدا ہوا۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ تو آپ ﷺ کو نبوت و رسالت کے شرف سے نواز رہا تھا' تو پھر بھی یہ خوف اور ڈر پیدا کیا اور آپ ﷺ اس فترۃ الوحی کے زمانے میں نہایت مضطرب رہے' حتیٰ کہ یہ دنیا آپ پر تنگ ہو گئی اور آپ باہر پہاڑوں پر تشریف لے جاتے اور دل میں سوچتے کہ خود کو نیچے گرا کر ہلاک کر لیں' حتیٰ کہ ایک دن آپ ﷺ نے غارِ حراء والا فرشتہ دوبارہ دیکھا' جس کی شکل و صورت زمین و آسمان کے درمیانی حصے کو بھرے ہوئے تھی' اس

نے کہا:

اے محمد (ﷺ)! آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے لیے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔

آپ ﷺ خوف وخطر محسوس کرتے ہوئے اپنے گھر کو لوٹے اور چادر لے کر لیٹ گئے' تو یہ آیاتِ مبارکہ نازل ہوئیں:

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ اے چادراوڑھنے والے! ۝ اٹھئے اور لوگوں کو ڈرایئے ۝ (المدثر: ۲۔۱)

یہ حالات وواقعات اس بات کی سرے سے نفی کرتے ہیں کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ کو جنون تھا یا اپنی طرف سے ہی باتیں سوچ کر ان کو وحی کہہ دیتے' اگر ایسی بات ہوتی تو مذکورہ بالا واقعات آپ ﷺ کے ساتھ پیش نہ آتے۔

حدیث بدء الوحی جو صحیح سند سے ثابت ہے' یہی اُن شکوک وشبہات پیدا کرنے والے لوگوں کے جواب کے لیے کافی ہے' جو لوگوں کے دلوں میں آپ ﷺ کی نبوت اور نازل ہونے والی وحی کے بارے میں غلط باتیں پیدا کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو نبوت ورسالت سے تکریم بخشی اور جس انداز میں خدا تعالیٰ نے وحی کی ابتداء فرمائی اس میں اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم حکمت پوشیدہ تھی جس سے سب شکوک وشبہات دور ہو گئے۔

شکوک پیدا کرنے والے لوگ اس کے بعد پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ جب آپ ﷺ پر وحی کے نزول کا سلسلہ جاری ہو گیا اور وحی کے نزول کے وقت آپ کے پاس دیگر صحابہ کرام بھی موجود رہتے تھے تو پھر وحی لانے والے فرشتے کو آپ کے علاوہ کوئی دوسرا کیوں نہیں دیکھتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جملہ موجود چیزیں آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتیں کیونکہ ہماری آنکھوں کے دیکھنے کی قوت محدود ہے' کائنات میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ تو نہیں سکتے' لیکن جانتے ہیں کہ وہ معدوم نہیں بلکہ موجود ہے۔ وہ خالق ومالک جس نے سب کی آنکھوں میں ایک محدود ومتعین قوتِ بصارت رکھی' وہی خالق ومالک بعض خاص لوگوں کی قوتِ بصارت دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ بھی کر سکتا ہے کہ جو چیز

ایک بندے کو تو نظر آ رہی ہو اور باقی سب کو وہ دکھائی نہ دے سکے۔

مالک بن نبی اس ضمن میں کہتے ہیں:

رنگوں کا اندھا پن ہمارے سامنے ایک مثالی حالت ہے، جن لوگوں کو یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے، انہیں بعض رنگ نظر نہیں آتے۔ اسی طرح بعض شعاعیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں مثلاً ULTRA VIOLET RAYS اور INFRAREDRAYS وغیرہ، اس کے علاوہ ایسی کوئی چیز نہیں کہ جو سائنٹیفک طور پر ثابت کر دے کہ یہ معاملہ تمام آنکھوں کے ساتھ یکساں ہے، اس لیے بعض آنکھوں کی حساسیت کم اور بعض آنکھوں کی حساسیت زیادہ ہوتی ہے۔ (الظاہرۃ القرآنیہ ص ۱۲۷)

پھر اس کے بعد وحی کا سلسلہ متواتر چلنا حقیقت وحی کو واضح کرتا ہے اور تشکیک پیدا کرنے والے لوگوں کے لیے مُسکت جواب ہے کہ وحی محض ایک نفسیاتی مظہر نہیں، ہم حقیقت وحی کی نفسِ دلالت پر مزید کچھ بحث اس طرح کرتے ہیں:

(۱) قرآن اور حدیث میں واضح فرق اور تمیز کا پایا جانا کہ قرآن پاک کی آیات جب بھی نازل ہوتیں، اُسی وقت ان کو لکھنے کا حکم دیا جاتا اور من وعن ان کی املاء کرائی جاتی۔ لیکن حدیث طیبہ سب کی سب صحابہ کرام کی زبانی یادداشت پر مشتمل ہوتیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ حدیث شریف حضور ﷺ کا ذاتی کلام ہے جس کا نبوت و رسالت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس میں فرق یہ ہے کہ قرآنِ پاک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل امین کے واسطہ سے بمع الفاظ و حروف نازل ہوا جب کہ حدیث طیبہ کا مفہوم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن الفاظ و ترکیب حضور ﷺ کی طرف سے ہیں، اس لیے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بواسطۂ جبریل نازل کردہ کلام کو اپنے کلام میں ملانے سے احتیاط فرماتے تھے۔

(۲) آپ ﷺ سے بعض اُمور کے متعلق سوال کیا جاتا تو آپ اس کا فوراً کوئی جواب نہ دیتے بلکہ خاموشی اختیار فرماتے، اسی طرح خاموشی کی حالت میں کئی کئی دن گزر جاتے، حتیٰ کہ جب اُس سوال کے جواب میں کوئی آیت قرآنی نازل ہوتی تو آپ ﷺ وہ سوال دوبارہ پوچھتے اور اس کے جواب میں جو آیت نازل ہوتی وہ تلاوت فرما دیتے۔

اگر آپ ﷺ بعض اُمور میں کوئی مؤقف اختیار فرماتے تو فوراً آیاتِ قرآنی نازل ہو جاتیں جو اس کی تائید کرتیں یا کوئی نیا حکم نازل ہوتا۔

(۳) رسول اللہ ﷺ اُمّی تھے (یعنی اس دنیا میں آپ ﷺ نے کسی سے بھی تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ آپ کی ساری تعلیم اللہ تعالیٰ نے فرمائی) تو ایسا آدمی جس نے کسی انسان سے رسماً تعلیم حاصل نہ کی ہو' وہ مکاشفۂ نفسیہ کے ذریعے تاریخی حقائق کو کیسے بیان کر سکتا ہے؟ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ' حضرت موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا قصہ اور اسی طرح دیگر تاریخی واقعات' آپ ﷺ نے اپنے کشف اور ذہنی اختراع سے تو بیان نہیں کیے بلکہ یہ سب کچھ بذریعۂ وحی معلوم ہوا' ان ساری حکمتوں سے آپ ﷺ کا اُمّی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ○ (العنکبوت:۴۸)

اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے اپنے دائیں ہاتھ سے (اگر آپ لکھ پڑھ سکتے) تو ضرور شک کرتے اہل باطل○

(۴) آپ ﷺ کا بعثت سے قبل چالیس سالہ زندگی میں سچائی کا مظاہرہ اور قوم میں اُس کا چرچا ہونا' اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ بعثت سے قبل اتنی سچائی اور صدق کا اظہار فرماتے تھے تو بعثت کے بعد وحی کے سلسلے میں تو بدرجۂ اتم خصوصی طور پر اس پر کاربند رہے ہوں گے' پہلے تو اپنی ذاتی سچائی کا معاملہ تھا اور اب وحیِ الٰہی کی سچائی کی بات تھی۔ اس لیے آپ وحی کے سلسلے میں کسی بھی شک وشبہ کو قریب نہ پھٹکنے دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے ساتھ آپ کے اوّلین تعلق کے سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اس ضمن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ

اور (اے سننے والے!) اگر تجھے کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے (اپنے نبی کے

مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۝ (یونس:۹۴)

ذریعے) تیری طرف اتارا تو دریافت کر ان لوگوں سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے' بے شک آیا ہے تیرے پاس حق تیرے رب کی طرف سے' پس ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں میں سے۝

اسی لیے روایت کیا جاتا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

نہ میں شک کرتا ہوں اور نہ ہی کسی سے پوچھوں گا۔

(یہ روایت ابن کثیر نے قتادہ سے نقل کی ہے)

باب سوم: بعثت سے ہجرت تک

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں دعوتِ اسلامیہ کے مراحل

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بعثت سے لے کر وفات تک دعوتِ اسلامیہ چار مراحل سے گزری۔

پہلا مرحلہ: خفیہ دعوت' جو تین سال تک جاری رہا۔

دوسرا مرحلہ: اعلانیہ دعوت' صرف زبانی زبانی جو ہجرت تک جاری رہا۔

تیسرا مرحلہ: اعلانیہ دعوت' جس کے ساتھ ساتھ سرکشوں' جنگ کا آغاز کرنے والوں اور حملہ آوروں سے قتال اور ان کی سرکوبی بھی جاری رہی' یہ مرحلہ صلح حدیبیہ تک جاری رہا۔

چوتھا مرحلہ: اعلانیہ دعوت' جس میں اُن مشرکین' ملاحدۃ اور بت پرستوں کے ساتھ کھلا جہاد کیا گیا جو دعوتِ اسلامیہ کے راستے میں کسی طرح بھی رکاوٹ بنے یا تبلیغ کے باوجود اسلام قبول نہ کیا' اسی مرحلہ میں شریعت اسلامیہ کا نظام قائم ہوا' جس کی بناء پر اسلام میں جہاد کا حکم قائم ہے۔

خفیہ دعوت

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے لوگوں کو بتوں کی پوجا کی بجائے ایک خدا کی عبادت کی دعوت دینے لگے' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس دعوت کو خفیہ رکھا تا کہ قریش جو کہ بتوں کی پوجا اور شرکیہ عقائد میں متعصب تھے' اُن کے شر سے بھی محفوظ رہا جا سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قریش کی عام مجالس میں اعلانیہ دعوت نہیں دیتے تھے بلکہ ابھی اُن لوگوں کو دعوت دینے کا اہتمام کیا جن سے آپ کا پرانا تعلق یا گہری قرابت تھی۔

اس اوائل دور میں جو لوگ دین اسلام میں داخل ہوئے' ان میں حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا' حضرت علی بن ابی طالب' حضرت زید بن حارثہ (آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے)' حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ' حضرت عثمان بن عفان' حضرت

زبیر بن عوام، عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔

یہ صحابہ آپ ﷺ سے خفیہ طور پر ملاقات کرتے اور ان میں سے جب کوئی عبادت کی تربیت حاصل کرنا چاہتا تو وہ قریش کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے مکہ کی گھاٹیوں میں چلا جاتا۔

پھر جب اسلام میں داخل ہونے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہوگئی تو آپ ﷺ نے ان کے لیے حضرت ارقم بن ابی الارقم کا گھر مختص فرمایا جہاں دین کی تعلیم کا کام ہوتا۔

اس دور میں تقریباً چالیس مرد اور عورتیں مشرف بہ اسلام ہوئے، جن میں سے زیادہ تر غریب یا غلام تھے یا وہ لوگ تھے جن کی قریش کے نزدیک کوئی حیثیت نہ تھی۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے: سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۴۹۔ ۲۶۱)

اسباق ونصائح

دعوت کی ابتداء خفیہ طور پر کرنے کی وجہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ابتدائی سالوں میں آپ ﷺ خفیہ طور پر دعوت دیتے رہے، لیکن اس کا سبب یہ ہرگز نہیں تھا کہ گویا آپ ﷺ اپنی جان کے خوف کی وجہ سے یوں کرتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دعوت دینے کا حکم دیا تو ارشاد فرمایا:

يَآ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ O قُمْ فَاَنْذِرْ O (المدثر: ۲۔۱) اے چادر لپیٹنے والے! O اٹھیے اور (لوگوں کو) ڈرایئے O

کیونکہ آپ ﷺ لوگوں کی طرف اللہ کے رسول بن کر تشریف لائے تھے، اس لیے آپ کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ خالق و مالک جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے اور دعوت کا حکم دیا ہے وہ ضرور آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ و معصوم رکھنے پر بھی قادر ہے۔ اس لیے اگر اللہ تعالیٰ پہلے دن سے ہی آپ کو اعلانیہ دعوت کا حکم دیتا تو آپ ﷺ ایک لمحہ بھی تاخیر کیے بغیر میدانِ عمل میں نکل آتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے حکمت کے تحت الہام کے ذریعے آپ ﷺ کے قلب اطہر میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ابھی ابتدائی دور میں دعوت کو خفیہ اور پوشیدہ رکھا جائے اور صرف اُن لوگوں پر دعوت کو پیش کیا جائے، جو جلد اس کو قبول کرلیں گے اور ایمان

لے آئیں گے' اس میں حکمت یہ تھی کہ بعد میں دعوت وارشاد کا کام کرنے والے لوگوں کے لیے یہ طریقہ مشعلِ راہ رہے اور اس سے یہ سبق حاصل کیا جائے کہ دعوت وتبلیغ کے کام میں ظاہری اسباب کو بھی ملحوظِ خاطر رکھ کر غور وفکر کر کے اپنے اہداف متعین کیے جائیں' لیکن یہ خیال بھی شاملِ حال رہے کہ یہ چیز خدائے واحد پر اعتماد اور توکل پر غالب نہ آ جائے اور انسان ظاہری اسباب اختیار کرنے میں اس حد تک آگے نہ بڑھ جائے کہ جو اس کے تفکر و تصور پر اثر انداز ہونے لگے' اس لیے کہ یہ صورتِ حال نہ صرف دعوتِ اسلامی کے مزاج کے خلاف ہے بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ پر ایمان کی اصل بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔

اس تفصیل سے ہم پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس عرصہ میں آپ ﷺ کی دعوت کا اسلوب بحیثیت ایک امام حکمت شرعیہ کے قبیل سے تھا' اس کا تعلق بحیثیت نبی آپ کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغی سرگرمیوں سے نہیں تھا۔

اسی بناء پر دعوتِ اسلامی کا کام کرنے والے لوگوں کو ہر زمانے میں حالات کے پیش نظر دعوت کے انداز میں لچک رکھنی چاہیے' حالات کے پیش نظر جیسی ضرورت ہو رازداری یا اعلانیہ' نرمی یا سختی کے مؤثر انداز میں دعوت پیش کرنے کا بہترین طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ شریعت اسلامیہ بھی سیرتِ طیبہ کے مذکورہ چار مراحل سے راہنمائی لیتے ہوئے دعوت کے کام میں کسی حد تک لچک اور نرمی کا تقاضا کرتی ہے' لیکن ماحول کے مطابق اندازِ دعوت کا تعین کرتے ہوئے ہر حالت میں مسلمانوں کی مصلحت اور دعوتِ اسلامی کی مصلحت کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

اسی وجہ سے جمہور فقہاء اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب مسلمانوں کی تعداد قلیل ہو یا مسلمان کمزور ہوں اور غالب گمان یہی ہو کہ غیر مسلم ان کو قتل کر دیں گے تو اس صورت میں مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت کو مد نظر رکھ کر کوئی قدم اٹھایا جائے گا کیونکہ اس کے مقابلے میں حفاظت دین کی مصلحت موہوم نظر آتی ہے۔

العز بن عبد السلام اس قسم کی لڑائی میں مسلمانوں کے اندھا دھند گھس جانے کو حرام قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

جب کسی لڑائی میں فتح ونصرت کا امکان نہ ہو اور شکست کے آثار سب سے زیادہ ہوں

تو اس میں مصلحت کے تحت پسپائی اختیار کرنا واجب ہے' کیونکہ اس سے مسلمانوں کی زیادہ اموات اور تباہی کا اندیشہ ہے جس سے کفار کو خوشی ہوگی اور اہل اسلام کی ذلت ہوگی' اس لیے ایسے حالات میں ثابت قدم رہنا سراسر تباہی ہے' اس میں کوئی مصلحت اور مفاد نہیں۔[1]

میرا مؤقف یہ ہے کہ یہاں حفاظت جان کی مصلحت کو مقدم رکھنے کی بات محض ظاہری اعتبار سے ہے ورنہ درحقیقت اس میں حفاظتِ دین کا مفاد ہے اس لیے کہ ان حالات میں دینی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جانوں کو بچایا جائے تاکہ وہ دیگر مفتوحہ علاقوں میں پیش قدمی اور جہاد کر سکیں' اور اگر یہ ہلاک ہو گئے تو اس میں دین کا اپنا نقصان ہے' اور اس طرح کفار کو موقع مل جائے گا کہ وہ اپنے سامنے بند راستوں کو کھولنے کے لیے حملہ آور ہو جائیں۔

خلاصہ

جب اعلانیہ دعوت یا قتال و جہاد کی وجہ سے نقصان ہو تو خفیہ دعوت اور مصالحت کا راستہ اختیار کرنا واجب ہے' اور جب اعلانیہ دعوت مفید ہو تو اُس وقت خفیہ دعوت کا طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں' جب قوت ہو اور دفاع کے اسباب وافر ہوں تو اس وقت ظالموں اور سرکشوں سے کسی طور بھی مصالحت اختیار کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح جب وسائل و اسباب وافر ہوں تو اس صورت میں کافروں کے علاقوں میں بھی گھس کر جہاد کرنے سے پہلوتہی اختیار کرنا جائز نہیں۔

اسلام قبول کرنے والے وہ اوّلین لوگ اور ان کے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کی حکمت

ہم نے سیرتِ طیبہ میں بیان کیا کہ وہ لوگ جو اس پہلے مرحلے میں مشرف بہ اسلام ہوئے' ان کی اکثریت غرباء' فقراء اور غلاموں پر مشتمل تھی' اس میں کیا حکمت تھی؟ اور ان جیسے افراد کی بنیاد پر اسلامی ریاست کی تاسیس میں کیا راز تھا؟

جواب: یہ جو کچھ بھی سامنے تھا یہ انبیاء کرام علیہم السلام کی پہلے مرحلے میں دعوت کا فطری نتیجہ

[1] قواعد الاحکام فی مصالح الانام ج ۱ ص ۹۵' نیز دیکھیے مؤلف کی کتاب: ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیہ ص ۲۶۱

ہوتا ہے' انبیاء کی تاریخ اس پر گواہ ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے متبعین بھی یہی غرباء و مساکین اور کم درجے کے لوگ تھے' جس وجہ سے اُن کی قوم ان کو طعنے دیتی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ. (ھود:۲۷)

(اے نوح!) ہم نہیں دیکھتے تمہیں مگر انسان اپنے جیسا اور ہم نہیں دیکھتے تمہیں کہ پیروی کرتے ہوں تمہاری بجز اُن لوگوں کے جو ہم میں حقیر و ذلیل (اور) ظاہر بین ہیں۔

اسی طرح فرعون اور اس کی قوم بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین کو کمزور اور حقیر سمجھتے۔ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے ہلاکت کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشٰرِقَ الْاَرْضِ وَمَغٰرِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا. (الاعراف:۱۳۷)

اور ہم نے وارث بنا دیا اس قوم کو جسے ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا (انہیں وارث بنایا) اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی۔

حضرت صالح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قومِ ثمود کی طرف بھیجا' ان کی قوم کے مغرور و متکبر لوگ آپ علیہ السلام سے دور ہو گئے اور نحیف و نادار لوگ اُن پر ایمان لے آئے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ (الاعراف:۷۶-۷۵)

کہا اُن سرداروں نے جو تکبر کیا کرتے تھے ان کی قوم سے اُن لوگوں کو جنہیں وہ کمزور و ذلیل سمجھتے تھے جو اُن میں سے ایمان لائے تھے: کیا تم یقین رکھتے ہو کہ صالح رسول ہیں اپنے رب کی طرف سے انہوں نے کہا: بے شک ہم اس پر جسے

دے کر انہیں بھیجا گیا ہے ایمان لانے
والے ہیںO کہنے لگے وہ لوگ جو تکبر کیا
کرتے تھے کہ ہم تو اس چیز کے جس پر تم
ایمان لائے ہو منکر ہیںO

اس سب میں راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین دے کر انبیاء و رسل کو بھیجا' اُس دین کی حقیقت یہ ہے کہ یہ دین انسان کو انسانوں کی سلطانی اور حکومت سے نکال کر ایک خدا کی سلطنت اور حکومت میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو سب سے پہلے حاکموں کی حاکمیت' سرکشوں کی سطوت اور الوہیت کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے خداؤں پر ضرب کاری کا کام کرتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ نظریہ غرباء' مساکین اور پسے ہوئے طبقے کے لیے روشنی کی کرن ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر دور میں دعوت الی اللہ کے سلسلے میں نام نہاد معبودوں اور خود ساختہ حکمرانوں کا ردِعمل اسلام کی دشمنی اور عناد میں ہی ظاہر ہوتا آیا ہے جب کہ اس حقیقت پر مبنی دعوت کو انہی پسے ہوئے مظلوم لوگوں نے ہی قبول کیا اور اس پر سرِ تسلیم خم کیا۔

یہی حقیقت اُس گفتگو سے بھی کھل کر آپ کے سامنے آ جاتی ہے جو گفتگو جنگِ قادسیہ میں فارسی لشکر کے سپہ سالار رستم اور سعد بن ابی وقاص کے لشکر میں موجود ایک سپاہی ربعی بن عامر کے درمیان ہوئی۔

رستم نے آپ کو کہا:

کس چیز نے آپ کو ہمارے ساتھ جنگ کرنے اور ہمارے علاقے پر حملہ کرنے کی دعوت دی ہے؟

آپ نے فرمایا: ہم اس لیے آئے ہیں تا کہ لوگوں کو انسانوں کی غلامی اور عبادت سے نکال کر خدا وحدہٗ لاشریک کی عبادت اور غلامی کی طرف لے آئیں۔

پھر آپ نے رستم کے دائیں بائیں جھکے ہوئے لوگوں کی صفوں کو دیکھتے ہوئے تعجب کے ساتھ کہا:

تمہارے بارے میں تو ہمیں خبریں پہنچی ہیں کہ تم بڑے عقل مند لوگ ہو' لیکن میں

دیکھ رہا ہوں کہ تم سے بڑھ کر کوئی بے وقوف قوم نہیں' ہم مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی دوسرے کو غلام نہیں بناتا' اور میرا خیال تھا کہ تم بھی ایک دوسرے کے ساتھ ویسے ہی ہمدردی کرتے ہو گے جیسے ہم ایک دوسرے سے کرتے ہیں لیکن جو کچھ تم نے کیا' یہ اس سے بہتر تھا کہ تم مجھے پہلے ہی بتا دیتے کہ تم میں سے بعض لوگ دوسروں کے خدا بنے ہوئے ہیں۔

یہ بات سن کر وہ کمزور اور مظلوم لوگ آپس میں سرگوشی کرنے لگے کہ اللہ کی قسم! اس عربی مرد نے سچ کہا۔

جب کہ جوان کے رئیس اور سردار تھے' انہوں نے ربعی کے کلام کو اپنے اوپر بجلی بن کر گرتے ہوئے محسوس کیا جس سے وہ دہل گئے۔

اور وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے: اس نے اپنے کلام کا ایسا تیر چلایا ہے' جس سے ہمارے غلام اس کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔[1]

بہرکیف اس ساری بحث کے بعد ہم دوبارہ اُس طرف لوٹتے ہیں کہ وہ مظلوم و کمزور لوگ جنہوں نے دوسروں کے مقابلے میں اسلام قبول کرنے میں پہلی کی' ان کا اسلام میں داخل ہونا محض اس پر ایمان لانا ہی نہ تھا بلکہ وہ متکبر سرداروں کے چنگل سے خلاصی اور ان کی غلامی سے آزادی پانے کی خاطر بھی دامنِ اسلام سے وابستہ ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان اور رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی تصدیق' یہ زعماء قریش اور مظلوم لوگوں کے درمیان قدرِ مشترک تھی اور ان میں سے ہر کوئی جانتا تھا کہ آپ ﷺ جو خبر دیتے ہیں' وہ سچی ہے' لیکن زعماء و کبراء کو ان کی زعامت اور سرداری آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع سے روکتی تھی' اس کی واضح ترین مثال آپ کے چچا ابو طالب تھے۔

جب کہ فقراء اور غرباء کو آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی' اس کے ساتھ ساتھ ایک بات یہ بھی تھی کہ اُن میں سے ہر کوئی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا اور اللہ تعالیٰ کی قوت اور سلطانی کے سامنے ہر قوت اور سلطانی کو ہیچ سمجھتا' یہی وہ شعور ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا ثمرہ ہے۔

[1] اس واقعہ کی تفصیل کے لیے' دیکھیے: اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء' تالیف: محمد خضری' ص ۱۰۰

یہ شعور وقت کے گزرنے سے پختہ ہوتا چلا جاتا تھا اور جس میں بھی رچ بس جاتا' اس کی قوت میں اضافہ ہو جاتا اور وہ اس کی سعادت کے نشے میں سرشار رہتا۔ اس سے ہم پر بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دین اسلام کے خلاف فکری یلغار میں ملوث پیشہ ور افراد یہاں پر ایک جھوٹی بات گھڑتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو دعوت پیش کی وہ صرف عرب کے علاقے کے لیے تھی اور وہ محض عرب کی فکری تحریک کی ترجمانی کر رہی تھی۔

اگر ایسی بات ہوتی تو دعوت کے ابتدائی تین سالوں میں جو چالیس مرد اور عورتیں مسلمان ہوئے' جن کی اکثریت غرباء' فقراء' مظلومین اور غلاموں پر مشتمل تھی' اُن میں سرفہرست صہیب رومی اور بلال حبشی جیسے عجمی لوگ نہ ہوتے۔

آگے آنے والی بحثوں میں آپ یہ بات پائیں گے کہ اس عربی ماحول نے ہی آپ ﷺ کو اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا اور آپ کے متبعین کو بھی اردگرد منتشر ہونے اور حبشہ وغیرہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا' اس کا سبب اس دعوتِ حق سے اُس عربی ماحول کی نفرت اور کراہت تھی' جس کے بارے میں یہ پیشہ ور دین کے دشمن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس عربی ماحول کے ذریعے آپ نے افکار کی ترجمانی کی۔

اعلانیہ دعوت

ابن ہشام نے لکھا ہے: پھر عورتیں اور مرد دین اسلام میں جوق در جوق داخل ہونے لگے حتیٰ کہ اسلام کا ذکر پورے مکہ میں پھیل گیا اور ہر طرف اس دین پر بات چیت ہونے لگی' اب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو حکم دیا کہ جو پیغامِ حق آپ کو دے کر بھیجا گیا ہے اس کو اعلانیہ طور پر بیان کریں' لوگوں کو اس کا حکم دیں اور اس کی دعوت دیں۔

بعثت کے تین سال خفیہ تبلیغ کے بعد آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اب اعلانیہ تبلیغ کرنے کا حکم دیا' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (الحجر: ۹۴)	سو آپ اعلان کر دیجئے اس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا اور منہ پھیر لیجئے مشرکوں سے ○

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء: ۲۱۴-۲۱۵)	اور آپ ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو ۝ اور آپ نیچے کیا کیجئے اپنے پَروں کو ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان سے ۝
وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ۝ (الحجر: ۸۹)	اور فرمایئے کہ میں تو بلاشبہ (ایسے عذاب سے) کھلا ڈرانے والا ہوں ۝

اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے اعلانیہ دعوت کا آغاز فرمایا' جب یہ آیت مبارک نازل ہوئی:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الحجر: ۹۴)	سو آپ اعلان کر دیجئے اس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا اور منہ پھیر لیجئے مشرکوں سے ۝

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رب تعالیٰ کی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور لوگوں کو نداء دینے لگے: یا بنی فہر! یا بنی عدی! یہ صدا سن کر سب لوگ جمع ہو گئے' اور جو خود نہ نکل سکا' اُس نے کوئی نمائندہ بھیجا کہ پتا چلے کہ کیا ہوا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اُس پار وادی میں ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟

تو سب نے کہا: ہم نے کبھی آپ سے جھوٹ نہیں سنا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں آنے والے عذابِ شدید سے ڈراتا ہوں جو بالکل تمہارے سامنے ہے۔

یہ سن کر ابولہب نے کہا: تمہارا سارا دن برباد ہو کیا تم نے اسی لیے ہمیں یہاں جمع کیا تھا؟

پس اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ (اللھب: ۱)	ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ و برباد ہو گیا۔

(متفق علیہ)

پھر آپ ﷺ پہاڑی سے نیچے اترے اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پیروی کی:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۝ (الشعراء:۲۱۴)

اور آپ ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو۝

آپ ﷺ نے اپنے جملہ رشتہ داروں اور اہل قرابت کو جمع فرما کر ارشاد فرمایا: اے بنی کعب بن لوی! اپنے آپ کو نارِ جہنم سے بچالو! اے بنی مرۃ بن کعب! اپنے آپ کو نارِ جہنم سے بچالو! اے بنی عبد مناف! اپنے آپ کو نارِ جہنم سے بچالو! اے بنی عبد المطلب! اپنے آپ کو نارِ جہنم سے بچالو! اے فاطمہ! تم بھی آگ سے بچ جاؤ! میں اللہ کی بارگاہ میں تم لوگوں کو اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکوں گا' البتہ جو رشتہ داریاں ہیں' میں ان کا لحاظ رکھوں گا۔ (متفق علیہ' الفاظ مسلم کے ہیں)

آپ ﷺ کی اعلانیہ دعوت پر قریش کا ردِ عمل یہ ہوا کہ انہوں نے آپ ﷺ کی دعوت کا انکار کیا اور منہ موڑ کر چلے گئے اور یہ عذر پیش کرنے لگے کہ ہم اپنے آباء واجداد کے دین کو نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ یہ رسومات ہمیں اپنے آباء سے ورثہ میں ملی ہیں اور یہ مراسم ہماری زندگی میں شامل ہو چکی ہیں۔

اس وقت رسول اکرم ﷺ نے ان کے افکار و نظریات کی آزادی کی ضرورت پر زور دیا اور ان کی عقلوں کو بتوں کی پوجا کی تقلید واتباع سے پاک کرنے کی کوشش فرمائی اور ان کو عقل و منطق استعمال کرنے کا درس دیا' اُن پر یہ واضح کر دیا کہ تم جن جھوٹے خداؤں کے سامنے عبادت کے لیے جھکتے ہو' یہ تمہیں کوئی نفع نقصان نہیں دے سکتے' اور جو تم یہ خیال کرتے ہو کہ یہ بتوں کی عبادت تمہیں تمہارے آباء واجداد سے ورثے میں ملی ہے تو یہ عذر بھی سراسر غلط ہے' جیسا کہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۝ (المائدہ:۱۰۴)

اور جب کہا جاتا ہے انہیں کہ آؤ اس کی طرف جو نازل کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اور آؤ (اس کے) رسول کی طرف' کہتے ہیں: کافی ہے ہمیں جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ

جانتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں (کیا
پھر بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے)○

جب آپ ﷺ نے ان کے جھوٹے خداؤں کے عیب بیان فرمائے' ان کے نام نہاد دانشوروں کو بے وقوف کہا اور اُن کے اس عذر کا بھی بھرپور جواب دیا کہ ان کے آباء واجداد بے عقلی اور بے وقوفی کی بناء پر بتوں کی پوجا کرتے رہے ہیں' تو قریش مکہ نے ان باتوں کا بہت اثر لیا اور آپ ﷺ کی دعوت کا انکار کر دیا اور آپ کے خلاف جمع ہو گئے سوائے ان چند لوگوں کے جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت عطا کر کے اُن کے چنگل سے بچا لیا' آپ کے چچا ابوطالب جو اُن سے بچ گئے' انہوں نے آپ ﷺ کی سرپرستی کی' حمایت کی اور آپ کی حفاظت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اسباق ونصائح

آپ ﷺ کی سیرت کے اس حصے سے تین پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جنہیں ہم اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

پہلا: جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کو اور عام لوگوں کو اعلانیہ دعوت دی تو یہ بات اُن سب کے لیے خلاف توقع اور خلاف معمول تھی' جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ابولہب نے اُسی وقت آپ ﷺ کی دعوت کا انکار کیا اور گستاخانہ الفاظ کہے' اور پھر جملہ مشرکین مکہ اور زعماء قریش نے آپ ﷺ کی مخالفت وعداوت پر اتفاق کر لیا۔

سیرت کے اس موضوع میں اُن جھوٹے دعوے کرنے والوں کا بھی واضح رد ہے' جو یہ کہتے ہیں کہ دین کی تعلیمات اور احکام عرب قومیت کا نتیجہ ہے' اور ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ محمد ﷺ نے جو دعوت پیش کی وہ اُس وقت کی عرب دنیا کی خواہشات اور تمناؤں کی عکاس تھی۔

ایسے مضحکہ خیز دعووں کے رد کے لیے کسی لمبی چوڑی بحث کی کوئی ضرورت نہیں' جو شخص بھی آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے کچھ واقفیت رکھتا ہے' وہ جانتا ہے کہ جو لوگ اس دعویٰ کو رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں وہی اس کی نامعقولیت اور بطلان کو بھی جانتے ہیں لیکن بہرحال وہ یہ من گھڑت دعویٰ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ دین کی

سلطانی اور تسلط کو دیگر اصولوں سے ہٹایا جائے' ان کے نزدیک کسی دعویٰ کی ترویج کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ صحیح بھی ہو بلکہ ان کے لیے اہم یہ ہے کہ ان کے مفادات و اغراض ان کی ترویج کو چاہتے ہوں' شاید آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے اس موضوع پر اس کتاب کے مقدمے میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا: اللہ تعالیٰ نے جو اعلانیہ دعوت کا یہ حکم دیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ. (الحجر:۹۴)　　سو آپ اعلان کر دیجئے اس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا۔

تو اسی حکم کے عموم میں جہاں دوسرے لوگ شامل تھے وہاں ممکن تھا کہ آپ ﷺ کے قریبی رشتہ دار بھی اسی میں شامل ہوتے تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے رشتہ داروں کو خاص طور پر دعوت دینے کا جو علیحدہ حکم دیا' اس میں کیا حکمت تھی؟

جواب: اس میں حکمت یہ ہے کہ ہر مسلمان پر عمومی طور پر' اور دعوت کا کام کرنے والے لوگوں پر خصوصی طور پر جو دعوت کی ذمہ داری کے درجات ہیں' اللہ تعالیٰ نے اُن درجات کو واضح فرمایا ہے۔

پہلے درجے کی ذمہ داری' انسان پر اپنی ذات کی ذمہ داری ہے کہ اُس دعوت پر پہلے خود ایمان لائے۔ دعوت کے اس پہلے درجے کو اس کا حق دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ابتداء وحی کے بعد فترۃ الوحی کا طویل وقفہ دیا تاکہ اس دور میں آپ ﷺ بذاتِ خود اس وحی کے سلسلے سے مانوس ہوں اور انہیں اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی مرسل ہیں اور اُن پر جو کلام نازل ہوا ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے تاکہ پہلے وہ خود اس پر پوری طرح ایمان لے آئیں اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والے جملہ احکام' اصول و مبادی اور شریعت کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لیے تیار کر لیں۔

اس کے بعد جو دعوت کا دوسرا درجہ ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال اور قریبی رشتہ داروں کو دعوت دے۔ اللہ تعالیٰ نے دعوت کے اس درجے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے حبیب کریم ﷺ کو اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت

دینے اور ڈر سنانے کا حکم دیا' دعوت کے اس درجے کی ذمہ داری میں ہر مسلمان صاحبِ اہل وعیال اور صاحبِ خاندان شریک ہے۔

آپ ﷺ نے جو دعوت اپنی قوم میں پیش کی اور ایک عام مسلمان جو دعوت اپنے رشتہ داروں میں پیش کرتا ہے' ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک نئی شریعت کی دعوت دی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی اور ایک عام مسلمان اُس چیز کی دعوت دیتا ہے' جو آپ ﷺ لے کر مبعوث ہوئے۔

جس طرح ایک نبی اور رسول اُس دعوت کا پرچار کرتا ہے اور اُن احکامات کی تبلیغ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں اور کسی صورت بھی اپنے اس مشن سے روگردانی اختیار نہیں کرتا' اسی طرح ایک صاحب اہل وعیال بھی کسی صورت بھی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کی تبلیغ سے روگردانی اختیار نہیں کر سکتا' ہر صاحب اہل و عیال کو چاہیے کہ وہ اپنے اہل وعیال اور رشتہ داروں کو احکاماتِ اسلام کی دعوت دیتا رہے' اور اس سلسلے میں اپنا اثر ورسوخ اور دباؤ بھی کام میں لائے۔

دعوت کی ذمہ داری کا تیسرا درجہ: دعوت کے اس درجے میں ایک عالم دین کا اپنے محلے اور شہر کے باسیوں کو دعوت دینا اور ایک حاکم وقت کا اپنی قوم اور پوری مملکت میں دعوت کو پھیلانا شامل ہے' تو اس طرح یہ عالم دین اور یہ حاکم دونوں آپ ﷺ کے شرعی ورثاء میں شمار ہوں گے' اُس حدیث طیبہ کے مطابق:

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ. علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

حاکم اور امام کو خلیفہ یعنی جانشینِ رسول کا نام دیا جاتا ہے' اسلامی معاشرے میں امام اور حاکمِ وقت کے لیے علم دین کا جاننا ضروری ہے تو اس طرح آپ ﷺ کی دعوت کی ذمہ داری اور علماء و حکام کی دعوت کی ذمہ داری اس درجے میں قدرِ مشترک ہوئی' فرق یہ ہے کہ آپ ﷺ بحیثیت نبی اُس نئی شریعت کی تبلیغ فرماتے رہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ تھی اور علماء و حکام اُمتی ہونے کی حیثیت سے اُس دعوت پر کاربند ہوتے ہوئے آپ کی سیرت و سنت پر عمل بھی کرتے ہیں اور اس کو آگے پہنچانے کے بھی پابند ہیں۔

تو اس طرح آپ ﷺ دعوت کی تین ذمہ داریوں کے متحمل تھے' اپنی ذات کی ذمہ داری' اس لیے کہ آپ ﷺ اس کے مکلف تھے' دوسری ذمہ داری اپنے اہل وعیال اور رشتہ داروں کو دعوت دینے کی تھی کیونکہ آپ اہل وعیال والے اور رشتہ داری والے تھے' تیسری ذمہ داری ساری انسانیت کو دعوتِ حق پہنچانے کی تھی کیونکہ آپ ﷺ نبی اور رسولِ مرسل تھے۔

تو اس طرح دعوت کے سلسلے میں آپ ﷺ کی سنت کے مطابق پہلے درجے کی ذمہ داری میں ہر مکلف شامل ہے' دوسرے درجے کی ذمہ داری میں ہر سربراہِ خاندان شامل ہے اور تیسرے درجے کی ذمہ داری میں علماء و حکام شامل ہیں۔

تیسرا: آپ ﷺ نے اپنی قوم کا یہ عیب ظاہر کیا کہ تم نے بغیر کسی غور وفکر کے خوبیوں اور خرابیوں سے قطع نظر' اپنے آپ کو اپنے باپ دادا کی موروثی رسومات میں قید کر رکھا ہے' لہٰذا آپ ﷺ نے ان کو اس تعصب پر مبنی اندھی تقالید سے چھٹکارا حاصل کرنے اور عقل و منطق پر مبنی اسلامی تعلیمات کی طرف دعوت دی۔

اس میں یہ دلیل ہے کہ دین اسلام بشمول عقائد و احکام ایسا فطری دین ہے' جو عقل و منطق کے مطابق ہے' کیونکہ اس میں ہر بات انسان کی فطرت اور اس کی مصلحت کے مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان باللہ اور دوسرے امورِ اعتقادیہ کی صحت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ یقینِ کامل اور آزاد فکر کی بنیاد پر قائم ہوں اور اس میں عرف اور تقلید ذرہ برابر بھی داخل نہ ہوں۔

صاحب جوہرۃ التوحید اپنے ایک معروف ارجوزہ میں ذکر کرتے ہیں:

فکل من قلد فی التوحید　　ایمانه لم یخل من تردید

(ترجمہ:) جس نے بھی توحید کے معاملہ میں تقلید کی اس کا ایمان تردید سے خالی نہیں (یعنی غیر معتبر ہے)۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام نے پرانی کفریہ رسوم و روایات پر ضربِ کاری لگائی اور اس کی غلامی سے لوگوں کو آزاد کرایا۔ اس لیے کہ اس کے تمام اصول اور احکام عقلِ سلیم کی اساس پر قائم ہیں جب کہ قدیم رسوم و روایات محض اندھی تقلید اور متعصبانہ محرک پر

قائم ہیں یعنی ان میں غور وفکر اور بحث وتمحیص کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوتا بلکہ محض ہٹ دھرمی ہی ہوتی ہے۔ عربی زبان میں جو کلمہ "تـقـالـیـد" استعمال ہوتا ہے' جس کا معنی ہے: "قدیم رسوم وروایات" عربی لغت اور علماء سماجیات کے ہاں اس کی تعریف کچھ یوں کی جاتی ہے:

آباء واجداد کی عادات وروایات کا وہ مجموعہ جن پر کسی معاشرہ یا علاقہ کے رسوم ورواج کی چھاپ ہو اور محض تقلید وتعصب کی بنیاد پر اُن عادات کو بقاء اور دوام حاصل ہو۔

لوگ اپنی معاشرتی زندگی کے مختلف مراحل میں جو عادات اپناتے ہیں' خوشی کے وقت جو کھیل کود یا رسومات اپنائی جاتی ہیں' غم اور مصیبت میں دکھ کے اظہار کے لیے جو ماتمی شکلیں اختیار کی جاتی ہیں اور وہ تمام کام جن کے لوگ عادی ہو چکے ہیں اور یہ سب رسوم وروایات زمانہ قدیم سے نسل درنسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہوں یا باہمی ربط کی وجہ سے انہیں خود بخود ہی اختیار کر لیا گیا ہو' ایسی تمام چیزوں کو لغت اور علم سماجیات کی اصطلاح میں "روایات" اور "تقالید" کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام کسی ایسی چیز کا متحمل نہیں جسے روایات کا نام دیا گیا ہو' خواہ اس کا تعلق عقیدے سے ہو یا دیگر مختلف احکام اور قوانین سے ہو۔

کیونکہ عقیدہ عقل سلیم اور منطق کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور احکامات دینی ودنیوی مصالح کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں' ان مصلحتوں کا ادراک غور وفکر اور تدبر سے کیا جا سکتا ہے' اگرچہ بعض عقلیں کچھ عوارض کی وجہ سے ان مصلحتوں کا ادراک کرنے سے قاصر بھی رہتی ہیں۔

اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ وہ لوگ کتنی خطرناک غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں جو اسلام کے نظام اور احکام کو "اسلامی روایات" کا نام دیتے ہیں' اس ظالمانہ نام کی ترویج سے ذہن اس بات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اسلامی اخلاق اور اسلامی طریقہ کی قدر وقیمت اس وجہ سے نہیں کہ وہ ایسے الٰہی قوانین ہیں جن میں انسانیت کی سعادت کا راز پنہاں ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلامی اخلاق اور اسلامی نظام ایسی قدیم اور موروثی عادات پر مشتمل ہے جو باپ دادا سے چلی آرہی تھیں' ایسی من گھڑت باتیں پھیلانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قدیم میراث سے لوگوں کے دل تنگ ہو چکے ہوتے ہیں' جن قدیم روایات کو جدید ترقی یافتہ اور نئے زمانے اور معاشرے کے لیے لازم قرار دینے کی کوشش کی

جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی احکام پر ان روایات کے شعار کا اطلاق کرنا کوئی چھوٹی اور عام غلطی نہیں، بلکہ یہ اُس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا مقصد باطل اور پُر فریب اصطلاحات کے ذریعے اسلام کے خلاف جنگ برپا کرنا ہے۔

دین اسلام کے بارے میں "اسلامی روایات" کی اصطلاح کو رواج دینے کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بیشتر احکام وقوانین پر "روایات" کا لیبل لگا دیا جائے، حتیٰ کہ جب ایک زمانہ گزر جائے گا اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات پختہ ہو جائے گی کہ اسلام کے احکام وقوانین کی حیثیت روایات کی ہے تو وہ یہ بھول جائیں گے کہ یہ نظام درحقیقت ایسے بنیادی اصول ہیں جو عقل سلیم اور آزاد تحقیق پر قائم ہیں، پھر دشمنانِ اسلام کے لیے آسان ہو جائے گا کہ وہ ایسی جگہ سے اس پر حملہ آور ہوں جہاں سے اسے زیادہ نقصان پہنچ سکے۔

دین اسلام جو نظام اور تشریعات لایا ہے، یہ بنیادی اصول ہیں۔ اصول اس چیز کو کہتے ہیں جو عقل اور غور وفکر کی اساس پر قائم ہو، اور اس کا ہدف کسی معین مقصد تک رسائی ہو، انسانوں کے وضع کردہ احکام انسانوں کے مختلف افکار کی وجہ سے بسا اوقات غلط ہو جاتے ہیں لیکن اسلام کے اصول کبھی غلط نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ جس ذاتِ باری نے انہیں وضع کیا ہے وہ عقول وافکار کا خود خالق ہے۔ صرف یہی ایک عقلی دلیل ان اصولوں پر ایمان لانے اور ان کی وجاہت وصحت پر یقین کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اسلام کے بیشتر اصول و احکام مثلاً نکاح وطلاق، عورتوں کا حجاب اور ان کی عصمت اور سلوک واخلاق کے عام مسائل پر "روایات" کا پردہ ڈال دیا گیا ہو تو پھر طبعی طور پر کچھ ایسے لوگ پائے جائیں گے جو ان روایات کو ترک کر دینے، ان کی قید سے رہائی پانے اور ان کی بیڑیوں کو توڑ دینے کی دعوت دیں گے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب فکر ورائے کی آزادی کو غلبہ حاصل ہو گیا ہو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں روایات موجود نہیں ہیں، یہ تو ایسا دین ہے جو عقل کو روایات کے شکنجوں سے آزادی دینے کے لیے آیا ہے جیسا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ابتدائی مراحل میں اس پر آپ کو کاربند دیکھا۔

روایات: وہ معاشرتی سلوک وطریق کے دھارے ہیں جن میں لوگ خود بخود محض تقلید کے محرک سے ہی بہہ جاتے ہیں۔

اصول: وہ خط ہے جس کے ذریعے زمانے کی ترقی کی رفتار کو کنٹرول کیا جائے' اس کے برعکس نہیں' روایات و تقالید کی مثال اُن طفیلی نباتات کی سی ہے جو معاشرے کے فکری میدانوں میں خود بخود اُگ آتی ہیں' یہ نقصان دِہ ہوتی ہیں' اس لیے ان کو اکھاڑ پھینکنا اور فکرِ سلیم کی راہ کو ان سے پاک کر دینا ہی ضروری ہے۔

قریش کی ایذاء رسانی

اعلانیہ دعوت کے بعد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ سے قریش کی دشمنی شدت اختیار کر گئی' آپ ﷺ کو مختلف قسم کی نت نئے انداز میں تکالیف اور ایذائیں دی گئیں' مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کعبہ کے صحن میں نماز ادا کر رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آیا' اُس نے آپ کے گلے میں کپڑا ڈال کر شدت سے بَل دیا کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا' حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے اور اُس کو کندھوں سے پکڑ کر اُس کو آپ ﷺ سے دور ہٹایا اور کہا: کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو' جو کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے۔ (رواہ البخاری)

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے اور آپ کے اردگرد قریش کے کچھ لوگ تھے۔ عقبہ بن ابی معیط اونٹ کی اوجھ لے آیا اور آپ ﷺ کی پیٹھ مبارک پر پھینک دی' آپ ﷺ نے سجدے سے سر نہ اٹھایا حتیٰ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور انہوں نے آپ ﷺ کی پیٹھ مبارک سے وہ گندگی ہٹائی اور جس نے یہ گستاخی کی' اُس کے خلاف دعا کی۔ (رواہ البخاری)

آپ ﷺ جب بھی مکہ میں کہیں چلتے پھرتے یا جاتے تو قریش کی طرح طرح کی ایذاء' بے ادبی اور بدتمیزی کا سامنا کرتے' وہ آپ کا مذاق اُڑاتے' طرح طرح کی باتیں کرتے اور ستاتے۔

اسی طرح کی ایک روایت طبری اور ابن اسحاق نے بیان کی ہے کہ ایک دفعہ آپ

ﷺ مکہ کی گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص نے مٹھی بھر مٹی آپ ﷺ کے سر میں پھینک دی' آپ ﷺ اسی حالت میں گھر لوٹے تو آپ کی ایک بیٹی آپ کے سر انور دھونے لگی اور ساتھ ساتھ رونے لگی' تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے میری بیٹی! نہ رو! بے شک تیرے باپ کا محافظ اللہ ہے۔ (دیکھئے: تاریخ الطبری ج ۲ ص ۳۴۴' سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۸)

آپ ﷺ کے صحابہ نے بھی طرح طرح کی تکالیف اور عذاب برداشت کیے حتیٰ کہ کچھ صحابہ انہی تکالیف کے باعث فوت ہو گئے' کچھ اندھے ہو گئے لیکن کوئی بھی تکلیف اور عذاب ان کو اسلام سے دور نہ کر سکا' اگر ہم اس کی تفصیل میں جائیں تو بحث لمبی ہو جائے گی۔ یہاں ہم صرف امام بخاری کی وہ روایت نقل کرتے ہیں جو انہوں نے خباب بن الارت سے روایت کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ ﷺ کعبہ کے سائے میں ایک چادر اوڑھے تشریف فرما تھے' اُس وقت ہم نے مشرکین کی طرف سے بہت سی تکالیف کا سامنا کیا' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کریں گے؟ آپ ﷺ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا' آپ نے فرمایا: بے شک تم سے قبل جو لوگ گزر چکے لوہے کی کنگھیاں ان کے جسموں پر پھیری جاتیں جس سے ان کی ہڈیوں سے گوشت علیحدہ ہو جاتا لیکن یہ تکلیف بھی ان کو دین سے نہ ہٹا سکی' یقیناً اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل کرے گا حتیٰ کہ ایک اونٹ سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا۔[1]

اسباق ونصائح

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کو مشرکین کی طرف سے دی جانے والی طرح طرح کی تکالیف کے متعلق پڑھ کر ایک فکر و تامل کرنے والے شخص کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ پوچھتا ہے کہ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ حق پر تھے تو پھر ان کو تکالیف اور عذاب کیوں دیئے گئے؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں کیوں نہ بچایا جب کہ ان کے درمیان اللہ کا رسول موجود تھا اور وہ اس کی طرف دعوت دینے والے اور اس کے راستے میں جہاد کرنے والے تھے۔

[1] رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو قریش کی جانب سے پہنچنے والی تکالیف کی تفصیلات کے لیے دیکھئے: کتب سیرت مثلاً سیرت ابن ہشام' تہذیب السیرۃ' نور الیقین للخضری وغیرہ۔

جواب: اس دنیا کے انسان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مکلف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی میں جو کلفت و مشقت بھی آئے، اس کو برداشت کرنے کا پابند ہے۔

اسلام کی طرف دعوت دینا اور اعلاء کلمۂ حق کے لیے جہاد کرنا ہر مسلمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم ہے اور اللہ عزوجل کے احکامات کی پابندی عبودیت کے متعلقات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبودیت و بندگی کا مطلب یہی ہے کہ اُس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ جب اُس کے حکم کی پابندی کریں گے تو تکلیف و مشقت کا بھی سامنا کرنا پڑے گا، اگر ہم اللہ عزوجل کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار نہیں کرتے تو پھر اُس پر ایمان لانے کا کوئی معنی باقی نہیں رہ جاتا، لہٰذا عبودیت و بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے حکم کی پابندی و پیروی کو اپنے اوپر لازم قرار دیا جائے اور اللہ عزوجل کے حکم کی پابندی میں مشقت بھی اٹھانا پڑے گی اور اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف مجاہدہ بھی کرنا پڑے گا، یہ بندگی کے لوازمات میں سے ہے۔

اس لیے اس دنیا میں اللہ کے بندوں پر دو اُمور کو لازم پکڑنا ضروری ہے:

پہلا امر: دین اسلام کو پوری طرح اپنانا اور صحیح اسلامی معاشرہ قائم کرنا۔

دوسرا امر: اس کی طرف جانے والے راستے کو اختیار کرنا، اس راستے میں ہر خطرہ مول لینا اور ہر مشکل برداشت کرنا اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے اپنے مال اور طاقت کو خرچ کرنا۔

یعنی اللہ عزوجل نے ہمیں ایمان کے ساتھ حکم کی پابندی کا مکلف بھی بنایا ہے اور ہم اس بات کے بھی مکلف ہیں کہ اس ایمان اور حق کے راستے میں ہر مشکل اور ہر تکلیف کو بھی برداشت کریں۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایمان لانے کے بعد ہمارے لیے اسلامی معاشرے کے قیام کا راستہ آسان اور سہل فرما دیتا لیکن اس صورت میں اللہ کے راستے پر چلنے والے سالک کی عبودیت اور خلوص کا اظہار نہ ہوتا، کیونکہ حقیقی سالک تو وہی ہے جو راستے میں مشکلات اور خطرات کے موجود ہونے کے باوجود پھر بھی اُسی حق کے راستے پر گامزن رہے، کیونکہ ایک مؤمن جب اپنے ایمان کا اعلان کرتا ہے تو اُسی دن سے وہ اپنی جان اور اپنے مال کا اللہ

عزوجل کے ساتھ سودا کر لیتا ہے اور اس بات کا اقرار بھی کرتا ہے کہ اس کی جملہ خواہشات اور تمنائیں اُس شریعت کے تابع ہیں جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے' اسی صورت میں اس بات کا بھی امکان تھا کہ ایک مؤمن اور منافق' صادق اور کاذب سب اس راستے پر چلنے لگیں اور اُن میں کوئی فرق اور امتیاز نہ رہے۔

اس طرح دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں اور اقامتِ دین کے لیے جہاد کرنے والوں کے لیے شروع ہی سے جو سنت الٰہیہ ہے' وہ تین حکمتوں کا تقاضا کرتی ہے:

پہلی حکمت: انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے لیے اپنی بندگی اور عبودیت کی صفت کو لازم پکڑے' اللہ عزوجل نے سچ فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَO (الذاریات:۵۶)

اور نہیں پیدا فرمایا میں نے جن وانس کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریںO

دوسرا حکم: بندگی اور عبودیت کے ضمن میں ہی مکلف ہونے اور ہر حکم کی پابندی کو لازم پکڑنا' کوئی بھی مرد یا عورت جب عاقل' بالغ اور سنِ رُشد کو پہنچ جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کا مکلف ہو جاتا ہے۔ اُس پر شریعت اسلامیہ کے جملہ احکامات کی پابندی اپنے اوپر لازم کرنے اور معاشرے میں اس کی ترویج کے سلسلے میں جتنی تکالیف اور مشکلات آئیں' اُنہیں بھی برداشت کرنا لازم ہے۔

تیسرا حکم صادقین کے سچ اور کاذبین کے جھوٹ کا اظہار: سب لوگ اسلام کا دعویٰ اور محبت الٰہی کا دعویٰ زبانی کرتے ہیں' اس صورت میں صادق اور کاذب برابر ہیں' لیکن ابتلاء وامتحان دو ایسے میزان اور ترازو ہیں جو صادق اور کاذب میں صحیح طریقے سے تمیز اور فرق کرتے ہیں' مصیبت میں جو کامیاب ہو گیا وہ صادق اور جو ناکام ہو گیا وہ کاذب کہلائے گا۔

اللہ عزوجل نے سچ فرمایا:

الٓمّٓO اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَO وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ

الف لام میمO کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں: ہم ایمان لے آئے

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝ (العنکبوت:۳-۱)

اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۝اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں جو ان سے پہلے گزرے پس اللہ تعالیٰ ضرور دیکھے گا انہیں جو (دعوائے ایمان میں) اتنے سچے تھے اور ضرور دیکھے گا (ایمان کے) جھوٹے (دعوے داروں) کو۝

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۝ (آل عمران:۱۴۲)

کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یوں ہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے اور دیکھا ہی نہیں (آزمائش میں) صبر کرنے والوں کو۝

اور جب اللہ تعالیٰ کی سنت اپنے بندوں کے بارے میں یہی ہے تو اللہ تعالیٰ کا جو طریقہ یا اس کی جو سنت ہے وہ کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتی، حتیٰ کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ رہا ہے، جیسا کہ اوپر والی آیاتِ بیّنات میں بیان کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مختلف تکالیف اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جو انبیاء و رسل گزرے اُن کو بھی ایذائیں پہنچائی گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کو بھی طرح طرح کی مشکلات اور مصیبتوں کو برداشت کرنا پڑا حتیٰ کہ کئی صحابہ کرام اسی طرح کی تکالیف سے بینائی کھو بیٹھے اور مشرکین کی طرف سے دیئے جانے والے عذاب کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے حالانکہ ان سب کا مرتبہ و مقام اور فضیلت و عظمت اللہ عزوجل کے ہاں بہت زیادہ ہے لیکن پھر بھی دنیا میں ان کو مختلف قسم کی تکالیف اور مصائب برداشت کرنا پڑے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے۔

جب ہم ان تکالیف اور مصائب کا جائزہ لیتے ہیں جو مسلمانوں کو اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے برداشت کرنا پڑیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشکلات اور تکالیف حقیقی مشکلات نہ تھیں، جو ایک سالک اور مجاہد کو منزلِ مقصود تک پہنچنے سے روک لیں بلکہ ہر سالک

اور مجاہد جو اپنی منزل تک پہنچنے کا ارادہ کر لے اور اس سفر پر چل نکلے' وہ ضرور اپنے راستے میں اس قسم کی مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے محوِ سفر رہتا ہے' یعنی ہر مسلمان جس کو اللہ تعالیٰ نے کسی منزل تک پہنچنے کا مکلّف اور پابند کیا ہے' وہ اس راستے میں ضرور کسی نہ کسی حد تک مختلف رکاوٹوں کو عبور کرتا ہے۔ حق کے راستے میں تکالیف اور رکاوٹیں ضرور آتی ہیں' کچھ لوگ تو ان رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں اور کچھ لوگ اسی راستے میں شہید ہو جاتے ہیں' جس قدر وہ تکالیف اٹھاتے ہیں اسی قدر وہ منزل کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس لیے کسی مسلمان کو کسی صورت میں نااُمید نہیں ہونا چاہیے' اگرچہ کتنی ہی مشقت اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑے' بلکہ دین اسلام کا طریقہ اور طبیعت تو یہ ہے کہ مسلمان حق کے راستے میں متعدد مشکلات' مصائب' تکالیف اور رکاوٹوں کے باوجود اللہ عزوجل کے حکم کی تعمیل میں پوری کوشش اور جدوجہد کرتے رہیں اور اس کو فتح و نصرت کی خوش خبری سمجھیں۔

اللہ عزوجل کے اس حکم میں غور کریں تو آپ اس میں واضح دلیل پائیں گے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○ (البقرہ: ۲۱۴)	کیا تم خیال کر رہے ہو کہ (یوں ہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ نہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہوئے ہیں' پہنچی انہیں سختی اور مصیبت اور وہ لرزا ٹھے یہاں تک کہ کہہ اُٹھا (اُس زمانہ کا) رسول اور جو ایمان لے آئے تھے اس کے ساتھ: کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے ○

جو لوگ اسلامی طبیعت سے واقف ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ جو تکالیف و مصائب راہِ حق میں آتی ہیں' یہ منزل سے دور کرتی ہیں' ان کو اللہ عزوجل نے ان الفاظ میں جواب دیا ہے:

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○	سن لو یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے ○

(البقرہ: ۲۱۴)

اس سوال کا جواب حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کے قصے سے بھی ملتا ہے جو ہم نے پیچھے بیان کیا ہے کہ جب اسلام قبول کرنے کی پاداش میں ان کو طرح طرح کا عذاب دیا گیا' ان کے جسم کا اکثر حصہ گرم لوہے سے داغا گیا تو وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! میرے لیے اور جملہ مسلمانوں کی فتح ونصرت کے لیے دعا فرمائیں' تو آپ ﷺ نے جو جواب دیا' اس کا مفہوم بھی اسی طرح ہے کہ اگر تم اس تکلیف اور ایذاء سے مرعوب ہو گئے ہو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان تکالیف کو برداشت نہیں کر سکتے تو بے شک جان لو کہ اس حق کے راستے میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور جتنے لوگ بھی اللہ عزوجل کی وحدانیت پر ایمان لائے اُن کے ساتھ اسی طرح ہوتا رہا ہے' تم سے پہلی امتیں جو گزر چکی ہیں ان کو بھی دین کے راستے میں بے شمار مشکلات ومصائب سے گزرنا پڑا' ان کے جسموں پر لوہے کی کنگھیاں پھیری جاتیں جس سے ان کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو جاتا لیکن پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے راستے سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹے۔

اگر تم ان تکالیف اور مصائب کی وجہ سے مایوس ہو گئے ہو یا نصرتِ الٰہی سے مایوس ہو چکے ہو تو یہ تمہارا صرف وہم ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ ان مشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جادۂ حق پر گامزن رہنا ہی فتح ونصرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور اپنے اس دین کو غالب کر کے رہے گا' حتیٰ کہ اتنا امن ہو جائے گا کہ ایک آدمی صنعاء سے حضر موت جائے گا تو اُسے راستے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ اُسے اپنے ریوڑ پر بھیڑیئے کے حملہ کا تو ڈر ہوگا (لیکن اپنے بارے میں مطمئن ہوگا)۔

اس حدیث طیبہ میں رسول اللہ ﷺ نے بلادِ فارس اور روم کی فتح کی خوش خبری دی ہے' حالانکہ فارس وروم کی فتح آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی' لیکن آپ ﷺ اس کی اطلاع اور خبر اُس وقت دے رہے ہیں جب ابھی صرف چند لوگ مسلمان ہوئے ہیں' اللہ کی بارگاہ میں آپ ﷺ کی فضیلت وعظمت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اور آپ کی قیادت میں یہ علاقے فتح ہوتے چہ جائیکہ تاریخ میں ان کی فتح آپ کے کسی پیروکار کی قیادت میں ہو' اس کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے' لیکن کامیابی کے لیے قانون دوسرا ہے۔

مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ابھی شام وعراق کے علاقوں پر فتح پانے کی پوری قیمت نہیں ادا کی تھی۔ جب کہ کامیابی پانے کے لیے پوری قیمت چکانا ضروری تھا۔ ورنہ کامیابی نہیں مل سکتی تھی' اگرچہ رسول اللہ ﷺ ان میں موجود تھے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ فتوحات کو رسول اللہ ﷺ کے نام یا ان کی قیادت یا ان کی نگرانی سے مربوط کیا جائے' اس لیے کہ آپ سے اللہ تعالیٰ بہت محبت فرماتا ہے' بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ فتح ونصرت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمان جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے بیعت کی ہے' وہ یہ ثابت کر دکھائیں کہ وہ اپنی بیعت میں سچے ہیں اور انہوں نے جو اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا اُس پر برضا ورغبت قائم ہیں' اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ. (التوبہ:۱۱۱)

یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمان داروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے' لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔

مصالحاتی کوششیں

ابن ہشام نے ابن اسحاق سے روایت کیا ہے کہ عتبہ بن ربیعہ جو اپنی قوم کا سردار اور صاحب بصیرت شخص تھا' اُس نے ایک مرتبہ قریش کی مجلس میں کہا: اے گروہِ قریش! آپ کی کیا رائے ہے اگر میں محمد (ﷺ) کے پاس جاؤں' اُن سے بات چیت کروں اور اُن پر کچھ تجاویز پیش کروں جن میں بعض کو وہ قبول کر لیں' ہم بھی اُسے قبول کر لیں تاکہ وہ ہماری مخالفت سے رک جائیں؟ قریش نے کہا: کیوں نہیں! اے ابوالولید! تم جاؤ! اور اُن سے بات چیت کرو۔

عتبہ' آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کے قریب ہو کر بیٹھ گیا' کہنے لگا: اے بھتیجے! تم جانتے ہو خاندان میں تمہیں جو عزت اور اعلیٰ نسبی حاصل ہے' لیکن تم نے اپنی قوم کے سامنے بہت بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے' تم نے اجتماعیت میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور پوری قوم کے عقل مندوں کو بے وقوف کہا ہے۔

میری بات سنو! میں تمہارے لیے کچھ تجاویز رکھتا ہوں' ان میں غور و فکر کرو شاید ان میں سے تم بعض کو تسلیم کر لو' رسول اللہ ﷺ نے اس کو فرمایا: اے ابو الولید! کہو! میں سنوں گا۔

اس نے کہا: اے بھتیجے! یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے اگر تم اس کے ذریعے مال و دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہم سب جمع ہو کر تمہیں اتنا مال دیں گے کہ تم ہم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے اور اگر تم اس سے شرف اور بزرگی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں حتیٰ کہ ہم کوئی کام تمہارے بغیر نہیں کریں گے' اور اگر تم بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر تم پر کوئی جن وغیرہ کا سایا ہے اور سمجھتے ہو کہ تم اُسے اپنے آپ سے دور نہیں کر سکتے تو ہم تمہارے لیے طبیب بلاتے ہیں اور تمہارے صحت یاب ہونے تک ہم اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اُسے فرمایا: اے ابو الولید! کیا تم اپنی بات سے فارغ ہو گئے؟

اس نے جواب دیا: ہاں! آپ نے فرمایا: اب میری بات سنو!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ (فصلت: ۱-۶)

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے' حامیم ۝ اتارا گیا ہے (یہ قرآن) رحمٰن و رحیم (خدا) کی طرف سے ۝ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل سے بیان کر دی گئیں ہیں یہ قرآن عربی (زبان میں) ہے' یہ ان لوگوں کے لیے جو علم (وفہم) رکھتے ہیں ۝ یہ مژدہ سنانے والے اور (بروقت) خبردار کرنے والا ہے بایں ہمہ منہ پھیر لیا ان میں سے اکثر نے' پس وہ اسے قبول نہیں کرتے ۝ اور ان (ہٹ دھرموں) نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے

ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے تم اپنا کام کرو ہم اپنے کام میں لگے ہوئے ہیںO آپ فرمایئے: میں انسان ہی ہوں (بہ ظاہر) تمہاری مانند (البتہ) وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا معبودِ خداوند یکتا ہے' پس متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف اور مغفرت طلب کرو اس سے اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لیےO

آپ ﷺ اسی طرح آیات کی تلاوت فرماتے رہے اور عتبہ سنتا رہا' حتیٰ کہ آپ ﷺ جب اس آیت پر پہنچے:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ. (فصلت:۱۳)

پس اگر وہ (پھر بھی) روگردانی کریں تو آپ فرمایئے کہ میں نے ڈرایا ہے تمہیں اس کڑک سے جو عاد و ثمود کی کڑک کی مانند (ہلاکت خیز) ہوگی۔

جب یہ آیت تلاوت کی تو عتبہ نے آپ ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھا' قراءت بس کرنے کا کہا اور رشتہ داری کا واسطہ دیا کیونکہ اس آیت مبارکہ میں جو دھمکی تھی وہ اس سے خوف زدہ ہو گیا تھا' پھر عتبہ اپنے گروہ کی طرف لوٹا' جب وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو قریش نے پوچھا: اے ابوالولید! کیا معاملہ ہوا ہے؟ اُس نے کہا: خدا کی قسم! میں نے ایسی بات سنی ہے جس کی مثل میں نے آج تک کوئی بات نہیں سنی' وہ نہ ہی شعر ہے نہ ہی جادو ہے اور نہ ہی کہانت ہے' اے گروہِ قریش! اگر تم میری بات کی پیروی کرو تو اس آدمی کو اسی حال پر چھوڑ دو جس پر وہ ہے' اللہ کی قسم! اس کا جو کلام میں سن کر آیا ہوں وہ بہت بڑی خبر ہے' وہ پوری ہو کر رہے گی' اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو وہ اس کے ساتھ نمٹنے میں تمہاری طرف سے کافی ہوں گے اور تمہیں اس کے خلاف لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی اور اگر یہ عرب پر غالب آ گیا تو

اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی ہو گی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہو گی۔

قریش نے کہا: اے ابوالولید! خدا کی قسم! اُس نے اپنی زبان سے تم پر جادو کر دیا ہے'

عتبہ نے کہا: میری یہی رائے ہے' اب جو تمہاری مرضی ہے کرو۔

طبری' ابن کثیر اور دیگر سیرت نگاروں نے روایت کیا ہے کہ مشرکین کا ایک وفد جس میں ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل بھی تھے' آپ ﷺ کے پاس آیا' اور آپ ﷺ پر کچھ تجاویز پیش کیں کہ ہم آپ کو اتنا مال و دولت دیتے ہیں کہ آپ ہم سب سے زیادہ مال دار ہو جائیں گے اور خوب صورت دوشیزہ سے آپ کی شادی کرتے ہیں' اس شرط پر کہ آپ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہنا ترک کر دیں اور ہماری عادات و اطوار پر نکتہ چینی چھوڑ دیں' جب آپ ﷺ نے انکار کر دیا اور جس کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا گیا تھا' اُس دعوت حق پر کاربند رہنے کا اصرار کیا تو پھر انہوں نے کہا کہ ایک دن آپ ہمارے خداؤں کی عبادت کیا کریں اور ایک دن ہم سب آپ کے خدا کی عبادت کیا کریں گے' تو آپ ﷺ نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا اور اس کی وضاحت کے لیے قرآن پاک کی یہ آیات نازل ہوئیں:

قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۝ (الکافرون: ۱-۶)

آپ فرما دیجئے: اے کافرو!۝ میں پرستش نہیں کیا کرتا (ان بتوں کی) جن کی تم پرستش کرتے ہو۝ اور نہ ہی تم عبادت کرنے والے اس (خدا) کی جس میں عبادت کیا کرتا ہوں۝ اور نہ ہی میں کبھی عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم پوجا کیا کرتے ہو۝ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کیا کرتا ہوں۝ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۝

قریش کے سرداروں نے دوبارہ ویسی ہی کوشش کی جو عتبہ کر چکا تھا' پس دوبارہ سب جمع ہو کر آپ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ پر سرداری اور مال و دولت کو پیش کیا اور ساتھ یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر آپ اپنے اوپر کسی جن بھوت کا سایا محسوس کرتے ہیں تو ہم

اس کا علاج کرواتے ہیں' اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: جو کچھ تم کہتے ہو مجھے ایسا کوئی مرض لاحق نہیں' میں اس لیے نہیں آیا کہ تم سے مال و دولت' سرداری یا بادشاہی طلب کروں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف رسول مبعوث کیا ہے اور مجھ پر کتاب نازل کی گئی ہے' اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں (جنت کی) خوش خبری اور (دوزخ کا) ڈر سناؤں' پس میں نے اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا دیئے ہیں اور تمہیں صحیح نصیحت کر دی ہے' اگر تم اُس پیغامِ حق کو قبول کر لو جو میں لے کر آیا ہوں تو یہ تمہاری دنیا اور آخرت کی بہتری کا سبب ہے' او اگر تم اس کو رد کر دو تو میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر صبر اختیار کروں گا اور ڈٹا رہوں گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔

قریش نے کہا: اگر آپ ہماری پیش کردہ تجاویز کو قبول نہیں کرتے تو پھر آپ جانتے ہیں کہ ہمارا یہ علاقہ بہت تنگ ہے' پانی کی کمی ہے اور ہماری زندگی کتنی مشکل ہے' لہٰذا جس رب نے آپ کو مبعوث کیا ہے' اُس رب سے ہمارے لیے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے ان سخت پہاڑوں کو کھسکا دے' شام اور عراق کی طرح یہاں پر ہمارے لیے نہریں چلا دے اور ہمارے جو آباء و اجداد گزر چکے ہیں ان کو دوبارہ زندہ کر دے اور دوبارہ زندہ کیے جانے والوں میں قصی بن کلاب ضرور زندہ ہوں کیونکہ وہ ایک سچے بزرگ تھے تو ہم ان سے آپ کے پیغام کے بارے پوچھیں گے کہ کیا یہ حق ہے یا باطل؟ اور اپنے رب سے یہ بھی دعا کریں کہ وہ آپ کو محلات' باغات' سونے اور چاندی کے خزانے عطا کرے تاکہ آپ اس موجودہ زندگی سے بہتر زندگی گزاریں' اگر آپ نے وہ سب کچھ کر دکھایا جس کا ہم نے آپ سے سوال کیا ہے تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور اللہ کی بارگاہ میں جو آپ کا مقام و مرتبہ ہے اُس سے بھی واقف ہو جائیں گے کہ اُس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

اس مطالبہ کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرمایا: میں ایسا نہیں کروں گا اور نہ ہی اپنے رب سے یہ دعا کروں گا۔

پھر قریش نے لمبی بات چیت کے بعد آپ ﷺ کو کہا: بے شک ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ کو یمامہ میں رہنے والا رحمٰن نامی شخص تعلیم دیتا ہے اور ہم کسی صورت میں کبھی بھی اُس رحمٰن نامی آدمی پر ایمان نہیں لائیں گے' اور اے محمد (ﷺ)! ہم اپنا یہ عذر پیش کرتے ہیں

اور خدا کی قسم! ہم آپ کو نہیں چھوڑیں گے حتیٰ کہ آپ ہلاک ہو جائیں یا آپ ہمیں ہلاک کر دیں' پھر وہ سب اٹھے اور واپس چلے گئے۔

اسباق ونصائح

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ ہم نے پیش کیا ہے' اس میں تین حکمتیں ہیں اور تینوں بڑی اہمیت کی حامل ہیں:

پہلی حکمت

آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے اس حصے پر گہرے غور و فکر کے بعد ہمارے لیے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت کی حقیقت کیا تھی' جس دعوت کو لے کر آپ آئے تھے' اور اُس دعوت کے اغراض و اہداف بھی تفصیل کے ساتھ کھل کر سامنے آ جاتے ہیں' جو موجودہ دور کے اربابِ دعوت اور مدعیانِ انقلاب اپنے دلوں میں چھپائے رکھتے ہیں' فرق کھل کر واضح ہو جاتا ہے۔

کیا نبی ﷺ اپنی اس دعوت کی آڑ میں بادشاہی چاہتے تھے؟ یا کیا وہ عہدہ اور مال و دولت کی آرزو رکھتے تھے؟ یا کیا آپ ﷺ (معاذ اللہ) کسی بیماری کی وجہ سے مختلف خیالات پیش کرتے رہتے تھے؟

یہ سب ایسے احتمالات ہیں کہ جن کو اسلام کے دشمن اور اسلام کے خلاف فکری یلغار کرنے والے مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں' لیکن اللہ رب العلمین نے اپنے رسول ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو ایسے اسرار و رموز سے بھر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زندگی کو ایسے واضح واقعات و مشاہدات سے بھر دیا ہے کہ جو ہر شک اور احتمال کی جڑ کاٹ دیتے ہیں اور ہر قسم کے وسوسوں کا راستہ روک لیتے ہیں' جس سے اسلام کے خلاف فکری سازش کرنے والے اپنے منہ کی کھاتے ہوئے ہر سازش میں ناکام ہوتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں؟

قریش اپنے دلوں میں جو شکوک و شبہات اور احتمالات محسوس کرتے تھے' اس سلسلے میں مذاکرات کے لیے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے تو اس عمل میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی۔ قریش آپ ﷺ کی دعوت' رسالت کے مقصد اور غایت کے متعلق

خوب جانتے تھے اور ان کو اس بات کا بھی علم تھا کہ آپ ان کے پیش کردہ کسی لالچ میں آنے والے نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا اس میں یہی ارادہ تھا کہ بعد میں آنے والے دین کے دشمن اور دین کے خلاف شکوک وشبہات اور فکری یلغار کرنے والوں کو تاریخ ہر زمانے میں جھٹلاتی رہے کہ ان کی پیدا کی ہوئی تشکیک بالکل غلط ہے۔

دین کے خلاف اس فکری یلغار کے ضمن میں ''کریمر'' اور ''فان فلوٹن'' نے ایک طویل بحث چھیڑی، اور غور وفکر کیا لیکن تشکیک اور سازش کے اس مشن میں انہیں کچھ ہاتھ نہ آیا بلکہ انہوں نے حقیقت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یہی کہتے رہے کہ (معاذ اللہ) آپ (ﷺ) اپنی دعوت کی آڑ میں سرداری اور حکمرانی کی رغبت رکھتے تھے، لیکن حقائق نے ہر میدان میں ان کو شکست سے دوچار کیا۔

ان سے قبل عتبہ بن ربیعہ اور اس کی مثل دوسرے لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے یہی کام لیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے ان تجاویز اور خواہشات کو پیش کیا کہ آپ انہیں بخوشی قبول کر لیں گے، آپ ان کی دی ہوئیں یہ ترغیبات قبول کر لیتے تو تمام قریش آپ کے پیروکار ہوتے، آپ کو اور آپ کے صحابہ کو تکلیف و اذیت دینے کے جو طریقے انہوں نے اختیار کر رکھے تھے اُن کو چھوڑ دیتے، اور اگر آپ کی رسالت اور دعوت کے پسِ پردہ یہی عزائم تھے تو آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے کیوں نرمی کا مظاہرہ نہ کیا؟

کوئی شخص جو بادشاہی اور سرداری کا خواہش مند ہو اور اس کی قوم اس کے سامنے اس چیز کو پیش بھی کر رہی ہو اور مصالحت کے انداز میں اس کی پیش کش بھی کر رہی ہو اور یہ پیش کش قبول کر لینے کی صورت میں عزت و تکریم کا یقین بھی دلائیں اور یہ پیش کش قبول نہ کرنے کی صورت میں دھمکی بھی دیں تو پھر کیا وہ شخص یہ سب کچھ سن لینے کے بعد آخر میں انہیں یہ کہے گا:

میں جو پیغامِ حق تمہارے پاس لے کر آیا ہوں اس کی وجہ سے میں تم سے مال و دولت طلب نہیں کرتا، نہ ہی میں تم میں شرف و بزرگی چاہتا ہوں اور نہ ہی تم پر حکومت چاہتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف رسول مبعوث کیا ہے اور مجھ پر کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے لیے بشیر و نذیر بنوں، اگر تم میرے اس پیغام کو قبول کر لو تو یہ تمہاری دنیا

اور آخرت کا حصہ ہے اور اگر تم اس کو رد کر دو تو میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر صبر اختیار کروں گا اور ڈٹا رہوں گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی معاشی زندگی اور رہن سہن کا طریقہ آپ کے اس مذکورہ فرمان سے مطابقت رکھتا تھا' ایسا نہیں تھا کہ آپ زبان سے تو سرداری اور بادشاہی سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوں جب کہ پسِ پردہ ان کے حصول کے لیے کوشش میں مصروف ہوں' آپ کا کھانا پینا بہت معمولی تھا' آپ کی معاشی حالت بظاہر فقراء اور مساکین سے بہتر نہ تھی۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' آپ فرماتی ہیں: جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وصال ہوا تو اُس وقت میرے حجرے کے طاقچے میں تھوڑے سے جو تھے' اس کے علاوہ کھانے کو کچھ نہ تھا' پس میں وہی تھوڑے سے جو کچھ عرصہ تک کھاتی رہی۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زندگی بھر دستر خوان پر کھانا نہیں کھایا اور آپ نے زندگی بھر چپاتی روٹی نہیں استعمال کی۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے لباس اور گھر کی دیگر اشیاء کے معاملے میں بھی نہایت سادگی اور اختصار فرماتے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کھجور کی چٹائی پر آرام فرماتے' جس سے آپ کے جسم پر چٹائی کے نشانات پڑ جاتے اور کبھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آرام دہ نرم بستر پر لیٹنا پسند نہیں فرمایا۔

ایک دفعہ ازواجِ مطہرات جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں' آپ کے پاس آئیں اور فاقہ کی شکایت کرنے لگیں اور سب نے نان ونفقہ کی زیادتی' لباس اور زیب و آرائش کی چیزوں کی زیادتی کا مطالبہ کیا تاکہ صحابہ کرام کی ازواج سے ان کی شان زیادہ ہو اور ان کی عظمت کم تر دکھائی نہ دے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے غصے سے چہرہ مبارک جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا' حتیٰ کہ قرآن پاک کی یہ آیات نازل ہوئیں:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا	اے نبی مکرم! آپ فرما دیجئے اپنی بیبیوں کو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی آرائش (و آسائش) کی خواہاں ہو تو آؤ!

جَمِیْلًاO وَاِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَۃَ فَاِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًاO (الاحزاب:۲۹۔۲۸)	تمہیں مال و متاع دے دوں اور پھر تمہیں رخصت کردوں بڑی خوب صورتی کے ساتھO اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے جو تم میں سے نیکوکار ہیں اجرِ عظیمO

رسول اللہ ﷺ نے یہ دونوں آیتیں ان کے سامنے تلاوت فرمائیں' پھر آپ ﷺ نے ان کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو اسی حالت میں آپ ﷺ کے ساتھ زندگی گزاریں اور اگر وہ مزید نان ونفقہ' سامانِ زیب وزینت اور مال و دولت کے مطالبہ پر اصرار کریں گی تو آپ انہیں چھوڑ دیں گے اور اچھے طریقے سے رخصت کر دیں گے' یہ سن کر تمام ازواجِ مطہرات نے اسی سادگی کی حالت میں آپ کے ساتھ رہنا اختیار کر لیا۔

(صحیح بخاری' مزید تفصیل کے لیے ان دونوں آیات کی تفسیر دیکھئے ابن کثیر)

ان سب روایات کے بعد عقل و دانش والے شخص کو کیسے آپ ﷺ کی صداقت و دیانت پر شک ہو سکتا ہے اور کیسے کسی شخص کے وہم و گمان میں آ سکتا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ سرداری و حکمرانی یا مال و دولت کا طمع رکھتے تھے۔

آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے یہ مذکورہ واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ ﷺ کی دعوت خالصتاً اللہ جل وعلا کے حکم کے مطابق تھی' اس میں کسی قسم کا کوئی دنیوی لالچ نہیں تھا۔

دوسری حکمت

اس بحث سے اُس ''حکمت'' کا معنی واضح ہوتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ اختیار فرماتے اور جس پر کاربند رہتے۔

کیا حکمت یہ ہے کہ آپ دعوت کی ترویج میں جو تدبیر بھی چاہیں اختیار کر لیں خواہ اس کی جو بھی نوعیت یا کیفیت ہو؟ کیا شارع نے آپ کو یہ صلاحیت دے دی ہے کہ آپ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو راہ چاہیں اختیار کر لیں اور جو ذریعہ چاہیں اپنا لیں اگر چہ آپ

کا مقصد برحق ہی ہو؟

نہیں! اسلامی شریعت نے جس طرح مقاصد و منازل کو متعین کر دیا ہے' اسی طرح وسائل کو بھی متعین کر دیا ہے۔ شریعت نے آپ پر لازم کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ مقاصد تک رسائی کے لیے صرف وہی معینہ راستے اختیار کرو جو بتائے گئے ہیں۔

حکمت اور تدبیر کے مختلف اور معتبر کچھ معانی ہیں لیکن صرف انہی جائز اور مشروع وسائل کی حدود میں۔

اس کی دلیل وہ واقعات ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں' حکمت اور تدبیر کے ضمن میں اس بات کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ بالفرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کے ساتھ سرداری یا بادشاہی کی شرط پر مصالحت کر لیتے اور اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ کر لیتے کہ بادشاہی یا سرداری کو بعد میں دعوتِ اسلامی کی ترویج کا ذریعہ بنائیں گے' خصوصاً جب بادشاہ یا سلطان کی گرفت جب اپنی رعایا پر مضبوط ہوتی ہے تو وہ ہر کام کروا سکتا ہے' اور یہ بات بھی آپ کو معلوم ہونی چاہیے کہ مختلف نظریات اور مذاہب کے داعی حکومت پر قبضہ جمانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تاکہ اقتدار کے ذریعے لوگوں پر اپنے افکار و نظریات مسلط کر سکیں۔

لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حکمت عملی کو اور دعوت کے اس ذریعے کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ یہ بذاتِ خود دعوت کے مبادیات سے متصادم ہے۔

اگر اس طرح کے طریقے کو درست حکمت اور تدبیر کی انواع میں سے ایک قسم قرار دے دیا جائے تو پھر سچے شخص کے سچ اور جھوٹے مکار شخص کے مکر اور جھوٹ میں کوئی فرق نہیں رہے گا' اور اس طرح مخلص داعیان اور جھوٹے مکار شعبدہ باز اسی حکمت اور تدبیر کے نام پر ایک ہی راستے کے مسافر نظر آئیں گے۔

اس دین کا فلسفہ' وسیلہ اور مقصد دونوں اُمور میں شرف اور سچائی پر مبنی ہے۔ جس طرح مقصد' سچائی' شرافت اور کلمۂ حق پر قائم ہوئے بغیر درست نہیں ہو سکتا' اسی طرح اُس مقصد تک پہنچنے والے ذریعہ کو بھی سچائی' شریعت اور کلمۂ حق کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ اربابِ دعوتِ اسلامی کو بیشتر حالات میں قربانی اور جہاد کی

ضرورت ہوتی ہے' کیونکہ وہ راستہ جو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ انہیں دائیں بائیں نہیں مڑنے دیتا۔

یہ بات غلط ہوگی کہ دعوت کے سلسلے میں حکمت کی مشروعیت کا مقصد داعی کے کام کو آسان بنانا یا اس کو تکالیف سے بچانا ہے' بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جو لوگوں کی عقلوں کے زیادہ قریب ہوں' اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب حالات مختلف ہوں اور دعوت کے راستے میں بغض وعناد کی رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہوں تو اُس وقت حکمت یہ ہے کہ جہاد کی تیاری کی جائے اور جان و مال کی قربانی کے لیے تیار رہا جائے۔ حکمت یہ ہے کہ ہر چیز کو اپنی جگہ پر رکھا جائے یعنی جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو اُسی کو بروئے کار لایا جائے۔ یہ ہے فرق حکمت اور دھوکا دہی کے درمیان اور اسی طرح فرق ہے حکمت اور مصالحت کے درمیان۔

آپ اس بات سے باخبر ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بعض زعماء قریش حاضر ہوئے اور اسلام کی سمجھ حاصل کرنے کے شوق کا اظہار کیا تو آپ نے خوش ہو کر اپنی پوری توجہ ان کی طرف مبذول کی' آپ اُن سے بات چیت کرنے لگے' ان کے سوالوں کے جوابات بڑی شرح وبسط سے دے رہے تھے' ان کو حقائقِ اسلام سے آگاہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ ابن اُم مکتوم پاس سے گزرے تو باتیں سننے کے لیے رک گئے اور ایک دو سوال حضرت عبداللہ ابن اُم مکتوم نے بھی پوچھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ قریش کو اسلام کی طرف مائل کر رہے تھے تو اس لیے آپ نے اُس نابینا صحابی کی بات سے اعراض فرمایا' اس امید پر کہ اس کے سوال کا جواب بعد میں بھی دیا جا سکتا ہے' ابھی قریش سے بات چیت مکمل ہو لے' لیکن اس چھوٹی سی بات پر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عتاب فرماتے ہوئے یہ آیات نازل فرمائیں:

عَبَسَ وَتَوَلّٰىO اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰىO (عبس: ۲۔۱)

چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیاO (اس وجہ سے کہ) ان کے پاس ایک نابینا آیاO

زُعماء قریش کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہونے کی وجہ سے نابینا صحابی سے

اعراض کرنے کے بارے میں آپ ﷺ نے جو اجتہاد کیا' اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند فرمایا' اگرچہ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی کیونکہ آپ ﷺ اُس وقت دعوت پیش کر رہے تھے لیکن چونکہ اس میں ایک مسلمان کی دل آزاری تھی' لہٰذا دعوت کے معاملہ میں اتنی چھوٹی سی بات سے بھی اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا' کیونکہ آپ ﷺ نے مشرکین قریش کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے نابینا صحابی سے اعراض فرمایا تھا' اتنی سی بات بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر مقبول ہے۔

خلاصہ

کسی بھی انسان کے لیے جائز نہیں کہ وہ حکمت اور نصیحت کے نام پر اسلام کے احکام و مبادی میں تغیر و تبدل کرے یا اسلام کی حدود سے تجاوز کرے یا ان حدود کو غیر ضروری سمجھے کیونکہ وہی حکمت اور مصلحت جائز اور مشروع ہے جو اسلام کی حدود و قیود اور اخلاقِ حسنہ کے دائرے میں ہو۔

تیسری حکمت

جب قریش نے آپ ﷺ کو دعوت ترک کرنے کی شرط پر مختلف تجاویز پیش کیں اور آپ کو سرداری و حکمرانی دینے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس کے جواب میں آپ ﷺ نے جو مؤقف اختیار فرمایا' اس میں ہمارے لیے بہت زیادہ نصیحتیں ہیں' یہ مؤقف آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی خالص مدد و تائید سے اختیار فرمایا' جملہ مفسرین کا کہنا ہے کہ اسی موقع پر یہ آیاتِ بینات نازل ہوئیں:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ	اور کفار نے کہا: ہم ہرگز ایمان نہیں
لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًاۙ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ	لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ
جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ	کردیں ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ O
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًاۙ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ	یا (لگ کر تیار) ہو جائے آپ کے لیے
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ	ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا پھر آپ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًاۙ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ	جاری کر دیں ندیاں جو اس باغ میں (ہر
مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ	طرف) بہہ رہی ہوں O یا آپ گرا دیں

نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۝ (الاسراء: ۹۳۔۹۰)

آسمان کو جیسے آپ کا خیال ہے ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے یا آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو (بے نقاب کر کے) ہمارے سامنے لے آئیں۝ یا (تعمیر) ہو جائے آپ کے لیے ایک گھر سونے کا' یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں بلکہ ہم تو اس پر بھی ایمان نہ لائیں گے کہ آپ آسمان پر چڑھیں یہاں تک کہ اتار لائیں ہم پر ایک کتاب جسے ہم پڑھیں' آپ (ان سب خرافات کے جواب میں اتنا) فرما دیں کہ میرا رب (ہر عیب سے) پاک ہے' میں کون ہوں مگر آدمی (اللہ کا) بھیجا ہوا۝

قریش کے مطالبات کے مطابق ان کو دنیوی اموال و اسباب نہ ملنے کا سبب یہ نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کو قرآن پاک کے معجزہ کے علاوہ کوئی معجزہ نہ عطا کیا گیا' جس وجہ سے قریش کے مطالبات پورے نہ ہوئے۔

یہ خیال غلط ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دیگر بے شمار معجزات عطا فرمائے' قریش کو اُن کے مطالبات کے مطابق دنیوی فراخی نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ اللہ عزوجل اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ قریش یہ مطالبات کفر و عناد اور مذاق و استہزاء کے طور پر کر رہے ہیں جیسا کہ ان کے مطالبات کے اسلوب اور نوعیت سے ظاہر ہے۔

اگر اس میں ان کا صدقِ طلب' حسن نیت اور واقعی اسلام قبول کرنے کا ارادہ ہوتا تو اللہ عزوجل ضرور ان کو ان کے مطالبات کے مطابق رزق میں فراخی عطا فرماتا اور عرب میں نہریں اور چشمے جاری فرما دیتا' لیکن قریش کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق تھا' جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں ارشاد فرمایا:

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ

اور اگر ہم کھول بھی دیتے ان پر

السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ○ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ○ (الحجر: ۱۴۔۱۵)

دروازہ آسمان سے اور وہ سارا دن اس میں سے اوپر چڑھتے رہتے○ پھر بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری تو نظریں بند کر دی گئی ہیں بلکہ ہم ایسی قوم ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے○

اس سے معلوم ہوا کہ قریش کے مطالبہ معجزات کو پورا نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزات عطا ہی نہیں فرمائے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب اکرم ﷺ کو بے شمار معجزات عطا فرمائے ہیں' جو مختلف واقعاتِ سیرت سے ثابت ہیں۔ قریش کے ساتھ معاملے اور اس بات میں کوئی تضاد نہیں۔

اقتصادی مقاطعہ

حضرت موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق وغیرہ سے مختلف اسناد سے روایات موجود ہیں کہ قریش بالآخر رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے پر جمع ہو گئے' یہ بات انہوں نے قبیلہ بنو ہاشم اور قبیلہ بنو مطلب سے کی لیکن ان دونوں قبیلوں نے آپ ﷺ کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا' جب قریش آپ کو قتل کرنے کے منصوبے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے آپ ﷺ' آپ کے صحابہ اور بنو ہاشم و بنو مطلب میں سے جو آپ کے حمایتی تھے' ان سب سے مقاطعہ و بائیکاٹ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس پر انہوں نے ایک معاہدہ تحریر کیا جس پر تمام مشرکین نے رضامندی کا اظہار کیا' اس معاہدے میں لکھا تھا کہ

(۱) کوئی شخص ان سے شادی بیاہ نہ کرے۔

(۲) کوئی شخص ان سے کسی قسم کی خرید و فروخت نہ کرے۔

(۳) کوئی شخص ان کو کھانے پینے کا کوئی سامان مہیا نہ کرے۔

(۴) ان سے کسی قسم کی کوئی صلح نہ کی جائے اور نہ ہی ان سے کوئی میل ملاپ رکھا جائے اور نہ اُن سے نرمی برتی جائے جب تک کہ بنو مطلب' رسول اللہ (ﷺ) کو قتل کے لیے ہمارے حوالے نہ کر دیں' اس معاہدے پر سختی سے عمل ہو گا۔

یہ معاہدہ لکھ کر انہوں نے کعبہ کے درمیان آویزاں کر دیا' قریش تین برس تک اس

معاہدے و مقاطعے کے پابند رہے' یہ عرصہ بعثت کے ساتویں سال محرم سے شروع ہو کر بعثت کے دسویں سال تک جاری رہا۔

ایک قول کے مطابق یہ مقاطعہ و بائیکات صرف دو سال جاری رہا۔

موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ حضور ﷺ کے صحابہ کرام کو حبشہ کی طرف ہجرت کے حکم سے پہلے لکھا گیا' آپ ﷺ نے اس مقاطعہ کے دوران صحابہ کرام کو ہجرت حبشہ کا حکم دیا۔

لیکن ابن اسحاق کی روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بائیکاٹ کا معاہدہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد اور صحابہ کرام کی حبشہ کی طرف ہجرت کے بعد لکھا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے ساتھ بنو ہاشم' بنو مطلب اور اس کے علاوہ جتنے بھی مسلمان تھے' سب کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا گیا' یاد رہے کہ مکہ میں مختلف ناموں سے متعدد گھاٹیاں ہیں۔ شعب ابی طالب میں بنو ہاشم' بنو مطلب اور مسلمانوں کے علاوہ کچھ کفار بھی محصور تھے' مسلمان تو اس وجہ سے کہ انہوں نے دین اسلام کو اختیار کیا اور کچھ کفار اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کے حمایتی تھے اور انہوں نے اپنے خاندان اور قبیلے کا ساتھ دیتے ہوئے آپ ﷺ کے ساتھ شعب ابی طالب نامی گھاٹی میں محصور ہونا قبول کیا۔ آپ ﷺ کے قبیلہ میں سے صرف ابولہب' عبد العزیٰ بن عبد المطلب نے اپنے قبیلے کا ساتھ نہ دیا' بلکہ وہ قریش کے ساتھ جا ملا' نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی مخالفت میں۔

آپ ﷺ نے اور آپ کے ساتھیوں نے یہ بائیکاٹ کے تین سال بہت مشکلات اور مصائب میں بسر کیے' ان سخت اور کٹھن حالات میں صحابہ کرام نے درختوں کے پتے اور سوکھا چمڑا تک کھایا۔

سہیلی ذکر کرتے ہیں کہ جب بھی کوئی قافلہ غلہ لے کر مکہ آتا تو کوئی صحابی جب بازار میں کھانے پینے کی کوئی چیز خریدنے کے لیے جاتا تو ابولہب کھڑا ہو جاتا اور کہتا: اے تاجروں کے گروہ! محمد (ﷺ) کے اصحاب پر غلہ مہنگا کر دو تاکہ یہ نہ خرید سکیں' پس وہ تاجر قیمتوں میں کئی گنا اضافہ کر دیتے حتیٰ کہ صحابہ بغیر کچھ خریدے واپس اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ آتے' اس حال میں کہ ان کے بچے بھوک سے بلک رہے تھے' لیکن بچوں کو کھلانے کے لیے

کوئی شے ان کے ہاتھوں میں نہ ہوتی جس سے ان کی دلجوئی ہو پاتی۔

جب اس مقاطعہ کو تین برس بیت گئے تو بنو قصی قبیلہ میں سے ایک گروہ نے قریش کو ملامت کی اور اس معاہدے کو توڑنے کے لیے اُن پر دباؤ ڈالا' اُدھر اللہ عزوجل نے اُس لکھے ہوئے معاہدے کی دستاویز پر دیمک کو مسلط کر دیا' جس نے دستاویز پر لکھی ہوئی ساری تحریر کو چٹ کر دیا' اُن کلمات میں سے صرف اللہ عزوجل کے نام والے کلمات محفوظ اور باقی رہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیمک کے چٹ کر جانے کی خبر اپنے چچا جناب ابوطالب کو دی' جناب ابوطالب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: کیا آپ کے رب نے آپ کو اس کی خبر دی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! یہ سنتے ہی جناب ابوطالب' قریش کے مجمع میں گئے' آپ نے کہا: وہ معاہدہ لاؤ! میں اُس پر آپ سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں جس سے اُن کو وہم ہوا کہ شاید جناب ابوطالب ہماری شرائط ماننے کے لیے تیار ہیں' پس وہ معاہدہ لائے جو لپٹا ہوا تھا' ابوطالب نے کہا: میرا بھتیجا جس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' اُس نے مجھے خبر دی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اس دستاویز پر دیمک مسلط کر دی ہے جس نے اس کی تحریر کو ختم کر دیا ہے۔ جس میں قطع رحمی اور جور وظلم کی باتیں لکھی ہوئی تھیں' اگر واقعی ایسی بات ہے جیسے میرے بھتیجے نے کہا ہے تو پھر تمہیں بھی ان کی موافقت کرنی چاہیے اور اپنے بُرے ارادے سے رجوع کر لو' خدا کی قسم! ہم کبھی بھی ان کو تمہارے حوالے نہیں کریں گے یہاں تک کہ ہم سب جان کی بازی لگا دیں گے اور جو میرے بھتیجے نے دیمک والی خبر دی ہے اگر واقعتاً ایسا نہیں ہوا تو ہم ان کو تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں' پھر تم جو چاہو ان کے ساتھ سلوک کرو۔ قریش نے کہا: جو آپ کہتے ہیں ہم اُس پر راضی ہیں' پس انہوں نے وہ لپٹا ہوا معاہدہ کھولا تو ایسے ہی دیمک سے کھایا ہوا پایا جس طرح صادق و مصدوق رسول نے خبر دی تھی' اس پر قریش کہنے لگے: تیرے بھتیجے نے جادو کر دیا ہے' اس سے قریش کے غیض وغضب میں مزید اضافہ ہوا۔

پھر قریش کے پانچ مشرک سردار اس معاہدہ کو توڑنے اور اس بائیکاٹ کو ختم کرنے کے لیے چلے' وہ پانچ سردار ہشام بن عمرو بن الحارث' زہیر بن امیہ' مطعم بن عدی' ابوالبختری بن ہشام اور زمعہ بن الاسود تھے' جس نے سب سے پہلے علی الاعلان اس مقاطعہ کو توڑنے کی سعی کی وہ زہیر بن امیہ تھا' وہ کعبہ میں جمع لوگوں کے پاس آیا اور کہا: اے اہل مکہ! کیا ہم کھانا

نہیں کھاتے' کپڑے نہیں پہنتے؟ بنو ہاشم اور بنو مطلب خرید وفروخت پر پابندی کی وجہ سے ہلاک ہونے والے ہیں' خدا کی قسم! میں اس ظلم پر مبنی معاہدے و مقاطعے کو پھاڑ کر ہی رہوں گا۔

پھر باقی سردار بھی اٹھے اور انہوں نے بھی ایسی ہی باتیں کہیں' پھر مطعم بن عدی اُس معاہدے کی دستاویز کی طرف بڑھا اور باقی ماندہ دستاویز کو پھاڑ دیا' پھر یہ پانچوں سردار اور ان کے ساتھ لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت شعب ابی طالب میں بنو ہاشم' بنو مطلب اور مسلمانوں کے پاس گئی اور انہیں اپنے گھروں کو واپس جانے کا کہا۔

اسباق ونصائح

اس ظلم پر مبنی مقاطعہ سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو تین سال تک کتنی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اور آپ نے دیکھا کہ قبیلہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے مشرکین بھی اس بائیکاٹ میں مسلمانوں کے ساتھ مصائب برداشت کرتے رہے' وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ آپ ﷺ کو اکیلے چھوڑ دیں۔ یہاں یہ بحث کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں کہ ان کے اس مؤقف کا سبب کیا تھا' قطع نظر عقیدہ اور دین کے وہ لوگ آپ ﷺ کی حفاظت وحمایت' ان سے قرابت داری اور رشتہ داری کے جذبے کے تحت کر رہے تھے' اس لیے وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے علاوہ قریش کے دوسرے خاندانوں کے مشرکین کو یہ چھوٹ نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ (معاذ اللہ) محمد ﷺ کو قتل کر دیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی دو خواہشات کو ترجیح دی اور ان کو یکجا کر دیا۔

پہلی: شرک پر قائم رہنا اور جس حق کو محمد ﷺ لے کر آئے تھے' اُس سے روگردانی اختیار کرنا۔

دوسری: حمیت اور رشتہ داری کا اظہار کرنا جس کی بناء پر آدمی دوسروں کے ظلم وستم کے مقابلے میں اپنے قریبی رشتہ دار کی حفاظت وحمایت کرتا ہے' اگر چہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔

مسلمان اور اُن میں سرفہرست رسول اللہ ﷺ جنہوں نے ان تکالیف اور سختیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا' صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حکم پر سرتسلیم خم کرتے ہوئے اور آخرت کو دنیا

پر ترجیح دیتے ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے مقابلے میں دنیا ان کے سامنے کم تر تھی۔ یہاں اس موضوع پر بحث کرنا اہمیت کا حامل ہے۔ سنا ہے کہ اسلام کے خلاف فکری یلغار کرنے والے بعض اہل باطل کہتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے پیچھے بنو ہاشم اور بنو مطلب کی عصبیت کارفرما تھی جو ان کی حفاظت اور حمایت کر رہی تھی۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ مشرکین قریش نے جب مسلمانوں سے مقاطعہ کیا تو اس موقعہ پر انہوں نے سلبی مؤقف اختیار کیا' یہ کھلا مغالطہ ہے' اس پر عقل و منطق کا کوئی حجاب نہیں' اس لیے کہ یہ چیز تو بالکل طبعی اور فطری تھی کہ بنو مطلب اور بنو ہاشم اپنے بھتیجے کی حفاظت کے لیے حمیت جاہلی پر عمل پیرا ہوں جس وقت ان کے بھتیجے کو کوئی اجنبی ہاتھ دھمکی دے رہا ہے اور برائی کے ارادے سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

حمیت جاہلی جب قرابت داروں کو اس قسم کے تعصب پر اُبھارتی ہے تو ان کے سامنے پھر کوئی اصول اور ضابطہ نہیں رہتا' اس معاملے میں وہ حق یا باطل سے متاثر نہیں ہوتے' ان کے سامنے صرف عصبیت ہوتی ہے اور عصبیت کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔

اس لیے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام نہ قبول کرنے والے رشتہ داروں میں دو متضاد صفات جمع ہو گئیں:

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے نتیجے میں غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ کی دعوت کا انکار کرنا۔

(۲) قریش کے سب مشرکین کے مقابلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد و حمایت کرنا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچا جائے کہ اس سب کا فائدہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اور آپ کے مشن کو کیا ہوا؟ حالانکہ اُن حمایتی مشرکین کو بھی ایسے ہی ایذائیں دی گئیں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ کرام کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

لیکن اہم بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام نہ قبول کرنے والے رشتہ داروں کی حمایت آپ کی رسالت و نبوت اور دعوت کی حمایت نہ تھی بلکہ ان کی حمایت صرف شخصی' انفرادی اور خاندان و قبیلہ کی وجہ سے تھی۔

اگر مسلمانوں نے اس حمایت کا فائدہ اٹھایا اور اس کو جہاد اور کافروں پر غلبہ حاصل

کرنے اور ان کی سازشوں اور دشمنی کے خلاف ایک جدوجہد کا ایک ذریعہ بنایا ہوتا تو ان کی یہ کوشش بہت مبارک ہوتی اور یہ سبیل بڑی کارگر ہوتی۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے صحابہ کا تعلق ہے تو وہ کون سی ایسی چیز تھی جو ان کو اس تنگ ماحول میں بھی اس پر قائم رکھے ہوئے تھی' اور اس شدت اور تکلیف کے مقابلے میں قائم رہ کر وہ کس مقصد کے حصول کے متمنی تھے؟ اس سوال کا جواب ایسے لوگ کیا دیں گے جو حضرت محمد ﷺ کی رسالت اور آپ پر ایمان لانے والے صحابہ کے ایمان کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ یہ دائیں بازو کے خلاف بائیں بازو کی بغاوت ہے یعنی مال دار اور عیاش لوگوں کے خلاف غریب اور مظلوم لوگوں کی بغاوت تھی۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ پر ہونے والے ظلم و ستم کے جو واقعات ہم نے پیش کیے ان کو تصور میں لائیں' پھر اس کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیں۔ دعوتِ اسلامی کو ایسی معاشی بغاوت سے کیسے ملایا جا سکتا ہے جسے بھوک نے بھڑکایا ہو اور مکہ کے تاجروں اور وہاں کے اقتصادی ساہوکاروں کے خلاف نفرت و بغض نے ہوا دی ہو؟ مشرکین نے آپ ﷺ پر بادشاہی' مال داری اور سرداری پیش کی' اس شرط پر کہ آپ دعوتِ اسلامی سے دست بردار ہو جائیں' تو آپ ﷺ پھر اس پر راضی کیوں نہ ہوئے؟ آپ ﷺ کے صحابہ نے اگر ان کا مقصد بھوک سے نجات اور خوش حالی تھا' آپ ﷺ پر قریش کی ان پیش کردہ تجاویز کو قبول کرنے کے لیے دباؤ کیوں نہ ڈالا؟

کیا بائیں بازو کی بغاوت والے اپنے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ڈور اور جیبوں میں مال و دولت سے بڑھ کر کچھ چاہتے تھے؟

آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کا آپ کے خاندان والوں کے ساتھ مکمل اقتصادی اور سماجی مقاطعہ کیا گیا تو یہ لوگ اپنا سب کچھ یعنی اپنا مال و دولت' جائیداد' رشتہ دار اور کاروبار چھوڑ کر شعب ابی طالب نامی گھاٹی میں محصور ہو گئے چنانچہ کوئی سامانِ تجارت ان کے ہاتھوں تک نہ پہنچ پاتا اور کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے گھروں میں داخل نہ ہو پاتی' یہاں تک کہ وہ درختوں کے پتے کھاتے رہے اور مشکلات کا سامنا کرتے رہے اور صبر کا مظاہرہ کرتے رہے اور ہر صورت میں آپ ﷺ کا ساتھ دیتے رہے' کیا جن کا ارادہ اور مقصد اقتصادی انقلاب

لانا ہوتا ہے وہ یوں کرتے ہیں؟

جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ ﷺ سے پہلے اور بعد میں جملہ صحابہ کرام نے بھی ہجرت کی اور اپنا مال' اپنی جائیداد اور اپنی جملہ ملکیتی چیزوں کو مکہ چھوڑ دیا اور مدینۃ المنورہ کی طرف عازمِ سفر ہوئے تو کیا جو لوگ مال و دولت کے لالچی ہوتے ہیں' وہ اس طرح ایک حکم پر اپنا سب کچھ یوں چھوڑ سکتے ہیں؟ لیکن صحابہ کرام نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے بدلے میں سب کو خیر باد کہہ دیا' کیونکہ ان کے سامنے دنیا اور دنیا کی حکمرانی کی کوئی قیمت نہ تھی۔

کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بائیں بازو کی بغاوت روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے برپا کی گئی تھی؟

اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والے کبھی اپنے مؤقف پر مندرجہ ذیل دو دلیلوں کو پیش کرتے ہیں:

اوّل: مکہ میں آپ ﷺ کے اصحاب کی پہلی جماعت جن میں سے زیادہ تر غلام' غرباء اور فقراء تھے' یہ محمد (ﷺ) کی اتباع اس لیے کرتے تھے تاکہ غربت و فقر کے کرب سے نجات حاصل کریں اور اس نئے دین کے سائے میں وہ یہ اُمید لگائے ہوئے تھے کہ مستقبل میں ان کی اقتصادی صورتِ حال بہتر ہوگی۔

دوم: ان اوّلین مسلمانوں کا مشقت میں تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ جب مسلمانوں پر دنیا کے نئے اُفق کھلے اور مال و دولت کی ریل پیل ہوئی' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول (ﷺ) کا مقصد یہی اقتصادی انقلاب تھا۔

جب مخالفین اسلام کی طرف سے لگائے گئے ان الزامات کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے یہی بات سامنے آتی ہے کہ یہ سب کچھ ان کا وہم و گمان اور جھوٹا خیال ہے۔

اگرچہ یہ بات درست ہے کہ صحابہ کرام کی اُس پہلی جماعت کے زیادہ تر لوگ غرباء اور غلام تھے' لیکن پھر بھی اس حقیقت اور مخالفینِ اسلام کے اُس جھوٹے وہم کے درمیان دور کا بھی کوئی تعلق اور واسطہ نہیں' جو شریعت لوگوں کے درمیان عدل و مساوات قائم کرنا اور ہر ظالم' مغرور اور سرکش کو لگام دینا چاہے گی' یہ بات مسلّمہ ہے کہ اس سے وہ تمام لوگ نہ صرف

اعراض کریں گے بلکہ اس کے خلاف برسرِ پیکار ہوں گے جو ظلم و ستم اور سرکشی کی زندگی گزارنے کے عادی ہوں' اس لیے کہ اس شریعت سے انہیں فائدوں سے زیادہ نقصانات حاصل ہوں گے' اسی طرح یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ اس شریعت کا ہر وہ شخص استقبال کرے گا جو کمزور اور مظلوم ہو اور جس کا سرکشی اور استحصال کی تجارت میں کوئی حصہ نہ ہو' کیونکہ اس طرح اس کو نقصانات سے زیادہ فائدے حاصل ہوں گے' یا کم از کم دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات ایسے نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ اس شریعت کی ذمہ داریوں اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے میں گرانی محسوس کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے گرد جمع ہونے والے اکثر لوگوں کو یہ یقین تھا کہ آپ ﷺ حق پر ہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں' لیکن سرداری' عظمت اور اقتدار کے دل دادہ لوگ اس حق کے سامنے رکاوٹ بن گئے جب کہ دوسرے لوگ جو اس پر ایمان لے آئے تھے اور یقین کرلیا تھا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے ان کو کوئی روکنے والا نہیں تھا۔

یہ حقیقت ہے جو ہر شخص کی سمجھ میں آجاتی ہے' اس حقیقت اور باطل گمان کرنے والوں کے خیالات کے درمیان کیا تعلق ہے؟

اس کے علاوہ جو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ اسلامیہ کی صورت میں جو پروگرام دیا تھا' اس کا مقصد مسلمانوں کو اقتصادی لحاظ سے مضبوط کرنا اور بادشاہی کے تختوں پر بٹھانا تھا' جو بالآخر پورا ہوا اور مسلمانوں کو دنیا کے متعدد ممالک کی حکمرانی مل گئی۔

اسلام اور مسلمانوں پر یہ اعتراض کرنا بھی مشرق و مغرب کو آپس میں ملا دینے کے مترادف ہے۔

جب مسلمانوں کو اپنے دین پر کاربند رہنے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر پکا یقین رکھنے کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کو بلادِ روم و فارس کی فتح سے نوازا اور وہاں مسلمانوں کو تمکنت عطا کی اور مسلمانوں کے ہاں دنیا کی ہر چیز کی ریل پیل ہوگئی تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں نے بلادِ روم و فارس کی تخت نشینی اور دولت کے طمع میں اسلام قبول کیا؟

اگر اسلام قبول کرنے کی آڑ میں مسلمانوں کا ارادہ دنیوی مال و دولت کا حصول اور

دنیوی خواہشات ہوتیں تو ہرگز فتوحات کے یہ معجزات دنیا کے سامنے رونما نہ ہوتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنہوں نے جیشِ قادسیہ تیار کیا اور اس کی قیادت حضرت سعد بن ابی وقاص کے سپرد کی' اگر اس لشکر کشی کا مقصد کسریٰ کے خزانوں کا حصول ہوتا یا دنیوی مال و دولت کی تمنا ہوتی یا تخت و تاج کے حصول کی تمنا ہوتی تو ہرگز حضرت سعد فتح و نصرت کی خوش خبری لے کر نہ لوٹتے بلکہ ان کو شکست و ذلت کا سامنا کرنا پڑتا' لیکن ان سب معرکوں میں اُن مسلمانوں کے پیشِ نظر دین اسلام کی نصرت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا' جب اللہ تعالیٰ راضی ہوا تو خدا تعالیٰ نے پھر مسلمانوں کو زمین میں حکومت بھی عطا کی' مال و دولت سے بھی نوازا اور خزانوں کی کنجیاں بھی عطا فرمائیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

معرکۂ قادسیہ میں اگر مسلمانوں کا مقصد ثروت و دولت اور عیش و عشرت کا حصول ہوتا تو حضرت ربعی بن عامر رستم کے پنڈال میں گھس کر سب کچھ تباہ و برباد نہ کرتے۔

حضرت ربعی بن عامر جب رستم کے پنڈال میں داخل ہوئے تو اس کی عیش و عشرت اور شاہانہ طرزِ عمل پر نفرت کا اظہار کیا' آپ نے اپنے نیزے سے وہاں پڑے ہوئے قالینوں اور مفاخرانہ گاؤ تکیوں کو تہس نہس کر دیا اور آپ رضی اللہ عنہ نے رستم سے یہ نہ فرمایا ہوتا: اگر تم اسلام قبول کرتے ہو تو ہم تمہاری زمین اور تمہارے اموال تمہارے لیے چھوڑ دیں گے اور تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

یہ بات بہت غور طلب ہے کہ کیا جو فاتح' حکومت' مال و دولت اور زمین کے حصول کی نیت سے آئے وہ ایسی بات کہتا ہے؟ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان جہاں جہاں بھی فتوحات کرتے گئے' یہ سب کچھ دین اسلام کی خاطر اور دنیا میں امن قائم کرنے کی غرض سے تھا' ان سے جاہ و منصب اور حکومت کا حصول مقصد نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے مسلمانوں کو دنیا میں عزت و تکریم عطا کی کیونکہ مسلمانوں نے کبھی بھی دنیوی جاہ و منصب کے حصول کی تمنا ہی نہیں کی تھی' مسلمانوں کے پیشِ نظر ہر معرکے میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی تھی' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کیا' اگر اس جہاد سے مسلمانوں کا مقصد دنیوی چیزوں کا حصول ہوتا تو یہ ہر صورت میں محروم رہتے۔

قانونِ الٰہی میں اگر غور و فکر کریں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ (القصص:۵)

اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں اُن لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں اور بنا دیں انہیں پیشوا اور بنا دیں انہیں (فرعون کے تخت و تاج کا) وارث ۝

یہ قانونِ الٰہی ایک عقل مند انسان کو بڑی آسانی سے سمجھ آ سکتا ہے' اس شرط پر کہ وہ ہر غرض' رغبت اور تعصب سے بالاتر ہو کر اس میں غور و فکر کرے اور اس پر عمل کرے۔

اسلام میں پہلی ہجرت

جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مسلمانوں پر کفار نے اپنے ظلم و ستم سے عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے اور مسلمان ان سے محفوظ نہیں ہیں تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ارشاد فرمایا:

اگر تم سرزمین حبشہ کی طرف نکل جاؤ تو یہ بہتر ہے کیونکہ وہاں ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا' وہ بھلائی کی سرزمین ہے' جب تک اللہ تعالیٰ تمہاری مصیبت کو رفع نہیں کر دیتا تم وہیں ٹھہرے رہو۔

یہ ارشاد سنا تو فتنہ فساد سے تنگ آئے ہوئے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت کے لیے حبشہ کی طرف رختِ سفر باندھ لیا' یہ اسلام میں مسلمانوں کی پہلی ہجرت تھی۔ ان مہاجرین میں سرفہرست حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور آپ کی زوجہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ' ابو حذیفہ اور آپ کی زوجہ' زبیر بن عوام' مصعب بن عمیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ شامل تھے' حتیٰ کہ حبشہ کو ہجرت کرنے والے صحابہ کرام کی تعداد اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ ہو گئی۔[1]

قریش نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان تو آہستہ آہستہ حبشہ کو ہجرت کر رہے ہیں اور

[1] یہ روایت صحیح ہے جیسا کہ ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں اس کے متعلق ذکر کیا ہے۔ (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۳۰' نیز دیکھیے: فتح الباری ج ۷ ص ۱۳۰)

ہمارے چنگل سے آزاد ہو رہے ہیں تو انہوں نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی طرف عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص (جو اُس وقت مسلمان نہ ہوئے تھے) کو نجاشی اور اس کے وزیروں اور مشیروں کے لیے بے شمار مختلف قسم کے تحائف دے کر بھیجا اور نجاشی سے درخواست کی کہ وہ ان مسلمانوں کو اپنے علاقے میں پناہ دینے سے انکار کر دے اور تمام مسلمانوں کو ہمارے حوالے کر دے۔

جب ان دونوں نے نجاشی کے دربار میں پہنچ کر اس مسئلے پر بات کی، حالانکہ یہ دونوں سفیر نجاشی سے پہلے اُس کے وزیروں اور مشیروں کو تحائف پیش کر کے اپنی بات پر قائل کر چکے تھے، تو نجاشی نے جب یہ بات سنی تو اُس نے مسلمانوں میں سے کسی ایک کو بھی اُن کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کے اس دینِ جدید کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں، تو مسلمانوں کو اور ان دونوں قریش کے سفیروں کو نجاشی کے سامنے لایا گیا۔ نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا: یہ کیسا نیا دین ہے جس کو اختیار کر کے تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا ہے؟ اور پھر نہ تم میرے دین میں داخل ہو اور نہ ہی کسی دوسری ملت کے دین میں تم نے شمولیت اختیار کی۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، رشتہ داروں سے قطع تعلق کرتے تھے، اپنے پڑوسیوں کو محروم رکھتے اور ہم میں سے طاقت ور کمزور کو ہڑپ کر جاتا، ہم اسی طریقے پر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ہی ایک رسول مبعوث کیا جس کے حسب، نسب، صداقت، امانت اور پاک دامنی کو ہم پہلے سے جانتے تھے اُس نے ہمیں ایک خدا کی طرف دعوت دی اور اس کی ہی عبادت کرنے کا حکم دیا، ہمارے آباء و اجداد جو پتھروں اور بتوں کی پوجا کرتے اُس سے ہمیں روکا اور ہمیں سچی بات کرنے، امانت کو ادا کرنے اور صلہ رحمی کا حکم دیا اور ہمیں بُرائیوں اور فحش کاموں سے منع کیا، پس ہم نے ان کی تصدیق کی اور اُس پر ایمان لائے اور وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام لے کر آئے ہم نے اس کی اتباع کی، بس اس وجہ سے ہماری قوم ہماری دشمن ہوگئی، انہوں نے ہمیں طرح طرح کی تکالیف دیں اور طرح طرح سے ستایا تا کہ ہم دوبارہ بتوں کی پوجا کی طرف

لوٹ جائیں' جب انہوں نے ظلم و جبر کی حد کر دی اور زمین ہم پر تنگ کر دی تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکلے' دوسروں کے مقابلے میں ہم نے آپ کے زیر سایہ زندگی گزارنے کا ارادہ کیا تا کہ آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہ کیا جائے۔

نجاشی نے یہ سن کر کہا کہ تمہارا رسول جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام لے کر آیا ہے اُس میں سے سناؤ؟ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات سنائیں' کلامِ الٰہی سن کر نجاشی رو پڑا حتیٰ کی اُس کی ڈاڑھی بھیگ گئی' پھر اُس نے کہا: خدا کی قسم! یہ تو وہی پیغام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے۔

پھر نجاشی قریش کے دونوں سفیروں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: یہاں سے واپس چلے جاؤ' خدا کی قسم! میں کسی ایک کو بھی تمہارے حوالے نہیں کروں گا' یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

(دوسرے روز) یہ دونوں سفیر دوبارہ نجاشی کی طرف لوٹے اور کہا: اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں بڑی عجیب بات کہتے ہیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو دوبارہ بلوایا اور اُن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پوچھا' حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہم اُن کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کی طرف سے روح اور اس کے کلمہ ہیں' جو اُس نے کنواری پاک دامن مریم کی طرف القاء کیا تھا' یہ سن کر نجاشی نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور ایک تنکا اُٹھایا' پھر کہا: خدا کی قسم! عیسیٰ ابن مریم کے بارے جو آپ نے کہا عیسیٰ ابن مریم اس تنکے کے برابر ذرا بھی زیادہ نہیں تھے۔ پھر نجاشی نے قریش کے دونوں سفیروں کے تحفے واپس کر دیئے اور دربار سے چلے جانے کو کہا اور اپنی سلطنت میں پناہ لینے والے مسلمانوں کی حفاظت میں مزید اضافہ کیا' یوں قریش کے سفیر خائب و خاسر مکہ لوٹے۔

کچھ عرصہ کے بعد حبشہ میں رہنے والے مسلمانوں نے یہ خبر سنی کہ اہل مکہ مسلمان ہو گئے ہیں تو مسلمانوں نے مکہ کا سفر شروع کر دیا' جب مکہ کے قریب پہنچے تو پتا چلا کہ اہل مکہ کے مسلمان ہونے کی خبر جھوٹی تھی' پھر یہ جو تینتیس (۳۳) کے قریب مرد تھے کچھ تو واپس چلے گئے اور کچھ نے مکہ میں رہنے والے لوگوں کی پناہ حاصل کر لی' حضرت عثمان بن مظعون' ولید

بن مغیرہ کی پناہ میں داخل ہوئے اور ابو سلمہ' جناب ابو طالب کی پناہ میں داخل ہوئے۔

اسباق ونصائح

مسلمانوں کی حبشہ کی طرف ہجرت کے واقعہ سے ہم تین قسم کے اسباق حاصل کرتے ہیں:

پہلا سبق

بے شک دین اسلام' اس کی پیروی اور اس پر پوری طرح عمل کرنا ہی ہر قوت کی اساس اور سر چشمہ ہے۔ یہی دین اسلام ہی مال' زمین' آزادی اور عزت و کرامت سے تمام حقوق کی حفاظت کا ضامن ہے۔

اس لیے دعوت دین کا کام کرنے والوں اور دین کے راستے میں جہاد کرنے والوں پر واجب اور ضروری ہے کہ وہ اپنی جملہ توانائیاں دین اسلام کی بنیادوں کی حفاظت پر صرف کریں' اور اپنا وطن' اپنی سرزمین' اپنا مال اور اپنی جان کو دین اسلام کے تحفظ کے لیے استعمال کریں اور جس وقت جس قربانی کی ضرورت پڑے وہی چیز اللہ کے راستے میں نچھاور کی جائے۔

اس وجہ سے کہ اگر دین پر غیر کا غلبہ ہو گیا یا دین مفقود ہو گیا تو اس کا ازالہ وطن' مال اور سرزمین نہیں کر سکتے' لیکن اگر ان دنیوی چیزوں کو یعنی وطن' مال جان وغیرہ کو دین کی سر بلندی اور حفاظت کے لیے خرچ کیا جائے جس سے دین کے عقائد مضبوط ہوں' معاشرے میں اس کی بنیادیں قائم ہوں اور لوگوں کے دلوں میں اس کا عقیدہ راسخ ہو تو اس راستے میں جو مال' وطن' سرزمین جو کچھ بھی قربان کیا ہوگا وہ دین کے غلبہ کی وجہ سے واپس مل جائے گا' بلکہ پہلے سے زیادہ قوی اور مضبوط ہو کر لوٹے گا۔

تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کائنات میں یہی سنت الٰہیہ رہی ہے کہ معنویت یعنی صحیح عقیدہ اور باطن جب مضبوط اور قوی ہوتا ہے تو یہی قوت پھر مادیت اور ظاہر کو مضبوط کرتی ہے۔

کوئی بھی امت جب اپنے عقائدِ سلیمہ' اخلاق حسنہ اور صحیح اجتماعی بنیادوں پر مضبوط اور کاربند رہتی ہے تو مادی قوت و سلطنت بھی اس کے پاس رہتی ہے' اور جب اپنے اخلاق'

عقائد اور معاشرتی و سماجی نظم و ضبط میں کمزور ہوتی ہے تو مادی و ظاہری قوت بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کوئی قوم اپنے عقیدے میں کمزور اور اپنے اجتماعی و انفرادی اخلاق میں انحطاط کا شکار ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مادی اعتبار سے قوی اور مضبوط ہوتی ہے لیکن حقیقت اور واقعیت کے اعتبار سے وہ بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ انحطاط کا شکار ہو رہی ہوتی ہے' اس کا سبب یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کے مقابلے میں ایک انسان کی عمر بہت کم ہوتی ہے' ایک انسان اپنے ذاتی مشاہدے سے اس میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا بلکہ پوری تاریخ کے آئینے میں اس کی جانچ ہوتی ہے اور دور تک تاریخ کا مطالعہ کرنے سے کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔

کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی قوم جو ایک وقت میں اپنے عقائد صحیحہ پر قائم تھی اور جملہ بہتر اخلاق اُس میں پائے جاتے تھے لیکن وہ ظاہری و مادی قوت اور سلطنت سے محروم ہوتی ہے' اور جب وہ ان چند ظاہری اسباب کو بھی دین اور عقیدۂ سلیمہ کی حفاظت پر صرف کرتے ہیں اور ہر بُرائی سے پاک معاشرے کی بنیاد رکھتے ہیں تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد درست عقائد رکھنے والے اور اس پر کار بند رہنے والے اپنا کھویا ہوا وطن بھی حاصل کر لیتے ہیں' غصب شدہ مال بھی واپس مل جاتا ہے اور ان کی ظاہری قوت و تمکنت بھی لوٹ آتی ہے۔

عالم کون و مکاں' انسان اور حیات کے متعلق صحیح اور درست تصور دین اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین میں نظر نہیں آتا' کیونکہ دین اسلام خود خالق کائنات نے اپنے بندوں کے لیے بنایا ہے اور پسند فرمایا ہے کیونکہ عدل و انصاف اور امن و سلامتی پر مبنی اجتماعی نظام' دین اسلام ہی پیش کرتا ہے۔ دعوتِ اسلام کی بنیادی چیزوں میں مال کی قربانی' وطن کی قربانی اور اپنی زندگی کو اس کے راستے میں قربان کر دینا شامل ہیں' اسی صورت میں مسلمان اپنی حفاظت کی ضمانت حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی لیے اسلام میں ہجرت کی ابتداء کی گئی' جب مشرکین کے ظلم و ستم کی انتہاء ہو گئی اور دین میں فتنہ ڈالا جانے لگا تو رسول اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کو وطن چھوڑنے اور ہجرت کر جانے کی ترغیب دلائی۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ دین کے راستے میں جملہ تکالیف اور مشکلات میں سے یہ ہجرت کوئی چھوٹی تکلیف اور مصیبت نہ تھی' حقیقت میں یہ تکلیف اور ایذاء سے بھاگنے کا نام نہیں بلکہ نصرتِ الٰہی کے آنے تک یہ مقامِ آزمائش کی تبدیلی کا نام ہے۔

یہ بات بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ مکہ اُس وقت دارالاسلام نہ تھا حالانکہ بعض کم سمجھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ صحابہ نے مکہ دارالاسلام کو کیوں چھوڑا اور کافروں کے ملک میں پناہ کی غرض سے کیوں گئے؟

حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت مکہ' حبشہ اور اس کے علاوہ کوئی بھی علاقہ دارِ اسلام نہ تھا سب برابر تھے' تو اُن حالات میں دین' دعوت اور ترویج و تبلیغ کے لیے جو علاقہ بھی موزوں تھا' وہیں قیام کرنا ہی سب سے بہتر تھا۔ اس لیے صحابہ کرام نے حبشہ کو مکہ سے بہتر پایا تو وہاں ہجرت کی کیونکہ مکہ میں مسلمانوں کا کچھ بھی محفوظ نہ تھا جب کہ حبشہ میں سب کچھ محفوظ تھا۔

دارالاسلام سے ہجرت کرنے کا حکم تین اقسام پر ہے:

وجوب' جواز اور حرمت۔

(۱) وجوب: یہ اُس وقت ہے جب مسلمانوں کو شعارِ اسلامیہ مثلاً نماز' روزہ' اذان اور حج وغیرہ کو قائم کرنے کی اجازت نہ دی جائے تو اس صورت میں وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔

(۲) جواز: جب مسلمانوں کو مختلف مصائب' تکالیف اور تنگی کا سامنا کرنا پڑے تو اس صورت میں جائز ہے کہ وہ کسی دوسرے اسلامی ملک میں ہجرت کر جائیں۔

(۳) حرام: واجباتِ اسلامیہ میں سے کسی واجب پر عمل نہ کرنے اور سُستی کی بناء پر اسلامی احکامات کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے دارالاسلام سے کسی ایسے ملک کی طرف ہجرت کرنا جہاں اسلامی احکامات پر پابندی لازم نہ ہو' یہ حرام ہے۔

(دیکھیے: تفسیر القرطبی ج ۵ ص ۳۵ ' احکام القرآن لابن العربی ج ۲ ص ۸۸۷)

دوسرا سبق

اس واقعہ سے ہم اس حقیقت کا ادراک بھی کرتے ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام میں کتنا گہرا تعلق تھا۔ نجاشی جو حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے دین پر قائم تھا اور نصرانیت میں مخلص اور سچا تھا' اس کے اس اخلاص کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ کسی دوسرے دین کی طرف مائل نہ ہوتا جو انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدہ کے خلاف تھا اور نہ ہی اُس کی مدد کرتا۔

یعنی اگر اُن لوگوں کی بنائی ہوئی باتیں صحیح ہوتیں جو یہ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور یہ اُن تین خداؤں میں سے ایک ہیں' پھر نجاشی تو انجیل مقدس پر بھی عمل کرتا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر بھی عمل کرتا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر بھی اخلاص کے ساتھ کاربند تھا تو اس صورت میں نجاشی کو مسلمانوں کا ردّ کرنا چاہیے تھا اور قریش کی مدد کرنی چاہیے تھی۔

لیکن جب نجاشی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآنی آیات سنیں تو اُس نے کہا: بے شک یہ کلام اور جو عیسیٰ ابن مریم لے کر آئے یہ دونوں ایک ہی جگہ سے آئے ہیں۔

نجاشی یہ جملہ اپنے اردگرد جمع جملہ کاتبانِ انجیل اور عیسائی علماء کے سامنے کہہ رہا تھا۔

یہ بات اُس بدیہی ثبوت کو پختہ کرتی ہے کہ جملہ انبیاء کرام علیہم السلام ایک ہی عقیدہ لے کر آئے' اُن میں سے کسی نے بھی دوسرے کی مخالفت نہیں کی' اہل کتاب نے جو اختلافات پیدا کیے' یہ ان کے آپس کے جھگڑے' جہالت اور ناواقفیت کی بناء پر نہیں تھے بلکہ علم کی روشنی آ جانے کے بعد سرکشی کی بنیاد پر تھے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ جاثیہ: ۱۷' اور اس کے علاوہ قرآن مجید میں دیگر جگہوں پر ذکر فرمایا۔

تیسرا سبق

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ضرورت کے وقت غیر مسلموں کی پناہ میں بھی داخل ہو سکتے ہیں' پناہ دینے والا اگرچہ اہل کتاب ہو جیسے نجاشی جو اُس وقت تو عیسائی تھا لیکن بعد میں مسلمان ہو گیا۔[1]

---

[1] صحیح مسلم میں روایت ہے کہ نجاشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آیا تھا' جب اس کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو اس کی خبر دی' پھر صحابہ کے ساتھ آبادی سے باہر گئے اور اس کی نمازِ جنازہ ادا کی۔

یا وہ کوئی مشرک ہو مثلاً جب مسلمان حبشہ سے اہل مکہ کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر لوٹے اور یہ خبر جھوٹی نکلی تو مسلمانوں نے اُس وقت مکہ کے چند مشرکوں کی حمایت اور پناہ حاصل کی مثلاً ابوطالب کی۔ اسی طرح رسول اکرم ﷺ جب طائف سے لوٹے تو مطعم بن عدی کی حمایت حاصل کر کے مکہ میں داخل ہوئے۔

لیکن یہ حمایت و پناہ اس بات سے مشروط ہے کہ اس سے دعوتِ اسلامیہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے' دین کے احکامات کو تبدیل نہ کیا جائے اور بعض حرام کاموں پر سکوت اختیار کرنے کی شرط نہ ہو' ورنہ کسی مسلمان کو ان مذکورہ شرائط کی بناء پر کسی کافر کی پناہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا وہ موقف ہے جو آپ نے اُس وقت اختیار کیا جب آپ کے چچا ابوطالب نے کہا کہ تم اپنی جان کی بقاء چاہو اور جو تمہارے بس میں نہیں وہ نہ کرو اور مشرکین کے خداؤں کو بُرا نہ کہو' تو اُس وقت آپ ﷺ نے اپنے چچا کی پناہ اور حمایت سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور حق بات کو بیان کرنے اور اس کی وضاحت کرنے پر سکوت اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہلا وفد

جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ مختلف مشکلات اور تکالیف کے دور سے گزر رہے تھے تو اس دوران مکہ کے باہر سے تعلیمِ اسلام کے لیے جو پہلا وفد آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا وہ حبشہ کے عیسائیوں کا تیس (۳۰) سے زائد مردوں پر مشتمل تھا۔ یہ وفد حضرت جعفر بن ابی طالب کی واپسی پر آپ کے ساتھ مکہ آیا' جب یہ لوگ آپ ﷺ کے پاس بیٹھے اور آپ ﷺ کی صفات اور احوال پر مطلع ہوئے اور قرآنی آیات کی تلاوت سنی تو یہ سب کے سب ایمان لے آئے' جب اس بات کا علم ابوجہل کو ہوا تو اُس نے ان کو سخت الفاظ میں کہا: ہم نے تم سے بڑھ کر بے وقوف مسافر نہیں دیکھے' تمہاری قوم نے تمہیں اس آدمی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تا کہ واپس جا کر انہیں خبر دو مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ فوراً تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس پر ایمان لے آئے اور اس کی تصدیق کر دی۔

اس وفد کے لوگوں نے جواباً کہا: سلام علیکم! ہم تم سے جاہلانہ باتیں نہیں کرتے' تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور ہم اپنے دین پر کاربند ہیں' ہم اپنے آپ کو خیر سے محروم نہیں کرتے۔

پس ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نازل ہوا:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ۝ وَاِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ۝ اُولٰٓىٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ۝ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ۝ (القصص: ۵۵۔۵۲)

جن کو ہم نے کتاب عطا فرمائی (نزولِ قرآن سے پہلے وہ اس پر ایمان لائے ہیں۝ اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اس کے ساتھ بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم اس سے پہلے ہی سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں۝ یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دو مرتبہ بوجہ ان کے صبر کے اور دور کرتے ہیں نیکی کے ساتھ بُرائی کو' نیز اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا خرچ کرتے رہتے ہیں۝ اور جب وہ سنتے ہیں کسی بے ہودہ بات کو تو منہ پھیر لیتے ہیں اس سے اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں تم سلامت رہو ہم جاہلوں (سے اُلجھنے) کے خواہاں نہیں ہیں۝[1]

اسباق ونصائح

وفد کی اس خبر سے دو اُمور کی معلومات ہمارے لیے قابلِ توجہ ہیں:

---

[1] اس روایت کو ابن اسحاق اور مقاتل نے روایت کیا ہے اور سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے' نیز دیکھیے: ابن کثیر' قرطبی اور نیشاپوری کی تفاسیر۔

پہلا امر

جس دور میں مسلمانوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا تھا' مختلف قسم کی ایذائیں اور تکالیف دی جا رہی تھیں' ان پر ان کی زمین تنگ کر دی گئی تھی اور ان سے بائیکاٹ کیا گیا تھا' ان حالات میں اس وفد کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں ملاقات کے لیے آنا اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اس بات پر ظاہر و باہر دلیل ہے کہ اربابِ دعوتِ اسلامیہ کو اگرچہ کتنی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے وہ کسی بھی حال میں ناکامی اور نامرادی تصور نہیں کرتے اور نہ کمزوری' پسپائی یا مایوسی کا شکار ہوتے ہیں بلکہ جیسے ہم نے پہلے کہا کہ یہ راستے کی تکالیف اور مشکلات ہی تو کامیابی اور فتح تک پہنچانے والی ہیں۔

یہ وفد مکہ میں آیا' اس میں تیس (۳۰) سے زیادہ عیسائی مرد موجود تھے' ایک روایت کے مطابق چالیس (۴۰) سے زیادہ تھے' سمندری لہروں کو عبور کرتے ہوئے یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تاکہ اس بحرِ بے کنار سے معرفت کے موتی حاصل کر سکیں تاکہ اس دعوتِ جدیدہ کو قبول کر کے اس کے ساتھ وفاداری کا اظہار کریں اور زبانِ حال سے اس بات کا اعلان کریں کہ دشمنانِ اسلام جتنا بھی اس دعوت کو روکیں' مسلمانوں کو جتنی بھی تکالیف اور ایذائیں دیں لیکن اس سب کے باوجود وہ اسلام کے اس نور کو مشارق و مغارب میں پھیلنے سے ہرگز نہیں روک سکتے اور نہ ہی اس کو بار آور ہونے سے روک سکتے ہیں۔

جس طرح ابو جہل کو اس وفد کے اسلام قبول کرنے کا علم ہوا تو اُس کینہ پرور نے اس کا اظہار بُرے الفاظ میں کیا اور بُرے الفاظ سے اس وفد کو مخاطب کیا' لیکن وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ یہ اور اس جیسے دیگر افراد یہی تو کر سکتے تھے کہ وہ مسلمانوں کو مزید ظلم و ستم کا نشانہ بنائیں' رہا یہ کہ وہ دعوت کی نشوونما کو روکیں تو یہ کام ان کے لیے قطعی ناممکن تھا۔

دوسرا امر

اس وفد کے لوگ جو ایمان لائے اس کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ اُس شخص جیسا ایمان تھا جو کفر کے اندھیروں سے اسلام کی روشنی کی طرف نکلا؟

حقیقت یہ تھی کہ اُن کا ایمان اُس سابقہ ایمان کا ہی تسلسل و استمرار تھا' جو دین اور عقیدہ وہ پہلے سے اپنائے ہوئے تھے' اُسی کے مطابق آگے چل رہے تھے' جیسا کہ سیرت نگاروں

نے روایت کیا کہ وہ لوگ عیسائی تھے اور انجیل پر ایمان رکھتے تھے اور اُس پر عمل کرتے تھے تو انجیل ہی ان کو یہ حکم دے رہی تھی کہ عیسیٰ ابن مریم کے بعد جو نبی آئے تم اُس پر ایمان لانا اور انجیل ہی نے اُس کے بعد میں آنے والے رسول کی صفات وخصوصیات بھی بیان کر دیں تو اس لیے اُن کے انجیل پر ایمان کا تقاضا یہی تھا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا مطلب ایک دین سے دوسرے دین میں داخل ہونا نہیں تھا' بلکہ یہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن پر نازل ہونے والی کتاب انجیل پر ایمان لانے کی حقیقت کا تسلسل تھا' کیونکہ اس رسول اور اس کتاب نے انہیں آخری نبی پر ایمان لانے کی تاکید کی تھی۔ اسی مضمون کو مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ○ (القصص:۵۳)

اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اس کے ساتھ' بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم اس سے پہلے ہی مسلمان تھے○

یعنی ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل ہی آپ کی دعوت پر ایمان لا چکے تھے اور سر تسلیم خم کر چکے تھے کیونکہ یہ اُنہی چیزوں میں سے ہے جن پر ایمان لانے کا انجیل نے ہمیں حکم دیا۔

یہی معاملہ ہے ہر اُس بندے کا جو حقیقی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بتائے ہوئے دین پر پوری طرح عمل پیرا ہے' کیونکہ تورات وانجیل پر ایمان لانا ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ قرآن پر اور صاحب قرآن پر بھی ایمان لایا جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ جو لوگ تورات وانجیل پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں' اُن کو تورات وانجیل کے مطالبات پر ہی صحیح طریقے سے عمل کرنے کی دعوت دی جائے تو اس طرح وہ خود بہ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ. (المائدہ:۶۸)

آپ فرمایئے: اے اہل کتاب! نہیں ہو تم کسی چیز پر (ہدایت سے) یہاں تک کہ (عمل سے) قائم کرو تورات و انجیل کو۔

ہم نے جو بیان کیا اس کی مزید تاکید یہی ہے کہ دینِ حق ایک ہی ہے متعدد دین نہیں رہے اور یہی دین حق حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک قائم و دائم ہے اور یہ جو ''ادیانِ سماویہ'' کا کلمہ بعض لوگ استعمال کرتے ہیں' یہ کلمہ بالکل غلط اور بے معنی ہے۔

ہاں! آسمانی شریعتیں تو متعدد رہی ہیں' ہر بعد میں آنے والی شریعت پہلی والی شریعت کی ناسخ ہوتی تھی لیکن متعدد آسمانی ادیان والی بات غلط ہے۔ دین شروع سے ایک ہی ہے اور وہ دین اسلام ہے لیکن شریعتیں مختلف ہوتی رہی ہیں' اس لیے ہمیں چاہیے کہ ''دین'' اور ''شریعت'' کے الفاظ کو خلط ملط نہ کریں۔

کیونکہ دین کا اطلاق عقیدہ پر ہوتا ہے اور شریعت کا اطلاق عبادات و معاملات کے متعلق جاری کردہ احکام پر ہوتا ہے۔

غم کا سال

غم کا سال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا دسواں سال تھا' اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا اور آپ کے چچا جناب ابوطالب کا انتقال ہوا۔

ابن سعد اپنی کتاب ''طبقات'' میں لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور جناب ابوطالب کی وفات کے درمیان ایک ماہ پانچ دن کا وقفہ تھا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مقام بہت بلند ہے' جیسے ابن ہشام نے لکھا کہ آپ اسلام کی سچی رفیق تھیں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی اُن سے کسی تکلیف کی شکایت کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن سے محبت و اُنس اور اطمینان ملتا' جب کہ ابوطالب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانہ بشانہ رہے اور اپنی قوم کے مقابلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاون و مددگار رہے۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ جب جناب ابوطالب فوت ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش نے ایسی تکالیف بھی دیں جو ابوطالب کی زندگی میں نہیں دی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ قریش کے

احمقوں میں سے ایک احمق نے سرِ راہ آپ کو روکا اور آپ کے سرِ اقدس میں مٹی ڈال دی' آپ ﷺ اسی حالت میں اپنے گھر تشریف لائے' آپ ﷺ کی ایک بیٹی اُٹھیں اور سرِ انور کو دھونے لگیں اور وہ روتی جاتیں' آپ ﷺ نے فرمایا: اے بیٹی! نہ رو! بے شک اللہ تعالیٰ خود تمہارے باپ کا محافظ ہے۔

(اسے اسحاق نے روایت کیا ہے' نیز دیکھئے: تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۴۴)

اس سال دعوت کے راستے میں بے شمار مشکلات اور تکالیف جھیلنے کی وجہ سے آپ ﷺ نے اس سال کو "عام الحزن" (غم کا سال) قرار دیا۔

اسباق ونصائح

مسلمانوں کو ابھی مکہ میں قوت حاصل نہیں ہوئی' ان حالات میں ابوطالب کی موت میں کیا حکمت تھی؟ حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ جناب ابوطالب اپنی قوت وتمکنت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرتے تھے اور مصائب وشدائد سے حتی الامکان بچاتے تھے۔

اسی طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھی جلد ہی وصال فرما جانے میں کیا حکمت تھی؟ کیونکہ رسول اللہ ﷺ مشکلات اور مصائب میں آپ رضی اللہ عنہا سے محبت و انس اور حوصلہ پاتے تھے اور ان کے تعاون سے شدائد وآلام کا احساس کم ہو جاتا۔

اس سے جو اہم بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس کا تعلق عقیدۂ اسلامیہ کی اساس اور بنیاد سے ہے۔ وہ یہ ہے کہ

اگر جنابِ ابوطالب اپنے بھتیجے کی اسی طرح حمایت وحفاظت کرتے رہتے یہاں تک کہ مدینہ میں حکومتِ اسلامیہ قائم ہو جاتی اور اس طرح آپ ﷺ اور جملہ مسلمان مشرکین کی تکالیف سے نجات حاصل کر لیتے تو اس سارے معاملے میں یہ وہم پیدا کیا جا سکتا تھا کہ اس دعوت کے پیچھے تو جناب ابوطالب کا ہاتھ تھا اور انہی کی مدد اور معاونت سے یہ کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ اپنی قوم میں ان کا مرتبہ ومقام بلند تھا اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے ایمان کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس دعوت کی کامیابی اور دولتِ اسلامیہ کے قیام میں ان کا تعاون اور ان کی حمایت تھی' جس کی بناء پر آپ کامیاب ہوئے' جب کہ دیگر مسلمان اس جیسی حمایت سے محروم تھے' اس لیے انہیں ستایا گیا لیکن حکمت

خداوندی کا تقاضا یہ تھا کہ جناب ابو طالب' جناب خدیجۃ الکبریٰ اور اس کے علاوہ بہ ظاہر جو آپ ﷺ کے حمایتی تھے' سب کو ختم کر دیا جائے تاکہ دو حقیقتیں کھل کر سامنے آ جائیں:

پہلی حقیقت: بے شک ہر حمایت ہر مدد اور تعاون اللہ عزوجل کی طرف سے ہی آتا ہے' اللہ عزوجل نے اپنے رسول کو مشرکین سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا ہوا تھا' اگرچہ آپ ﷺ کی حمایت لوگوں میں سے کوئی کرتا یا نہ کرتا' آپ ﷺ کی ذات معصوم و مامون تھی اور آپ ﷺ کی دعوت نے ضرور بہ ضرور کامیاب ہونا ہی تھا۔

دوسری حقیقت: لوگوں سے محفوظ رکھنے اور عصمت کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ آپ کو بہ ظاہر مشکلات' تکالیف اور ایذاء رسانی نہیں ہوگی' اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو لوگوں سے محفوظ رکھنے کے بارے ارشاد فرمایا:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ. (المائدہ:٦٧) — اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے۔

لوگوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو قتل ہونے سے بچائے گا' اس کے علاوہ جو مشکلات اور تکالیف ہیں' ان میں سے کافی حد تک انبیاء و رسل کو ان کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ حق کے راستے میں مصائب و آلام آتے ہیں' پھر کامیابی حاصل ہوتی ہے' ان مشکلات و مصائب کا انبیاء پر آنا اللہ تعالیٰ کے اُس بچانے کے وعدہ کے خلاف نہیں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو ارشاد فرمایا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ○ (الحجر:٩٤-٩٥) — سو آپ اعلان کر دیجیے اُس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا اور منہ پھیر لیجیے مشرکوں سے' ہم کافی ہیں آپ کو مذاق اُڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لیے ○

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ — اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا

وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَO وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُO (الحجر: ۹۸-۹۹)

کرتے ہیں' سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور ہو جایئے سجدہ کرنے والوں سے' اور عبادت کیجئے اپنے رب کی یہاں تک کہ آ جائے آپ کے پاس یقینO

سنت الٰہیہ کے متقاضی یہ حکمت جلیلہ ہے کہ دعوت کے راستے میں جس طرح رسول اللہ ﷺ ان مشکلات کا سامنا کریں اسی طرح ہر زمانے کے عام مسلمان بھی دعوتِ اسلامیہ کے سلسلے میں ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کرنے اور ان کا سامنا کرنے کو تیار رہیں اور ان تکالیف کو بہ خوشی گوارا کریں۔ اگر رسول اللہ ﷺ اپنی دعوت میں بغیر کسی مشقت اور تکلیف اٹھائے کامیاب ہو جاتے تو آپ ﷺ کے صحابہ اور بعد میں آنے والے مسلمان آرام دِہ زندگی کا مطالبہ کرتے اور دعوت کے راستے میں مصائب و مشکلات کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیتے۔

جب کہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو دعوتِ دین کے سلسلے میں مختلف قسم کی تکالیف کا سامنا ہوتا ہے تو اُس وقت وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تکالیف اور مشکلات تو رسول اللہ ﷺ کو بھی پیش آئیں' اس لیے ہر مسلمان ہنسی خوشی ان مشکلات کو برداشت کرتا ہے۔

آپ ﷺ کو بعض اوقات لوگوں کی طرف سے مذاق' تمسخر اور اہانت کا بھی سامنا کرنا پڑا جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا کہ ایک دفعہ آپ ﷺ کے سر مبارک میں مٹی ڈال دی گئی' آپ اسی حالت میں تشریف لائے تو آپ کی ایک صاحب زادی نے سرِ انور دھویا' حالانکہ آپ ﷺ اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنی ساری مخلوق میں سے مختص فرمایا اور چنا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے طائف کی طرف ہجرت فرمائی تو وہاں پر آپ ﷺ کو جن سخت ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی سب کو معلوم ہیں تو ان سب حالات کو دیکھ کر ہر مسلمان دعوتِ دین کے راستے میں پیش آمدہ جملہ مشکلات کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ یہ ایک چیز ہے' سیرت کے اس قطعہ سے جو دوسری بات متعلق ہے وہ یہ ہے

کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بعثت کے اس دسویں سال کو جو عام الحزن کا نام دیا' وہ محض حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور جناب ابوطالب کی جدائی کے غم میں تھا' اور بعض لوگ تو اپنے فوت شدگان پر ماتم کرنے اور لمبا سوگ منانے کا استدلال بھی آپ ﷺ کی سیرت کے اس واقعہ سے کرتے ہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کہنا ان کے فہم اور سوچ کی خطا اور غلطی ہے۔ آپ ﷺ اپنے چچا اور اپنی زوجہ کے فراق میں اتنے سخت غمگین نہیں ہوئے تھے' اور نہ ہی مطلقاً اپنے قریبی رشتہ داروں کے فوت ہو جانے کی وجہ سے اس سال کو عام الحزن کا نام دیا' بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ ان دونوں کی وفات کے بعد دعوتِ اسلامیہ کے کئی دروازے بند ہو گئے۔ آپ کے چچا جناب ابوطالب کی حمایت میں دعوت و ارشاد کے بعض کاموں میں آپ ﷺ کو کامیابی حاصل ہوئی' لیکن چچا کی وفات کے بعد یہ راستے بند ہوتے دکھائی دیئے' آپ ﷺ جس طرح بھی کوشش کرتے' آگے کئی رکاوٹوں اور عداوتوں کو پاتے اور جب بھی کسی طرف رخ کرتے تو آگے راستہ بند ہوتا' پس آپ اپنی دعوت کے ساتھ ایسے ہی لوٹ آتے جیسے آپ جاتے۔ نہ کوئی آپ کی بات سنتا اور نہ ہی کوئی آپ پر ایمان لاتا' بلکہ ہر کوئی استہزاء کرتا' تمسخر اُڑاتا' سرکشی کرتا اور ہتک آمیز طریقے سے پیش آتا' آپ ﷺ اس وجہ سے غمگین ہو جاتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری مجھے سونپی ہے اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی' بس اسی وجہ سے اس سال کا نام عام الحزن رکھ دیا' بلکہ کبھی تو آپ ﷺ اس وجہ سے غمگین ہوتے کہ میں جس حق کو لے کر آیا ہوں' لوگ کیوں اس پر ایمان نہیں لا رہے۔

اکثر اوقات آپ ﷺ پر اسی بات کا غلبہ رہتا' اس غم اور حزن کو کم کرنے اور موانست پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں' اور اس میں آپ ﷺ کو یاد دلایا جاتا کہ دعوت و تبلیغ سے بڑھ کر آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور اگر یہ لوگ آپ کا پیغامِ حق سن کر ایمان نہیں لاتے تو آپ اس وجہ سے اپنے اوپر اتنا بوجھ نہ لیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ	(اے حبیب!) ہم جانتے ہیں کہ رنجیدہ کرتی ہے آپ کو وہ بات جو یہ کہہ

الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ○وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِ الْمُرْسَلِيْنَ○وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ○ (الانعام:۳۵-۳۳)

رہے ہیں تو وہ نہیں جھٹلاتے آپ کو بلکہ یہ ظالم (دراصل) اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ○ اور بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے تو انہوں نے صبر کیا اس جھٹلائے جانے پر اور ستائے جانے پر یہاں تک کہ آ پہنچی انہیں ہماری مدد اور نہیں کوئی بدلنے والا اللہ کی باتوں کو اور آ ہی چکی ہیں آپ کے پاس رسولوں کی کچھ خبریں○ اور اگر گراں ہے آپ پر ان کا (حق سے) روگردانی کرنا تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں (تو اس پر چڑھ جاؤ)' پھر لے آؤ ان کے پاس کوئی معجزہ (تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے) اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو جمع کر دیتا انہیں ہدایت پر تو آپ نہ ہو جائیں ان سے جو علم نہیں رکھتے○

رسول اللہ ﷺ کی ہجرتِ طائف

جب قریش مکہ نے آپ ﷺ پر ظلم وستم کی حد کر دی تو آپ ﷺ طائف کی طرف نکلے تا کہ قبیلۂ بنو ثقیف کی حمایت حاصل کریں اور یہ اُمید کرتے ہوئے کہ وہ پیغامِ حق کو تسلیم کر لیں گے اور اُن پر ایمان لے آئیں گے۔ جب آپ ﷺ طائف پہنچے تو وہاں پر قبیلہ بنو ثقیف کے ایک گروہ کو پایا' یہ لوگ ان کے سردار تھے' آپ ﷺ ان کی مجلس میں بیٹھ گئے اور انہیں اللہ عزّ وجل کی وحدانیت کی دعوت دی اور جس مقصد کے لیے آئے تھے' وہ بیان فرمایا۔ انہوں نے بہت بُرے طریقے سے اس کا جواب دیا' اور ایسی غلیظ گفتگو کی' جس کی آپ ﷺ کو توقع نہ تھی' آپ ﷺ وہاں سے اُٹھے اور اُن سے آخری بات یہ کی کہ وہ

میرے یہاں طائف آنے کو قریش سے پوشیدہ رکھیں لیکن اس کا بھی انہوں نے کوئی مثبت جواب نہ دیا' پھر یہیں پہ بس نہیں ہوا' طائف کے سرداروں نے اپنے علاقہ کے اوباش لڑکوں اور غلاموں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا' وہ بدطینت لوگ آپ ﷺ پر آوازیں کستے اور بُرا بھلا کہتے اور پتھر مارتے جاتے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے قدمین شریفین لہولہان ہو گئے' آپ ﷺ کے ساتھ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ تھے' وہ خود آگے ہو کر آپ ﷺ کو پتھروں سے بچاتے حتیٰ کہ ان کے سر میں بھی کئی گہرے زخم آئے۔

(طبقات ابن سعد ج ا ص ۱۹۶)

آپ ﷺ اسی حالت میں چلتے چلتے عتبہ بن ربیعہ کے باغ تک پہنچے۔اب وہ بنوثقیف کے اوباش لڑکے بھی واپس لوٹ گئے' تھکن اور زخموں نے آپ ﷺ کو مضمحل کر دیا تھا' آپ ﷺ انگور کی بیل کے سائے میں بیٹھ گئے' ربیعہ کے دونوں بیٹے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے' جب آپ ﷺ کو اس سائے میں کچھ اطمینان حاصل ہوا تو آپ ﷺ نے اپنا سرِ انور اٹھایا اور یہ دعا مانگی:

اے مولا! میں اپنی طاقت کی کمزوری' عملی قوت کی کمی اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے بسی کا شکوہ تیری بارگاہ میں کرتا ہوں' اے ارحم الراحمین! تو سب کمزوروں کا رب ہے اور تو میرا بھی رب ہے' تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے کرتا ہے جو مجھ سے ترش روئی سے پیش آئے یا کیا تو نے میرا معاملہ کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو پھر مجھے ان تکلیفوں کی کوئی پرواہ نہیں مگر تیری طرف سے عافیت اور سلامتی مجھے مل جائے تو یہ میرے لیے دل کشا ہے' میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے نور کے ساتھ جس سے تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں' دنیا اور آخرت کے کام سنور جاتے ہیں' مجھے اس سے محفوظ رکھ کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا مجھ پر اپنی ناراضگی اتارے' میں رضا کا طلب گار ہوں حتیٰ کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے' تیری طاقت اور زور کے علاوہ کوئی طاقت نہیں۔

یہ سب کچھ دیکھ کر باغ کے مالک ربیعہ کے دونوں بیٹوں کے دلوں میں شفقت پیدا ہوئی' انہوں نے اپنے ایک عیسائی غلام کو بلایا جس کا نام عداس تھا' اُس کے ہاتھ انگوروں کا ایک گچھا طشت میں رکھ کر آپ ﷺ کے پاس بھیجا' جب عداس نے یہ انگور آپ ﷺ

کے سامنے رکھے اور تناول فرمانے کا کہا تو آپ ﷺ نے ''بسم اللہ'' کہتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا اور تناول فرمایا' تو عداس نے تعجب سے پوچھا کہ اللہ کی قسم! کھانے سے پہلے اس طرح کا کلام اس علاقے کے لوگ تو نہیں پڑھتے' آپ ﷺ نے پوچھا: تم کس علاقے سے ہو اور تمہارا دین کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا: میں عیسائی ہوں اور میں موصل کے علاقے نینویٰ سے ہوں' آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نیک بندے یونس بن متی کے علاقے سے؟ عداس نے پوچھا: آپ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ میرا بھائی ہے' وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں' یہ سنتے ہی عداس آپ ﷺ کی طرف بڑھا اور آپ کے سرانور' ہاتھوں اور قدموں کے بوسے لینے لگا۔

(اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے: سیرت ابن ہشام ج۱ ص ۴۲۰)

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ طائف سے مکہ واپس لوٹ رہے تھے تو نخلہ کے مقام پر رات کے پچھلے پہر آپ ﷺ نماز پڑھنے لگے' وہاں سے جنات کا ایک گروہ گزرا جنہوں نے آیاتِ قرآنی سنیں' جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو یہ جن اپنی قوم کی طرف لوٹے اور ان کو ڈر سنایا' اُن سب نے جو سنا تھا وہ مان گئے اور اُس پر ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قصے کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ (الاحقاف: ۳۱-۲۹)

اور جس وقت ہم نے متوجہ کیا آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سنیں تو جب آپ کی خدمت میں پہنچے تو بولے: خاموش ہو کر سنو' پھر جب تلاوت ہو چکی تو لوٹے اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے ○ انہوں نے (جا کر) کہا: اے ہماری قوم! ہم نے (آج) ایک کتاب سنی ہے جو اُتاری گئی ہے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد تصدیق کرنے والی ہے پہلی کتابوں کی رہنمائی کرتی ہے حق کی

طرف اور راہِ راست کی طرف O اے ہماری قوم! قبول کرلو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو اور اس پر ایمان لے آؤ بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو اور بچالے گا تمہیں دردناک عذاب سے O

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ. (الجن:۱)

آپ فرمائیے: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ بڑے غور سے سنا ہے (قرآن کو) جنوں کی ایک جماعت نے۔

جب آپ ﷺ زید بن حارثہ کے ساتھ واپس مکہ لوٹے اور مکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے تو زید نے آپ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ مکہ میں کیسے داخل ہوں گے؟ حالانکہ انہوں نے تو آپ کو نکال دیا ہے' آپ ﷺ نے فرمایا: اے زید! جو تم دیکھ رہے ہو اللہ تعالیٰ اس میں کشادگی پیدا فرمانے والا ہے اور راستہ نکالنے والا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ اپنے دین کا مددگار ہے اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے' پھر بنوخزاعہ کا ایک آدمی مطعم بن عدی کی طرف بھیجا اور اس کو خبر دی کہ آپ اس کی پناہ میں مکہ داخل ہورہے ہیں' مطعم نے یہ قبول کرلیا' تو آپ ﷺ یوں مکہ واپس تشریف لائے۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۹۶' سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۸۱)

اسباق ونصائح

جب ہم آپ ﷺ کی ہجرتِ طائف اور اس میں آپ ﷺ پر ڈھائے جانے والے مظالم کو دیکھتے ہیں اور پھر مکہ لوٹ کر آپ کی دعوت کی نئی سرگرمیوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ان سب اُمور کو ہم کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

آپ ﷺ کو جو مختلف قسم کی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا' بالخصوص سفرِ طائف میں جن مظالم سے دوچار ہوئے' ان سب کا تعلق اعمالِ تبلیغیہ سے تھا۔

جس طرح آپ ﷺ نے ہمیں خالق و مخلوق کے بارے میں عقائد کی تبلیغ فرمائی' ہمیں احکام' عبادات' اخلاق اور جملہ معاملاتِ اسلام سے آگاہ فرمایا' اسی طرح آپ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ بھی بتایا کہ انہیں اللہ کے راستے میں کس قدر صبر کرنا چاہیے' اور آپ ﷺ نے صبر اور ثابت قدمی کی کیفیت اپنے عمل سے بیان فرما دی جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا. (آل عمران: ۲۰۰)

اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمر بستہ رہو (خدمتِ دین کے لیے)۔

آپ ﷺ نے جس طرح جملہ عبادات کا طریقہ ہمیں اپنے عمل سے سکھایا ہے' مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا: تم ایسے نماز پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو' اسی طرح فرمایا: میرے عمل سے اپنی عبادتوں کے طریقے سیکھ لو۔

اسی پر قیاس کرتے ہوئے اور اسی بنیاد پر دوسرے اعمال کو منطبق کرتے ہوئے' آپ ﷺ نے دعوت کے راستے میں مختلف قسم کی بے شمار مشکلات اور مظالم پر صبر کرتے ہوئے زبانِ حال سے یہ ارشاد فرمایا ہے: تم بھی ایسے ہی صبر اختیار کرو جیسے مجھے صبر کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ صبر کرنا اور مشکلات و شدائد کا مقابلہ کرنا بھی اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے' جن کا سب لوگوں کو حکم دیا گیا ہے اور جن کے ساتھ آپ ﷺ لوگوں میں مبعوث ہوئے ہیں' آپ ﷺ کے سفرِ طائف سے بہ ظاہر کوئی شخص یہ خیال اور گمان کر سکتا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ وہاں طائف میں مغلوب ہو گئے اور وہاں آپ ﷺ پر مظالم کی حد کر دی گئی' جس وجہ سے شاید آپ نے دل میں ان مظالم کا گہرا اثر لیا اور اسی لیے آپ ﷺ کو جب ابن ربیعہ کے باغ میں کچھ اطمینان ہوا تو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف اس دعا کے ساتھ متوجہ ہوئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان سب مصائب و مظالم کو راضی بہ رضا رہتے ہوئے قبول کیا اور ان سختیوں اور شدائد کے مقابلے میں صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا' ورنہ

اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تو ایذاء دینے والے اُن اوباشوں اور اس ایذاء پر اُبھارنے والے اُن زعماء طائف سے بدلہ اور انتقام لے سکتے تھے' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتقام لینا پسند نہ فرمایا۔

اس کی دلیل بخاری و مسلم کی وہ حدیث طیبہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا یومِ اُحد سے بھی سخت دن آپ کی زندگی میں گزرا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مجھے تمہاری قوم سے کئی تکالیف پہنچیں' اُن میں سب سے زیادہ سخت تکلیف دِہ میرے لیے ''یوم العقبہ'' طائف کا دن تھا' جب میں ابن عبد یالیل بن عبد کلال کے پاس گیا اور اس کے سامنے دعوت پیش کی مگر اُس نے یہ دعوت قبول نہ کی' میں غم زدہ حالت میں جدھر رُخ ہوا اُدھر ہی چل پڑا' جب میں قرن الثعالب کے مقام پر پہنچا تو میں نے نگاہ اوپر اٹھائی تو دیکھا کہ بادل میرے اوپر سایا کیے ہوئے تھے' پھر دیکھا کہ اس میں جبریل ہیں' انہوں نے مجھ سے کہا: اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ سن لیا ہے جو آپ کی قوم نے آپ سے کہا ہے اور جو انہوں نے آپ کی دعوت کا جواب دیا ہے۔ پہاڑوں کا فرشتہ اُس نے بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں' پھر پہاڑوں کے فرشتے نے پکار کے مجھے سلام کیا' اس کے بعد مجھ سے کہا: اے محمد! اللہ نے آپ کی دعوت پر آپ کی قوم کے جواب کو سن لیا ہے' میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں' مجھے آپ کے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں حکم دیں' آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ چاہیں تو میں ان پر دونوں طرف کے پہاڑوں کو اٹھا کر ملا کر ڈھانک دوں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا: نہیں! بلکہ میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں گے۔

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام اور اپنی امت کو مشکلات اور شدائد میں صبر کرنا سکھایا ہے' بلکہ اللہ کے راستے میں جملہ تکالیف کے مقابلے میں صبر اختیار کرنے اور ثابت قدمی اختیار کرنے کا درس دیا ہے۔

کوئی اعتراض کرنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ پھر اس صورت میں شکوہ کرنے اور ایسی دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی جس میں حزن و ملال اور مشکلات کا ذکر کیا گیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغاثہ پیش کرنا اپنی عاجزی وانکساری اور کمزوری وضعف کا

ذکر کرنا ہی اس کی عبادت و اطاعت ہے اور قرب خداوندی کا ذریعہ ہے' اس میں حکمت یہ ہے کہ مصائب و آلام میں مبتلا انسان اللہ تعالیٰ کے دروازے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے اوپر خداوند تعالیٰ کی بندگی کی چادر اوڑھ کر دست سوال دراز کرتا ہے تو وہ ضرور قرب کی منزلوں پر فائز ہوتا ہے تو اس طرح صبر اختیار کرنے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے بہتری کی دعا کرنے اور فضل و کرم کی بھیک مانگنے میں کوئی تعارض نہیں' بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو ہمیں اپنی سیرتِ طیبہ کے ذریعہ اسی بات کا درس دیا' مصائب و آلام پر صبر اختیار کرنا اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا' یہ خاص لوگوں کا عمل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عاجزی و انکساری و تذلل اختیار کرنا' اعلیٰ وظیفۂ بندگی ہے۔

نفسِ بشریت جتنی بھی بلندی تک پہنچ جائے' یہ ہر حال میں دائرۂ بشریت سے خارج نہیں ہو سکتا' کیونکہ ہر انسان اپنی فطرت کے مطابق ہر خیر و شر کا احساس بھی رکھتا ہے اور شعور بھی رکھتا ہے۔ انسان میں نعمتوں کی لذت کا شعور بھی ہے اور مصیبت میں درد والم کا شعور بھی ہے' اس لیے یہ مجبور ہے کہ نعمت ملے تو خوشی کا احساس اور تکلیف کے وقت درد کا احساس ہو اور گھبرائے۔

اس سب کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اگرچہ اپنے نفس کو ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رکھا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بشری کیفیات بھی رکھتے تھے' تکلیف میں درد کا احساس بھی رکھتے تھے اور نعمتوں پر خوشی کا اظہار بھی کرتے تھے لیکن ان سب کے باوجود آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے راستے میں لذتوں اور خوشیوں کے مقابلے میں مصائب و آلام اور تکالیف کو بہ خوشی سینے سے لگاتے تھے' صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اس کے لیے حق بندگی ادا کرتے ہوئے' یہی وہ طریقہ ہے جو ثواب کے حصول اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے اور اس کے مکلف ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

سیرتِ طیبہ کے مختلف واقعات اور مناظر میں غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی قوم کے مظالم اور ایذاء رسانی کے برعکس سفرِ طائف میں زیادہ سخت تکالیف اور مظالم کا سامنا کرنا پڑا لیکن جب بھی آپ ﷺ کو تکلیف دی جاتی' اللہ تعالیٰ اُس پر سخت ناراضگی کا

اظہار فرماتا اور آپ ﷺ کو تسلی دیتا اور آپ ﷺ پر رحم فرماتا' تاکہ مسلسل تکالیف اور مشکلات کے باعث آپ ﷺ کے دل میں مایوسی پیدا نہ ہو۔

طائف کی طرف ہجرت کے اس سفر کے دوران آپ ﷺ پر جو سختیاں آئیں' ان میں آپ ﷺ کو جسمانی ایذاء بھی دی گئی اور ناکامی کی تکلیف بھی ہوئی جس کا تذکرہ گزر چکا ہے' اس بار بھی اللہ تعالیٰ نے ان مظالم پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا' طائف کے جن اوباشوں نے آپ ﷺ کو پتھر مارے اور جن سرداروں نے آپ ﷺ کو برا بھلا کہا' ان کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے سخت وعید کا ذکر فرمایا' لیکن وہاں پر ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس سے کافی حد تک آپ ﷺ کے دل کو اطمینان اور تسلی حاصل ہوئی کہ جب ایک عیسائی عداس نامی شخص اپنے ہاتھ میں انگوروں کا ایک طشت لے کر حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے اپنا تعارف کرایا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں تو وہ عیسائی غلام جھکا اور آپ ﷺ کے سرانور' ہاتھ مبارک اور قدمین شریفین کے بوسے لینے لگا' اس واقعہ سے قوم کے اُن اوباش لوگوں کی بے ادبی اور گستاخی کا کسی حد تک ازالہ ہوتا نظر آتا ہے' ہم یہاں پر مصطفیٰ صادق الرافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اس بارے میں کلام نقل کرتے ہیں' وہ یہ طائف والا واقعہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

کیا عجب بات ہے اس طائف والے واقعہ میں تقدیرِ الٰہی کے کتنے اسرار ورموز ہیں! جلد ہی عزت وجلال اور خیر آگے بڑھے' کفار کی برائی' بے وقوفی اور عداوت پر معذرت کرنے لگے اور طعن وتشنیع اور برے کلمات کے بعد ادب واحترام کروایا گیا اور ہاتھ پاؤں کو بوسے دلوائے گئے۔

ربیعہ کے دونوں بیٹے بھی دشمنانِ اسلام میں سے تھے اور مکہ کے ان لوگوں میں سے تھے جو نبی اکرم ﷺ کے چچا ابوطالب کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو چھوڑ دیں اور اس کی مدافعت سے قطع تعلق ہو جائیں یا ہمارے حوالے کر دیں' ورنہ وہ لوگ ان دونوں کے خلاف جنگ شروع کر دیں گے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ کوئی ایک فریق ہلاک ہو جائے' لیکن ان کی حیوانی سرشت اور جبلت اُس وقت انسانی قدر میں تبدیل ہو گئی جس قدر کے ساتھ یہ دین آیا۔ اس لیے کہ دین کا مستقبل فکر سے

وابستہ ہے نہ کہ سرشت اور جبلت سے۔

اسی طرح نصرانیت بھی یہاں اسلام سے معانقہ کرتی ہے اور اس کی عزت کرتی ہے' کیونکہ ایک صحیح اور سچا دین دوسرے صحیح اور سچے دین کے لیے ایسے ہی ہوتا ہے جیسے بھائی بھائی ہوتے ہیں' لیکن فرق یہ ہے کہ بھائی بھائی کا خونی رشتہ ہوتا ہے اور دین کا رشتہ عقل و دانش سے ہوتا ہے۔

اس طائف والے واقعہ میں تقدیر کے اسرار و رموز کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ جو انگور کا پکا ہوا میٹھا اور رس سے بھرا ہوا گچھا پیش کیا گیا اور اللہ کے نام سے اس کی ابتداء کی گئی' اس میں جو حکمت پوشیدہ تھی وہ یہ تھی کہ انگوروں کے میٹھے دانوں سے بھرپور گچھے سے مراد مستقبل کی عظیم اسلامی سلطنت تھی اور گچھے کے ہر دانے سے مراد ہر وہ ملک تھا جو اس عظیم اسلامی سلطنت کا حصہ بنا۔ (وحی القلم ج ۲ ص ۳۰)

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا جو دفاع کیا' وہ بھی ایک مثال ہے۔ جب بھی طائف کے اوباشوں کی طرف سے کوئی پتھر آپ ﷺ کی طرف آتا' حضرت زید بن حارثہ خود آگے ہو جاتے اور پتھر اپنے جسم پر کھا کر آپ ﷺ کا دفاع کرتے' اس طرح کرتے کرتے آپ رضی اللہ عنہ کے سر پر متعدد زخم آئے' حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ہر مسلمان کے لیے نمونہ ہے کہ ہر مسلمان کو اسی طرح قائدِ اسلام کے دفاع اور حفاظت کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینی چاہیے۔ آپ ﷺ کے ساتھ ہر صحابی کا تعلق اور محبت ہی تھی کہ تمام صحابہ آپ ﷺ کے دفاع اور حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے میں کوئی حرج محسوس نہ کرتے' اگرچہ آج رسول اللہ ﷺ اپنی ظاہری حیات کے ساتھ ہم میں موجود نہیں کہ ہم بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرح آپ ﷺ کے گرد اپنے جسموں کی دیوار بنا کر دفاع کریں' لیکن اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ہم اسلام اور دعوتِ اسلامیہ کے راستے میں کسی قسم کی مصیبت اور تکلیف کا سامنا کرنے سے گریز نہ کریں' اور جس طرح آپ ﷺ نے اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے جدوجہد اور مشقت کی ہمیں بھی آج اسی طرح جدوجہد اور کوشش کرنی چاہیے۔ ہر دور اور ہر زمانے میں اسلام کی طرف راہنمائی کرنے والے قائدین موجود رہے ہیں اور رہیں گے' یہ لوگ دعوت کے اس

کام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور نائب کی حیثیت رکھتے ہیں' تمام مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان کے مخلص سپاہی بنیں' ان کے گرد حلقہ بنا کر ان کی حفاظت کریں اور ان پر اپنی جان و مال تک قربان کر دیں جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام کرتے تھے۔

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رات کے پچھلے پہر نخلہ میں نماز پڑھ رہے تھے تو وہاں جنات کے ایک گروہ نے تلاوتِ قرآن سنی اور اسلام لے آئے' اس واقعہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ جنات کا بھی وجود ہے اور وہ بھی انسانوں کی طرح دین کے پابند اور مکلف ہیں' اُن میں سے بھی کچھ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے اور کچھ ایمان نہ لائے اور کافر رہے۔

یہ دلالت درجۂ قطعیت تک پہنچی ہوئی ہے کیونکہ قرآن پاک نے اس کا تذکرہ قطعی اور صریح نصوص میں کیا ہے' مثلاً سورۂ جن کی ابتدائی آیات یا سورۂ احقاف کی یہ آیتِ ذیل:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَاِذْ صَرَفْنَـآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ" سے لے کر "وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍO" تک۔ (الاحقاف: ۳۱۔۳۰۔۲۹)

یہ واقعہ جو ابن اسحاق اور ابن ہشام نے نقل کیا ہے' اس واقعہ کو بخاری' مسلم اور ترمذی نے بھی اسی طرح کمی بیشی سے روایت کیا ہے۔

امام بخاری نے جو ابن عباس کی سند سے روایت کیا ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ عکاظ کے بازار کی طرف تشریف لے جا رہے تھے اور اُس وقت شیاطین کا آسمان پر جانا اور وہاں سے خبریں لانا بند ہو چکا تھا اور اُن پر شہاب ثاقب پھینکے جانے لگے تھے۔ اس موقع پر جنات اپنی قوم کے پاس واپس گئے اور باہم مشورہ کیا کہ ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی ہے' جس وجہ سے ہم پر شہاب پھینکے جانے لگے ہیں؟ کہنے والے نے کہا کہ تمہارے اور آسمانی خبروں کے درمیان جو رکاوٹ ہے وہ کسی نئے واقعہ کی وجہ سے ہے' اس لیے تمام مشارق و مغارب میں پھرو اور تلاش کرو کہ وہ نیا واقعہ کیا ہے' پس وہ سب زمین کے مشارق و مغارب میں پھیل گئے تاکہ تحقیق کریں کہ وہ کون سا نیا واقعہ ہے جو ان کے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوا

ہے۔ جو جنات کا گروہ تہامہ کی طرف گیا انہوں نے آپ ﷺ کو بازار عکاظ جاتے ہوئے نخلہ کے مقام پر پایا' نخلہ کے مقام پر آپ ﷺ صحابہ کو نماز فجر پڑھا رہے تھے' جب جنات نے قرآن کی تلاوت سنی تو انہوں نے کہا: یہ ہے وہ خاص چیز جو ہمارے اور آسمانی چیزوں کے درمیان حائل ہوگئی ہے' وہ وہاں سے اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور کہا: اے قوم! بے شک ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا ہے' پس ہم اُس پر ایمان لے آئے اور اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے' اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ آیت نازل فرمائی اور اس کی خبر دی۔ (بخاری ج ۶ ص ۷۳)

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ. (الجن:۱) آپ فرمایئے: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ بڑے غور سے سنا ہے (قرآن کو) جنوں کی ایک جماعت نے۔

امام مسلم اور امام ترمذی نے بھی انہی مذکورہ بالا الفاظ میں یہ روایت نقل کی ہے' البتہ اس کے شروع میں کچھ الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ وہ زائد الفاظ یہ ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے نہ تو جنات کو قرآن سنایا اور نہ ہی ان کو دیکھا' آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ گئے۔

امام ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا الفاظ شاید امام بخاری نے عمداً حذف کر دیئے ہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ آیات جنوں کو سنائی تھیں تو اس بے سنرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نفی پر یہ بات مقدم ہے' اور امام مسلم نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی لیے امام مسلم نے ابن عباس کی حدیث کے بعد ابن مسعود کی سند سے مروی یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

میرے پاس جنوں کا ایک داعی آیا' میں اس کے ساتھ گیا اور اُن کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ ان روایات کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ اس میں متعدد واقعات کو جمع کیا گیا ہے یعنی یہ جو دو روایات ہیں' یہ دو مختلف واقعات ہیں۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۶۷۳)

پھر امام مسلم' بخاری اور ترمذی نے جو کچھ روایت کیا ہے' یہ ابن اسحاق کی روایت سے

دو طرح سے مختلف ہے۔

پہلی وجہ: ابن اسحاق کی روایت میں یہ بات نہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو نماز پڑھائی' بلکہ اس روایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اکیلے نماز پڑھی جب کہ دیگر جتنی بھی روایات ہیں اُن میں یہ بات موجود ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو نماز پڑھائی۔

دوسری وجہ: ابن اسحاق کی روایت میں نمازِ فجر کی تخصیص نہیں کی گئی جب کہ دیگر جملہ روایات میں نمازِ فجر کا ذکر موجود ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابن اسحاق کی روایت میں کوئی اشکال نہیں جب کہ دوسری جملہ روایات میں دو طرح کے اشکال ہیں:

پہلا اشکال: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس سفرِ طائف میں حضرت زید بن حارثہ کے علاوہ کوئی صحابی نہیں تھا' جیسے کہ جملہ سیرت نگاروں نے یہی روایت کیا ہے' تو پھر یہ بات کیسے پختہ ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کی جماعت کو نماز پڑھائی؟

دوسرا اشکال: پانچ نمازیں تو معراج کی رات فرض ہوئیں اور معراج کا واقعہ سفرِ طائف کے بعد پیش آیا' جیسا کہ جملہ محققین کا اس بات پر اتفاق ہے' تو پھر کیسے یہ بات درست ہے کہ آپ ﷺ نے نمازِ فجر پڑھی؟

پہلے اشکال کا جواب: ممکن ہے کہ جب آپ ﷺ طائف سے واپس مکہ لوٹ رہے تھے تو مکہ کے قریب نخلہ کے مقام پر پہنچتے ہی کچھ صحابہ کرام راستے میں مل گئے ہوں تو آپ ﷺ نے اُن سب کو فجر کی نماز پڑھائی ہو۔

دوسرے اشکال کا جواب: یہ بات بھی ممکن ہے کہ جنات کی آپ ﷺ سے ملاقات اور قرآن پاک سننے کے واقعات متعدد بار پیش آئے ہوں تو ایک مرتبہ کی روایت حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہو اور دوسری مرتبہ کی ملاقات حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہو' اور اس واقعے کے متعلق جملہ روایات اپنی اپنی جگہ صحیح ہوں۔

یہی وہ قول ہے جس پر جمہور محققین کا اتفاق ہے' یہ اُس صورت میں ہے کہ جب یہ مانا جائے کہ معراج کا واقعہ سفرِ طائف کے بعد پیش آیا لیکن اگر یہ مانا جائے کہ معراج کا واقعہ

سفرِ طائف سے پہلے پیش آیا تھا تو پھر ان روایات میں کوئی اشکال نہیں رہتا۔

اس واقعہ کے تناظر میں جو اہم بات ہم سب کو جاننی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کا اس بات پر ایمان و یقین ہونا چاہیے کہ جنات موجود ہیں اور وہ ایک زندہ مخلوق ہے اور جس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کے مکلف ہیں' اسی طرح وہ بھی مکلف ہیں اگرچہ ہم اپنے حواس سے اُن کا ادراک نہیں کر سکتے۔

وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی موجودگی کو ہماری بصری طاقت سے پوشیدہ رکھا ہے' جس وجہ سے ہم اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ نہیں سکتے' یہ بات معلوم ہے کہ ہماری آنکھیں موجودات میں سے مخصوص اشیاء کو محدود مقدار میں اور شرائط سے ہی دیکھ سکتی ہیں۔

جب اس مخلوق کا وجود کتاب و سنت کی روایاتِ متواترہ یقینیہ سے ثابت ہو گیا اور یہ بات ضروریاتِ دین میں سے ہو گئی تو اس لیے جملہ اہل اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ جنات کا انکار کرنا یا اُن کے وجود میں شک کرنے سے اِرتداد اور کفر لازم آتا ہے کیونکہ ان کے وجود کا انکار ایسی چیز کا انکار کرنا ہے جو ضروریاتِ دین میں سے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اُس خبرِ متواتر کی بھی تکذیب لازم آئے گی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ہم تک پہنچی ہے۔

کسی صاحب عقل و دانش کو غفلت و جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بات کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ صرف اُسی چیز کو مانے گا جو ''سائنس'' سے مطابقت رکھتی ہو' اور اس طرح وہ فخریہ اس بات کا اظہار کرنے لگے کہ وہ جنات کے وجود کا قائل نہیں کیونکہ اُس نے نہ تو جنات کو دیکھا ہے اور نہ اسے کبھی یہ محسوس ہوئے ہیں۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اس قسم کے دعویٰ سے بہت سے موجوداتِ یقینیہ کا انکار لازم آئے گا محض ایک سبب سے کہ جی جنات نظر نہیں آتے۔ مشہور سائنسی اصول ہے کہ کسی چیز کے عدمِ وجدان سے اس کا عدمِ وجود لازم نہیں آتا' یعنی آپ جس چیز کو تلاش کر رہے ہیں اُس کا دکھائی نہ دینا اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ چیز موجود ہی نہیں۔

طائف کی طرف سفر کے دوران آپ ﷺ نے جو کچھ دیکھا یا جو مشکلات آپ ﷺ کے ساتھ پیش آئیں' ان سب کا آپ ﷺ کی ذات پر کیا اثر ہوا؟

اس سوال کا جواب آپ ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو آپ ﷺ نے زید بن حارثہ کے سوال کے جواب میں فرمایا' جب حضرت زید نے تعجب کے ساتھ سوال کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ مکہ واپس کیسے جائیں گے حالانکہ اہل مکہ نے تو آپ کو وہاں سے نکال دیا ہے؟

تو آپ ﷺ نے بڑے اطمینان اور یقین سے جواب دیا: اے زید! جو حالات تم دیکھ رہے ہو اللہ تعالیٰ ہی کشادگی اور آسانی پیدا کرنے والا ہے' اور بے شک اللہ تعالیٰ ہی اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی کا محافظ ہے۔

آپ ﷺ کو طائف میں جس تکلیف اور ایذاء کا سامنا کرنا پڑا اور اس سے قبل مکہ میں جن مصائب و آلام کو برداشت کیا' اس سب کے باوجود آپ ﷺ کے خدا تعالیٰ پر یقین میں اور اپنے اندر پائی جانے والی قوتِ ارادی پر کوئی اثر نہیں پڑا' بلکہ آپ ﷺ اُسی طرح مطمئن اور پر یقین ہیں' اللہ کی قسم! یہ کوئی عام بشری نفس نہ تھا بلکہ آپ ﷺ کے دل میں تو نبوت کا یقین بھی پیوست تھا' وہ یہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔

اور وہ یہ جانتے تھے کہ وہ ٹھیک اُسی راہ پر گامزن ہیں جس پر چلنے کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی رہے گا' اُس نے ہر چیز کا ایک وقت متعین کر رکھا ہے۔

اس میں ہمارے لیے ایک علمی فائدہ یہ ہے کہ جب تک ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی توفیق سے اس کی راہ پر چل رہے ہیں' دعوتِ اسلامی کی راہ میں آنے والی آزمائشیں اور تکالیف ہمیں اس راہِ ہدایت سے پھیر نہ سکیں اور یہ کہ ہم میں سُستی اور کاہلی نہ پیدا ہونے پائے' جو شخص اللہ تعالیٰ سے طاقت وقوت حاصل کر رہا ہو' اس کی شان نہیں کہ وہ سستی یا مایوسی کو آڑے آنے دے' اس لیے کہ جب اس کام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مدد بھی کرتا ہے۔

سستی' مایوسی اور کم ہمتی اُن دوسری راہوں اور اصولوں کے درمیان پیش آنے والی رکاوٹوں اور آزمائشوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے' جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا۔ اس لیے کہ اس صورت میں کام کرنے والے اپنی خاص قوتِ کار اور اپنی ذاتی جدوجہد پر ہی اعتماد کرتے ہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ یہ سب کچھ مخصوص انسانی دائرے میں محدود ہوتا ہے' اس لیے

فطری بات یہ ہے کہ محدود انسانی قوت کے پیمانے کے پیش نظر اور بہت زیادہ آزمائشوں' تکلیفوں اور پریشانیوں کی وجہ سے قوت عمل اور منصوبہ بندی' مایوسی اور سستی کا شکار ہو جائے۔

معجزۂ اسراء و معراج

اسراء: اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا جو سفر کرایا اس کو اسراء کہتے ہیں۔

معراج: مسجد اقصیٰ سے آگے ساتوں آسمانوں تک اور پھر اُس سے بھی اوپر اُس آخری حد تک لے جانا جہاں جن وانس اور ملائکہ تمام مخلوقات کے علوم منقطع ہو جاتے ہیں' اس کو معراج کہتے ہیں' یہ تمام سفر ایک ہی رات میں ہوا۔

معجزۂ معراج کی تاریخ کے بارے کچھ اختلاف ہے' کیا یہ نبوت کے دسویں سال ہوا یا اس کے بعد؟ ابن سعد نے اپنی کتاب الطبقات الکبریٰ میں جو روایت کیا ہے' اس کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے اٹھارہ (۱۸) ماہ قبل پیش آیا۔

جمہور اہل اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ سفرِ معراج روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوا تھا' اسی لیے یہ واقعہ اُن بڑے معجزات میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو سرفراز فرمایا۔

اس معجزۂ معراج کا پورا واقعہ جو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے وہ طویل ہے' اُس کا خلاصہ یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

کہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں سواری کے لیے ایک براق پیش کیا گیا' براق ایک جانور ہے جو گدھے سے بڑا اور خچر سے تھوڑا چھوٹا ہے' جہاں تک نگاہ پہنچتی ہے وہاں اس کا ایک قدم پڑتا ہے۔

آپ ﷺ مسجد حرام سے چلے اور مسجد اقصیٰ پہنچے' وہاں آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی' پھر جبریل امین ایک برتن میں شراب طہور اور ایک برتن میں دودھ لے کر حاضر ہوئے' آپ ﷺ نے دودھ پسند فرمایا' جبریل عرض کرتے ہیں: آپ نے فطرت کو اختیار فرمایا ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم براق پر سوار ہو کر آسمان کی طرف سفر شروع کرتے ہیں' آپ پہلے' دوسرے' تیسرے' اسی طرح ساتوں آسمانوں سے اوپر تشریف لے گئے' اس کے بعد آپ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے وہاں آپ کو خاص وحی فرمائی۔

پھر اسی رات مسلمانوں پر پانچ نمازیں فرض کی گئیں حالانکہ یہ دن رات میں پچاس نمازیں ہیں جنہیں کم کر کے پانچ کر دیا گیا[1]

ایک ہی رات میں زمین سے زمین تک یہ سفر مکمل ہوا' جب صبح ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رات کو پیش آنے والا واقعہ بیان فرمایا' مشرکین خود بھی اور دوسروں کو بھی جمع کرنے لگے تا کہ اس بات کا مذاق اُڑایا جائے اور اس پر ہنسا جائے' بعض مشرکین نے تو چیلنج کر دیا کہ آپ واقعی وہاں گئے ہیں اور وہاں نماز پڑھی ہے تو ہمیں بیت المقدس کے احوال واوصاف اور وہاں کا نقشہ بتائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں گئے تھے اور ایک سرسری نظر بیت المقدس کو دیکھا بھی تھا لیکن آپ کے دل میں یہ بات نہ آئی کہ اس کے جملہ اطراف واکناف کو دیکھا جائے اور اس کا نقشہ اور ستونوں کی تعداد کو ذہن میں محفوظ کیا جائے' لیکن اب اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کی تصویر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے رکھ دی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تفصیل کے ساتھ اس کے احوال واوصاف اس طرح بیان فرمانے لگے اور مشرکین مکہ کے سوالوں کے جواب دینے لگے گویا کہ بیت المقدس آپ کے سامنے ہے۔

امام بخاری ومسلم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے' آپ نے فرمایا:

جب قریش نے میری بات جھٹلا دی تو میں حجر میں کھڑا ہو گیا' اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو مجھ پر منکشف کر دیا' پس میں اس کی نشانیوں کی خبر دینے لگا گویا کہ میں اُس کو دیکھ رہا ہوں۔

---

[1] اگر آپ واقعۂ اسراء ومعراج کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے صحیح مسلم یا صحیح بخاری یا سنت صحیحہ کے کسی دوسرے ماخذ کا مطالعہ کریں' اور "معراج ابن عباس" جیسی کتاب پر بالکل اعتماد نہ کریں' اس لیے کہ یہ جھوٹ اور گمراہ کن باتوں سے بھری پڑی ہے' اور حضرت عبداللہ بن عباس کا اس کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔

بعض مشرکین نے آپ ﷺ کے معجزۂ معراج کی خبر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جا کر دی' اس امید پر کہ یہ بھی اس کو بہت بڑی بات سمجھتے ہوئے اس کی تصدیق نہیں کریں گے' لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر واقعی یہ بات رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے تو یہ سچ ہے' میں تو اس سے بھی بڑی بات پر اُن کی تصدیق کرتا ہوں۔

جس رات یہ واقعہ پیش آیا' اسی صبح جبریل امین بھی آئے اور نمازوں کے اوقات اور اس کی کیفیت ذکر کی' آپ ﷺ ان پانچ نمازوں کی مشروعیت سے پہلے صبح و شام دو دو رکعت نماز پڑھتے تھے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام ادا کیا کرتے تھے۔

اسباق ونصائح

اوّل: رسول اور معجزات

بعض محققین نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی تصویر کشی میں اس قدر مبالغہ کا کام لیتے ہیں کہ وہ عام بشری زندگی معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ نام نہاد محققین بڑی تفصیل سے یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی زندگی میں خارقِ عادت کام اور معجزات نہیں پائے جاتے تھے بلکہ آپ ان معجزات کا انکار کرتے تھے اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے تھے' اور ان معجزات کا مطالبہ کرنے والوں کی طرف کوئی التفات نہیں کرتے تھے' آپ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ معجزات اور خوارق آپ کی شان کے لائق نہیں اور یہ کہ آپ معجزات دکھانے پر قادر نہیں' اور یہ نام نہاد محققین اپنے دعویٰ پر کچھ اس طرح کی آیات سے استدلال کرتے ہیں:

قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ. 　آپ فرمایئے کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں۔ (الانعام:۱۰۹)

اس قسم کی آیات سے قاری یا سامع کو یہ خیال گزرتا ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت مطہرہ ایسے معجزات اور نشانیوں سے خالی تھی' جس قسم کے معجزات کے ذریعے اللہ تعالیٰ عام طور پر اپنے سچے نبیوں کی تائید فرماتا ہے۔

جب ہم رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اس قسم کے نظریے میں غور وفکر کرتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ اصل میں یہ نظریہ بعض مستشرقین اور غیر مسلم محققین مثلاً گوستاف لوبون'

اوگسٹ کانٹ' هیوم اور گولڈ زیہر وغیرہ کا پیش کردہ ہے' ان کے نزدیک اس نظریے کی اساس اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ پہلے نمبر پر ان معجزات کے خالق اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان دل میں راسخ ہو جائے تو پھر ہر ایسی چیز پر ایمان لانا آسان ہو جاتا ہے اور پھر دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں بچے گی جس کو حقیقت میں معجزہ قرار دیا جا سکے۔

پھر عالم اسلام کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ یہ نظریہ ان مستشرقین سے بعض مسلمانوں نے بھی اپنا لیا۔

پھر ان مسلمانوں نے اپنی تمام تر کوششیں اور تمام علوم ان غیر مسلم لوگوں کے افکار کو پھیلانے میں وقف کر دیئے' بغیر کسی تحقیق کے۔ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ یورپ کی سائنسی ترقی اور نشاۃ ثانیہ کے مظاہر کی چمک دمک نے انہیں اپنا گرویدہ کر لیا اور یہ اس کے دھوکے میں آ گئے' ان مسلمانوں میں شیخ محمد عبدہٗ' شیخ محمد فرید وجدی اور حسین ھیکل شامل ہیں۔

پھر شکوک وشبہات پیدا کرنے والوں اور اسلام کے خلاف فکری یلغار بپا کرنے والوں نے غور کیا تو انہوں نے پایا کہ مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے اور ان میں فکری یلغار بپا کرنے کے لیے خود مسلمانوں کے اقوال میں ایسی باتیں موجود ہیں کہ جو ان کے لیے نئے میدان اور نئے آفاق کھولتی ہیں اور یہ چیز انہیں اس سلسلے میں پرانے وسائل اختیار کرنے سے بے نیاز کر دیتی ہے' یعنی اسلامی عقیدے کے خلاف براہِ راست جنگ اور ذہنوں میں الحادی عقائد کے بیج بونے کے پرانے وسائل۔

انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے بعض مخصوص صفات مثلاً شجاعت' عبقریت اور قیادت وغیرہ کو تعریف وتحسین کی عبارات میں رواج دینا شروع کر دیا اور ساتھ ہی وہ آپ ﷺ کی عمومی زندگی کی تصویر میں اس قدر مبالغہ آرائی کرنے لگے کہ وہ عقل سے ماوراء معجزات اور خارقِ عادت کاموں سے دُور معلوم ہو' تاکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے ذہنوں میں نبی اکرم ﷺ کی ایک ایسی نئی تصویر راسخ کر دیں کہ کبھی تو وہ ایک عبقری کی تصویر ہو' یا کبھی وہ ایک قائد کی تصویر ہو یا کبھی ایک ہیرو کی تصویر ہو' لیکن کسی

حال میں بھی وہ ایک نبی اور رسول کی تصویر نہ ہو' عبقریت اور بطولت جیسے القاب کو مشہور کرنے سے نبوت و رسالت کے جملہ حقائق جن میں وحی' غیبیات اور خوارق وغیرہ شامل ہیں' یہ سب اساطیر "MY THOLOGY" قرار پا جائیں گے' کیونکہ وحی اور نبوت تو ظاہری طور پر معجزات کی بنیاد پر معلوم ہوتی ہے۔

ان القاب کے رواج پانے کے بعد فطری طور پر یہی تصور قائم ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ کے گرد مختلف لوگوں اور مختلف قوموں کا کثرت کے ساتھ جمع ہونے' آپ کے پرچم تلے آنے اور آپ کی دعوت کو قبول کرنے کا سبب محض آپ کی عبقریت سے متاثر ہونا اور آپ کی زندگی میں قائدانہ خصوصیات کا پایا جانا تھا۔

اپنے اس ارادے سے ان کا جو مقصد تھا وہ اُن کے اس عمل سے واضح ہو رہا ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کے امتیوں کو مسلمان کی بجائے نیا نام محمدیین (MOHAMMADENS) دے دیا۔

لیکن اگر ہم منطق اور معروضی تحقیق کی روشنی میں حضرت محمد ﷺ کے معاملہ کی حقیقت کو واضح کرنا چاہیں تو اس کے سامنے تخیل اور تصور کی کوئی گنجائش نہیں' اس پر ہم تفصیلاً ذکر کرتے ہیں۔

اوّل: اگر ہم وحی کے مظاہر میں غور و فکر کریں جو کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بہت واضح ہے اور تفصیلاً اس کا ذکر گزر چکا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نمایاں ترین وصف نبوت و رسالت کا ہے' جس میں کوئی شک و شبہ نہیں اور نبوت اُن غیبی حقائق میں سے ہے جو ہمارے محسوس پیمانوں کے ماتحت نہیں ہے' اس طرح پتا چلا کہ خارقِ عادت معجزہ کی حقیقت آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات کی اصل میں موجود ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے معجزات و خوارق کے وقوع کی نفی کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نبوت کے مفہوم کو ہی کالعدم نہ قرار دیا جائے' اور اسے آپ کی حیاتِ طیبہ سے مٹا نہ دیا جائے' اور ایسا کرنا بذاتِ خود بدیہی طور پر دین کے ہی انکار کرنے کے مترادف ہے۔ اگرچہ بعض مستشرق محققین نے اس کے نتیجے کی وضاحت نہیں کی' بلکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ذہانت' عبقریت' شجاعت اور حکمت عملی کے نتیجے کی بجائے مقدمات وضع کرنے پر ہی اکتفاء

کیا ہے کیونکہ ان مقدمات کو تسلیم کرنے کے بعد نتیجہ تو خود بخود ہی نکل آئے گا' اگرچہ اس کی وضاحت کرنے اور اس کو کھول کر بیان کرنے سے ان کے سینے تنگ تھے لیکن پھر بھی اکثر نے اس کے نتیجے کو صراحۃً بیان کر دیا' مثلاً شبلی شمیل نے دین پر ایمان لانے کو ایک محال اور ناممکن الوقوع معجزے پر ایمان لانے سے تعبیر کیا ہے۔[1]

آپ بہ خوبی اس بات سے باخبر ہیں کہ اگر دین کی اصل ہی مشکوک ہو جائے یا اس کا انکار کر دیا جائے تو پھر معجزات کی جزئیات کے انکار یا اثبات کا مسئلہ باقی ہی نہیں رہتا۔

دوم: جب ہم رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر بہت سے معجزات جاری کیے' جنہیں تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں اور جن کا انکار کرنے کی کوئی مجال نہیں۔ اس لیے کہ یہ معجزات ایسی صحیح اور متواتر اسناد سے منقول ہیں جو فکر و عقل کو قطعیت و یقین کے درجے تک لے جاتی ہیں۔

مثلاً ان قطعی دلائل میں سے آپ ﷺ کی انگلیوں مبارک سے پانی کے چشمے جاری ہونا ہے' اس حدیث طیبہ کو امام بخاری نے کتاب الوضوء میں' امام مسلم نے کتاب الفضائل میں' امام مالک نے اپنی کتاب موطأ کی کتاب الطہارۃ میں اور دیگر ائمہ حدیث نے بے شمار سندوں سے روایت کیا ہے' حتیٰ کہ زرقانی نے قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے: بے شک آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہونے کا واقعہ متعدد بار بڑے جمِ غفیر کے سامنے پیش آیا اور بہت زیادہ سندوں سے مروی ہے' ان اسناد کے مجموعے سے معنوی تواتر کی بناء پر علم قطعی حاصل ہوتا ہے۔ (دیکھیے: موطأ پر زرقانی کی شرح ج ۱ ص ۶۵)

اسی طرح مشرکین کے مطالبے پر آپ ﷺ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہو جانے والی حدیث کو امام بخاری نے ''کتاب احادیث الانبیاء'' میں اور امام مسلم نے ''کتاب صفۃ القیامۃ'' میں اور دیگر عام علماء حدیث نے اس کو روایت کیا ہے۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

اس واقعہ پر صحیح اسناد کے ساتھ متواتر احادیث مروی ہیں۔ یہ چیز علماء کے درمیان متفق ہے کہ یہ واقعہ نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں ہی پیش آیا اور یہ واقعہ آپ ﷺ کے

[1] ڈاکٹر شبلی شمیل یہ بات بوکنز کی کتاب کے عربی ترجمے کے مقدمہ میں ذکر کرتا ہے۔ بوکنز کی وہ کتاب جس میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی تشریح کی گئی ہے۔

روشن معجزات میں سے ایک ہے۔ (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۶۱)

انہی معجزاتِ باہرہ میں سے اسراء و معراج کا واقعہ بھی ایک معجزہ ہے' جس کے بارے میں ہم یہاں بحث کر رہے ہیں۔ اس واقعہ والی حدیث علماء کے درمیان متفق ہے' جس کے ثبوت کی قطعیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جمہور مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آپ کے نمایاں ترین معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔

عجیب بات ہے کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے لیے صفتِ عبقریت اور صرف عبقریت کو ہی رواج دیتے نہیں تھکتے اور آپ کی حیاتِ طیبہ سے معجزات اور خوارق کو علیحدہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

وہ لوگ اُن احادیث متواترہ سے تجاھل عارفانہ برتتے ہیں جو صحت میں قطعیت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہیں اور ان کے بارے میں تائید یا تردید کے متعلق کوئی بات نہیں کرتے' گویا کہ کتب احادیث میں ان کا کوئی تذکرہ ہی نہیں حالانکہ ان میں سے ہر واقعہ دس سے زائد اسناد سے مروی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ان کے اس تجاھل کا سبب اُس گنجلک اشکال سے راہِ فرار اختیار کرنا ہے جو ان احادیث طیبات میں غور کرتے وقت ان کو پیش آئے گا۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے اُس نظریے کی واضح طور پر تردید ہو جاتی ہے' جو ان کے ذہنوں میں گھوم رہا ہے۔[1]

سوم: معجزہ' ایسا کلمہ ہے جس میں غور و فکر کرتے وقت کوئی ذاتی معنی نہیں پایا جاتا بلکہ اس سے محض اس کا نسبی معنی مراد ہوتا ہے۔ لوگوں کی اصطلاح میں معجزہ سے مراد ہر وہ کام ہے جو غیر عادی اور غیر معروف ہو' اور ہر معروف چیز زمانہ اور مدت گزرنے کے ساتھ ارتقاء حاصل کرتی ہے' اسی طرح یہ چیز ثقافت' عقل و شعور اور علوم میں ترقی کے ساتھ ساتھ تبدیل بھی ہوتی ہے' تو اس طرح کئی چیزیں کچھ عرصہ قبل تک تو عام لوگوں کی تعریف اور اصطلاح کے مطابق معجزہ کہلائیں لیکن آج کے سائنسی دور میں وہ چیزیں معروف اور مروّج ہو چکی ہیں اور کچھ

---

[1] ایسے لوگوں میں ایک ''حیاتِ محمد'' کے مصنف ہیں' انہوں نے ان احادیث اور ان کی مثل دیگر احادیث کے نتائج سے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں عجیب و غریب ہرزہ سرائی کی ہے۔ تاکہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ان کے خیالی نظریے کی صفائی متاثر نہ ہونے پائے۔

چیزیں جو متمدن اور تہذیب یافتہ ماحول میں معروف ہوتی ہیں لیکن غیر متمدن لوگوں میں' وہ چیزیں معجزہ بن جاتی ہیں۔

بلکہ حق بات یہ ہے جو ہر عقل مند سمجھ جاتا ہے کہ ہر چیز جو معروف ہو یا غیر معروف وہ اپنی اصل میں معجزہ ہے۔

ستارے معجزہ ہیں' افلاک کی حرکت معجزہ ہے' قانونِ کشش معجزہ ہے' انسان کے جسم میں اعصاب کا مجموعہ معجزہ ہے' انسانی جسم میں دورانِ خون معجزہ ہے' انسانی جسم میں پائی جانے والی روح معجزہ ہے۔

انسان بذاتِ خود ایک معجزہ ہے' فرانسیسی سائنس دان شاتو بریاں کا یہ قول کتنا دقیق ہے کہ انسان ایک مابعد الطبیعاتی حیوان ہے یعنی ایک ایسا حیوان جو غیب کے پردوں میں پوشیدہ ہے۔

لیکن انسان چونکہ طویل مانوسیت اور مسلسل ان چیزوں کے عادی ہونے کی وجہ سے ان کا معجزہ ہونا بھولا ہوا ہے' اپنی جہالت اور غرور کی وجہ سے یہ خیال کرتا ہے کہ معجزہ صرف وہی چیز ہے جو صرف معروف اور عادت کے مطابق ہو۔

پھر جو معروف اور معتاد چیزیں انسان اخذ کرتا ہے' اس کو چیزوں پر ایمان لانے یا انکار کرنے کی کسوٹی بناتا ہے۔

انسان نے تمدن اور سائنس کے مدارج میں جتنی بھی ترقی کر لی ہے وہ پھر بھی اس عجیب جہالت میں مبتلا ہے۔

تھوڑا سا غور وفکر کرنے سے انسان پر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ جس معبودِ برحق نے اس پوری کائنات کا معجزہ تخلیق فرمایا' اس کے لیے یہ مشکل نہیں کہ وہ اس میں کسی دوسرے معجزے کا اضافہ کر دے۔

یا اس کائنات میں جو اُس نے نظام قائم کیا ہے اُس میں کچھ تغیر وتبدل کر دے' اسی طرح کا غور وفکر انگریز مستشرق ولیم جونز نے کیا اور کہا:

جس قدرت نے دنیا کو تخلیق کیا' وہ اس بات سے عاجز نہیں کہ اس میں سے کسی چیز کی کمی کر دے یا اس میں کسی چیز کا اضافہ کر دے' یہ بات کہنے کے لحاظ سے آسان ہے کہ یہ چیز

عقلی طور پر نا قابلِ تصور ہے لیکن اس کو جو نا قابل تصور کہا جاتا ہے یہ چیز اتنی نا قابل تصور نہیں جس حد تک اس دنیا کا وجود ہے۔

ولیم جونز کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ دنیا موجود نہ ہوتی اور ایک ایسے آدمی کو کہا جاتا کہ جو معجزات اور خوارق کا منکر ہو اور ان کے وجود کا تصور نہ رکھتا ہو کہ ایک ایسی خصوصیات والی کائنات وجود میں آنے والی ہے' تو وہ سرے سے ہی یہ جواب دے گا کہ یہ تو نا قابل تصور ہے۔ اس کا یہ انکار اس سے زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا جتنی شدت سے وہ کسی معجزے کی نفی کرتا ہے۔

ہر مسلمان کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزات کے بارے میں یہ چیز اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔

دوم: معجزۂ اسراء و معراج اُن عظیم واقعات میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اُن مشکل حالات کے بعد عزت و تکریم سے نوازا۔

رسول اللہ ﷺ کو قریش کی طرف سے مختلف اقسام کی تکالیف دی گئیں' آخر میں آپ ﷺ کو ہجرتِ طائف کے موقع پر تکلیف دی گئی' جس کا ذکر پیچھے گزر چکا' اس کا اظہار آپ ﷺ کی اُس دعا و مناجات سے ہوتا ہے جو آپ نے ربیعہ کے بیٹوں کے باغ میں استراحت پانے کے بعد اپنے رب سے کی تھی' اس دعا سے اُس شعور اور احساس کا اظہار ہوتا ہے جو ایک انسان اپنی کمزوری کی صورت میں مدد کی طلب کی صورت میں کرتا ہے۔ یہی جذبہ اور احساس ہی انسان میں عبودیتِ الٰہی کا مظہر ہے' آپ ﷺ کی اس التجاء میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکوہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اُس سے عافیت اور معونت کی شدید طلب موجود ہے' اور شاید آپ کو اس بات کا خوف ہوا کہ یہ مصائب و آلام جن سے سامنا ہے کہیں یہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے سبب سے تو نہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ کی دعا میں ایک یہ بھی جملہ تھا: اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کسی تکلیف کی پرواہ نہیں۔

اس کے بعد اسراء و معراج کی ضیافت کا واقعہ ہوا' جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کی عزت و تکریم اور آپ کی عزیمت و ثابت قدمی کی تجدید کا اظہار تھا' پھر یہ واقعہ ایک دلیل کے طور پر بھی سامنے آیا کہ آپ ﷺ کو جو مصائب و تکالیف اپنی قوم کی طرف سے

در پیش تھیں' یہ اس وجہ سے نہیں تھیں کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ نے آپ کو چھوڑ دیا ہے یا اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہو گیا ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے والوں اور اس کے محبوبوں کے ساتھ یہی سنت الٰہیہ ہے اور ہر زمانے میں دعوتِ اسلامی کی بھی یہی سنت ہے۔

سوم: بیت المقدس تک کے سفر میں موجود اسرار و رموز: بے شک آپ ﷺ کے بیت المقدس تک کے سفر اور ساتوں آسمانوں کی طرف عروج کے درمیان' زمانی تعلق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس گھر کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی قدر و منزلت اور تقدس حاصل ہے' اور اس سے واضح طور پر یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اور حضرت محمد بن عبداللہ علیہما الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کے درمیان گہرا اور مضبوط تعلق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو ایک ہی دین کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔

اس میں یہ راہنمائی بھی موجود ہے کہ مسلمانوں کو ہر زمانے اور ہر دور میں اس ارضِ مقدسہ کی حفاظت اور اس میں دخل اندازی کرنے والے دشمنانِ دین سے اس کی مدافعت کی کوشش کرنی چاہیے' گویا کہ حکمتِ الٰہی اس زمانے کے مسلمانوں کو خبردار کر رہی ہے کہ اس مقدس سرزمین میں یہودیوں کی عداوت و جارحیت کے سامنے کمزوری' بزدلی اور سستی سے کام نہ لینا' اور اسے اُن کی پلیدی سے پاک کرنا' اور اسے اہل ایمان کی طرف لوٹا دینا' کون جانتا ہے کہ شاید اس اسراء و معراج کے عظیم واقعہ کی وجہ سے ہی صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ میں وہ عظیم شجاعت پیدا ہوئی ہو جس کی وجہ سے انہوں نے اس مقدس خطے پر سے صلیبی حملوں کو روکنے کے سلسلے میں اپنی تمام کوششیں صرف کی ہوں اور انہیں خائب و خاسر الٹے پاؤں لوٹنے پر مجبور کر دیا ہو۔

چہارم: حضرت جبریل امین نے نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں جب ایک پیالہ شرابِ طہور اور ایک پیالہ دودھ کا پیش کیا تو آپ ﷺ نے دودھ پسند فرمایا' یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسلام دین فطرت ہے' یعنی ایسا دین ہے جو اپنے عقیدہ اور احکام میں ہر وہ چیز رکھتا ہے جو حقیقی انسانی فطرت کے مطابق ہے اور اسلام میں ایسی کوئی چیز نہیں جو انسان کی حقیقی فطرت سے متصادم و متعارض ہو' اگر فطرت لمبائی چوڑائی رکھنے والا جسم ہے تو دین اسلام اس کی مقدار کے مطابق اس کا موزوں لباس ہے۔

یہ ہے اس دین کے تیزی سے پھیلنے اور لوگوں کے دیوانہ وار اس دین کو قبول کرنے کا راز۔ انسان تہذیب و تمدن کے کتنے ہی مدارج طے کر لے اور کتنی ہی مادی آسائشیں حاصل کر لے' یہ اپنی فطرت کے تقاضوں کی تکمیل اور فطرت سے تعلق نہ رکھنے والے تکلفات اور تعقدات کے طوق سے آزادی حاصل کرنے کی جانب مائل رہتا ہے۔ اسلام ہی وہ واحد نظام ہے جو انسانی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

پنجم: اسراء اور معراج اکٹھے روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس پر متقدمین و متاخرین جمہور مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے:

حق بات کہ جس پر اکثر لوگوں' بیشتر سلف اور عام متاخرین فقہاء' محدثین اور متکلمین کا اتفاق ہے' وہ یہ ہے کہ واقعۂ اسراء آپ ﷺ کے جسم اطہر کے ساتھ پیش آیا' اور تمام آثار اسی پر دلالت کرتے ہیں' جس نے ان کا مطالعہ کیا یا ان کے متعلق بحث کی' اور ان کے ظاہر کو کسی دلیل کے بغیر نہیں پھیرا جا سکتا اور انہیں ظاہر پر محمول کرنا محال بھی نہیں کہ جس سے تاویل کی ضرورت ہو۔ (نووی علیٰ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰)

امام ابن حجر اپنی شرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں:

بے شک اسراء اور معراج ایک ہی رات میں' بیداری کی حالت میں اور آپ ﷺ کے جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوئی۔ جمہور علماء حدیث' فقہاء اور متکلمین کا یہی موقف ہے۔ صحیح روایات و اخبار کا ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اس ظاہری مفہوم سے پھرنا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ یہ عقلی طور پر محال نہیں جس وجہ سے تاویل کی ضرورت پڑے۔

(فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۷ ص ۱۳۶-۱۳)

وہ پختہ اور واضح دلائل جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اسراء و معراج جسمانی اور روحانی ہوئی' اُن میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ مشرکین قریش نے اس خبر کو بہت بڑا سمجھا اور اس پر تعجب کا اظہار کیا اور فوراً ہی اس کی تکذیب کر دی۔ اگر یہ محض خواب کی بات ہوتی اور آپ ﷺ نے ان کو ایک خواب کی حیثیت سے ہی اس کی خبر دی ہوتی تو ان لوگوں کی طرف سے کسی تعجب' حیرت یا انکار کا مظاہرہ نہ ہوتا کیونکہ خواب میں دیکھی جانے والی چیزوں کی کوئی حد نہیں ہوتی' بلکہ اس طرح کے خواب تو مسلمان اور کافر

سب کے لیے دیکھنا ممکن ہے' اگر معاملہ ایسے ہی ہوتا تو وہ لوگ آپ کو آزمانے یا چیلنج کرنے کے ارادے سے آپ سے بیت المقدس کے احوال' اس کے دروازوں اور اس کے ستونوں کے متعلق سوال نہ کرتے۔

رہی یہ بات کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہوا اور عقل اس کا تصور کیسے کر سکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے کائنات اور زندگی کے دیگر معجزے رونما ہوئے ایسے ہی یہ معجزہ بھی رونما ہوا' ہم نے ابھی پیچھے ذکر کیا ہے کہ اس کائنات کے جملہ مظاہر اپنی حقیقت کے اعتبار سے معجزہ ہیں' تو جس طرح عقلیں ان کو آسانی اور سہولت سے تصور میں لے آتی ہیں' اسی طرح اس معجزے کو بھی سہولت اور آسانی سے تصور میں لانا اور تسلیم کر لینا ممکن ہے۔

ششم: اسراء و معراج کے واقعہ کے متعلق بحث کرتے وقت آپ ''معراج ابن عباس'' جیسی کتاب سے بچ کر ہی رہیں۔ یہ کتاب جھوٹی اور من گھڑت باتوں کا مجموعہ ہے جن کی نہ کوئی اصل ہے اور نہ ہی کوئی سند ہے' کسی نے یہ فعل شنیع کرتے ہوئے ان من گھڑت جھوٹی باتوں کو حضرت عبداللہ بن عباس سے منسوب کر دیا ہے' ہر تعلیم یافتہ بلکہ ہر صاحب عقل یہ بات جانتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ان اکاذیب سے بَری ہیں اور انہوں نے معراجِ رسول پر کوئی کتاب تالیف ہی نہیں کی' بلکہ تصنیف و تالیف کی تحریک تو اُموی دور کے اواخر میں ظاہر ہوئی۔

جب بُرائی کے علم برداروں کو اس کتاب کا پتا چلا اور انہوں نے اس میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ایسی جھوٹی باتوں کو پایا جو بہت سے لوگوں کا ایمان متزلزل کر سکتی تھیں تو انہوں نے اس کتاب کی ترویج کرنا اور لوگوں کو اس کی طرف بُلانا شروع کر دیا' اور وہ لوگ جنہوں نے اس کتاب کی مدح و تعریف کی' اُن میں سے ایک ڈاکٹر لویس عوض ہے اور تم کیا جانو کہ ڈاکٹر لویس عوض کیا ہے؟ یہ صاحب دوسرے سب لوگوں سے قبل اس بات کو جانتے ہیں کہ یہ کتاب حضرت عبداللہ بن عباس کی طرف جھوٹی باتوں کو منسوب کرنا ہے اور اس میں درج جملہ احادیث باطل ہیں لیکن ان کے نزدیک جلد ہی جھوٹ اُس وقت سچ میں بدل جاتا ہے جب اس میں ایسی باتیں پائی جائیں جن سے مسلمانوں کے افکار کو پراگندہ کیا جا سکے اور ان کے دین میں التباس پیدا کیا جا سکے۔

حضور ﷺ کی قبائل سے ملاقات اور انصار کے قبولِ اسلام کی ابتداء

رسول اللہ ﷺ اس پوری مدت میں ہر سال حج کے موسم میں اُن قبائل سے ملتے جو مختلف اطراف سے بیت الحرام کی طرف آتے' آپ ﷺ اُن پر کتاب اللہ کی آیات تلاوت فرماتے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دیتے لیکن کوئی بھی اس دعوت کو قبول نہ کرتا۔

ابن سعد اپنی کتاب الطبقات الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر سال حج کے دوران زائرین کے پاس جاتے اور بالخصوص عکاظ' مجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں شرکت کرنے والے لوگوں کے پاس جاتے' اُنہیں اللہ تعالیٰ کے پیغامات سناتے' حق کی دعوت دیتے اور جنت کی خوش خبری دیتے لیکن کوئی بھی اس سلسلے میں آپ کی مدد نہ کرتا۔ آپ ﷺ اُن کو فرماتے: اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہہ دو تم فلاح پا جاؤ گے اور (اس کلمہ کی برکت سے) تم عرب کے حکمران بن جاؤ گے اور عجم تمہارے سامنے سرنگوں ہوگا اور اگر تم ایمان لے آؤ گے تو تم جنت میں بھی بادشاہ ہو گے۔

ابولہب' آپ ﷺ کے پیچھے ہی ہوتا اور کہتا جاتا: اس کی اطاعت نہ کرنا بے شک یہ صابی اور جھوٹا ہے' پس لوگ ابولہب کی یہ بات سن کر آپ ﷺ کے پیغامِ حق کو جھٹلا دیتے اور آپ ﷺ کو ایذاء دیتے۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۱ ص ۲۰۱۔۲۰۰' ابن اسحاق نے بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے' دیکھئے: سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۲۳)

ابن اسحاق نے زہری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے پاس آئے اور اُنہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دی' اور اپنی رسالت اُن پر پیش کی' اُن میں سے بحیرہ بن فراس نامی شخص نے کہا: خدا کی قسم! قریش میں سے اگر یہ نوجوان میرے ساتھ ہو جائے تو میں تمام عرب کو فتح کر لوں' پھر اُس نے کہا: آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر ہم آپ کی بیعت کر لیں' پھر اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مخالفین پر غلبہ دے دے تو کیا آپ کے بعد پھر ہماری حکمرانی ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حکومت تو اللہ ہی کی ہے وہ جسے چاہے نواز دے' پھر اُس شخص نے کہا: کیا ہم آپ کے لیے اپنی گردنیں عربوں کے نشانہ بننے کے لیے پیش کریں اور اللہ جب آپ کو غلبہ عطا کر دے تو پھر حکومت بھی ہمارے علاوہ

کسی اور کی ہوگی؟ لہٰذا ہمیں آپ کی دعوت سے کوئی غرض نہیں۔

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۲۵، تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۵۰)

نبوت کے گیارہویں برس بھی گزشتہ سالوں کی طرح آپ لوگوں کو دعوتِ اسلام پیش کر رہے تھے کہ اس دوران عقبہ کے قریب (عقبہ گھاٹی کو کہتے ہیں، اس سے مراد منیٰ اور مکہ کی درمیانی جگہ جمرۃ العقبہ ہے) قبیلہ خزرج کے ایک قافلے سے آپ کی ملاقات ہوئی[1] جن سے اللہ تعالیٰ نے خیر اور بھلائی کا ارادہ فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے اُن سے پوچھا: آپ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہم خزرج قبیلہ کے چند افراد ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم یہود کے حلیف لوگوں میں سے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! آپ نے فرمایا: کیا تم بیٹھتے نہیں کہ میں تم سے کچھ باتیں کرلوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ضرور، پس وہ سب لوگ آپ ﷺ کے پاس بیٹھ گئے، آپ ﷺ نے اُنہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت دی اور اُن پر اسلام پیش کیا اور قرآنِ پاک کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ اُن کے دل پہلے ہی قبولِ اسلام کے لیے تیار تھے کیونکہ وہ سال ہا سال سے یہودیوں کے ساتھ رہ رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ یہود اہل علم اور اہل کتاب ہیں، جب بھی یہودیوں اور ان قبائل کے درمیان کوئی لڑائی جھگڑا ہوتا تو یہود ان کو کہا کرتے کہ بے شک قریب کے زمانے میں ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے ہم اُس نبی کی اتباع کریں گے اور اُس کے ساتھ مل کر ہم تمہیں قومِ عاد اور اِرم کی طرح ہلاک کردیں گے۔

جب آپ ﷺ نے اُن سے بات چیت کی اور انہیں اسلام کی دعوت دی تو وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور کہنے لگے: تم جانو کہ خدا کی قسم! یہی وہ نبی ہیں جن کی آمد کا ذکر یہود تمہیں دیتے آئے ہیں، پس یہود ان کو ماننے میں تم سے سبقت نہ لے جائیں۔

پس اُن لوگوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کرلیا اور عرض کرنے لگے: ہم اپنی قوم کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ کسی قوم میں ہم سے زیادہ باہمی عداوت نہیں ہوگی، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کو آپ کی دعوت پر جمع فرمادے گا، ہم ان کے پاس جاکر اُن کو آپ

[1] اس گروہ میں چھ افراد تھے: اسعد بن زرارہ، عوف بن الحارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر اور جابر بن عبداللہ۔

کے حکم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس دین سے جو ہم نے قبول کیا ہے وہ اپنی قوم پر پیش کرتے ہیں' اگر اللہ تعالیٰ نے اُن کو آپ کے ہاتھ پر جمع کر دیا تو پھر آپ سے زیادہ مضبوط کوئی نہیں ہوگا۔

پھر وہ لوگ واپس لوٹے اور آئندہ سال ایامِ حج میں دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔

(ابن اسحاق نے یہ روایت عاصم بن عمر سے اور انہوں نے اپنی قوم کے بوڑھوں سے روایت کی ہے' نیز دیکھئے: سیرت ابن ہشام ج ا ص ۴۲۸)

بیعت عقبہ اُولیٰ

نبوت کے گیارھویں سال مدینہ میں اسلام پہنچا' اس کے بعد جب حج کا موسم آیا تو مدینہ کے بارہ آدمیوں نے رسول اللہ ﷺ سے عقبہ اُولیٰ کے پاس ملاقات کی اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی' یہ بیعت نساء طرز کی اُن دفعات پر مشتمل بیعت تھی' جس میں جنگ اور جہاد کی بیعت نہیں تھی بلکہ یہ اُسی طرح کی بیعت تھی جو آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے روز جبلِ صفا پر عورتوں سے لی تھی۔

مدینہ کے ان افراد میں اسعد بن زرارہ' رافع بن مالک' عبادہ بن صامت اور ابوالہیثم بن التیہان شامل تھے' حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اس بیعت کی خبر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہم بارہ آدمی تھے' رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا: آؤ! مجھ سے بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے' تم چوری نہیں کرو گے' تم زنا نہیں کرو گے' تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے' تم بہتان نہیں لگاؤ گے' تم نیکی کے کام میں میری نافرمانی نہیں کرو گے' پس تم میں سے جس نے اس بیعت کو نہ توڑا اُس کا اجر اللہ پر ہے' تم میں سے جس نے کوئی گناہ کیا تو جو سزا اس کو دنیا میں دی گئی وہ اس کے گناہ کا کفارہ ہوگی اور جس کے گناہ کو اللہ تعالیٰ نے چھپا لیا اگر اللہ چاہے تو اس کو سزا دے اور اگر اللہ چاہے تو اس کو معاف فرما دے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے ان دفعات پر بیعت کی۔[1]

---

[1] صحیح بخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب وفود الانصار وبیعۃ العقبہ۔ صحیح مسلم' کتاب الحدود۔ اس بیعت میں حضرت عبادہ کی شرکت کے سلسلے میں طویل کلام کیا گیا ہے' اس کی تحقیق دیکھئے ''فتح الباری'' میں اس مذکورہ حدیث کی شرح میں۔

جب مدینہ کے یہ لوگ واپس لوٹنے لگے تو آپ ﷺ نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تا کہ یہ مدینہ والوں کو قرآن کی تعلیم دیں' اسلام کی تعلیم دیں اور ان کو دین سمجھائیں' آپ رضی اللہ عنہ کو ''مقرئ المدینہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسباق ونصائح

بعثت کے بعد رسول اکرم ﷺ کو جن مشکلات اور سخت حالات کا سامنا تھا' اب ان حالات میں تبدیلی رونما ہوتی نظر آتی ہے۔

آپ ﷺ کا صبر رنگ لا رہا تھا' جدوجہد بار آور ہو رہی تھی اور دعوتِ حق کا جو بیج آپ ﷺ نے بویا تھا' اب اس کا پھل آ رہا تھا اور اس کے نتائج وثمرات ظاہر ہونے لگے تھے۔

لیکن اس نتیجے پر پہنچنے سے قبل اور اس پھل کا تذکرہ کرنے سے پہلے ہمیں حضور ﷺ کے اُس صبر عظیم کا بھی ذکر کرنا چاہیے اور اُن ذہنی وجسمانی تکالیف کا بھی اندازہ کرنا چاہیے جو آپ ﷺ نے اس دعوتِ حق کے راستے میں برداشت کیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنی دعوت کو صرف قریش تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ ہر قسم کی مشکلات کے باوجود آپ ﷺ نے دعوت کا سلسلہ وسیع فرمایا' حج کے موسم میں مختلف اطراف وجہات سے آنے والے لوگوں کو بھی دعوتِ حق پیش کی اور انہیں توحید کے خزانے کی طرف بلایا' آپ ﷺ ان کی مجالس میں کئی دفعہ تشریف لے گئے لیکن پہلے پہل کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔

امام احمد اور اصحاب سنن نے ایک صحیح حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حج کے موسم میں مختلف قبائل پر اپنی دعوت پیش کرتے اور فرماتے: کیا کوئی ایسا آدمی ہے جو مجھے اپنی قوم کی طرف لے جائے کیونکہ قریش نے مجھے اپنے رب کے کلام کی تبلیغ سے روک دیا ہے؟ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۵۶' مزید دیکھیے: الفتح الربانی فی ترتیب مسند الامام احمد ج ۲۰ ص ۲۶۹' زاد المعاد ج ۲ ص ۵۰)

نبوت کے اعلان کے بعد کے یہ گیارہ سال آپ ﷺ نے سخت مشکلات میں گزارے' کسی لمحے بھی راحت اور استقرار نہیں ملا۔ قریش ہر وقت آپ ﷺ کو شہید کرنے

کے پروگرام بناتے رہتے اور مختلف قسم کی ایذائیں اور تکالیف دیتے رہتے لیکن اس سب کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزیمت میں کوئی کمزوری نہیں آئی اور نہ ہی آپ کی قوت ارادی میں کوئی ضعف پیدا ہوا۔

ان گیارہ سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قوم' اپنے پڑوسیوں اور اردگرد کے تمام قبائل اور جماعات کے درمیان زبردست اجنبیت کا شکار رہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی بھی نہ غمگین ہوئے اور نہ ہی مایوس ہوئے اور نہ ہی رب تعالیٰ کے ساتھ محبت وانس میں کوئی فرق پڑا۔

یہ گیارہ سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں مسلسل جدوجہد اور متواتر صبر کی حالت میں بسر کیے' ان سب مشکلات اور صبر وتحمل کا نتیجہ اور اس کی قیمت یہ تھی کہ اسی راستے سے گزر کر اسلامی حکومت کی سرحدیں مشرق ومغرب تک پھیلنا تھیں' روم کی قوت اور فارس کی عظمت نے اس کے سامنے ہیچ نظر آنا تھا' اور اردگرد کی سب تہذیبوں نے دم توڑ جانا تھا۔

یہ عظمت وشان اور مرتبہ ومقام اللہ تعالیٰ جہاد' صبر اور مشکلات کے بغیر بھی عطا فرما سکتا تھا لیکن اپنے بندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ اُس خدا تعالیٰ نے جہاں انسانوں میں صفت عبودیت لازمی طور پر رکھی ہے وہاں وہ اپنے بندوں میں یہ صفتِ عبودیت اختیاری طور پر بھی دیکھنا چاہتا ہے کہ یہ اپنے اختیار اور ارادے سے بھی عبادت وریاضت اور عاجزی وانکساری اختیار کریں۔

عبادت وبندگی جدوجہد اور کوشش کے بغیر متحقق نہیں ہوتی' تکالیف اور مشکلات کے بغیر منافق اور صادق میں فرق نہیں ہو سکتا' اور یہ عدل بھی نہیں ہے کہ کچھ خرچ کیے بغیر ہی کامیابی مل جائے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس حوالے سے انسان کو دو چیزوں کا مکلف ٹھہرایا ہے:

(۱) شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور اسلامی معاشرے کا قیام۔

(۲) اس مقصد کے حصول کے لیے ہر طرح کی جدوجہد اور کوشش بروئے کار لانا اور کانٹوں سے بھرا ناہموار راستہ اختیار کرنا۔

اب ہم یہاں پر اُن کامیابیوں کا ذکر کرتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گیارہ سالہ دعوت

کے نتیجے میں حاصل ہوئیں اور ان کی نشو ونما کی کیفیت اور طبیعت پر غور کرتے ہیں۔

پہلے نمبر پر: جتنی بھی کامیابیاں حاصل ہوئیں' یہ سب قریش کے علاوہ دوسری قوموں اور قبائل کے اسلام لانے کے نتیجے میں حاصل ہوئیں' اس کی کیا وجہ ہے؟

ہم نے اس کتاب کے شروع میں ہی کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ کا یہ تقاضا ہے کہ وہ دعوتِ اسلامیہ کے سمجھنے کو اتنا آسان اور واضح کر دے کہ جس کی طبیعت اور مصدر میں کسی کو بھی شک نہ گزرے تاکہ اس پر ایمان لانا سہل اور آسان ہو' یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امی مبعوث کیا' انہوں نے اس دنیا میں کسی سے پڑھنا لکھنا نہ سیکھا۔

اور نہ ہی کسی کے سامنے کچھ پڑھ کر سنایا یا لکھ کر دکھایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم میں بھیجا جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اُس قوم میں کوئی تہذیب وتمدن یا ثقافت نام کی کوئی چیز تھی' وہ بالکل غیر مہذب اور اُجڈ قوم تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی قوم میں اخلاقِ کریمہ' امانت ودیانت اور عفت و پاکیزگی کی مثال بنایا' اب حکمت خداوندی کا تقاضا یہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے انصار ومددگار بھی ان کی اپنی قوم اور علاقے سے نہ ہوں تاکہ کوئی گمان کرنے والا یہ خیال نہ کرے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت صرف ایک قومی یا علاقائی دعوت تھی۔

یہ فی الواقع ایک ایسی واضح دلیل ہے جو ہر غور وفکر کرنے والے پر یہ بات منکشف کر دیتی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت نے ہر طرح سے دعوتِ نبویہ کی حفاظت فرمائی اور اسے گھیرے رکھا تاکہ شکوک وشبہات پیدا کرنے والا کوئی بھی شخص کسی طرف سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر کسی قسم کی طعن وتشنیع نہ کر سکے۔

یہی بات مغربی محققین میں سے کئی افراد نے کی ہے۔ کتاب ''حاضر العالم الاسلامی'' میں ''دینہ'' کی طرف سے یہ بات نقل کی گئی ہے' وہ لکھتا ہے:

یہ مستشرقین جنہوں نے خالص یورپی اسلوب میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے' یہ تین چوتھائی صدی تک اپنے دعویٰ کے مطابق بحث وتحقیق کرتے رہے ہیں تاکہ جمہور مسلمان محققین نے متفقہ طور پر اپنے نبی کی سیرت جس طرح پیش کی ہے' اسے رد کر دیا جائے' اور ان کی خواہش یہ تھی کہ ان طویل تحقیقات وتدقیقات کے نتیجے

میں وہ سیرتِ نبوی کے سلسلے میں طے شدہ آراء کو رد کر دیں اور مشہور روایات کو جھٹلا دیں' پس کیا وہ اس میں کامیاب ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں کسی معمولی سی بھی نئی چیز کا اثبات نہ کر سکے' بلکہ اگر ہم ان جدید آراء کو گہری نظر سے دیکھیں جنہیں اُن مستشرقین نے پیش کیا ہے خواہ وہ فرانسیسی ہوں یا انگریز ہوں یا جرمن ہوں یا بلجیکی ہوں یا ہالینڈی ہوں' ہم ان میں کافی حد تک خلط اور تضاد پائیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان مستشرقین میں سے ایک کوئی بات کرتا ہے تو دوسرا اُس کی تردید کرتا ہے۔ (حاضر العالم الاسلامی ج۱ ص ۳۳)

دوسرے نمبر پر: انصارِ مدینہ میں اسلام کی ابتداء کی کیفیت پر غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینۃ المنورہ کی زندگی اور ماحول کو دعوتِ اسلامیہ کے قبول کرنے کے لیے پہلے ہی سے تیار فرمایا تھا' اہل مدینہ کے دلوں میں اس دین کو قبول کرنے کے آثار پہلے ہی سے پائے جاتے تھے' اس نہج پر اہل مدینہ کی نفسیاتی آمادگی کے مظاہر کیا تھے؟ اس موضوع پر غور وفکر کریں تو پتا چلتا ہے کہ اہل مدینہ میں وہاں کے رہنے والے حقیقی باشندے عرب تھے' جو مشرک تھے اور دوسرے وہاں کے رہائشی وہ یہودی تھے جو مختلف اطراف سے ہجرت کر کے جزیرۂ عرب میں آئے تھے۔

مدینہ میں رہنے والے عرب مشرکین بنیادی طور پر دو بڑے بڑے قبیلوں میں منقسم تھے اُن میں سے ایک قبیلہ اَوس تھا اور دوسرا خزرج تھا۔

جب کہ یہودی تین قبائل میں منقسم تھے: (۱) بنو قریظہ (۲) بنو نضیر (۳) بنو قینقاع۔

یہود کی جس طرح عادت ہے انہوں نے اوس اور خزرج کے درمیان نفرت اور بُغض کا بیج بونا شروع کر دیا حتیٰ کہ یہ دونوں قبائل آپس میں جنگ وجدال کرنا شروع ہو گئے اور ان کے درمیان طویل خون ریز جنگیں ہوئیں۔

محمد بن عبد الوہاب نے اپنی کتاب ''مختصر سیرۃ الرسول ﷺ'' میں لکھا ہے: ان کے درمیان ایک سو بیس (۱۲۰) سال تک جنگ جاری رہی۔ (مختصر سیرۃ الرسول ص ۱۲۴)

اس طویل جنگ کے دوران اوس اور خزرج قبیلہ میں سے ہر ایک نے یہود کے کسی نہ کسی قبیلہ سے معاہدہ کر رکھا تھا' قبیلہ اوس نے یہودی قبیلہ بنی قریظہ سے معاہدہ کیا اور قبیلہ خزرج نے بنی نضیر اور بنی قینقاع سے جنگی معاہدہ کیا تھا۔

اوس اور خزرج کے درمیان آخری معرکہ یومِ بعاث ہجرت سے چند سال قبل ہوا تھا' جس میں اُن کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔

اس اثناء میں جب بھی کبھی عربوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوتا تو یہودی عربوں کو یہ دھمکی دیا کرتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا زمانہ قریب ہی ہے' ہم اس نبی پر ایمان لائیں گے اور ان کے ساتھ مل کر ہم تمہیں اس طرح قتل کریں گے جیسے قومِ عاد اور قومِ ارم کو قتل کیا گیا۔

یہ وہ حالات تھے جب اہل مدینہ اس دین سے کچھ متعارف ہوئے اور انہوں نے اس سے کچھ اُمیدیں لگائی تھیں کہ شاید اس دین کی برکت سے اُن کی صفوں میں اتحاد پیدا ہو اور شقاوت کے اسباب اُن سے مٹائے جا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے یوں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے راہ ہموار کی' ابن قیم اپنی کتاب ''زاد المعاد'' میں لکھتے ہیں:

یوں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ کی طرف ہجرت کا سامان پیدا فرمایا کیونکہ حکمت خداوندی کا تقاضا یہی تھا کہ مدینہ ہی وہ مرکز بن جائے جہاں سے دنیا کے اطراف و اکناف میں اسلام کا پیغام پھیلے۔ (زاد المعاد ج ۲ ص ۵۰' طبع الحلبی)

تیسرے نمبر پر: بیعت عقبہ اُولیٰ میں اہل مدینہ کے جن بڑے بڑے متعدد افراد نے اسلام قبول کیا' ان کے اسلام کی کیا صورت تھی؟ اور اُن پر عائد کی جانے والی اسلامی ذمہ داریوں کی کیا حد تھی؟ ہم نے دیکھا کہ اُن کا اسلام لانا محض زبان سے ہی شہادتین کا اقرار نہ تھا بلکہ تصدیق قلبی اور اقرار لسانی دونوں شامل تھے' اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے التزامی طور پر بیعت لی کہ وہ اپنے روزمرہ کے معاملات کو اسلام کے نظامِ اخلاق اور عمومی مبادیات کے مطابق ڈھالیں گے' اور اُن سے یہ بھی بیعت لی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے' چوری نہیں کریں گے' بدکاری نہیں کریں گے' اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے' ایک دوسرے پر جھوٹا بہتان نہیں باندھیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں جس نیک کام کا بھی حکم دیں گے وہ ان کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

یہی اسلامی معاشرے کے بنیادی خدوخال ہیں جن کی تبلیغ و ترویج کے لیے آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے' تو اس لیے یہ بات نہیں ہو سکتی تھی کہ لوگوں کو صرف شہادتین کی ہی تلقین کر دی جاتی اور پھر انہیں چھوڑ دیا جاتا کہ وہ اپنی زبان سے دُہراتے رہیں اور اپنے انحرافات اور مفاسد پر قائم رہیں' یہ بات صحیح ہے کہ جب کوئی انسان شہادتین کی تصدیق کرتا ہے اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانتا ہے اور فرائض کی تصدیق کرتا ہے تو اس پر مسلمان ہونے کا نام صادق آتا ہے' لیکن جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کرتا ہے' جو اسلامی معاشرے کی بنیاد اور اس کے نظام ومبادی کی چابی ہے تو وہ شخص اس اقرار کے ساتھ ہی تمام اُمور میں اللہ تعالیٰ کی حاکیت ہی کو تسلیم کرتا ہے' تو جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان پایا گیا تو پھر لامحالہ رب تعالیٰ کی حاکیت' اس کے دستور پر ایمان اور اس کی شریعت پر عمل کا جاری رکھنا ضروری اور لازمی ہو گیا۔

یہ بہت ہی عجیب بات ہے کہ بعض وہ لوگ جو خود ساختہ نظاموں اور قوانین کے اسیر ہو چکے ہیں اور وہ علی الاعلان اسلام کو ترک کر دینے اور اس سے لاتعلق ہو جانے کا بھی اظہار نہیں کرنا چاہتے' وہ اس کائنات کے خالق و مالک کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو لین دین اور صلح جوئی کے معاملہ سے مشابہ ہے' اور ان کا لین دین اور صلح جوئی کا رویہ یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کے مظاہر کو اپنے اور اسلام کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ معاشرے میں اسلام کے مظاہر میں مساجد اور عبادت کے مظاہر ہیں جن میں اسلام کا حکم ہی چلتا ہے اور اس کے دیگر نظاموں' قوانین اور اخلاق کا جہاں تک تعلق ہے تو ان میں حسب مرضی اور حسب ارادہ وہ تغیر و تبدل کر سکتے ہیں۔

وہ سرکش اور بذاتِ خود معبود بننے والے لوگ جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا اور انہوں نے ان رسولوں کے پیغامات کو جھٹلا دیا تھا اگر انہیں دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں ایسی دلچسپ باتوں کا پتا چل جاتا تو وہ جان لیتے کہ ایسی دعوت کو قبول کر کے انہیں نہ تو اپنی حاکیت سے کنارہ کش ہونا پڑے گا اور نہ ہی اپنے قوانین وضوابط میں سے کسی چیز کو چھوڑنا پڑے گا تو وہ اس میں داخل ہونے سے ذرا بھی سُستی کا مظاہرہ نہ کرتے' بلکہ وہ اپنا نظام شریعت اس جدید روشن خیالی کے نظریے سے ہم آہنگ کر لیتے اور شریعت کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے' لیکن وہ

جانتے تھے کہ یہ دین اسلام ایک ایسا مربوط اور منظم دین ہے جس میں حکم اور شریعت صرف اور صرف خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتی ہے اور اللہ کا رسول اس کی تبلیغ و ترویج کا کام کرتا ہے' اسی وجہ سے انہوں نے کھل کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کی اور اسلام قبول نہ کیا' اس کے علاوہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دین صرف اور صرف چند کلمات اور کچھ عبادات کا نام ہے' اللہ تعالیٰ نے ان کی تنبیہ کے لیے ارشاد فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ○ (النساء:٦٠)

کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن کی طرف جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس (کتاب) کے ساتھ جو اتاری گئی آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے (اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لیے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا اور چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک ○

اس سے معلوم ہوا کہ دین اسلام محض چند عقائد و عبادات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے' جو زندگی کے ہر مرحلے پر انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔

بیعت عقبہ اولیٰ میں جہاد کے علاوہ جملہ اُمور پر بیعت لی گئی' جہاد کی بیعت نہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت جہاد اور قتال ابھی شریعت کا حصہ نہیں بنا تھا' اسی وجہ سے اُن بارہ آدمیوں سے آپ ﷺ نے جو بیعت لی' اُس میں جہاد اور قتال کے الفاظ شامل نہیں تھے' اسی وجہ سے سیرت نگاروں نے اس کو "بیعتِ نساء" طرز کی بیعت قرار دیا ہے۔

چوتھے نمبر پر: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دینے کے پابند اور مکلف تھے کیونکہ آپ ﷺ ساری انسانیت کی طرف اللہ کے رسول بن کر تشریف لائے' اس لیے اپنے رب کی دعوت کو لوگوں تک پہنچانا آپ ﷺ پر لازم تھا' لیکن جو لوگ ابھی اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے' اس دعوت کے پھیلانے میں اُن کا

تعلق اور ذمہ داری کیا تھی؟

اس سوال کا جواب بھی اسی واقعہ میں موجود ہے کہ آپ ﷺ نے بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد ان بارہ مدنی انصاریوں کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تا کہ یہ اہل مدینہ کو اسلام کی دعوت دیں' انہیں قرآنِ حکیم کی تعلیم دیں' اس کے احکام بتائیں اور نماز قائم کرنے کی تلقین کریں' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ' آپ ﷺ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے مدینہ روانہ ہو گئے اور وہاں جا کر اہل مدینہ کو اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی' آپ رضی اللہ عنہ اہل مدینہ کو قرآنِ حکیم کی تعلیم بھی دیتے اور اُن کو احکامِ شریعت سکھاتے۔ اس دوران اہل مدینہ میں سے اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو قتل کے ارادے سے بھی آتا تو آپ اُس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے اور اُسے قرآن پاک کی آیات سناتے اور اُسے اسلام کے بعض احکامات سے آگاہ کرتے تو وہ شخص جو آپ کو قتل کرنے کی غرض سے آتا وہ بھی آپ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر آپ کی مجلس میں دیگر مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ جاتا اور قرآنِ حکیم اور احکامِ شریعت کی تعلیم حاصل کرنے لگتا' اس طرح کرتے کرتے مدینہ میں اسلام کافی حد تک پھیل چکا تھا اور مدینہ کے گلی کوچوں میں ہر محفل اور ہر مجلس میں اسلام ہی کے بارے میں بات چیت ہوتی۔

لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کون تھے؟

یہ مکہ کے بہت ناز و نعم سے زندگی گزارنے والے نوجوان تھے' یہ بہت خوب صورت لباس پہننے والے' اچھی جسامت والے جوان تھے' لیکن جب اسلام میں داخل ہوئے تو ہر قسم کے ناز و نعم اور عیش و عشرت کو ختم کر دیا اور رسول ﷺ کی اتباع میں دعوتِ اسلام کے راستے میں ہر طرح کی مشکلات اور تکالیف کو برداشت کیا اور نہایت سادہ زندگی بسر کی' حتیٰ کہ جب غزوۂ احد میں آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو ان کے کفن کے لیے ان کے پاس صرف ایک ہی کپڑا تھا' جب آپ کو کفن دینے کے لیے وہ کپڑا آپ کے جسم پر ڈالا گیا تو آپ کے جسم پر پورا نہیں آتا تھا' سر ڈھانپتے تو پاؤں ننگے ہو جاتے اور اگر پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر ننگا ہو جاتا' اس بات کی خبر جب رسول اللہ ﷺ کو دی گئی تو آپ رضی اللہ عنہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی گزشتہ ناز و نعم والی زندگی یاد کر کے رونے لگے اور پھر فرمایا: سر کے اوپر کفن

ڈال دو اور پیروں پر کچھ اذخر گھاس ڈال کر ڈھانپ دو۔

(مسلم ج ۳ ص ۴۸ 'نیز دیکھئے: الاصابہ' ابن حجر' ج ۳ ص ۴۰۳)

دعوتِ اسلامیہ کا کام صرف انبیاء و رسل اور ان کے ورثاء و خلفاء پر ہی لازم نہیں کیونکہ دعوتِ اسلامیہ کا کام اسلام کے بنیادی احکامات سے علیحدہ نہیں بلکہ یہ حقیقتِ اسلام کا حصہ ہے۔

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی شان اور اپنی استطاعت کے مطابق دعوتِ اسلام کا کام کرتا رہے' کوئی بھی مسلمان اس سے بَری نہیں۔ دعوت کی حقیقت یہ ہے کہ ''الامر بالمعروف والنہی عن المنکر'' یعنی نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا' یہ سارے کا سارا جہاد ہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جہاد فرائضِ اسلام میں سے ایک فرض چیز ہے' جو ہر مسلمان پر اپنی طاقت کے مطابق کرنا لازم ہے۔

اس لیے اسلامی معاشرے میں علیحدہ کوئی مذہبی لوگوں کی انفرادی حیثیت نہیں بلکہ ہر انسان جو اسلام میں داخل ہوا' اُس نے دوسرے احکامات کے ساتھ ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کی بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کر لی ہے' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' عالم ہو یا جاہل' وہ جس حیثیت اور جس مقام پر بھی ہے وہ اسلام کے ہر حکم کا پابند ہے۔ تمام مسلمان اس دین کی تبلیغ کرنے والے اور اس دین کے محافظ ہیں' اللہ تعالیٰ نے جملہ مسلمانوں سے جنت کے بدلے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں' اس لیے مسلمانوں کو اپنے جان و مال' دین کی سربلندی کے لیے خرچ کرتے رہنا چاہیے۔

لیکن علماء جو بحث و تحقیق اور اجتہاد کرتے ہیں' مسلمانوں کو دین کے احکام سے روشناس کرتے ہیں' زندگی میں پیدا ہونے والی مشکلات کا حل شریعت کی ثابت شدہ نصوص کی روشنی میں پیش کرتے ہیں' ان کی ان قابل قدر خدمات کا تعلق مذکورہ بالا بحث کے ساتھ بالکل نہیں۔

بیعت عقبہ ثانیہ

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جب اگلے سال حج کے ایام میں مکہ واپس آئے تو ان کے ساتھ مدینہ کے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت بھی تھی' یہ لوگ اپنی مشرک قوم کے

ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے' لیکن ابھی انہوں نے اپنے اسلام کا اعلان نہ کیا تھا بلکہ اس معاملہ کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ایامِ تشریق کے درمیانی روز عقبہ میں ملاقات کا وعدہ فرمایا تھا' جب ہم حج سے فارغ ہوئے تو جس رات میں آپ ﷺ نے ہم سے ملاقات کا وعدہ فرمایا تھا ہم اپنی قوم کے ساتھ اُس رات اپنے اپنے پڑاؤ میں سو گئے' جب رات کا ایک تہائی حصہ گزرا تو ہم اپنے اپنے پڑاؤ سے نکلے اور بلی کی طرح چھپتے چھپتے مقررہ جگہ پر پہنچے' حتیٰ کہ عقبہ کے پاس ایک گھاٹی میں ہم سب لوگ جمع ہو گئے' ہم تہتر (۷۳) مرد تھے اور ہمارے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں' جن کے نام نسیبہ بنت کعب اور اسماء بنت عمرو بن عدی ہیں۔

حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں: ہم گھاٹی میں جمع ہو کر آپ ﷺ کا انتظار کرنے لگے حتیٰ کہ آپ ﷺ اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے ساتھ تشریف لے آئے (جو اُس وقت اپنی قوم کے دین پر ہی تھے لیکن حفاظت کے لیے آپ ﷺ کے ساتھ آئے)۔

قوم نے گفتگو شروع کی اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! آپ اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو کچھ ہم سے لینا چاہیں لے لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جواباً گفتگو کرتے ہوئے قرآن مجید کی تلاوت کی' اللہ تعالیٰ کی طرف ان کو دعوت دی اور اسلام کی طرف رغبت دلائی اور فرمایا:

میں تمہیں اس شرط پر بیعت کرتا ہوں کہ تم میری حفاظت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی خواتین اور بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے دستِ اقدس کو پکڑا اور عرض کی: جی ہاں! اُس ذات کی قسم ہے جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے! ہم آپ کا تحفظ ہر اُس چیز سے کریں گے جس سے ہم اپنی بیویوں اور بچوں کا تحفظ کرتے ہیں' یارسول اللہ ﷺ! آپ ہمیں بیعت فرمالیجیے' ہم جنگی چالوں کے ماہر ہیں' ہم نے نسل در نسل اس کو وراثت میں پایا ہے۔ براء ابھی بات کر رہے تھے کہ ابوالہیثم بن التیہان بولے: یارسول اللہ ﷺ! ہمارے اور یہودیوں کے درمیان معاہدے ہیں ہم انہیں ختم کر دیں گے' کہیں ایسا تو

نہ ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو آپ اپنی قوم کی طرف لوٹ آئیں اور ہمیں چھوڑ دیں؟ حضور ﷺ یہ سن کر مسکرائے اور پھر فرمایا: نہیں! بلکہ تمہارا خون میرا خون ہے' تمہاری حرمت میری حرمت ہے' میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو' میں اُس سے جنگ کروں گا جس سے تم جنگ کرو گے اور میں اُس سے صلح کروں گا جس سے تم صلح کرو گے۔

پھر حضور ﷺ نے فرمایا: تم مجھے اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کر کے دو' جو اپنے اپنے قبیلے کے ذمہ دار افراد ہوں' پس اس طرح بارہ نقیب بنائے گئے' نو قبیلہ خزرج میں سے تھے اور تین قبیلہ اوس میں سے تھے۔

جب بارہ نقیب مختص ہو گئے تو آپ ﷺ نے اُن نقیبوں کو ارشاد فرمایا: تم اپنی قوم کے اسی طرح کفیل ہو جس طرح حضرت عیسیٰ ابن مریم کے حواریوں نے کفالت کی تھی اور میں اپنی قوم کا کفیل ہوں۔

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے آپ ﷺ کے دستِ اقدس پر بیعت کی' پھر اس کے بعد باقی ساری قوم نے بیعت کی۔

بیعت کرنے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: تم سب اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف لوٹ جاؤ۔

حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ عرض کرنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! اگر آپ چاہیں تو ہم صبح ہی اہل منیٰ پر اپنی تلواروں سے حملہ کر دیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا' تم اپنے اپنے خیموں میں واپس چلے جاؤ۔

حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں: پھر ہم سب اپنے اپنے پڑاؤ میں لوٹ آئے اور وہاں صبح تک سوئے رہے۔

جب صبح ہوئی تو قریش مکہ کا ایک گروہ ہمارے پاس آیا' انہوں نے کہا: اے گروہِ خزرج! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم ہمارے صاحب (ﷺ) کے پاس اس لیے آئے ہو تا کہ انہیں یہاں سے نکال لے جاؤ اور تم نے ہمارے خلاف جنگ کرنے پر اس سے بیعت بھی کر لی ہے' قسم بخدا! عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں جس سے لڑنا ہمیں تمہارے خلاف جنگ کرنے

سے زیادہ ناپسندیدہ ہو' اُس وقت ہم میں سے مشرک اُٹھ کھڑے ہوئے اور خدا کی قسم! اٹھا کر کہنے لگے: ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا اور نہ ہی ہمیں اس کا کوئی علم ہے۔ انہوں نے سچ ہی کہا تھا کیونکہ انہیں اس بیعت کا علم نہیں تھا' اور ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے' اور جب سب لوگ منیٰ سے واپس چلے گئے لیکن قومِ قریش کو اس خبر کے متعلق معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی واقعہ ضرور رونما ہوا ہے' تو وہ ہماری جستجو میں نکلے' انہوں نے سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو رضی اللہ عنہما کو مقام ''اذاخر'' میں پالیا' یہ دونوں نقیب تھے۔ حضرت منذر کو تو قریش پکڑ نہ سکے البتہ حضرت سعد کو انہوں نے پکڑ لیا' انہوں نے کجاوے کی ڈوری سے ان کے ہاتھ ان کی گردن سے باندھ دیئے' پھر وہ انہیں مارتے پیٹتے اور ان کے پیشانی کے بال کھینچتے (ان کے بال بہت زیادہ تھے) ہوئے ان کو مکہ لے آئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں قریش کے ہاتھوں اسیر تھا' وہ گھسیٹ رہے تھے کہ اچانک قریش مکہ میں سے ایک آدمی میرے پاس آیا' اُس نے کہا: کیا قریش کے کسی شخص کے ساتھ تیرا عہد یا پناہ کا کوئی تعلق ہے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! بخدا! میں جبیر بن مطعم اور حارث بن اُمیہ کے تاجروں کو پناہ دیتا رہا ہوں اور اپنے اہل شہر کے ہر قسم کے ظلم و تعدی سے اُنہیں بچایا کرتا تھا۔ اس نے کہا: ان دونوں کا نام لے کر دُہائی دو۔ حضرت سعد فرماتے ہیں: میں نے اسی طرح کیا' پس مطعم بن عدی اور حارث بن امیہ کو پتا چلا تو آئے اور انہوں نے مجھے قریش کے ہاتھوں سے نجات دلائی۔

ابن ہشام کہتے ہیں: اس بیعت میں جہاد کی شرط بھی شامل تھی' اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہاد کا اِذن عطا فرمایا تھا' یہ شرط بیعت عقبہ اولیٰ میں شامل نہ تھی کیونکہ اس وقت جہاد کا اذن نہیں ملا تھا' اس لیے پہلی بیعت عورتوں کی بیعت کے مشابہ تھی' جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہاد کا حکم دیا تو بیعت عقبۂ اخیرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے ہر سرخ و کالے کے خلاف جنگ کرنے پر بیعت لی' اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے اور اپنے رب تعالیٰ کے لیے بھی بیعت لی اور وفا کرنے پر انصار کو جنت کا مژدہ سنایا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے

جنگ کی بیعت لی اور عہد لیا کہ ہم ہر حال میں سمع و طاعت کریں گے' یہ کہ ہم اپنی تنگی اور کشادگی' خوشی و مجبوری ہر صورت میں آپ ﷺ کے مطیع و فرماں بردار رہیں گے اور ہم اس کے اہل لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا جھگڑا نہیں کریں گے' ہم جہاں بھی ہوں گے حق کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف زدہ نہیں ہوں گے۔ (سیرت ابن ہشام' مسند امام احمد' طبری)

وہ پہلی آیت جس میں آپ ﷺ کو جہاد کی اجازت دی گئی' وہ یہ ہے: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحج: ۴۰-۳۹)

اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے' اس بناء پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہے ۝ وہ (مظلوم) جن کو نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے ناحق صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے' اور اگر اللہ تعالیٰ بچاؤ نہ کرتا لوگوں کا' انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر تو (طاقت ور کی غارت گری سے) منہدم ہو جاتیں خانقاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا' یقیناً اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) سب پر غالب ہے ۝

اسباق ونصائح

یہ دوسری بیعت عقبہ اپنے مضمون کے لحاظ سے پہلی بیعت عقبہ سے مطابقت وموافقت رکھتی ہے۔ ان دونوں بیعتوں میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اسلام میں داخل ہونے کا اعلان ہے اور ان میں جملہ شرائط اور معاہدے 'اطاعت' فرماں برداری اور دین کے ساتھ اخلاص پر مبنی ہیں' آپ ﷺ کے احکامات پر پوری طرح عمل کرنے کی بات بھی شامل ہے' لیکن ہم دو ایسی شرائط اور اُمور بھی دیکھتے ہیں جو ان دونوں بیعتوں میں فرق کرتے ہیں۔

پہلا فرق

بیعت عقبہ اولیٰ میں اہل مدینہ کے بارہ مردوں نے بیعت کی لیکن بیعت عقبہ ثانیہ میں ستر سے زائد مردوں اور دو عورتوں نے بیعت کی۔

پہلے سال جنہوں نے بیعت کی اُن بارہ افراد کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی مدینہ گئے تاکہ وہاں پر دعوت کا کام سرانجام دیں اور انہوں نے دعوتِ اسلام صرف اپنے آپ تک محدود نہ رکھی بلکہ اپنے اردگرد دوسرے عورتوں اور مردوں کو بھی اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کو تلاوتِ قرآن پاک سناتے' دین کے احکام اور شریعت کا نظام سمجھاتے۔ اس وجہ سے اس سال مدینہ میں اسلام تیزی سے پھیلا حتیٰ کہ مدینہ کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جس میں اسلام داخل نہ ہوا ہو' اور اہل مدینہ کی عمومی مجالس ومحافل میں بھی اسلام کے نظام اور اس کی خصوصیات کے بارے میں ہی بات چیت ہوتی رہتی۔

ہر مسلمان کا ہر دور اور ہر زمانے میں یہی فریضہ ہے کہ وہ جہاں بھی جائے' جہاں بھی رہے دین اسلام کی دعوت کسی نہ کسی طرح دیتا رہے۔

دوسرا فرق

بیعت عقبہ اولیٰ کی شرائط میں جہاد اور قتال کا ذکر نہیں لیکن بیعت عقبہ ثانیہ میں جہاد کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود ہے یہ کہ رسول اللہ کا دفاع کرنے کے لیے جہاد کرنا ہوگا اور اس دین کی طرف دعوت دینے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لانا ہوں گے۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ پہلی بیعت کرنے والے لوگ اس وعدہ کے ساتھ لوٹے کہ وہ

آئندہ برس دوبارہ اسی عقبہ کے پاس دیگر مسلمانوں کے ساتھ آئیں گے اور تجدید عہد کریں گے اور بیعت کریں گے' اُس وقت چونکہ ابھی جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا' اس لیے پہلی بیعت میں جہاد کا ذکر نہ کیا گیا' اور چونکہ مسلمانوں نے دوبارہ دوسرے سال آنا تھا' اس لیے پہلی بیعت میں ساری شرائط نہ رکھی گئیں۔

اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی بیعت بیعتِ مؤقت تھی' جس وجہ سے اُس میں انہی شرائط پر بیعت کی گئی جن شرائط پر عورتوں سے بیعت کی گئی تھی۔

جب کہ دوسری بیعت' یہ وہ بنیاد اور اساس تھی جس کی بناء پر آپ ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی' اس لیے یہ بیعت اُن شرائط پر مبنی تھی جن کی مشروعیت ہجرت کے بعد مکمل ہونی تھی' کیونکہ اس دوسری بیعت میں جہاد اور آپ کی دعوت کا قوت و طاقت سے دفاع کرنے کی شرائط شامل تھیں۔ یہ ایسا حکم تھا جس کی مشروعیت مکہ میں نہیں ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو مطلع فرما دیا کہ عنقریب مستقبل میں ان کی مشروعیت ہونے والی ہے۔

اس سے صحیح طریقے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد کی مشروعیت آپ ﷺ کے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد ہوئی' جب کہ یہ صحیح نہیں جو کہ ابن ہشام کی روایت سے سمجھا جاتا ہے کہ جہاد کے جواز کا حکم ہجرت سے قبل مکہ میں بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت ہی نازل ہو گیا تھا' کیونکہ بیعت عقبہ ثانیہ کی دفعات میں یہ بات نہیں کہ اُسی وقت ہی جہاد لازم ہو گیا ہے' بلکہ آپ ﷺ نے اہل مدینہ سے جہاد کی بیعت مستقبل کے پیش نظر لی تھی کہ جب ہجرت ہو جائے گی اور آپ ﷺ وہاں اقامت اختیار فرمائیں گے تو اُس وقت جہاد اور دفاع لازم ہو گا۔

اس کی دلیل وہ قول ہے جو پیچھے گزر چکا ہے کہ جب عباس بن عبادہ نے بیعت کر لینے کے بعد عرض کیا: خدا کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! اگر آپ چاہتے ہیں تو ہم اہل منیٰ کے ساتھ کل صبح ہی اپنی تلواروں سے جہاد شروع کر دیتے ہیں' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ابھی تم اپنی اپنی قیام گاہوں میں لوٹ جاؤ۔

یہ بات متفق علیہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت کے بارے پہلی آیت یہ نازل ہوئی:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُۨ ۝ (الحج:۳۹)

اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بناء پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہے ۝

امام ترمذی اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ سے نکالا گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انہوں نے اپنے نبی کو نکال دیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۵۶)

بے شک ہم ضرور اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ۝

اب یہ لوگ ضرور ہلاک ہوں گے' حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُۨ ۝ " (الحج:۳۹)۔

تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اُسی وقت جان گیا کہ اب قتال ہو گا۔ (النسائی ج ۲ ص ۵۲' تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴)

جہاد و قتال کے مؤخر ہونے کی متعدد حکمتیں ہیں:

(۱) یہ مناسب تھا کہ قتال کی مشروعیت سے پہلے اسلام کا تعارف ہو' اس کی طرف دعوت دی جائے' اس کی حقانیت پر دلائل قائم کیے جائیں' اس کے سمجھنے کے راستے میں حائل جملہ مشکلات کو حل کیا جائے' اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ راہِ جہاد کے اوّلین مراحل ہیں' اس لیے ان کی انجام دہی فرضِ کفایہ ہے اور اس کی ذمہ داری میں تمام مسلمان شریک ہیں۔

(۲) ابھی رحمت خداوندی کا تقاضا یہی تھا کہ اسلام میں نو وارد مسلمانوں کو جہاد کے وجوب کا مکلّف نہ ٹھہرایا جائے تاکہ ابھی وہ پہلے اپنے لیے ایک دارالاسلام بنالیں تاکہ وہ دارالاسلام ان کا مرکز اور پناہ گاہ ثابت ہو۔

جہاد اور اس کی مشروعیت

جہاد کے متعلق جو تذکرہ ہو چکا' اس کے علاوہ آئندہ صفحات میں بھی جہاد اور قتال کے بارے میں تفصیلی بحث آئے گی' یہاں ہمیں تھوڑی دیر رکنا ہوگا تاکہ ہم جہاد' اس کی مشروعیت اور اس کے مراحل کے متعلق صحیح فکر سے آگاہی حاصل کریں' جہاد کے متعلق فکری یلغار کرنے والوں کو بہت دلچسپی رہی ہے' وہ اس سلسلے میں حق اور باطل کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس دینِ حنیف کے قلعے میں شگاف ڈالیں تاکہ لوگ اس کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو جائیں۔

یہ لوگ جو بالخصوص جہاد کی مشروعیت کے بارے میں اپنا پورا زور صرف کرتے ہیں' یہ جان کر آپ کا تعجب دور ہو جائے گا کہ چونکہ ارکانِ اسلام میں سے اہم رکن جہاد ہے اور دشمن کی نظر میں سب سے زیادہ خطرناک رکن بھی یہی جہاد ہے کہ جس سے دشمن خوف زدہ رہتا ہے اور جس سے اُس پر رعب طاری ہو جاتا ہے' دشمن جانتے ہیں کہ یہ رکنِ اسلام اگر مسلمانوں کے دلوں میں بیدار ہو گیا اور کسی زمانے میں بھی اس کا اثر مسلمانوں کی زندگی میں پیدا ہو گیا تو پھر اسلامی غلبہ کے مقابلے میں کوئی بھی قوت اور طاقت کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے اسلام کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے کسی بھی عمل کا آغاز خاص طور پر اسی نقطہ سے ہونا چاہیے۔

یہاں پر ہم سب سے پہلے اس موضوع پر وضاحت کریں گے کہ اسلام میں جہاد کا مفہوم اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اور اس کے مراحل کے درجات کیا ہیں؟ پھر ہم اس کے مفہوم میں داخل کیے جانے والے مغالطوں اور بغیر وجہ کے کی گئیں اس کی تقسیمات کے بارے میں وضاحت کریں گے۔

پس جہاد کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لیے پوری جدوجہد اور کوشش صرف کرنا' قتال اور جنگ کے ذریعے کوشش کرنا' جہاد کی ایک قسم ہے۔

جہاد کی غرض و غایت اور مقصد یہ ہے: اسلامی معاشرے کا قیام اور صحیح اسلامی مملکت کی تشکیل۔

جہاد کے مراحل کے ضمن میں جیسا کہ گزر چکا ہے کہ آغازِ اسلام میں جیسا کہ ہم نے جانا جہاد پُر امن دعوت اور اس کے راستے میں آنے والی جملہ تکالیف اور مشکلات کے باوجود اس پر ڈٹے رہنے تک محدود تھا' پھر ہجرت کے آغاز سے اس میں دفاعی جنگ بھی مشروع ہو گئی یعنی ہر قوت کا اُسی طرح جواب دیا جائے' پھر اس کے بعد ہر اُس شخص کے ساتھ بھی جنگ کرنا جائز ہو گیا جو اسلامی معاشرے کے قیام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں۔ اس سلسلے میں یہ طے پایا کہ ملحدین' مشرکین اور بت پرستوں سے دینِ اسلام کے علاوہ کچھ بھی قبول نہیں کیا جائے گا' کیونکہ صحیح اسلامی معاشرے اور الحاد و بت پرستی کے درمیان مطابقت و موافقت کا کوئی امکان نہیں۔ جب کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کا اسلامی معاشرے کے تحت رہنا اور جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا کافی جانا گیا' جس طرح مسلمان زکوٰۃ دیتے ہیں یہ اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کریں۔

اس آخری مرحلے میں جہاد کے حکم کو اسلام میں استقرار حاصل ہوا' ہر زمانے کے مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ جب ان کے پاس طاقت ہو اور ضروری ساز و سامان ہو تو جہاد کریں۔ اسی مرحلہ کے بارے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَّاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○ (التوبہ: ۱۲۳)	جنگ کرو اُن کافروں سے جو آس پاس ہیں تمہارے اور چاہیے کہ وہ پائیں تم میں سختی اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے○

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بارے فرمایا:

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ دیں' جس نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیا تو اُس نے اپنا مال اور اپنی جان مجھ سے محفوظ کر لی اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ (متفق علیہ)

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جہاد فی سبیل اللہ کو دفاعی جنگ اور اقدامی جنگ میں تقسیم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا' کیونکہ جہاد کی مشروعیت محض دفاع یا محض جارحانہ اقدام پر نہیں۔ جہاد کی ضرورت اور حاجت اس بناء پر ہے کہ اسلامی معاشرے کو مکمل اسلامی اصول

ونظام کی شکل میں قائم کیا جائے' اب اس کے لیے دفاعی راستہ اختیار کرنا پڑے یا اقدام کرنا پڑے' اس میں کوئی فرق نہیں۔

مشروع دفاعی جنگ' یہ ایسے ہی ہے جیسے مسلمان اپنے مال یا اپنی عزت وآبرو یا اپنی جائیداد یا اپنی جان کا دفاع کرتا ہے' یہ جنگ کی ایک صورت ہے جس کا جہاد کے اُس اصطلاحی معنی سے کوئی تعلق نہیں جو فقہ اسلامی میں موجود ہے۔ اسے ''قتالِ صائل'' کا نام دیا جاتا ہے۔ فقہاء نے کتبِ فقہ میں اس کا مستقبل باب باندھا ہے۔ موجودہ دور کے بہت سے محققین اس ''قتالِ صائل'' (ظالم کے خلاف جنگ) میں اور جہاد کا وہ اصطلاحی مفہوم جو ہم نے ذکر کیا' ان دونوں میں اختلاط پیدا کر دیتے ہیں۔

شریعتِ اسلامیہ میں جہاد کے معنی اور اس کی غرض وغایت کا یہ ہے خلاصہ جو ہم نے پیش کر دیا۔

جو تحریفات اور مغالطے اس میں پیدا کیے گئے ہیں' انہیں ظاہر میں دو متضاد نظریات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے' یہ دونوں نظریات جو بہ ظاہر متضاد و متصادم ہیں' لیکن حقیقت میں یہ دونوں نظریات آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ دونوں نظریات ایک ہی ذریعہ سے تشکیل پاتے ہیں' جن کا مقصد ہے جہاد کی مشروعت کا انکار۔

پہلا نظریہ: یہ نظریہ اعلان کرتا ہے کہ اسلام صرف تلوار کے ذریعے پھیلا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے جبر کا راستہ اختیار کیا' ان کے ہاتھوں اسلامی فتوحات ظلم وزیادتی اور جبر وقہر کے نتیجے میں ہوئیں' یہ فتوحات لوگوں کے ازخود اسلام میں داخل ہونے اور اس پر قناعت کرنے کی وجہ سے نہیں ہوئی تھیں۔[1]

دوسرا نظریہ: یہ نظریہ پہلے نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے اسلام امن و سلامتی اور محبت کا دین ہے' اس میں جہاد اُس وقت جائز ہوتا ہے جب کھلی جارحیت کا جواب دینا ہو' مسلمان صرف اُسی صورت میں جنگ کرتے ہیں جب انہیں اس پر اُبھارا جائے اور مجبور کیا جائے۔

---

[1] یہ نظریہ ''وان ولوٹن'' نے پیش کیا' اس کا مطالعہ کیجئے' اس کی کتاب ''السیادۃ العربیۃ'' ص د سے مطبوعہ النہضۃ المصریۃ۔

باوجود یکہ یہ مذکورہ دونوں نظریات متضاد ہیں' جیسے کہ ہم نے ذکر کیا' لیکن اسلام کے خلاف فکری یلغار کرنے والے ان دونوں کے ذریعے ایک مخصوص اور معین مقصد حاصل کرتے ہیں' جو ان دونوں مفروضوں میں سے ہر ایک سے مطلوب و مقصود ہے' آپ کے لیے اس کی وضاحت کچھ اس طرح سے ہے:

ان دشمنانِ دین نے پہلے اس بات کی خوب اشاعت اور تشہیر کی کہ دین اسلام دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور بغض و نفرت کرتا ہے' پھر انہوں نے کچھ انتظار کیا یہاں تک کہ ان کی یہ پھیلائی ہوئی خبر بار آور ہونے لگی اور اہل اسلام نے اس کا رد کیا اور اسلام کے حق میں اس مبینہ ظلم و زیادتی کا انکار کیا۔

اسی دوران کہ جب مسلمان اس باطل نظریے کا رد کر رہے تھے کہ انہی شکوک و شبہات پیدا کرنے والوں میں سے کچھ لوگ اُٹھے اور انہوں نے یہ بات گھڑی کہ ہم تو طویل علم و تحقیق کے بعد اسلام کا دفاع کرنے لگے ہیں' اور اس تہمت کا جواب دیتے ہوئے کہنے لگے کہ اسلام تلوار' تیر اور نیزے کا دین نہیں جیسا کہ اس پر الزام لگایا جاتا ہے بلکہ یہ تو اس کے برعکس محبت اور امن و سلامتی کا دین ہے کہ جس میں جہاد صرف کھلی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی ضرورت کے پیش نظر ہی مشروع ہے۔ جہاں تک امن و سلامتی کا کوئی راستہ نکلتا ہو اہلِ اسلام کو جنگ کی ترغیب نہیں دی جاتی۔ سادہ لوح مسلمانوں نے اسلام پر لگائے گئے ظلم و زیادتی کے پہلے شنیع الزام کے بعد اس شاندار دفاع پر خوب تالیاں بجائیں' جب وہ اسلام کے خلاف پہلے الزام کا جواب دینے کی تیاری کر رہے تھے تو دوسرا دفاعی نظریہ آنے کی صورت میں انہوں نے اس کی بہت تائید و توثیق کی' اور ایک کے بعد ایک دلیل نکال کر دینے لگے کہ اسلام تو ایسا ہی پُرامن ہے جیسا انہوں نے کہا۔ یہ تو باہمی سلامتی اور صلح کلی کا دین ہے' جو دوسروں کے ساتھ اُس وقت تک کوئی جھگڑا نہیں کرتا جب تک کہ اس کے گھر پر کوئی حملہ نہ کر دے اور اس کو خواب سے کوئی بیدار نہ کر دے۔

ان سادہ لوح مسلمانوں سے یہ بات اوجھل ہو گئی کہ جنہوں نے پہلی افواہ اُڑائی اور پھر دوسری افواہ اڑائی ان کا مطلوبہ نتیجہ یہی تھا جو انہوں نے خفیہ طور پر حاصل کر لیا۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ ایسی باتیں پیش کی جائیں اور مختلف آزمودہ وسائل اپنائے جائیں کہ جن

سے بالآخر مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کی فکر اور تصور ختم کیا جائے' اور ان کے دلوں میں عظمت و سربلندی کی روح موت کا شکار ہو جائے۔

ہم یہاں پر اس کا ایک ثبوت پیش کرتے ہیں' جو ہمارے ساتھی ڈاکٹر وہبہ زحیلی اپنی کتاب ''آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی'' میں ایک مشہور انگریز مستشرق ''اندرسن'' کی زبانی پیش کرتے ہیں۔

ہم یہاں آپ کے لیے وہ عبارت نقل کرتے ہیں:

اہل مغرب بالخصوص انگریز مسلمانوں کے اندر سے نظریۂ جہاد کے اُبھرنے سے ڈرتے ہیں' تاکہ اس وجہ سے ان کا شیرازہ متحد نہ ہو جائے اور وہ اپنے دشمنوں کے سامنے کہیں کھڑے نہ ہو جائیں' اسی وجہ سے وہ جہاد کے نظریہ کے منسوخ ہونے کی ترویج و اشاعت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حق فرمایا ہے اُن کے بارے میں جن میں ایمان نہیں ہے:

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ. (محمد:٢٠)

پس جب اُتاری جاتی ہے کوئی واضح سورت اور اس میں جہاد کا ذکر ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہوتا ہے کہ وہ تکتے ہیں آپ کی طرف جیسے تکتا ہے جس پر موت کی غشی طاری ہو۔

جمعہ کی شام ۳ جون ۱۹۶۰ء میری ملاقات انگریز مستشرق ''اندرسن'' سے ہوئی۔ میں نے اس موضوع پر اس کی رائے کے بارے پوچھا' اُس نے مجھے نصیحت کی کہ میں کہا کروں کہ جہاد آج کے زمانہ میں فرض نہیں اس فقہی اصول کی بناء پر کہ زمانہ بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں' اس کی رائے میں جہاد موجودہ عالمی حالات کے موافق نہیں کہ جن حالات میں مسلمان عالمی تنظیموں اور بین الاقوامی معاہدات سے منسلک ہیں' اور جہاد ہی کی وجہ سے لوگ اسلام کے خلاف بات کرتے ہیں' آزادی اور فکری ترقی کے حالات ایسی فکر کو قبول نہیں کرتے جو طاقت کے ذریعے لاگو کی جائے۔ (آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی ص ۵۹)

اب ہم دوبارہ بیعت عقبہ ثانیہ کے متعلق بات کرتے ہیں' یہ ایسا معاملہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ شامل تھا کہ اہل مکہ کے کانوں تک اس بیعت کی خبر پہنچ گئی اور انہیں پتا چل گیا کہ اس میں نبی ﷺ اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان کوئی معاہدہ طے پا گیا ہے۔

شاید اس کی حکمت یہ تھی کہ نبی اکرم ﷺ کی مدینہ کی طرف ہجرت کے اسباب کی تیاری ہو' آگے ہم یہ بات پائیں گے کہ جوں ہی مشرکین تک یہ خبر پہنچی انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر بہت زیادہ تنگی کرنا شروع کر دی۔

بہرکیف جو بھی حکمت ہو' بے شک بیعت عقبہ ثانیہ آپ ﷺ کی مدینۃ المنورہ کی طرف ہجرت کا پہلا قدم تھی۔

صحابہ کرام کو مدینۃ المنورہ کی طرف ہجرت کی اجازت

ابن سعد اپنی کتاب الطبقات الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب یہ تقریباً ستر کے قریب خوش نصیب آپ ﷺ سے مل کر واپس ہوئے تو آپ ﷺ بہت خوش ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کے لیے اہل حرب کی صورت میں ایک قوم اور متعدد لوگ آپ ﷺ کو عطا فرمائے' جو سامانِ جنگ رکھتے ہیں اور دوسروں کی مدد کرتے ہیں' کفار کو جب پتا چلا تو انہوں نے مسلمانوں پر سختیاں اور ایذائیں پہلے سے زیادہ کر دیں' انہوں نے مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ تنگ کرنا شروع کر دیا' اب مسلمانوں نے اُس حد تک گالی گلوچ اور تکالیف کا سامنا کیا جو پہلے نہ ملی تھیں تو صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے اس ظلم کی شکایت کی اور ہجرت کی اجازت طلب کی' آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے تمہارے دارِ ہجرت کی خبر دے دی گئی ہے اور وہ یثرب ہے جو یہاں سے نکلنا چاہتا ہے وہ یثرب کی طرف نکلے۔

یہ حکم سنتے ہی صحابہ کرام ہجرت کی تیاری کرنے لگے' ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے اور مدد کرنے لگے اور پوشیدہ طور پر چھپ کر نکلنے لگے' صحابہ کرام میں سے جو شخص سب سے پہلے مدینہ آیا وہ ابوسلمہ بن عبداللہ الاسد تھے' پھر ان کے بعد عامر بن ربیعہ اپنی بیوی بنت ابی حثمہ کے ساتھ آئے' یہ ہودج نشین پہلی خاتون تھیں[1] جو مدینہ ہجرت کر کے آئیں' پھر اس

[1] عربی روایت میں ''ظعینۃ'' کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے: ہودج میں سفر کرنے والی عورت۔

کے بعد صحابہ کرام کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا' یہ سب مدینہ کے انصار کے پاس آتے تو مدینہ کے انصار ان کو اپنے ہاں ٹھہراتے اور ان کو پناہ دیتے تھے۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۱۱-۲۱۰' تاریخ الطبری ج ۱ ص ۳۶۷)

اس دوران حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سوا سب صحابہ کرام نے خفیہ طریقے سے ہجرت کی۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنی تلوار گلے میں لٹکائی' اپنی کمان کو کندھے پر رکھا' اپنے ہاتھ میں تیر پکڑ لیے' اپنا نیزہ اپنی کمر پر باندھ لیا اور کعبہ کی طرف گئے' کعبہ کے صحن میں قریش کے سرداروں کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بڑے اطمینان اور تمکنت سے بیت اللہ کا سات پھیروں سے طواف کیا' پھر مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھی' پھر وہاں کھڑے ہو گئے اور فرمایا: بگڑ جائیں چہرے' اللہ ان دشمنوں کی ناک نیچی کرے' جو چاہتا ہے کہ اس کی ماں اس پر روئے یا اس کے بچے یتیم ہو جائیں یا اس کی بیوی بیوہ ہو جائے' وہ مجھ سے اس وادی کے پار آ کر ملے۔

حضرت علی فرماتے ہیں: کچھ کمزور اور مظلوم لوگ آپ کی اتباع میں نکلے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کچھ بتایا' پھر مدینہ کی طرف چل پڑے' ان کے سوا کوئی بھی آپ کے پیچھے نہیں آیا۔ (اسد الغابہ ج ۴ ص ۵۸)

اس طرح پھر ہجرت کا سلسلہ لگاتار شروع ہو گیا حتیٰ کہ مکہ میں چند لوگ باقی رہ گئے جن میں رسول اللہ ﷺ' حضرت ابوبکر صدیق' حضرت علی رضی اللہ عنہما یا وہ مسلمان تھے جو مشرکین کی قید میں تھے یا جو مریض تھے اور یا وہ جو کمزوری کی وجہ سے سفر کرنے سے عاجز تھے۔

اسباق ونصائح

مکہ میں صحابہ کرام جس امتحان میں مبتلا تھے وہ مشرکین کی طرف سے دی جانے والی تکالیف' ایذائیں اور طرح طرح کی ذہنی' اخلاقی اور جسمانی سزائیں تھیں' جب آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دے دیا تو اب مسلمانوں کو دوسرے امتحان کا سامنا تھا' یہ

امتحان وطن، اموال، جائیداد اور رشتہ داری چھوڑنے کا امتحان تھا۔

لیکن وہ سب کے سب اپنے دین اور اپنے رب کی رضا کے لیے پہلے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے اور دوسرے امتحان میں بھی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مشکلات اور تکالیف کو صبر اور پختہ عزم سے برداشت کیا حتیٰ کہ جب ان کو مدینۃ المنورہ کی طرف ہجرت کرنے کا اشارہ ملا تو انہوں نے اپنا وطن، مال و دولت، جائیداد اور حسب نسب چھوڑ کر مدینۃ المنورہ کی طرف رخت سفر باندھا، بلکہ وہ مکہ سے چھپ کر نکلے، یہ سب کچھ اُسی صورت میں ہوتا ہے جب اپنے مال و متاع اور دیگر اشیاء کو چھوڑ دیا جائے، انہوں نے سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر دین کو سینے سے لگا لیا اور اس کے بدلے میں انہیں مدینۃ المنورہ میں انصار کی صورت میں مخلص دینی بھائی مل گئے، جنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی ہر طرح سے مدد کرنے کے منتظر تھے۔

یہ مثال ہے اُس صحیح مسلمان کی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دین سے مخلص ہو تو پھر اُسے وطن کی، مال و دولت کی اور حسب نسب کی کوئی پرواہ نہیں رہتی، وہ سب کچھ دین کے راستے میں قربان کر دیتا ہے۔ مکی صحابہ کرام نے یہ اعلیٰ مثال قائم کر کے دکھائی۔

مدینہ کے مسلمانوں نے بھی اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں میں پناہ دے کر اُن سے مواسات، ان کی مدد کر کے اور ان سے محبت و انس کا اظہار کر کے سچے اسلامی بھائی چارے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں محبت کی مثال قائم کر کے دکھائی۔

آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دینی بھائی چارے کو نسبی بھائی چارے سے زیادہ قوی اور مضبوط بنایا ہے، اسی لیے اسلام کے ابتدائی دور میں میراث کا استحقاق دینی بھائیوں اور مہاجروں کے لیے بھی بیان کیا گیا۔

جب تک مدینہ ایک مضبوط دارالاسلام اور مستحکم اسلامی ریاست نہیں بن گیا تھا اس وقت تک میراث میں رشتہ داروں کا حصہ نہیں بتلایا گیا تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا	یقیناً جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی
وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي	اور جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا. (الانفال:۷۲)

سے راہِ خدا میں اور وہ جنہوں نے پناہ دی (مہاجرین کو) اور (ان کی) مدد کی یہی لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جولوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی تمہارے لیے ان کی وراثت سے کوئی چیز نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں۔

ہجرت کے اس حکم سے دوشرعی احکام کا استنباط ہوتا ہے۔

(۱) دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کا وجوب

قرطبی نے ابن العربی سے روایت کیا ہے: یہ ہجرت جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں فرض ہوئی، اس کی فرضیت قیامت تک باقی ہے۔ جس ہجرت کا حکم فتح مکہ کے ساتھ منقطع ہو گیا وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے قصد سے عبارت ہے، اگر کوئی شخص دارالحرب میں ٹھہرا رہے گا تو وہ گناہ گار ہوگا۔ (تفسیر القرطبی ج ۵ ص ۳۵۰)

دارالحرب سے اسی طرح ہجرت کا حکم ہے اور دارالحرب وہ جگہ ہے جہاں مسلمانوں کو شعائرِ اسلامیہ کو قائم کرنے سے روکا جائے یعنی نماز، روزہ، جماعت اور اذان سے منع کیا جائے اور اسی طرح ظاہری احکامِ شریعت کی ادائیگی کی اجازت نہ دی جائے۔

اس حکم پر قرآنِ مجید کی جس آیتِ مبارکہ سے استدلال کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝

بے شک وہ لوگ کہ قبض کیا ان (کی روحوں) کو فرشتوں نے اس حال میں کہ وہ ظلم توڑ رہے تھے اپنی جانوں پر، فرشتوں نے انہیں کہا کہ تم کس شغل میں تھے (معذرت کرتے ہوئے) انہوں نے کہا: ہم تو بے بس تھے زمین میں، فرشتوں نے کہا: کیا نہیں تھی اللہ کی زمین کشادہ تاکہ تم ہجرت کرتے اس میں؛ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم

(النساء:۹۸-۹۷) ہے اور جہنم بہت بُری پلٹ کر آنے کی جگہ ہےO مگر واقعی کمزور و بے بس مرد اور عورتیں اور بچے جونہیں کر سکتے تھے (ہجرت کی) کوئی تدبیر اور نہیں جانتے تھے (وہاں سے نکلنے کا) کوئی راستہO

(۲) مسلمانوں پر ایک دوسرے کی مدد کرنا واجب ہے

اگرچہ ان کے علاقے اور ممالک مختلف ہی ہوں اور جیسے بھی ممکن ہو یہ مدد کرنا ضروری ہے۔ جملہ ائمہ کرام اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جو مسلمان اپنے غریب، مظلوم اور کمزور مسلمان بھائیوں کی مدد کرنے پر قادر ہوں، اگرچہ یہ دنیا کے کسی کونے میں ہوں اور پھر بھی انہوں نے اگر مظلوم و مقہور مسلمانوں کی مدد نہ کی تو یہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے۔

ابوبکر بن العربی فرماتے ہیں: جب مسلمان قیدی ہوں یا مظلوم تو شرعی ولایت کا تعلق اُن کے ساتھ بھی قائم ہے اور بدن کے اعتبار سے ان کی مدد و نصرت واجب ہے، ہم پر لازم ہے کہ ہم انہیں طاقت کے ساتھ قید سے چھٹکارا دلائیں ورنہ اپنے جمیع اموال خرچ کر کے ان کو نجات دلائیں حتیٰ کہ کسی کے پاس کوئی درہم بھی نہ بچے۔

(احکام القرآن لابن العربی ج ۲ص ۸۷۶)

جو موالات اور باہمی تعلق مسلمانوں کا آپس میں ہے، یہ واجب ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ باہمی بھائی چارہ اور مضبوط تعلق قائم کریں، لیکن مسلمانوں کا غیر مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کا تعلق بھائی چارہ اور موالات قائم کرنا درست نہیں، اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس بات کی صراحۃً تصدیق ہوتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌO (الانفال:۷۳)

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اگر تم (ان حکموں پر) عمل نہیں کرو گے تو برپا ہو جائے گا فتنہ ملک میں اور (پھیل جائے گا) بڑا فسادO

ابن عربی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے کفار اور مؤمنین کے درمیان سے ولایت اور حمایت کو ختم کر دیا' مؤمنوں کو مؤمنوں کا دوست اور حمایتی قرار دیا اور کافروں کو کافروں کا ہی حمایتی اور دوست قرار دیا' کیونکہ وہ اپنے دین کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اپنے اعتقاد کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ (احکام القرآن لابن العربی ج ۲ ص ۸۷۶)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی تعلیماتِ الٰہیہ کے ساتھ مطابقت ہی ہر دور اور ہر زمانے میں مسلمانوں کی فتح ونصرت کی بنیاد ہے' آج جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب مسلمانوں نے ان تعلیماتِ الٰہیہ پر عمل چھوڑ دیا اور اغیار کی مدد ونصرت کرنا شروع کر دی تو اس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ آج مسلمان ہر طرف کمزور اور ضعیف ہیں اور اُن پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔

ہجرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

صحیح احادیث کے حوالے سے علماء سیرت اور محدثین نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ مسلمان جوق در جوق مدینۃ المنورہ کی طرف ہجرت کر گئے ہیں تو وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور ہجرت کی اجازت طلب کی' یہ اُس وقت آخری صحابی رہ گئے تھے' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ذرا ٹھہر جاؤ! مجھے امید ہے کہ مجھے بھی ہجرت کا اذن مل جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں کیا آپ بھی ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر اپنے آپ کو روک لیا تا کہ سفرِ ہجرت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مصاحبت اختیار کریں' آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس سے دو سواریاں (اونٹنیاں) تیار کیں اور چار ماہ تک ان کی خوب پرورش کرتے رہے۔ (البخاری ج ۴ ص ۲۵۵)

اس اثناء میں قریش نے جب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور دوسرے علاقے کے لوگ بھی آپ کی جماعت میں شامل ہو رہے ہیں تو انہیں خوف پیدا ہوا کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں نہ چلے جائیں اور وہاں اُن کو جمع کر کے مکہ پر حملہ آور نہ ہو جائیں تو سب مشرکین ''دارِندوہ'' میں جمع ہوئے' یہ قصی بن کلاب کی حویلی تھی جہاں قریش ہر مسئلے کا

فیصلہ کرتے تھے' اب کی بار وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے اور باہمی مشورہ کرنے لگے' آخر کار وہ اس فیصلے پر متفق ہوئے کہ ہر قبیلے سے ایک ایک مضبوط نوجوان لیں اور انہیں تیز دھار تلواردیں' پھر وہ سب کے سب یک بارگی حملہ کر کے محمد (ﷺ) کو قتل (شہید) کر دیں اور اس طرح بنو عبد مناف ساری قوم سے ان کے خون بہا کے لیے نہیں لڑیں گے اور انہوں نے اس کی ایک تاریخ بھی متعین کر دی' حضرت جبریل امین رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں آئے اور ہجرت کا حکم سنایا اور اُس رات اپنے بستر پر جا کر محوِ استراحت ہونے سے روک دیا۔

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۵' طبقات ابن سعد ص ۲۱۲)

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر میں دوپہر کی گرمی میں بیٹھے تھے کہ ایک کہنے والے نے میرے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کپڑا لپیٹے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ اُس وقت آپ کبھی ہمارے گھر تشریف نہ لاتے تھے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اُن پر میرے ماں باپ قربان ہوں! اللہ کی قسم! یقیناً کوئی بات ضرور ہے جس وجہ سے آپ اِس وقت تشریف لائے ہیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: پس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے' انہوں نے اندر آنے کی اجازت طلب فرمائی' ان کو اجازت دی گئی' آپ ﷺ اندر داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا: اپنے پاس سے لوگوں کو دور کر دو! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں! یہ تو آپ کے ہی گھر کے افراد ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے یہاں سے ہجرت کر جانے کا حکم ملا ہے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں! ان دو اونٹنیوں میں سے ایک آپ قبول فرما لیں' آپ ﷺ نے فرمایا: مگر یہ میں قیمتاً لوں گا' حضرت عائشہ فرماتی ہیں: پھر ہم نے اُن کے لیے سامانِ سفر تیار کیا اور زادِ راہ کو چمڑے کے ایک تھیلے میں باندھ دیا' اسماء بنت ابی بکر نے اپنے کمر بند کو پھاڑ کر اُس چمڑے کے تھیلے کا منہ باندھا (اور کمر بند کا ایک حصہ اپنی کمر پر باندھ لیا) اس لیے ان کو ''ذات النطاق'' پٹکے والی کے لقب سے یاد کیا

جاتا ہے[1]

آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور انہیں مکہ میں ہی رہنے کا حکم دیا تاکہ وہ لوگوں کی امانتیں واپس کر دیں جو اہل مکہ نے آپ ﷺ کی امانت وصداقت سے متاثر ہو کر آپ ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں کیونکہ مکہ کے کسی شخص کو جب اپنی کوئی چیز ضائع ہونے کا خدشہ ہوتا تو وہ اس چیز کو آپ ﷺ کے پاس بطورِ امانت رکھوا دیتا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو حکم دیا کہ تم دن بھر مکہ کے لوگوں کی باتیں اور تاثرات سننا اور رات کو آ کر ہمیں مطلع کرنا۔ حضرت عامر بن فہیرہ جو آپ رضی اللہ عنہ کا آزاد کردہ غلام تھا' ان کو حکم دیا کہ تم دن بھر بکریاں چرانا اور رات کو غارِ ثور کے دہانے پر لے آنا تاکہ ہم اُن کے دودھ کو استعمال کریں' اپنی بیٹی حضرت اسماء کو حکم دیا تم ہر روز شام کو حسبِ ضرورت جو کچھ کھانا میسر ہو سکے لے کر غارِ ثور میں آ جانا۔

ابن اسحاق اور امام احمد روایت کرتے ہیں کہ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں: جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' رسول اللہ ﷺ کی معیت میں سفر کو نکلے تو آپ نے اپنا سارا مال و دولت اپنے ساتھ لے لیا' وہ پانچ ہزار درہم تھے یا چھ ہزار درہم تھے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ان کے جانے کے بعد میرے دادا ابوقحافہ جن کی بصارت معدوم ہو چکی تھی' وہ آئے اور کہنے لگے: مجھے لگتا ہے بخدا! ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اپنی جان کے ساتھ اپنا سارا مال بھی لے گیا ہے اور تمہیں مصیبت میں ڈال گیا ہے' میں نے عرض کی: دادا جان! ہرگز ایسا نہیں بلکہ وہ تو ہمارے لیے خیر کثیر چھوڑ کر گئے ہیں' وہ کہتی ہیں: میں نے کچھ پتھر لیے اور گھر میں جس مخصوص طاق میں میرے ابا جان دولت رکھتے تھے وہاں پر رکھ دیے اور اُن کے اوپر ایک کپڑا ڈال دیا' پھر اپنے دادا جان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئی اور کہا: دادا جان! ہاتھ سے ذرا ٹٹولیں یہ مال ہے' ابوقحافہ نے جب وہاں ہاتھ

---

[1] طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت اسماء نے اپنے پٹکے کو پھاڑ کر اس کے ایک ٹکڑے سے تھیلے کا منہ بند کر دیا اور دوسرے ٹکڑے سے اسے لٹکا دیا' اسی لیے ان کو ''ذات النطاقین'' (دو پٹکوں والی) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

پھیرا تو انہیں کچھ محسوس ہوا اور کہنے لگے: ہاں! بالکل وہ کچھ نہ کچھ چھوڑ ہی گیا ہے' یہ اُس نے اچھا کیا ہے' یہ تمہارے لیے گزارے کا سامان ہے۔ آپ فرماتی ہیں: میرے ابا جان حالانکہ سب کچھ ساتھ لے گئے تھے لیکن یہ سب کچھ میں نے دادا کو چپ کروانے کے لیے کیا۔

(سیرت ابن ہشام ج ا ص ۴۸۸' مسند امام احمد ج ۲۰ ص ۲۸۲)

جس رات آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تھی' اُسی رات جب اندھیرا گہرا ہو گیا تو مشرکین آپ ﷺ کے دروازے پر جمع ہونے لگے کہ جب آپ ﷺ رات کے پچھلے پہر نکلیں گے تو آپ کو قتل (شہید) کر دیا جائے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن دشمنانِ رسول پر نیند طاری کر دی اور آپ ﷺ ان کے درمیان سے (ان کے سروں پر مٹی پھینکتے ہوئے) نکل گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سُلا دیا اور آپ رضی اللہ عنہ کو یہ اطمینان دلایا کہ صبح تک آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

رسول اللہ ﷺ' حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ رات کی اُس تاریکی میں مکہ سے نکلے اور غارِ ثور میں تشریف لے گئے' یہ ہجرت راجح قول کے مطابق ماہِ ربیع الاول کے دوسرے روز بمطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء (میلادی) کو ہوئی اور آپ ﷺ کی بعثت کو تیرہ سال گزر چکے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' آپ ﷺ سے پہلے غارِ ثور میں داخل ہوئے تا کہ غار کو ٹٹولیں کہ اُس میں کوئی موذی جانور یا سانپ تو نہیں جو آپ ﷺ کو نقصان پہنچائے۔ اس طرح انہوں نے اپنی جان سے بڑھ کر آپ ﷺ کا تحفظ کیا' یہ دونوں اُس غار میں تین دن تک رہے' رات کے وقت حضرت عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ وہاں جاتے اور وہ دن بھر کی اہلِ مکہ کی خبریں بتاتے' اور سحری کے وقت وہاں سے واپس آتے اور یوں ظاہر کرتے کہ گویا انہوں نے رات قریش کے ساتھ ہی بسر کی ہے۔ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ شام کے وقت چراگاہ سے اپنی بکریوں کا ریوڑ غارِ ثور کے پاس لے جاتے' ان کا دودھ دوہتے اور حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کرتے' جب حضرت عبداللہ غار سے نکلتے تو حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے پیچھے بکریوں کا ریوڑ لے کر چل پڑتے تا کہ ان کے قدموں کے نشانات مٹ جائیں۔

اُدھر مکہ میں جب مشرکین کو آپ ﷺ کی ہجرت کا علم ہوا تو وہ مکہ اور اس کے ارد گرد آپ ﷺ کو مدینہ کے راستے پر تلاش کرنے لگے حتیٰ کہ وہ تلاش کرتے کرتے غارِ ثور تک بھی پہنچ گئے' جب آپ ﷺ نے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشرکین کے قدموں کی آہٹ سنی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خوف زدہ ہو گئے اور آپ ﷺ کو سرگوشی کرتے ہوئے عرض کیا: اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے قدموں کے نیچے سے غار کو دیکھے تو وہ ہمیں دیکھ لے گا' تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! کیا ان دونوں کے ساتھ تیسرا اللہ نہیں ہے؟ (متفق علیہ)

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو اندھا کر دیا اور کسی ایک نے بھی غار کی طرف توجہ نہ کی اور کسی ایک کے بھی دل میں یہ بات نہ آئی کہ غار کے اندر جا کر دیکھیں' جب مشرکین اپنے اس ارادے میں ناکام ہوئے تو وہ واپس لوٹ گئے' ان کے جانے کے بعد عبداللہ بن ارقط آیا جو مشرک تھا' اُس کو مدینہ کا راستہ دکھانے کے لیے کرایہ پر رکھا گیا تھا' وہ معاہدے کے مطابق وہی دو اونٹنیاں لے کر غارِ ثور پر حاضر ہو گیا' عبداللہ بن ارقط ساحل سمندر کی طرف سے مدینہ کو جانے والے خفیہ راستے پر چل پڑا' حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے اونٹنیوں پر سوار ہو کر چل نکلے۔

اُدھر اہل مکہ نے اعلان کر دیا کہ جو آپ ﷺ کو اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لائے گا اس کو دونوں کے بدلے ایک ایک سو اونٹ انعام ملے گا۔

ایک دن بنی مدلج کی مجلس میں سراقہ بن جعشم بھی بیٹھا تھا کہ اچانک اُسی قبیلے کا ایک شخص وہاں آیا' اور اُس نے کہا: میں نے بھی ساحل کے قریب ایک چھوٹا سا قافلہ دیکھا ہے' میرا خیال ہے اس میں محمد (ﷺ) اور ان کے دو ساتھی تھے۔ سراقہ جان گیا کہ قافلے کا سراغ مل گیا ہے اور یہ وہی قافلہ ہے' لیکن اُس نے لوگوں میں غلط فہمی ڈالنے کے لیے کہا: نہیں! وہ تو فلاں بن فلاں تھے جن کو تم نے دیکھا ہوگا' وہ تو ابھی ہمارے سامنے سے گزرے ہیں' وہ تو اپنی گم شدہ اونٹنی تلاش کر رہے ہوں گے (سراقہ نے یہ بات اس لیے کی تاکہ کوئی دوسرا شخص بھی انعام کے لالچ میں ان کو پکڑنے کے لیے اٹھ کھڑا نہ ہو)۔

پھر سراقہ مجلس میں تھوڑی دیر بیٹھا اور اٹھ کر چلا گیا' وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اُسی

راستے پر چل نکلا' جب سراقہ' آپ ﷺ کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر گیا' پھر دوبارہ سوار ہو کر وہ چل پڑا حتیٰ کہ اب وہ اتنا قریب پہنچ گیا کہ آپ ﷺ کی قراءت سننے لگا' لیکن آپ ﷺ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی جب کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہے تھے' اب کی بار سراقہ کے گھوڑے کے دونوں اگلے قدم گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور سراقہ گھوڑے سے گر گیا' پھر اس نے گھوڑے کو برا بھلا کہا' جب گھوڑے کے قدم زمین سے نکلے تو ساتھ ہی زمین سے بگولے کی طرح دھواں بھی نکلا جو آسمان کی طرف بلند ہو گیا' اب سراقہ جان گیا کہ آپ ﷺ مجھ سے محفوظ ہیں اور سراقہ کے دل میں دہشت اور آپ ﷺ کا رعب پیدا ہو گیا' پس سراقہ نے اہلِ قافلہ کو آواز دی اور امان طلب کی' یہ سن کر آپ ﷺ نے اپنے ساتھی سمیت وقوف فرمایا حتیٰ کہ سراقہ آپ ﷺ کے قریب ہوا' منت سماجت کرنے لگا اور معافی کی درخواست کی اور مغفرت طلب کی' پھر اُس نے کچھ سامانِ سفر بھی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا لیکن آپ ﷺ نے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمیں کسی چیز کی حاجت نہیں' لیکن تم بس اتنا کرو کہ ہماری خبر کسی تک نہ پہنچے' اُس نے کہا: ایسا ہی ہوگا۔ (متفق علیہ بمطابق بخاری)

پھر سراقہ اُسی راستے سے مکہ واپس آ گیا اور جو شخص بھی اُس سے آپ ﷺ کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ لوگوں کو کوئی مناسب بات کہہ کر ٹال دیتا۔

یوں سراقہ صبح کے وقت تو آپ ﷺ اور آپ کے ساتھی کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کے ارادے سے نکلا لیکن شام کو جب واپس لوٹا تو ان کی حفاظت کر رہا تھا اور لوگوں کی توجہ اُن سے ہٹا رہا تھا اور ان کو واپس پھیر رہا تھا۔

حضور اقدس ﷺ کی قباء میں آمد

رسول اللہ ﷺ جب قباء کے مقام پر پہنچے تو جو لوگ وہاں موجود تھے' انہوں نے بڑی گرم جوشی سے آپ ﷺ کا استقبال کیا' آپ ﷺ نے وہاں کلثوم بن ہدم کے ہاں چند روز قیام فرمایا' انہی ایام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مکہ کے لوگوں کی امانتیں واپس لوٹا کر قباء پہنچ گئے' حضور ﷺ نے وہاں مسجد قباء تعمیر فرمائی' یہی وہ مسجد ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ. (التوبہ:۱۰۸)

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے پہلے دن سے وہ زیادہ مستحق ہے کہ آپ کھڑے ہوں اس میں۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینۃ المنورہ کی طرف اپنا سفر شروع فرمایا۔ مسعودی کی روایت کے مطابق مدینۃ المنورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو پہنچے۔

(مروج الذہب ج ۲ ص ۲۷۹، بیروت)

سب اہل مدینہ نے نہایت گرم جوشی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استقبال کیا اور ہر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کی لگام تھامنے لگا کہ سواری اس کے ہاں بیٹھے اور میزبانی کا شرف اسے حاصل ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسے چھوڑ دو! یہ حکم کی پابند ہے، یعنی جہاں بیٹھنے کا حکم اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہے، یہ وہیں بیٹھے گی، وہ اونٹنی جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوار تھے وہ مدینۃ المنورہ کے گلی کوچوں میں چلتی رہی، بالآخر وہ اونٹنی بنی نجار کے دو یتیم بچوں کی کھلیانی[1] زمین میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے جا بیٹھی، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان شاء اللہ یہی منزل ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامان اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق اس استقبال میں بنونجار کی بچیاں خوشی سے اپنے گھروں سے نکل آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینۃ المنورہ تشریف لانے پر اور ان کی ہمسائیگی اختیار فرمانے پر خوشی سے یہ اشعار پڑھنے لگیں:

نحن جوار من بنی النجار یا حبذا محمد من جار

(ترجمہ:) ہم خاندانِ بنونجار کی بچیاں ہیں واہ کیا ہی اچھے ہمسائے ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے پوچھا: کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ سب نے بیک زباں ہو کر کہا: ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے میرا دل بھی تم سے محبت کرتا ہے۔

---

[1] عربی روایت میں "مربد" کا لفظ آیا ہے، اس کا معنی ہے: وہ جگہ جہاں کھجوریں خشک کی جاتی ہیں۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر حضور ﷺ کے قیام کا منظر

ابوبکر بن ابی شیبہ' ابن اسحاق اور امام احمد بن حنبل نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اپنے ہاں حضور ﷺ کے قیام کے بارے یوں فرماتے ہیں:

جب حضور ﷺ نے میرے غریب خانے میں قیام فرمایا تو آپ ﷺ نے گھر کی نچلی منزل میں قیام کرنا پسند فرمایا' میں اور اُمِ ایوب رضی اللہ عنہا گھر کی بالائی منزل میں تھے' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر نثار! مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ آپ مجھ سے نیچے والی منزل میں ہوں اور میں آپ سے اوپر والی منزل میں رہوں' لہٰذا آپ اوپر والی منزل پر تشریف لے جائیں اور میں نیچے والی منزل میں رہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے لیے اور مجھ سے ملاقات کرنے والوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم نچلی منزل میں رہیں۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم اوپر والی منزل پر تھے اور حضور ﷺ نچلی منزل میں تھے کہ ایک دفعہ ہمارا گھڑا ٹوٹ گیا جو پانی سے بھرا ہوا تھا' میں اور میری بیوی نے لحاف اٹھایا' جو ہمارا ایک ہی لحاف تھا اور اس سے پانی جذب کرنے لگے ہمیں خوف تھا کہ کہیں پانی حضور ﷺ کے اوپر نہ گرے' جس سے آپ ﷺ کو اذیت پہنچے' میں خوف کی حالت میں نیچے اُترا اور آپ ﷺ سے عرض گزار ہوا اور آپ کی شفقت چاہی' میری التجا کرنے پر آپ ﷺ اوپر والی منزل پر منتقل ہو گئے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم حضور ﷺ کے لیے شام کا کھانا تیار کرتے اور آپ ﷺ کی خدمت میں بھیج دیتے' اگر آپ ﷺ کی بارگاہ سے بچا ہوا کھانا واپس آتا تو میں اور اُمِ ایوب کھانے سے اُس جگہ کو تلاش کرتے جہاں آپ ﷺ کے دستِ مبارک کا اثر ہوتا تو ہم حصولِ برکت کے لیے وہاں سے کھانا کھاتے تھے' ایک دن ہم نے کھانے میں لہسن اور پیاز ڈال کر پکایا اور آپ ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا' آپ ﷺ نے وہ کھانا واپس بھیج دیا' جب میں نے دیکھا تو اُس پر آپ ﷺ کے دستِ مبارک کے نشانات نہیں تھے' میں گھبرا کر آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا' میں نے عرض

کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ نے آج کھانا واپس بھیجا تو اس پر آپ کے دستِ مبارک کے نشانات نہ تھے' جب آپ کا باقی کھانا ہمارے پاس آتا ہے تو میں اور اُم ایوب اُس جگہ کو تلاش کرتے ہیں جہاں آپ کے دستِ مبارک کے نشانات ہوتے ہیں' ہم حصولِ برکت کے لیے وہاں سے ہی کھاتے ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اس کھانے میں اُس پودے (پیاز و لہسن) کی بو پائی (جو فرشتوں کے لیے ناگوار ہے) اور مجھ سے (وحی کی صورت میں) سرگوشی بھی کی جاتی ہے (اس لیے میں نے یہ کھانا واپس بھیج دیا) لیکن تم اسے کھالو' ہم نے وہ کھانا کھالیا' پھر اس کے بعد ہم نے آپ ﷺ کے کھانے میں کبھی بھی پیاز یا لہسن نہیں ڈالا۔

(الاصابہ لابن حجر ج ا ص ۴۰۵' سیرۃ ابن ہشام ج ا ص ۴۷۹' مسند امام احمد ج ۲۰ ص ۲۹۲)

اسباق ونصائح

سابقہ فصل میں جب مسلمانوں کی ہجرتِ حبشہ کا ذکر کیا گیا تو اس کے تبصرے میں ہم نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہجرت کے معنی و مفہوم کو واضح کیا تھا' اُس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے دین اور عقیدہ کی عظمت و اہمیت کو ہر چیز سے فوقیت دی ہے' جب دین اور شعائرِ اسلام کو جنگ کے ذریعے مٹایا جارہا ہو تو اس وقت وطن' مال و دولت' جائیداد' جاہ و منصب اور جسم و جان کی دین کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے وقت دین اسلام کے راستے میں ان سب چیزوں کو قربان کرنا ضروری اور فرض قرار دیا ہے۔

ہم نے گزشتہ بحث میں یہ بھی کہا تھا کہ اس دنیا میں سنت الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ جب عقائد سلیمہ اور دین حق کی صورت میں قوتِ معنویہ مضبوط اور قوی ہوگی تو اس کے نتیجے میں ظاہری و مادی قوت بھی مضبوط ہوگی۔

اس لیے امت مسلمہ کے لیے یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ امت دین اسلام اور اخلاق سلیمہ کو مضبوطی سے تھامے رکھے' اس کے نتیجے میں اس امت کو وطن' مال و دولت اور عزت و عظمت حاصل ہوگی جس سے اس امت کا دفاع مضبوط ہوگا اور بقاء حاصل ہوگی' اور اگر اس امت نے اپنے دینی عقائد اور اخلاق کو کمزور کرلیا تو پھر اس کی مادی و ظاہری قوت بھی

اضمحلال اور ضعف کا شکار ہو جائے گی' عروج و زوال کی اس داستان پر تاریخ شاہدِ اعظم ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے دین اور عقیدہ کے تحفظ کی راہ میں ضرورت کے وقت ہر قسم کی قربانی پیش کرنا ضروری اور فرض قرار دیا ہے۔

اس حقیقت پر دلیل کے طور پر حضور ﷺ کا مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمانا بھی کافی ہے' ظاہری اعتبار سے تو ہجرت میں وطن' جائیداد اور سب کچھ چھوڑا جا رہا تھا لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ اپنے وطن کی حفاظت کی ضمانت تھی کیونکہ کئی ایسی چیزیں ہیں کہ جن کا ترک کر دینا اور اُن سے اعراض کرنا ہی ان کی حفاظت کی علامت ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ اپنی ہجرت کے چند سال بعد جب اپنے وطن مکۃ المکرمہ میں واپس تشریف لاتے ہیں تو اب آپ ﷺ ایک فاتح کی شان سے اس شہر میں داخل ہوتے ہیں' اس دین کی برکت سے اب آپ ﷺ کو اتنی قوت اور طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ مشرکین مکہ جو ایک وقت آپ ﷺ کو تکالیف اور ایذائیں دیتے رہے اور بالآخر آپ ﷺ کو شہید کرنے کے ارادے سے کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کر لیتے ہیں' اب وہ سب کے سب آپ ﷺ کے سامنے مجبور ہیں اور امان طلب کر رہے ہیں۔

یہ بحث تو گزشتہ فصل میں گزر چکی' اب ہم حضورِ اقدس ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کی روشنی میں چند احکام مستنبط کرتے ہیں جو ہر مسلمان کے لیے نہایت اہم ہیں:

(۱) حضور ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے واقعہ میں جو بات سب سے اہم اور واضح ہے' وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس سفر کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے ہم سفر کے طور پر مختص فرمایا' یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے باقی صحابہ کرام کو ہجرت کا حکم دے دیا لیکن آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس ہی روکے رکھا' یہ شرف تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے صرف اور صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی حاصل ہوا ہے۔

علماء کرام نے اس سے یہ حکم مستنبط کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بہت محبت تھی اور تمام صحابہ کرام میں سے آپ رضی اللہ عنہ ہی حضور ﷺ کے زیادہ قریب تھے' اس لیے آپ ﷺ کے بعد خلافت کے حق دار بھی حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

اس کے علاوہ بھی کئی ایسے واقعات ہیں جن سے یہ حکم مزید مضبوط ہوتا ہے' مثلاً حضور ﷺ نے اپنے مرضِ وصال میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی نماز پڑھانے کے لیے منتخب فرمایا اور کسی دوسرے صحابی کو اس کی اجازت نہ تھی' اسی طرح ایک صحیح حدیث میں آپ ﷺ کا ایک قول وارد ہوا ہے:

اگر میں اپنا خلیل بناتا تو ضرور ابوبکر کو ہی اپنا خلیل بناتا۔ (مسلم ج ۷ ص ۱۰۵)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' حضور ﷺ کی نظر میں جو اتنے محبوب اور مکرم ہوئے یہ سب کچھ اسی وجہ سے تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' حضور ﷺ کے مثالی اور سچے ساتھی تھے' جنہوں نے اپنا مال' اپنی جان اور اپنا سب کچھ حضورِ اقدس ﷺ پر قربان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اس قربانی کی ایک مثال ہم اُس وقت دیکھتے ہیں جب غار میں داخل ہونے لگے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی جان کو آپ ﷺ پر فدا کرتے ہوئے پہلے خود غارِ ثور میں داخل ہوئے تاکہ وہ محسوس کریں کہ غار کے اندر کوئی سانپ' کوئی موذی جانور یا کوئی اور ایسی چیز تو نہیں جو آپ ﷺ کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے' ہم نے دیکھا کہ کس طرح انہوں نے اس خطرناک اور طویل سفر کے دوران اپنے بیٹے' اپنی بیٹی' اپنے غلام اور چرواہے اور اپنے مال کو آپ ﷺ کی خدمت میں لگائے رکھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' حضور اکرم ﷺ سے کس قدر محبت اور عشق کرتے تھے۔

میری جان کی قسم! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی محبتِ مصطفیٰ وہ مثالی محبت ہے جسے اللہ اور رسول پر ایمان رکھنے والے ہر شخص پر اختیار کرنا لازم اور ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اس ضمن میں ارشاد ہے:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین. (متفق علیہ)	تم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اُس کی اولاد اُس کے والد اور جمیع لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہجرت اور آپ ﷺ کی ہجرت کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے کسی مسلمان کے دل میں یہ بات بھی آ سکتی ہے کہ کیوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اعلانیہ طور پر مشرکین کو چیلنج کرتے ہوئے بغیر کسی خوف وخطر کے ہجرت کی جب کہ حضور ﷺ نے مشرکین سے چھپتے ہوئے محتاط طریقے سے ہجرت فرمائی؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا حضرت عمر میں نبی اکرم ﷺ سے زیادہ جرأت تھی؟

جواب: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ کوئی بھی دوسرا مسلمان جو کام کرتا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی و شخصی تصرف شمار ہوتا ہے' اس طرح کے کیے ہوئے کسی کے بھی عمل میں شرعی حجت موجود نہیں ہوتی ' اُس کو اپنے ایمان' قوت اور جرأت کے مطابق جو بھی وسائل و اسالیب درکار ہوں ان کے مطابق کام کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ بانیٔ شریعت ہیں یعنی آپ ﷺ کے دین کے متعلقہ جملہ افعال وتصرفات ہمارے لیے شریعت کا درجہ رکھتے ہیں' اسی لیے شریعت کے ماخذ اور مصادر میں آپ ﷺ کی سنت دوسرا اہم مصدرِ شریعت ہے' اور سنت کے ضمن میں آپ ﷺ کے جملہ اقوال' افعال' صفات اور تقریر آتے ہیں' اگر حضور ﷺ بھی اُسی طرح ہجرت فرماتے جس طرح اعلانیہ طور پر چیلنج کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تھی تو اس طرح لوگ اس کو اپنے لیے واجب سمجھتے' اور کوئی احتیاطی تدبیر یا کسی خفیہ طریقے کو جائز نہ سمجھتے' جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام جو اس دنیا میں لازم قرار دیے ہیں' وہ سب کے سب اسباب اور مسببات کا تقاضا کرتے ہیں' اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ فی الواقع سب کام اللہ تعالیٰ کے ارادے سے اور اُسی کے سبب پیدا کرنے سے ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ نے اسی وجہ سے ہجرت کے دوران ان تمام اسالیب اور مادی وسائل کو استعمال فرمایا ایسی صورتِ حال میں عقل انسانی جن کو لازمی سمجھتی ہے' آپ ﷺ نے ان ظاہری وسائل میں سے کسی ایک جائز وسیلہ کو بھی ترک نہیں فرمایا بلکہ اس کو اہمیت دی اور اسے استعمال فرمایا۔

حضور ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس حال پر چھوڑا کہ وہ چادر

اوڑھ کر آپ کے بستر مبارک پر سو گئے اور پھر کچھ امن ہوا تو ایک مشرک کو ہی کرایہ پر لیا تاکہ وہ مدینہ کی طرف جانے والا ایسا راستہ بتلائے جس پر دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہو' اسی طرح آپ ﷺ تین دن غارِ ثور میں پناہ گزیں رہے تاکہ کفار ان کو ڈھونڈ نہ سکیں' اسی طرح آخر تک آپ ﷺ نے وہ جملہ مادی وظاہری احتیاطی تدابیر بھی اختیار فرمائیں جن کا ادراک عقلِ انسانی کرسکتی ہے۔

آپ کے اعمال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ عزوجل پر ایمان لانا' ظاہری و مادی اسباب کو استعمال کرنے کی نفی نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم حکمت کے تحت ہی یہ اسباب پیدا فرمائے ہیں۔

آپ ﷺ نے جو یہ ظاہری و مادی اسباب کو استعمال فرمایا' اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ گویا آپ ﷺ کو واقعی اپنی جان کا خطرہ تھا یا مشرکین کے قبضے میں آجانے کا کوئی شک تھا' اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ جب آپ ﷺ سب ظاہری اسباب کو استعمال کرکے غارِ ثور میں پناہ گزیں ہوئے اور مشرکین اُس غار کے پاس پہنچ گئے' اتنے قریب کہ جہاں وہ کھڑے تھے اگر وہیں سے نیچے جھک کر دیکھتے تو ان کی نظر غار کے اندر آپ ﷺ پر جاتی' اس صورتِ حال میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بہت زیادہ خوف سے بھر گئے' لیکن آپ ﷺ نے یہ سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر رکھا تھا' اس لیے آپ ﷺ خود بھی مطمئن تھے اور اپنے یارِ غار کو بھی مطمئن کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اے ابوبکر! تمہارا کیا خیال ہے ان دونوں کے بارے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے؟

اگر صرف اُن ظاہری اسباب پر ہی اعتماد ہوتا تو اس کا یہی تقاضا تھا کہ آپ ﷺ اس حال میں کچھ خوف وخطر بھی محسوس کرتے لیکن آپ ﷺ کفار کے اتنے قریب آجانے کے باوجود بھی مطمئن رہے۔

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے جو ظاہری و مادی احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں یہ سب شرعی ضرورت تھی' جب آپ ﷺ ان ظاہری اسباب کو اختیار فرما چکے' اب آپ ﷺ نے اپنے دل کا رابطہ اللہ عزوجل کی ذات سے جوڑ لیا اور اب اُسی خالق و مالک کی ذات پر ہی پورا اعتماد اور بھروسا کرنے لگے۔ آپ ﷺ اپنے اس عمل سے یہ بتانا چاہتے تھے کہ

مسلمان صحیح طریقے سے یہ بات جان لیں کہ ہر قسم کا اعتماد اور بھروسا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر کیا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو ظاہری اسباب پیدا فرمائے ہیں اُن اسباب کو اپنانا توکل علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔

اس وضاحت کی ایک نمایاں دلیل یہ بھی ہے کہ جب سفر کے دوران سراقہ بن جعشم تلاش کرتے کرتے آپ ﷺ کے قریب پہنچ آیا' جو قتل کے ارادے سے آیا تھا تو اس صورتِ حال میں اگر صرف ظاہری اسباب اور احتیاطات پر ہی اعتماد اور بھروسا ہوتا تو آپ ﷺ ضرور کچھ خوف وخطر محسوس کرتے لیکن آپ ﷺ اس دشمن کی طرف کوئی توجہ دیئے بغیر تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف رہے اور اپنے رب تعالیٰ کی مناجات میں ہی مگن رہے کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ جس خالق و مالک کے حکم سے ہم ہجرت کر رہے ہیں' وعدے کے مطابق ضرور وہ ہمیں ہر قسم کے دشمنوں سے محفوظ و مامون رکھے گا۔ اس صورت حال میں بھی آپ ﷺ کا ظاہری اسباب اختیار فرما کر پورے کا پورا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر تھا۔

(۳) حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے مکہ چھوڑا تاکہ وہ لوگوں کی امانتیں واپس کر دیں جو مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ اس میں بہت بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ وہ کتنا بڑا تضاد تھا جس میں مشرکینِ مکہ مبتلا تھے' وہ یہ کہ ایک طرف وہی مشرکینِ مکہ آپ ﷺ کو جادوگر یا شعبدہ باز کہتے (معاذ اللہ) اور دوسری طرف ان کو اپنی امانتیں رکھنے کے لیے مکہ میں آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی صادق اور امین نہ ملا' جس وجہ سے انہوں نے اپنی امانتیں' اپنے اموال اور دیگر اشیاء بغیر کسی خوف وخطر کے آپ ﷺ کے پاس ہی رکھیں۔

یہ بات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ مشرکین مکہ کا ایمان نہ لانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ انہیں آپ ﷺ کے صدق میں کوئی شک تھا بلکہ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے غرور وتکبر کی بناء پر حق کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو اُس حق سے بالاتر سمجھتے تھے جو پیغامِ حق آپ ﷺ لے کر آئے اور آپ ﷺ کو ماننے کی صورت میں انہیں اپنی حکمرانی اور سرداری ختم ہو جانے کا ڈر تھا۔

(۴) حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے جس مستعدی اور پھرتی کا مظاہر کیا' وہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ صبح شام غار سے مکہ اور مکہ سے غارِ ثور میں آتے جاتے' دن بھر مشرکینِ مکہ کی مجالس میں بیٹھتے اور ہر قسم کی خبریں اکٹھی کرتے اور شام کو غارِ ثور میں پہنچ کر اپنے والد گرامی اور حضور ﷺ کو مشرکینِ مکہ کے ارادوں سے مطلع کرتے۔ اس کے علاوہ آپ کی بہن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے بھی جس ہوشیاری اور محنت سے کام کیا وہ بھی ہمارے لیے اہم ہے' حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا پہلے سامانِ سفر اور زادِ راہ تیار کرنے کا اہتمام کرتی ہیں اور اس قافلے کو روانہ کرنے میں پوری طرح شریک رہیں' پھر تین دن کیسی مستعدی اور جانفشانی سے کھانا تیار کر کے غار تک پہنچاتی رہیں۔

ان دونوں نوجوانوں کا یہ عمل ہماری نوجوان نسل کے لیے مشعل راہ ہے' چاہے کوئی مرد ہے یا عورت' دین کے راستے میں دین کی سربلندی اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی قوت و استطاعت کے مطابق اپنی اپنی خدمات پیش کرے' کسی مسلمان کے لیے یہی کافی نہیں کہ وہ صرف اور صرف اپنی ذات تک ہی محدود رہے یا اپنی عبادات پر ہی اکتفاء کرتا رہے بلکہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی طاقت' صلاحیت اور کوشش کو اسلام کے راستے میں وقف کرے۔

ہر دور اور ہر زمانے میں مسلمان نوجوانوں کی یہی عادت ہونی چاہیے' حضور ﷺ کے ساتھ دعوت اور جہاد کے مراحل میں جتنے لوگ بھی شریک رہے ان میں غالب تعداد نوجوانوں کی ہی تھی' جن کی عمریں جوانی کے پہلے مرحلے سے ابھی آگے نہیں بڑھی تھیں' انہوں نے دین اسلام کی مدد و نصرت اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور طاقتوں کو صرف کیا۔

(۵) رسول اللہ ﷺ کے قافلے کا پیچھا کرتے ہوئے سراقہ اور اس کے گھوڑے کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا (یہ سراقہ جب غلط ارادے سے آپ ﷺ کے قافلے کے قریب ہوا تو دو بار گھوڑا گرا اور آخر میں گھوڑے کے اگلے قدم گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور آسمان تک گرد و غبار کا دھواں بلند ہوا) یہ حضور ﷺ کا واضح معجزہ تھا'

جملہ ائمہ حدیث اور علماء اس واقعہ کی صحت پر متفق ہیں' بخاری و مسلم اور دیگر محدثین نے اس واقعہ کو معجزہ قرار دیا ہے اور دیگر معجزات میں شامل کیا ہے' جن کی تفصیل گزر چکی ہے۔

(۲) ہجرت کے اس واقعہ میں ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ جب مشرکین نے قتل کے ارادے سے آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیا تو آپ ﷺ اُسی رات جب گھر سے نکلتے ہیں تو باہر محاصرہ کیے ہوئے تمام مشرکین پر نیند طاری ہوگئی اور کسی کو بھی کچھ محسوس نہ ہوا اور اس سے بڑھ کر اُن کے ساتھ یہ ہوا کہ آپ ﷺ نے اُن پر مٹی پھینکی جو اُن سب کے سروں میں پڑی اور آپ ﷺ قرآنِ پاک کی یہ آیت کریمہ پڑھتے ہوئے گھر سے باہر تشریف لے گئے:

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (یٰس:۹)

اور ہم نے بنادی ہے ان کے سامنے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے' پس وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے ۝

یہ معجزہ ایک اعلان کے مشابہ تھا جو اُس وقت کے مشرکین اور ان کے علاوہ ہر زمانے کے دیگر لوگوں کو یہ بات باور کرانے کے لیے کافی ہے کہ سب یہ بات سمجھیں کہ جب مشرکینِ مکہ آپ ﷺ کو اور آپ کے صحابہ کو طرح طرح کی تکالیف اور ایذائیں دیتے رہے اور حضور ﷺ یہ سب کچھ دین کے راستے میں برداشت کرتے رہے تو اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اُن سے دور ہوگئی تھی یا اللہ تعالیٰ نے اُن سے اپنی توجہ ہٹالی تھی' اس پر مشرکین کو اور دین کے دشمنوں کو خوش نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ کی مدد اور نصرت قریب ہی ہے' ممکن ہے اس میں کوئی دیر حکمت کی وجہ سے ہو جائے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچتی ہی نہیں' اللہ تعالیٰ کی مدد بہت قریب ہے اور اس مدد کے وسائل و ذرائع کا مشاہدہ ہر آن اور ہر لحہ ہی ہو رہا ہے۔

(۷) رسولِ اکرم ﷺ کا مدینۃ المنورہ پہنچنے پر جس شان و شوکت اور گرم جوشی سے استقبال کیا گیا' اس سے پتا چلتا ہے کہ اہل مدینہ کے مردوں' عورتوں اور بچوں کے دل

آپ ﷺ کی محبت سے کس قدر معمور تھے۔

اہل مدینہ ہر روز مدینۃ المنورہ سے باہر نکل کر چلچلاتی دھوپ کی تمازت کو برداشت کرتے ہوئے سارا سارا دن آپ ﷺ کی آمد کا انتظار کرتے' جب سورج غروب ہو جاتا تو سب واپس آ جاتے اور اگلے روز دوبارہ اُسی جگہ آ کر انتظار کرتے' ایک دن جب حضورِ اقدس ﷺ کو تشریف لاتے ہوئے اُنہوں نے دیکھ لیا' ان کے سینوں میں جذبات جوش مارنے لگے اور ان کی زبانیں آپ ﷺ کی آمد کی خوشی میں آپ ﷺ کو دیکھتے ہی قصیدے گنگنانے لگیں' آپ ﷺ نے بھی اُن سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا' جو بنونجار کی بچیاں آپ ﷺ کے گرد جمع ہو کر قصیدہ پڑھنے لگیں تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ خدا کی قسم! میرا دل بھی تم سے محبت کرتا ہے۔

اس سارے واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی محض اتباع آپ ﷺ کی محبت نہیں ہے بلکہ محبت ہی اطاعت و اتباع کی اساس اور عمل پر اُبھارنے والی ہے' اگر دل میں محبت ہی نہیں ہوگی تو پھر کوئی ایسا محرک ہی نہیں ہوگا جو اتباع پر ابھارے۔

بے شک وہ قوم گمراہ ہوگئی جنہوں نے محض یہی گمان کر لیا کہ محبتِ رسول ﷺ صرف اتباع واقتداء ہی کا نام ہے کیونکہ اتباع واقتداء، تو کسی جذبے کے تحت ہی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت سب کو جان لینی چاہیے کہ محبتِ قلبی ہی وہ جذبہ ہے جو کامل اتباع واقتداء پر اُبھارتا ہے اور جو احساسات کو برانگیختہ کرتا ہے اور جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ایمان باللہ کے لیے اپنی محبت کو معیار و مقیاس قرار دیا اور فرمایا کہ تمہیں اپنی جان' اپنی اولاد' اپنے والدین اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اگر مجھ سے محبت نہیں تو تم مؤمن ہی نہیں یعنی تمہارا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی اس صورت میں جھوٹا ہے' اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سے محبت' باپ بیٹے کی محبت کی جنس سے ہے یعنی ان دونوں کا سرچشمہ دل اور جذبات ہیں ورنہ ان دونوں کے درمیان موازنہ ومقارنہ درست نہ ہوتا۔

(۸) حضور ﷺ جن دنوں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر اقامت پذیر رہے' اس دوران عاشقانِ مصطفیٰ ﷺ کے محبت وعشق سے بھرے کئی واقعات رونما ہوئے۔

ان عشق و محبت کی داستانوں میں سے ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کھانا تناول فرما چکتے اور بچا ہوا کھانا جب واپس بھیجتے تو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ محترمہ کھانے کے برتن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انگلیوں کے نشانات تلاش کرتے' جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک کا کوئی نشان محسوس ہوتا' وہ دونوں حصول برکت اور تبرک کے طور پر وہاں سے کھانا کھاتے' اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعلقہ اشیاء اور آپ کے آثار سے تبرک حاصل کرنا جائز اور مشروع ہے اور صحابہ کرام کی سنت سے یہ ثابت شدہ امر ہے۔

امام بخاری و مسلم نے کئی ایسی احادیث طیبات روایت کی ہیں جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلقہ اشیاء سے تبرک حاصل کرتے ہیں' ان کے وسیلے اور توسل سے شفاء طلب کرتے ہیں یا ان کے توسل سے اللہ تعالیٰ کی عنایت اور توفیق طلب کرتے ہیں اور مختلف شکلوں میں عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

مثلاً امام بخاری نے اپنی صحیح میں ''کتاب اللباس'' میں ایک حدیث طیبہ روایت کی ہے کہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ موئے مبارک (بال مبارک) ایک بوتل نما چیز میں محفوظ رکھے ہوئے تھے' جب بھی کسی صحابی کو کوئی بیماری یا تکلیف ہوتی تو وہ ایک برتن میں پانی ڈال کر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجتے' آپ رضی اللہ عنہا وہ موئے مبارک اُس پانی میں ڈبو کر متبرک بنا دیتیں' پھر صحابہ کرام وہ موئے مبارک سے متبرک پانی پیتے اور اس کے توسل اور وسیلے سے شفاء اور برکت طلب کرتے۔

امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں کتاب الفضائل میں اسی طرح کی ایک حدیث طیبہ روایت کی ہے کہ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُم سلیم کے گھر تشریف لے گئے' وہ گھر میں موجود نہیں تھیں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محوِ استراحت ہو گئے' پھر ایک دن آپ تشریف لائے اور ان کی غیر موجودگی میں سو گئے' اُم سلیم اس وقت گھر پہ موجود نہیں تھیں' جب وہ گھر آئیں تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم مبارک سے پسینہ نکل رہا ہے اور بستر پر پڑے چمڑے کے بچھونے پر جمع ہو رہا ہے' انہوں نے اپنا چھوٹا صندوق کھولا اور پسینے کے قطروں کو چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں

ڈالنے لگیں' جب آپ ﷺ بیدار ہوئے تو فرمایا: اے ام سلیم! یہ تم کیا کر رہی ہو؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم اس پسینے کے ذریعے اپنے بچوں کے لیے برکت حاصل کریں گے' آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے تو نے اپنا مقصد پا لیا۔[1] (مسلم ج ۲ ص ۸۳)

اس موضوع کی متعدد احادیث طیبات صحیحین (بخاری و مسلم) میں روایت کی گئیں ہیں'

[1] شیخ ناصرالدین البانی کہتے ہیں کہ اب اس طرح کی احادیث کی اس زمانے میں کوئی ضرورت نہیں' یہ بات انہوں نے ان توسل اور تبرک والی احادیث پر جرح وتنقید کرتے ہوئے کہی ہے۔ جو مجموعۂ احادیث استاذ محمد المنتصر الکتانی نے کلیہ شرعیہ کے طلباء کے لیے تیار کیا تھا' ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی بھی مسلمان کو ایسے خطرناک اور بے ہودہ کلمات کہنا زیب نہیں دیتا کیونکہ آپ ﷺ کے جمیع اقوال' جمیع افعال اور جمیع تقریرات شریعت کا حصہ ہیں اور شریعت قیامت تک باقی ہے' شریعت کے احکام صرف کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ہی منسوخ ہوتے ہیں' تشریع کا ایک اہم فائدہ اور دلالت یہ ہے کہ اس سے ایک حکم معلوم ہوتا ہے اور اس کے مطابق عقیدہ رکھنا جائز ہے۔

مذکورہ بالا آثار نبوی ﷺ سے تبرک وتوسل والی احادیث اصطلاح حدیث کے مطابق صحیح ہیں اور کتاب اللہ اور سنتِ صحیحہ نے ان کو منسوخ نہیں کیا' اس لیے ان احادیث کا مضمون تشریعی یوم قیامت تک باقی ہے' اس کا معنی یہ ہے کہ جب حضور ﷺ کے آثار اور آپ سے متعلقہ اشیاء سے تبرک وتوسل حاصل کرنا جائز اور مشروع ہے اور اس میں کوئی ممانعت نہیں تو پھر آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات اور عنداللہ آپ ﷺ کی شان وعظمت سے وسیلہ پکڑنا اور آپ کے توسل سے دعا کرنا تو بدرجۂ اتم جائز ہے' اور یہ چیز رہتی دنیا تک ثابت شدہ اور مشروع ہے' پھر یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ آج کے اس زمانے میں اب توسل اور تبرک کی ضرورت نہیں رہی؟ شیخ ناصرالدین البانی نے جو کہا کہ اب ایسے توسل کی ضرورت نہیں یہ ان کی ذاتی رائے ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس مخصوص ''مکتبہ فکر'' سے تعلق رکھتے ہیں اس میں توسل تبرک اور وسیلہ کو جائز نہیں سمجھا جاتا' اس لیے انہوں نے ان صحیح احادیث کی سراسر مخالفت کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے لیکن اُس ایک شخص کے کہہ دینے سے یہ منسوخ تو نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقت یہی ہے کہ آثار نبوی ﷺ سے جس طرح صحابہ کرام توسل وتبرک حاصل کرتے تھے آج بھی ایسا کرنا جائز ہے۔

مثلاً آپ ﷺ کے وضو کے بچے ہوئے پانی کو لینے کے لیے صحابہ کرام دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر حاصل کرتے۔

اسی طرح کثرت کے ساتھ صحابہ کرام آپ ﷺ کے آثار اور باقیات سے تبرک حاصل کرتے اور ان کے توسل سے خیر اور شفاء طلب کرتے مثلاً صحابہ کرام آپ ﷺ کے لباس مبارک کو حاصل کرتے اور تبرک کے طور پر استعمال کرتے' آپ ﷺ کے استعمال شدہ برتنوں سے بھی تبرک حاصل کرتے' اسی طرح دیگر آثارِ نبوی ﷺ سے بھی تبرک حاصل کرتے تھے۔

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مادی آثار سے یوں توسل اور تبرک حاصل کرنا جائز ہے تو آپ ﷺ کو عنداللہ جو مقام و مرتبہ اور شان و عظمت حاصل ہے' اُس سے اور آپ ﷺ کے رحمت للعالمین ہونے کی شان سے توسل حاصل کرنا کیوں کر صحیح نہیں؟

یہاں پر اس وہم کو دُور کر دیا جائے کہ ہم وسیلہ اختیار کرنے کو برکت حاصل کرنے پر قیاس کر رہے ہیں اور یہ کہ یہ مسئلہ محض قیاسی ہے۔ اس وجہ سے کہ ''توسل'' اور ''تبرک'' یہ دونوں کلمات ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں' اس سے مراد یہ ہے کہ جس ذات کا وسیلہ اختیار کیا جا رہا ہے اُسی کے واسطے سے خیر و برکت چاہی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ ﷺ کو جو عظمت و شان حاصل ہے' اس کا وسیلہ اختیار کرنا یا آپ ﷺ کے آثار' باقیات اور آپ کے ملبوسات کو وسیلہ بنانا یہ سب جزئیات اور افراد ہیں جو ایک جامع نوع کے تحت داخل ہوتے ہیں اور جامع نوع مطلق وسیلہ پکڑنا ہے جو صحیح احادیث سے ثابت شدہ ہے۔ تمام جزئی صورتیں ایک قاعدہ کی رُو سے عمومِ نص کے تحت آتی ہیں جسے علماءِ اصول ''تنقیح المناط'' کہتے ہیں۔

ہم واقعہ ہجرت کے سلسلے میں اس قدر تبصرے اور وضاحت پر ہی اکتفاء کرتے ہیں اور آئندہ صفحات میں ہم ان عظیم المرتبت کاموں کا تذکرہ کریں گے جنہیں آپ نے مدینہ منورہ کے جدید معاشرے میں آ کر سرانجام دیا۔

باب چہارم:

جدید معاشرے کی بنیادیں

پہلی بنیاد (مسجد کی تعمیر)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینۃ المنورہ کی طرف ہجرت سے اُس وقت روئے زمین پر پہلا ''دارالاسلام'' وجود میں آیا' یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اسلامی حکومت اپنے بانیٔ اول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت اور نگرانی میں قائم ہونے والی ہے۔

اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد جو پہلے کام کیے وہ اس اسلامی ریاست کی بنیادیں قائم کیں تھیں' اس سلسلے میں تین بنیادی کام جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینۃ المنورہ میں کیے' وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مسجد کی تعمیر

(۲) جملہ مسلمانوں پر عمومی طور پر اور مہاجرین وانصار کے درمیان خصوصی طور پر مواخات کا قیام

(۳) دستور کی تحریر' جس میں مسلمانوں کی آپس کی زندگی کا نظام متعین کیا گیا اور مسلمانوں کے دوسری قوموں سے تعلقات کے اصول عمومی طور پر وضع کیے اور بالخصوص یہود کے ساتھ تعلقات کے اصول بیان کیے۔

مسجد کی تعمیر

ہم سب سے پہلے مسجد کی تعمیر سے بات شروع کرتے ہیں' ہجرت کے واقعات میں ہم نے بیان کیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینۃ المنورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی اُس جگہ پر بیٹھی جو دو یتیم انصاری بچوں کی ملکیت تھی' حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت سے قبل ہی وہاں پر دیگر صحابہ کرام کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر رکھی

تھی۔

حضور ﷺ نے حکم دیا کہ اس جگہ پر مسجد تعمیر کی جائے' ان دونوں یتیم بچوں کو بلایا جو اُس وقت حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے زیر کفالت تھے' آپ ﷺ نے اُن بچوں سے اُس زمین کی قیمت طے کرنا چاہی تو اُن دونوں بچوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ زمین ہم آپ کو ہبہ کرتے ہیں' آپ ﷺ نے اس کا انکار کر دیا اور بالآخر ان دونوں بچوں سے دس دینار میں یہ زمین خرید لی۔[1] (رواہ البخاری ج ۴ ص ۲۵۸' ابن سعد فی الطبقات ج ۲ ص ۴)

اُس جگہ پر کچھ غرقد اور کھجور کے درخت تھے اور چند مشرکین کی پرانی قبریں تھیں' آپ ﷺ نے قبروں کو اکھیڑنے اور درختوں کو کاٹنے کا حکم دیا اور قبلے کی جانب ان کو درست کر دیا گیا' مسجد کا طول سو (۱۰۰) ذراع تھا اور دونوں جانب عرض بھی اتنا یا اس سے کچھ کم تھا' پھر انہوں نے کچی اینٹیں بنائیں اور آپ ﷺ نے مسجد کی بنیاد رکھی اور مسجد کی تعمیر میں صحابہ کرام کے ساتھ بذاتِ خود بھی شریک ہوئے' آپ ﷺ خود اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور یوں مسجد کی تعمیر ہوئی' مسجد کا قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا' کھجور کے ستونوں پر کھجور کی پتیوں اور ٹہنیوں سے چھت بنائی گئی' کسی نے عرض کیا: کیا ہم اس کا پختہ چھت نہ بنائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چھپر کی طرح کا ہی چھپر رہنے دو جو لکڑیوں اور گھاس پھوس سے بنایا گیا تھا' اس کی شان زیادہ ہے۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۵)

مسجد کے فرش پر ریت اور چھوٹے چھوٹے کنکر باقی رہے (اور اسی کے اوپر نماز پڑھی جاتی)۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (مسجد کی تعمیر سے قبل) جہاں نماز کا وقت ہوتا وہیں نماز پڑھ لیتے' بعض

[1] متعدد علماء سیرت نے اس روایت کو نقل کیا ہے' بخاری شریف کی روایت میں یہ بات نہیں کہ آپ ﷺ نے دس دینار میں یہ زمین خریدی' فتح الباری میں ابن حجر نے موسیٰ بن عقبہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ اُن بچوں سے آپ ﷺ نے دس دینار میں یہ زمین خریدی اور واقدی نے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ وہ دس دینار کی رقم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پیش کی۔

اوقات بکریوں کے باڑے میں بھی نماز پڑھ لیتے' پھر آپ ﷺ نے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا اور بنونجار کو بلا بھیجا' جب وہ جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے بنونجار! زمین کا یہ ٹکڑا مجھے قیمتاً دے دو' تو اُن سب نے عرض کی: نہیں! خدا کی قسم! ہم اس کی قیمت طلب نہیں کرتے مگر اللہ سے اس کا اجر طلب کرتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہاں پر مشرکین کی کچھ قدیم قبریں تھیں' کچھ حصہ ناہموار تھا اور کچھ کھجوروں کے درخت تھے' آپ ﷺ نے حکم دیا تو مشرکین کی قبریں اکھیڑ دی گئیں' کھنڈرات کو برابر کر دیا گیا اور کھجوروں کے درختوں کو کاٹ دیا گیا اور مسجد کے قبلہ کی طرف ترتیب سے لگا دیئے گئے اور دونوں جانب پتھر چن دیئے' صحابہ کرام رجز پڑھتے ہوئے پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے' آپ کی زبانِ مبارک پر اُس وقت یہ کلمات تھے:

اللهم لاخير الاخير الآخرة فانصر الانصار والمهاجرة

(ترجمہ:) اے اللہ! حقیقی خیر تو آخرت کی ہے' اے اللہ! تو انصار اور مہاجرین کی مدد فرما۔

(بخاری ج ا ص ۱۱۱)

مسجد نبوی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت تک بغیر تغیر و تبدل کے جوں کی توں رہی' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی کچھ تعمیر و تحسین کی لیکن اس کی بنیادیں وہی رہیں جو آپ ﷺ نے قائم فرمائی تھیں' اس کے ستون اور چھت ویسے ہی لکڑی اور کھجوروں کی ٹہنیوں کے رہے' پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس میں کچھ بڑی تبدیلیاں فرمائیں اور مسجد کو وسیع و عریض کیا' اس کی دیواریں منقش پتھروں اور چونے سے تعمیر کروائیں۔ (اعلام الساجد ص ۲۲۵۔ ۲۲۴)

اسباق ونصائح

اس موضوع پر جو ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے' اس سے ہمیں مندرجہ ذیل امور پر راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

(۱) اسلامی سلطنت اور اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت

رسول اللہ ﷺ جوں ہی مدینۃ المنورہ تشریف لائے اور یہاں سکونت اختیار فرمائی تو

س کے ساتھ ہی یہاں پر ایک مضبوط اسلامی معاشرے کے قیام کی طرف توجہ دی کہ جس میں وہاں کے مسلمانوں (مہاجرین و انصار) پر مشتمل ایک مضبوط اور مستحکم اسلامی معاشرہ قائم ہو چنانچہ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے جو پہلا قدم اٹھایا' وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی معاشرے کے قیام کی پہلی بنیاد مسجد ہے' کیونکہ اسلامی معاشرے میں عقیدے' عمل اور آداب کی جو مضبوطی اور رسوخ پیدا ہوتا ہے اس کا منبع اور مرکز مسجد ہے' اور یہ سب چیزیں مسجد کی روح اور اس کے نظام سے پھوٹتی ہیں۔

بے شک اسلامی نظام اور آداب میں مسلمانوں کا باہمی بھائی چارے کا رشتہ نہایت اہمیت رکھتا ہے' نظامِ اسلام جملہ مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند قرار دیتا ہے اور یہ باہمی اسلامی بھائی چارے کا رشتہ مسجد کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا' مسجد ایک ایسی بابرکت جگہ ہے جہاں مسلمان دن میں متعدد مرتبہ جمع ہوتے ہیں' اس طرح مسلمانوں کے درمیان سے وہ جملہ تفریقیں جو مال و دولت' جاہ و منصب اور ذات پات کے اعتبار سے ہوتی ہیں وہ سب کی سب ختم ہو جاتی ہیں' جب یہ اونچ نیچ کا فرق ختم ہوتا ہے تو پھر باہمی محبت و الفت اور بھائی چارہ پیدا ہوتا ہے۔

اسلام کا نظام اور اس کے آداب تقاضا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان ان کے جملہ معاملات میں مساوات و عدل کی روح اجاگر ہو' لیکن یہ روح اُس وقت تک اجاگر نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمان روزانہ اللہ عزوجل کے سامنے ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نہ ملیں۔ عبودیتِ الٰہی اُن سب کے درمیان قدرِ مشترک ہو' اور اُن سب کے دل اپنے ایک ہی رب کی طرف متوجہ ہوں۔

لیکن اگر ہر مسلمان اپنے گھر میں ہی رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر لے اور نماز ادا کر لے اور اجتماعی طور پر عبادت کی کوئی صورت نہ ہو تو معاشرے میں عدل و مساوات کا تصور کبھی بھی خود غرضی' خود پسندی اور انانیت پر غالب نہیں آ سکتا۔

اسلام کے نظام اور اس کے آداب کا تقاضا یہ ہے کہ جملہ مسلمان مضبوط اور راسخ وحدت کے سانچے میں ڈھل جائیں اور اللہ کی رسی یعنی اس کے حکم اور اس کی شریعت کو جمع ہو کر تھامے رکھیں' لیکن اگر اسلامی معاشرے کے مختلف اطراف میں ایسی مساجد قائم نہیں

ہوں گی جہاں جمع ہو کر مسلمان اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی شریعت کو سمجھ سکیں جس سے علم و معرفت کے ساتھ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہیں' تو اس طرح ان کی وحدت پارہ پارہ ہو کر بکھر جائے گی اور بہت جلد خواہشات اور شہوات اُن میں تفرقہ ڈال دیں گی۔

مسلم معاشرے اور جدید اسلامی حکومت میں انہی تصورات کو قائم کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے سب کاموں سے پہلے مسجد کی تعمیر فرمائی۔

(۲) نابالغ بچوں اور یتیموں سے معاملات طے کرنے کا حکم

اس حدیث طیبہ سے بعض فقہاء احناف نے نابالغ بچوں کے صحت تصرف پر استدلال کیا ہے۔ (اعلام الساجد ص ۲۲۳)

اور دلیل کے طور پر وہ حدیث طیبہ پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دو یتیم نابالغ بچوں سے کھلیان والی زمین کا سودا کیا اور اُن سے وہ زمین مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے خریدی' اگر نابالغ بچوں کا تصرف صحیح نہ ہوتا تو آپ ﷺ ان دونوں سے وہ زمین نہ خریدتے (یہ مذکورہ بالا موقف چند فقہاء کا ہے)۔

جب کہ جمہور فقہاء کا موقف یہ ہے کہ وہ نابالغ بچہ جو ابھی سن رُشد کو نہیں پہنچا' اس کا معاملات میں تصرف صحیح نہیں ہے۔

اور یہ اپنے موقف پر استدلال' قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ سے کرتے ہیں' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ. (بنی اسرائیل: ۳۴)	اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر ایسے طریقہ سے جو (اُس یتیم کے لیے) بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔

جمہور فقہاء کے اس موقف کے مطابق کھلیان والی زمین کی خریداری والی حدیث کے دو جواب دیے جاتے ہیں:

پہلا: ابن عیینہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں یتیم بچوں کے چچا سے سودا کیا تھا جس چچا کی کفالت میں وہ دونوں یتیم بچے تھے اور آپ ﷺ نے اُن

بچوں سے جو کھلیان والی زمین خریدی' یہ ان کے چچا کی وساطت سے خریدی تھی' لہٰذا اب اس سے یہ اعتراض ختم ہو گیا' اس لیے یہ روایت حنفیہ کی دلیل نہیں بن سکتی۔

(فتح الباری بشرح البخاری ج ۸ ص ۱۷۵)

دوسرا: نبی اکرم ﷺ کو مسلمانوں کے جملہ اُمور میں ولایت حاصل ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے جو اُن دونوں یتیم بچوں سے زمین خریدی تو یہ اُس ولایتِ عامہ کی وجہ سے تھی جو آپ ﷺ کو جملہ مسلمانوں پر حاصل ہے' لہٰذا یہ زمین آپ ﷺ نے ولی ہونے کی حیثیت سے خریدی نہ کہ ایک فرد کی حیثیت سے۔

(۳) پرانی قبروں کو اکھیڑ کر ہموار کر کے وہاں مسجد تعمیر کرنے کا جواز

امام نووی نے اس حدیث طیبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اس حدیث طیبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پرانی قبروں کو اکھیڑ کر زمین ہموار کر دینا جائز ہے اور یہ کہ اگر وہ مٹی ہٹا دی جائے جس میں میتوں کا خون اور پیپ شامل ہو گیا ہو تو اُس زمین پر نماز ادا کرنا جائز ہے' اسی طرح اگر وہ زمین پاک کر دی گئی ہو تو وہاں مسجد بھی بنانا جائز ہے۔ اسی طرح یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جس زمین میں میتوں کو دفن کیا گیا ہو اور پھر اس پر کافی عرصہ بیت چکا ہو تو اس کی فروخت جائز ہے اور اس کی ملکیت اس کے مالک کے پاس باقی ہے اور اگر اُس نے یہ زمین وقف نہ کی ہو تو اس کے بعد یہ ورثاء میں تقسیم بھی ہو گی۔ (اعلام الساجد ص ۲۳۶)

علماءِ سیرت نے لکھا ہے کہ کھلیان والی زمین پر جو قبریں تھیں وہ بہت پرانی ہو چکی تھیں' اس لیے وہاں خون اور غلاظت کا تصور تو نہیں کیا جا سکتا لیکن وہاں جو کچھ باقی ماندہ رہ گیا تھا' اُس کو اکھیڑ کر صاف کر دیا گیا۔

میری رائے: میں اس بارے میں کہتا ہوں کہ جس زمین کو وقف نہیں کیا گیا تھا وہاں پر بنی ہوئی قبروں کو اکھیڑ کر جگہ درست کر کے مسجد بنانا تو جائز ہے لیکن اگر وہ زمین قبروں وغیرہ کے لیے وقف کی گئی تھی تو پھر اُس وقف شدہ زمین کو کسی دوسرے کام میں لانا جائز نہیں۔

(۴) مساجد کو پختہ بنانے اور اُن میں نقش و نگار بنانے کا حکم

تشیید و پختہ بنانا: یعنی مساجد کو پتھروں کے ساتھ یا اس کی مثل گچ وغیرہ سے پختہ تعمیر کرنا

جس سے مسجد کی بنیادیں، دیواریں، ستون اور چھت مضبوط اور دیرپا ہوں۔
نقش ونگار بنانا: یعنی اصل تعمیر کے علاوہ زائد طور پر مسجد کی دیواروں وغیرہ پر نقش ونگاری اور تزئین وآرائش کرنا۔

مساجد کو پختہ، مضبوط اور عالی شان بنانا علماء کے نزدیک جائز اور مستحسن ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں مسجد نبوی کی پرانی عمارت شہید کر کے نئی اور پختہ عمارت تعمیر کی، اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے میں مسجد کو پختہ نہیں بنایا لیکن آپ ﷺ کا ایسا نہ کرنا مفہومِ مخالف پر دلالت نہیں کرتا یعنی مساجد کے پختہ بنانے کے عدم جواز پر دلالت نہیں کرتا، اس لیے کہ مساجد بنانے کا جو اصل مقصد اور حکمت ہے اس میں کسی طرح بھی خلل پیدا نہیں ہوتا، مساجد کو پختہ، مضبوط اور خوب صورت تعمیر کرنے میں شعائر اللہ کا احترام، ان کی حفاظت اور دیکھ بھال زیادہ ہوتی ہے۔ علماء کرام مندرجہ ذیل آیت مبارکہ سے بھی استدلال کرتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. (التوبہ:۱۸)	صرف وہی آباد کر سکتا ہے اللہ کی مسجدوں کو جو ایمان لایا ہو اللہ پر اور روزِ قیامت پر۔

اس آیت مبارکہ میں ''عمارۃ'' سے مراد مساجد کو پختہ بنانا، ان کی بنیادیں مضبوط بنانا اور ان کو آباد کرنا اور اچھا انتظام کرنا ہے، لیکن نقش ونگار بنانے اور ملمع سازی کرنے کو فقہاء نے مکروہ کہا ہے، پھر مکروہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) مکروہ تحریمی (۲) مکروہ تنزیہی۔

بعض فقہاء کے نزدیک یہ مکروہ تحریمی ہے اور بعض کے نزدیک یہ مکروہ تنزیہی ہے۔
جن فقہاء نے اس کو مکروہ تحریمی یعنی حرام کے قریب قرار دیا ہے یا جن فقہاء نے اس کو مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے یہ سب اس بات پہ متفق ہیں کہ تعمیر مسجد کے لیے جو مال وقف کیا گیا ہے اس کو اصل ضرورت کے علاوہ تزئین وآرائش اور نقش نگاری کے لیے استعمال کرنا حرام ہے، جب تعمیر کرنے والا خود اس مالِ وقف کو اس میں لگائے تو پھر یہ اختلاف وارد ہوتا ہے۔
امام زرکشی نے امام بغوی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وقف کردہ مال سے نقش ونگار بنانا

جائز نہیں' اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ اپنی جیب سے تاوان کی صورت میں اتنا مال مسجد کے وقف شدہ مال میں جمع کروائے گا' اور اگر کسی نے اپنی گرہ سے نقش و نگار کا کام کروایا تو یہ اس نے مکروہ فعل کیا ہے کیونکہ اس وجہ سے نمازیوں کی توجہ نماز سے ہٹ کر نقش و نگار کی طرف ہو جاتی ہے۔[1]

عمومی طور پر مساجد کو پختہ اور مضبوط تعمیر کرنا اور خصوصی طور پر ان میں نقش نگاری کرنا دونوں میں فرق واضح ہے۔

مسجد تعمیر کرنے کی حکمت اور تقاضا یہ ہے کہ اُس میں عبادت کی جائے' آخرت کو یاد کیا جائے' دنیوی خواہشات کو کم کیا جائے' باہمی بھائی چارے اور اخوت کی فضا پیدا کی جائے تو اس لحاظ سے مساجد کو پختہ اور مضبوط تعمیر کرنے سے اُس اصل حکمت اور مقصد میں فرق نہیں پڑتا' لیکن مساجد میں نقش و نگار بنانے اور گل کاری کرنے سے اس حکمت اور مقصد میں اس صورت میں خلل پیدا ہوتا ہے کہ نمازیوں کے دل مظاہرِ دنیا اور تزئین و آرائش کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اُن میں خشوع و خضوع اور احساسِ بندگی کمزور ہو جاتا ہے کیونکہ مسجد میں داخل ہوتے وقت ایک مسلمان کو دنیوی خیالات اور تصورات کو ذہن سے خارج کر کے اپنے دل و دماغ کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنا چاہیے اور دنیا کی بجائے آخرت کا خیال اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔

اسی مقصد کی طرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے راہنمائی فرمائی ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا تو فرمایا: مسجد کی عمارت لوگوں کو بارش سے بچانے والی ہو لیکن اُس عمارت میں سرخ اور پیلا رنگ کرنے سے اجتناب کرنا' اس سے لوگ فتنے میں مبتلا ہوں گے۔

البتہ علماء میں اس بات پر اختلاف ہے کہ مسجد میں قبلہ کی جانب آیاتِ قرآنیہ لکھنی چاہئیں یا کہ نہیں؟

امام زرکشی اپنی کتاب ''اعلام الساجد'' میں تحریر کرتے ہیں:

---

[1] یہ فقہاء شافعیہ کا مؤقف ہے لیکن اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو تزئین و آرائشِ مساجد کو فقہاء حنفیہ نے جائز قرار دیا ہے۔

مالک فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے' اس لیے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا لیکن کسی نے بھی اس کی مخالفت اور انکار نہیں کیا تھا۔ (اعلام الساجد ص ۲۲۷)

پیچھے جو گزر چکا اس سے واضح ہوتا ہے کہ آج کے دور میں مساجد کی تعمیر و تزئین کرنے والے بہت سے لوگوں کا عمل درست نہیں' وہ اس طرح کہ یہ لوگ مساجد کی تزئین و آرائش کرنے' نقش و نگار بنانے اور شان و شوکت کے مختلف مظاہر سے ان کو آراستہ کرنے میں بہت محنت اور کوشش کرتے ہیں حتیٰ کہ ایسی مزین و منقش مساجد میں داخل ہونے والا شخص اپنے اندر ذرا بھی عاجزی و انکساری اور عبودیتِ الٰہی کا احساس نہیں رکھتا بلکہ انہیں دیکھ کر فنِ تعمیر اور عربی فنِ آرائش کی ترقی پر فخر کا احساس ہوتا ہے' جس کا وہ مساجد زبانِ حال سے بیان کر رہی ہوتی ہیں۔

سادہ لوح مسلمانوں کے ساتھ اس شیطانی کھیل کا ایک بُرا نتیجہ یہ نکلا کہ غرباء اس دنیوی طمع و لالچ کے مظاہر سے چھٹکارا نہ پا سکے' کیونکہ ماضی میں مساجد کا ایسا ماحول ہوتا تھا کہ غریب اپنی غربت کو بھول جاتا تھا اور وہ دنیا اور اس کی رنگینیوں سے نکل کر آخرت اور اس کے فضل کی طرف متوجہ ہوتا تھا' لیکن اب ان مساجد کے مظاہر دنیا کی رنگینیوں کی یاد دلاتے ہیں جن دنیوی رنگینیوں سے وہ غرباء محروم ہیں اور یہ چیز اُن میں غربت اور بدحالی کا احساس پیدا کرتی ہے۔

افسوس! مسلمانوں کا حال کتنا بُرا ہو گیا ہے کہ انہوں نے اسلام کے حقائق سے روگردانی اختیار کر کے اپنے آپ کو ایسے جھوٹے مظاہر میں منہمک کر لیا ہے جن کے اوپر دین کا پردہ پڑا ہوا ہے' لیکن ان کے اندر دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں اور ہوا و ہوس کے ساتھ موجود ہے۔

دوسری بنیاد: مسلمانوں کے درمیان اخوت

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان اخوت قائم فرمائی' ان کے درمیان اخوت کا رشتہ حق اور ہمدردی کی بنیاد پر قائم فرمایا یہاں تک کہ انہیں موت کے بعد ایک دوسرے کا وارث بھی قرار دیا' اس لیے اُن میں دین کا رشتہ' خون کے رشتے سے بدرجہا

مضبوط قرار پایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل کو بھائی بھائی بنایا' حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور زید بن حارثہ کو بھائی بھائی بنایا' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خارجہ بن زہیر کو بھائی بھائی بنایا' حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھائی بھائی بنایا' حضرت عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ اور سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کو بھائی بھائی بنایا' اسی طرح دیگر صحابہ کرام کو بھی آپس میں بھائی بھائی بنایا۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہ کرام کے درمیان یہ بھائی چارہ اور اخوت کا رشتہ جملہ معاملات اور موالات میں قائم فرمایا' اس کا ذکر آگے آئے گا۔ اخوت کا یہ رشتہ مادی معاملات پر بھی قائم تھا' اس کا مظہر یہ تھا کہ تمام اشیاء میں دونوں بھائی ایک دوسرے کی وراثت میں بھی شامل تھے' اخوت کے یہ حقوق غزوۂ بدر تک نسبی اور خونی رشتہ داری کے حقوق سے ہر لحاظ سے مقدم رہے' پھر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ○ (الانفال: ۷۵)

اور رشتہ دار (ورثہ میں) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں حکم الٰہی کے مطابق یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے○

اس آیت کے نازل ہونے کے ساتھ ہی پچھلا حکم منسوخ ہوگیا' اس طرح اخوتِ اسلامیہ کا اثر میراث سے منقطع ہوگیا اور ہر انسان کا اسی طرح نسبی رشتہ مؤثر ہوا اور تمام مؤمن مسلمان بھائی بھائی کہلائے۔

امام بخاری نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب مہاجرین مدینۃ المنورہ آئے تو وہ سب مہاجرین اُن انصار کے حق وراثت میں حصہ دار بنے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپس میں بھائی بھائی بنایا تھا اور اس حق وراثت میں قریبی رشتہ دار شامل نہ تھے' جب یہ آیت نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہوگیا' آیت یہ ہے:

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے: سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۰۴' طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ. (النساء:۳۳) اور ہر ایک کے لیے بنا دیئے ہیں ہم نے وارث۔

پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ. اور وہ لوگ جن سے بندھ چکا ہے (النساء:۳۳) تمہارا عہد و پیمان۔

یعنی ان کی مدد و نصرت کرو' ان سے مالی تعاون کرو اور ان کی خیر خواہی چاہو اور اس طرح میراث کا حکم مواخات کی بنیاد پر ختم ہو گیا۔ (رواہ البخاری فی کتاب التفسیر ج ۵ ص ۱۷۸)

اسباق ونصائح

ایک اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے یہ دوسری بنیاد ہے' جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمایا' اس اساس کی اہمیت مندرجہ ذیل اُمور سے واضح ہوتی ہے:

(۱) کسی بھی ریاست کی تعمیر و ترقی کی اساس وہاں بسنے والی قوم کی وحدت اور امدادِ باہمی پر قائم ہوتی ہے' یہ وحدت اور امدادِ باہمی' بھائی چارے اور محبت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور جب تک کسی قوم یا جماعت میں باہمی بھائی چارے اور محبت کے رشتے استوار نہیں ہوتے وہ کسی ایک نقطے پر جمع نہیں ہو سکتے تو جب کسی قوم یا امت میں حقیقی وحدت اور اتحاد پیدا نہیں ہو جاتا وہ ایک ریاست یا مملکت بنانے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس باہمی محبت' بھائی چارے اور اتفاق و اتحاد سے بھی پہلے ایک ایسے عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے جس پر سب کا ایمان ہو اور جس سے سب وابستہ ہوں۔

اگر دو شخص باہم محبت اور بھائی چارہ تو رکھنے کی کوشش کریں لیکن اُن کا عقیدہ اور زاویہ فکر مختلف ہو تو وہ کبھی بھی ایک نقطے پر جمع نہیں ہوں گے' اور اگر یہ صورتِ حال پوری قوم میں ہو تو کبھی بھی وہ قوم ایک ریاست یا مملکت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو گی۔

یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو ایک کرنے اور ان کے دلوں میں باہمی اخوت اور محبت کی اساس اور بنیاد اُسی عقیدۂ اسلامیہ کو بنایا جو عقیدہ اور تعلیمات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر مبعوث ہوئے تھے' یہی عقیدہ لوگوں میں خالص اللہ تعالیٰ کی بندگی کا احساس پختہ کرتا ہے اور تمام قسم کے فرق مٹا دیتا ہے' صرف تقویٰ و پرہیزگاری کو بہتر

سمجھا جاتا ہے۔

جب لوگوں کے افکار اور عقائد مختلف ہوں گے تو ان کے درمیان اخوت' محبت اور عدل و انصاف پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ کہ ہر انسان اپنی انا اپنے اثر و رسوخ اور اپنی خواہشات کے اندر ہی اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا ہو تو اتفاق و اتحاد ناممکن ہے۔

(۲) کوئی بھی معاشرہ ہو اس میں خواہ کیسے ہی افراد ہوں' ان کا طرزِ زندگی کیسا ہی ہو' بہرکیف ایک چیز سب میں مشترک ہوتی ہے' وہ یہ کہ اُس معاشرے کے افراد کا کسی نہ کسی طریقے سے آپس میں تعاون اور باہمی تعلقات استوار ہوتے ہیں' یہ باہمی تعلقات تجارت' معاملات اور زندگی کے ہر شعبے کے حوالے سے قائم ہوتے ہیں' اگر یہ باہمی تعاون اور تعلقات و معاملات کا نظام' عدل اور مساوات کی بنیاد پر قائم ہو تو یقیناً وہ ایک پرامن عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ ہے' اور اگر یہ نظام ظلم و زیادتی کی بنیاد پر قائم ہے تو وہ ظلم اور جبر پر مبنی استحصالی معاشرہ ہوگا جو ترقی نہیں کر سکتا۔

ایک پرامن عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ جس میں معاملاتِ زندگی اور اسبابِ رزق کی تقسیم عدل و انصاف کے اصولوں پر قائم ہو' اُس میں وہ کون سی ضمانت ہے جو اس عدالت کو سلامت رکھے ہوئے ہوتی ہے؟

بے شک اس سلامتی اور عدل و انصاف کی پہلی ضمانت' طبعی اور فطری اخوت اور الفت پر مبنی ہے اور دوسرے نمبر پر ضمانت قانون اور سلطنت کی حکمرانی ہے۔

کوئی بھی سلطنت جو افراد کے درمیان عدل و انصاف کو عملی طور پر قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے' اس کو چاہیے کہ لوگوں کے درمیان اخوت و الفت کا رشتہ استوار کرے' اور یہ بات پیشِ نظر رہے کہ سلطنت کے کسی فیصلے یا کسی اقدام کی وجہ سے لوگوں میں حسد و حقد اور بغض و کینہ نہ پیدا ہو' اگر لوگوں میں یہ حسد و بغض پیدا ہو گیا تو پھر ظلم و زیادتی اور سرکشی کی بدترین صورت پیدا ہوگی جو سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان حقیقی اخوت و الفت قائم فرمائی جو اجتماعی عدل کی بنیاد پر قائم تھی اور اُسی بنیاد پر دنیا میں ایسا اجتماعی نظام قائم ہوا جو عدل و انصاف' اخوت و الفت اور امن و سلامتی کی بنیاد پر استوار ہوا۔ عدل و انصاف کے یہی

اصول آگے بڑھ کر قوانین اور احکامِ شریعت کی شکل اختیار کر گئے لیکن یہ سب کچھ سب سے پہلے مدینۃ المنورہ کی سرزمین پر اسی اوّلین بنیاد اخوتِ اسلامی پر قائم ہوا' اگر یہ عظیم اسلامی اخوت نہ ہوتی جو خود عقیدۂ اسلامی کی حقیقت پر معرضِ وجود میں آئی تو اسلامی معاشرے کو قوت دینے اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں ان اصولوں کا کوئی مثبت اثر نہ ہوتا۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے درمیان جو مواخات قائم فرمائی یہ کوئی زبانی کلامی بات نہیں تھی بلکہ حقیقت میں عملی طور پر اس کا مظاہرہ کیا گیا اور جملہ تعلقات و معاملات میں اس اخوت کا گہرا تعلق تھا اور اس کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقیقی طور پر اُن صحابہ کرام کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور باہمی اخوت کی یہ ذمہ داری اُن صحابہ کرام نے پوری طرح ادا کر دی' اس پر دلیل کے طور پر حضرت سعد رضی اللہ کا واقعہ کافی ہے۔

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کو جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ پر اپنے گھربار' اپنے مال' اپنی بیویوں اور اپنی ہر چیز کو نصف نصف تقسیم کر کے پیش کیا' لیکن حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اُن سے بازار کی جانب راہنمائی چاہی تاکہ بازار میں جاکر کچھ کام کاج کر کے کچھ کما سکیں۔

اسی طرح جملہ صحابہ کرام نے مواخات کے بعد اپنا سب کچھ اپنے مہاجر صحابہ کو آدھا آدھا تقسیم کر کے پیش کیا' صحابہ کرام عام حالات میں بھی اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرتے لیکن ہجرت کے بعد جب مواخات قائم ہوئی تو صحابہ کرام نے بھائی چارے اور اخوت کی ایسی تصویر پیش کی کہ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسی اخوت کے سلسلے میں بنائے جانے والے بھائیوں کو وراثت کے حق میں بھی حصہ دار ٹھہرایا' اس شرعی حکم کے نفاذ میں حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اخوتِ اسلامیہ حقیقی اور حسی طور پر بیٹھ جائے' اور سب یہ جان لیں کہ مسلمانوں کے درمیان اخوت ومحبت کا یہ جو باہمی رشتہ ہے یہ محض کوئی زبانی کلامی بات نہیں بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی عدل کے نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔

پھر بعد میں اس اخوت کی بنیاد پر قائم رشتہ کے بارے میں وراثت کی تنسیخ کا جو حکم آ گیا' اس کی حکمت یہ تھی کہ بالآخر وراثت کا جو قانون حتمی شکل میں قائم ہوا' وہ بھی درحقیقت اخوتِ اسلام کی ہی بنیاد پر قائم ہوا' اسی وجہ سے یہ حکم بھی آ گیا کہ دو مختلف ادیان والے قریبی رشتہ دار بھی باہم وارث نہیں ہو سکتے' یعنی مسلمان کافر کا یا کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

ہجرت کے ابتدائی دور میں انصار اور مہاجرین پر باہمی تعاون' مدد اور محبت والفت کی کچھ خاص ذمہ داری ڈالی گئی تھی کیونکہ اُس وقت مہاجرین اپنا وطن' علاقہ' جائیداد' مال ودولت اور سب رشتہ دار مکہ میں چھوڑ کر مدینہ کے انصار کے پاس مہمان بن کر آئے تھے تو آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات قائم فرمائی تھی' یہ نہایت اہم ذمہ داری کا کام تھا' اسی لیے اس مواخات میں مہاجرین بھائیوں کو قریبی رشتہ داروں پر مقدم رکھنے کا حکم دیا گیا تھا' تاکہ بھرپور طریقے سے ان مہاجرین کے ساتھ تعاون ہو سکے۔

بعد میں جب مدینۃ المنورہ میں مہاجرین کے حالات درست ہو گئے اور ان کو استقرار مل گیا اور وہاں اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور مدینۃ المنورہ کے جدید معاشرے میں اسلامی روح رچ بس گئی' اُس وقت مناسب تھا کہ اس سانچے کو ختم کر دیا جائے جس میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مخصوص تعلقات کا نظام قائم کیا گیا تھا' اس لیے کہ اب عام اسلامی اخوت اور اس کے نتیجے میں عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے زیر اثر اس نظام کے کمزور اور منتشر ہونے کا کوئی خدشہ نہیں تھا' لہٰذا اب اس میں کوئی حرج نہ جانا گیا کہ مسلمانوں کے درمیان نسبی رشتہ اور تعلق کو دوبارہ مؤثر قرار دے دیا جائے اور اس کا اثر اب دینی اور بھائی چارے کے رشتے سے زائد ہو۔

حضور ﷺ نے مدینۃ المنورہ میں صحابہ کرام کے درمیان جو مواخات قائم فرمائی' اس سے قبل مکۃ المکرمہ میں بھی حضور ﷺ نے مکہ کے مسلمانوں کے درمیان مواخات قائم فرمائی تھی۔ ابن عبدالبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مواخات دو مرتبہ ہوئی تھی' ایک مرتبہ صرف مہاجرین کے درمیان مکۃ المکرمہ میں اور دوسری مرتبہ مہاجرین اور انصار کے درمیان مدینۃ المنورہ میں۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۹۱)

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اخوت کی بنیاد اسلامی تعلق اور رابطہ ہے' جس کی تجدید اور تقویت ہجرت کے بعد کی گئی' اُن مخصوص حالات میں جب مہاجرین اور انصار ایک جگہ جمع ہوئے۔ درحقیقت یہ اخوت اور بھائی چارہ اسلام اور عقیدہ کی وحدت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا' اور یہ اس کی عملی تاکید اور تنفیذ تھی۔

تیسری بنیاد (مسلمانوں اور دیگر اقوام کے درمیان معاہدے کی تحریر)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینۃ المنورہ میں سب سے پہلے جو اہم اور بنیادی کام انجام دیا وہ جدید حکومت کی دستوری حیثیت سے متعلق تھا۔

ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینۃ المنورہ میں آئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا کہ مدینہ کے رہنے والے اکثر عربوں نے اسلام قبول کر لیا اور انصار کا کوئی ایسا گھر نہیں بچا تھا جہاں اسلام نہ پہنچا ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اب مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک معاہدہ تحریر فرمایا' اس میں یہودیوں کو بھی شامل فرمایا' انہیں ان کے دین اور ان کے اموال کے تحفظ کا یقین دلایا اور اُن پر کچھ شرائط عائد کیں اور انہیں کچھ حقوق بھی دیئے۔

معاہدے کی اس تحریر کو ابن اسحاق نے بغیر سند کے ذکر کیا' ابن خیثمہ نے اس کی سندیوں بیان کی ہے کہ ہم نے روایت کیا: احمد بن جناب (ابوالولید) سے' انہوں نے روایت کیا: عیسیٰ بن یونس سے' انہوں نے روایت کیا: کثیر بن عبداللہ بن عمرو المزنی سے' انہوں نے روایت کیا اپنے والد سے' ان کے والد نے ان کے دادا سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک معاہدہ تحریر فرمایا' اور آگے انہوں نے ابن اسحاق ہی کی طرح روایت ذکر کی ہے۔ (عیون الاثر لابن سید الناس ج ۱ ص ۱۹۸)

امام احمد نے بھی اس معاہدے والی روایت کو اپنی مُسند میں سریج سے روایت کیا ہے' وہ فرماتے ہیں: ہم نے روایت کیا: عباد سے' انہوں نے حجاج سے' انہوں نے عمرو بن شعیب سے' انہوں نے اپنے والد سے اور ان کے والد نے ان کے دادا سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک معاہدہ تحریر فرمایا۔ (مسند احمد ج ۲۱ ص ۱۰' شرح البنا)

ہم یہاں پر وہ پورا معاہدہ نقل نہیں کرتے کیونکہ وہ بہت طویل ہے' البتہ اُس معاہدے

ے کچھ اہم بند یہاں ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں ہم مدینۃ المنورہ میں قائم ہونے والی جدید اسلامی ریاست کے دستور کا جائزہ لے سکیں۔

مندرجہ ذیل بند اور شقیں اسی طرح اصل معاہدے میں تحریر شدہ ہیں:

(۱) قریش اور یثرب کے مسلمان، ان کی اتباع کرنے والے، اُن کے ساتھ الحاق کرنے والے اور ان کے ہمراہ جہاد کرنے والے دیگر لوگوں کے علاوہ یہ سب ایک امت ہیں۔

(۲) جملہ مسلمان اجتماعی طور پر، اپنے مختلف قبائل کے باوجود اپنے دستور کے مطابق آپس میں خون بہا ادا کریں گے اور اپنے معروف طریقے کے مطابق اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کریں گے اور مؤمنین کے درمیان عدل و انصاف قائم کریں گے۔

(۳) مؤمنین کسی مؤمن کو مقروض یا زیر بار دیکھ کر بے یار و مددگار ہی نہیں چھوڑ دیں گے بلکہ وہ اس کے خون بہا یا فدیہ کی ادائیگی کے لیے اُس کی مدد کریں گے۔

(۴) مسلمانوں میں سے جس نے بھی بغاوت کی یا ظلم کیا یا جرم کیا یا مسلمانوں کے درمیان فساد یا عداوت پیدا کی، تو تمام خداترس مسلمان اُس کے خلاف متحد ہو جائیں گے اور تمام مل کر اس کا مقابلہ کریں گے خواہ وہ باغی ان میں سے کسی ایک کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(۵) کوئی مسلمان کسی کافر کے بدلے میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ کسی مؤمن کے خلاف کسی کافر کی مدد کرے گا۔

(۶) اللہ تعالیٰ کا ذمہ ایک ہی ہے، مسلمانوں کا ادنیٰ فرد بھی کسی کو پناہ دے سکتا ہے، اس کی پابندی سب پر لازم ہوگی، مسلمان دوسرے تمام لوگوں کے سوا آپس میں باہم معاون و مددگار اور ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

(۷) جن مسلمانوں نے اس صحیفہ میں تحریر شدہ دستور کا اقرار کر لیا، اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لے آیا، اُس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی فتنہ باز کی مدد کرے اور نہ ہی اسے پناہ دے جس نے کسی فتنہ پرور کو پناہ دی یا اس کی مدد کی تو روزِ حشر اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب ہوگا، اس سے کوئی عوضانہ یا کوئی بدل قبول نہیں کیا جائے گا۔

(۸) یہود جب تک مسلمانوں کے ساتھ مل کر معرکہ آراء ہوں گے' وہ جنگ کے اخراجات بھی برداشت کریں گے۔

(۹) قبیلہ بنوعوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک فریق اور ایک وحدت ہوں گے' یہودی اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر رہیں گے مگر جس نے ظلم کیا اور گناہ کا مرتکب ہوا تو وہ اپنے ہی نفس اور اپنے ہی اہل خانہ کو ہلاکت میں ڈالے گا۔

(۱۰) یہودیوں کے ذمہ اپنا خرچہ ہوگا اور مسلمانوں کے ذمہ اپنا خرچہ ہوگا اور جو کوئی بھی ان معاہدہ کرنے والوں میں سے کسی ایک فریق کے خلاف جنگ کرے گا تو اس کے مقابلے میں یہ معاہدہ قبول کرنے والے سب مل کر ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں گے۔

(۱۱) اس معاہدہ کو قبول کرنے والوں کے مابین اگر کوئی جھگڑا یا تنازعہ رونما ہو جس سے فتنہ فساد بھڑکنے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد ﷺ کی طرف ہی یہ مقدمہ پیش کیا جائے گا۔

(۱۲) جو شخص مدینہ سے باہر رہے گا وہ بھی امن میں رہے گا اور جو مدینہ کے اندر ہی رہے گا وہ بھی امن میں رہے گا مگر ظالم اور غداری کرنے والا مجرم اس سے مستثنیٰ ہوگا۔

(۱۳) بے شک اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اس معاہدے کی تصدیق فرمانے والا اور اس کو پورا کرنے والا ہے' اور اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص کا مددگار ہے جو نیکی کرے اور تقویٰ اختیار کرے۔

اسباق ونصائح

اس معاہدے میں متعدد ایسی اہم راہنمائیاں ہیں جو اسلامی معاشرے کے نظم ونسق سے متعلق مختلف احکامات سے تعلق رکھتی ہیں۔

ہم مختصر طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) اس معاہدہ اور میثاق کا اطلاق عصرِ حاضر میں مستعمل اصطلاحی لفظ ''دستور'' پر ہوتا ہے۔ اس میثاق اور معاہدے کی شکل میں اُس وقت کے دستور کا ہی اعلان تھا کیونکہ اس میثاق اور معاہدے کی تمام شقیں کسی بھی لحاظ سے موجودہ دور کے جدید دستور سے

کم نہ تھیں، اس میثاق میں ریاست کے داخلی اور خارجی جملہ خطوط پر واضح احکامات موجود تھے اور اس میں وہ جملہ اصول وقوانین موجود تھے جن کی بنیاد پر ایک ریاست کے افراد ایک طرف آپس میں باہم ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کر سکتے ہیں اور دوسری طرف ایک ریاست کے افراد دوسری اقوام کے ساتھ تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔

اس دستور کی تکمیل اور کمال کے متعلق یہی کافی ہے کہ یہ دستور رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی طرف سے وحی کردہ ہدایت کی روشنی میں وضع فرمایا اور اپنے صحابہ کرام کو لکھوا دیا۔

پھر اس دستور کو جملہ مسلمانوں اور ان کے پڑوسی یہودیوں کے درمیان متفقہ بنیاد قرار دیا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشرہ پہلے ہی دن سے ایک مکمل دستور کی بنیاد پر قائم ہوا اور جب ایک اسلامی ریاست بھی قائم ہوگئی تو پہلے ہی دن سے اس ریاست کے نظام کو چلانے کا ایک مکمل دستور بھی موجود تھا جس کی ایک ریاست ضرورت مند ہوتی ہے۔

اس دستور کے جملہ نکات اسلامی معاشرے کے شرعی احکام منطبق کرنے میں بھی بنیادی حیثیت اختیار کر گئے کیونکہ بنیادی طور پر اس میں وحدتِ امتِ مسلمہ کی فکر شامل تھی، اور دیگر تنظیمی اور اداراتی نظم ونسق کے بارے بھی اس میں شقیں موجود تھیں۔ کسی بھی جگہ پر اس وقت تک نہ کوئی اسلامی حکومت قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا قانون چل سکتا ہے جب تک کہ یہ دستوری تنظیم قائم نہ ہو، جس کو رسول اللہ ﷺ نے تشکیل دیا کیونکہ یہ دستوری تنظیم اور ڈھانچہ بذاتِ خود احکامِ شریعت کا ایک جزء ہے۔

اس بدیہی حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے بعد اُن لوگوں کے جھوٹے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، جو اپنی بصارت وبصیرت کی آنکھیں بند کر کے اسلام پر طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں، وہ اپنے زعم میں یہ کہتے ہیں کہ اسلام محض ایک دین ہے جو صرف بندے کا تعلق اپنے رب سے جوڑتا ہے، اس کے علاوہ ریاست کے دستوری ڈھانچے سے متعلقہ اور تنظیمی معاملات سے متعلقہ اس میں کوئی شے نہیں۔ یہ ان کی جھوٹی اور من گھڑت

باتیں ہیں اور ان کا پرانا جال ہے' اسلام کے خلاف سازش اور فکری یلغار کرنے والے اور استعماری سوچ رکھنے والے زرخرید غلام اسلام کو قید کرنا چاہتے ہیں تا کہ اس کا آگے بڑھنا رک جائے جس سے یہ اسلامی معاشروں میں کوئی کام انجام نہ دے سکے' اور اس کی وہ شان باقی نہ رہے جس سے یہ دوسرے گمراہ معاشروں پر غالب ہو سکے' اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اسلام کی تعلیمات صرف اور صرف دین تک ہی محدود کر دی جائیں جس میں ریاست کے متعلق کچھ نہ ہو' اور دین صرف عبادات پر مشتمل ہو جس میں قوانین وضوابط وضع کرنے کی گنجائش نہ ہو' اور اگر اسلام درحقیقت دین اور ریاست دونوں سے متعلق ہو تو پھر بھی اس کے بارے میں ایسی جھوٹی باتیں گھڑی جاتیں کہ جس سے ریاست کو اس سے بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔

جب کہ اُن فکری یلغار کرنے والوں کی بدقسمتی کہ ان کا یہ بُنا ہوا جال جلد ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا' اور ان کی یہ بات بے معنی قرار پائی' اور واضح ہو گیا کہ یہ بات انہوں نے محض پوشیدہ حقد و بغض کی بناء پر کی تھی۔

لیکن جہاں تک ان عظیم دفعات کا تعلق ہے تو ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ خود اسلامی معاشرے کا وجود ریاست کے مکمل ڈھانچے میں ہوا اور اس کے قوانین وضوابط ایسے معاشرتی اور اجتماعی نظم وضبط کے سانچوں میں ڈھل کر نازل ہوئے جو تمام جہات اور جملہ اطراف سے ہم آہنگ تھے۔ یہ دستاویز اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

تشریعی احکام کی اہمیت وقدر سے قطع نظر یہ احکام ایسے اجزاء ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو ایک عظیم دستوری وتنظیمی عمارت قائم ہوتی ہے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدے میں یہود کے ساتھ معاملات کے متعلق جو شقیں شامل فرمائیں' وہ عدل وانصاف پر مبنی تھیں' اگر یہود کی بُری عادات اور مکر وفریب غالب نہ آتا اور جملہ تعلقات اسی میثاق اور معاہدے کے مطابق قائم رہتے اور کوئی فریق بھی ان کو نہ توڑتا تو یقیناً اس عدل وانصاف کے ثمرات ظاہر ہوتے لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ یہودیوں پر ان کی پرانی عادات لوٹ آئیں اور وہ مکاری' غداری اور دھوکا دہی پر اُتر آئے' اور اس معاہدے کی شقوں کو توڑنے لگے' انہوں نے آپ ﷺ

کے کسی قانون میں اور دنیا کی کسی قوم میں آج تک نہیں ملتی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ فرق بھی نمایاں ہے جسے ملحوظِ خاطر رکھنا لازمی اور ضروری ہے جو فرق اسلامی شریعت میں پائی جانے والی دل کش انسانی مساوات کے درمیان اور تقلیدی مظاہر کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جن تقلیدی مظاہر کا آج جدید تہذیب کے عُشاق چرچا کر رہے ہیں' اللہ کی شریعت کی مساوات تو صحیح انسانی فطرت پر قائم ہے' اور اس میں عزت وعظمت اور مساوات کا حقیقی فیضان سب کو ملتا ہے خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد اور افراد ہوں یا جماعتیں۔

جب کہ جدید تہذیب میں اصلی حیوانی جذبات ہیں جس میں مقاصد یہ کارفرما ہیں کہ عورت ایک ایسی مادی چیز ہے جو وسیع پیمانے پر مرد کے لیے دل لگی اور تفریح کا سامان ہے۔

چوتھے نمبر پر: میثاقِ مدینہ کا گیارہواں بند ہماری راہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ بے شک مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے جملہ اختلافات' خصومات اور اپنے تمام جھگڑوں میں شریعتِ اسلامیہ کے علاوہ کسی دوسری طرف رجوع کریں بلکہ مسلمانوں کے لیے حاکم عادل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی شریعت اور اس کا حکم ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشتمل ہے' اگر مسلمان اپنے کسی مسئلے کے حل کے لیے شریعتِ اسلامیہ کے علاوہ کسی اور طرف رجوع کریں گے تو وہ سخت گناہ کے مرتکب ہوں گے جو ان کے لیے دنیا میں شقاوت و بدبختی اور آخرت میں گناہ کا سبب ہوگا۔

یہ وہ بنیادی چار احکامِ شریعت ہیں جن پر یہ میثاقِ مدینہ مشتمل تھا اور اسی بنیاد پر مدینۃ المنورہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی ریاست قائم فرمائی' اور مسلمانوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جدید معاشرے کے قیام کا منہج وضع فرمایا' اس کے علاوہ بھی اس میثاقِ مدینہ میں کئی احکامِ شریعت پوشیدہ ہیں جو غور و تامل سے واضح ہو سکتے ہیں۔

اس میثاق و معاہدے سے مطابقت حاصل کرتے ہوئے' اس سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے اور اس کے جملہ احکام پر پوری طرح عمل پیرا ہوتے ہوئے ہی اسلامی ریاست مضبوط ستونوں اور قوی بنیادوں پر قائم ہوئی' پھر یہ ریاست شرق و غرب میں تیزی سے پھیلتی چلی گئی' جو انسانیت کی عظمت اور ترقی کی علامت بنی اور اس نے لوگوں کے سامنے صحیح تہذیب و تمدن اور عظیم ثقافت کے درخشاں مظاہر پیش کیے۔

باب پنجم:
دفاعی جنگوں کا مرحلہ

مقدمہ

یہ غزوات جن کا تذکرہ ہم نے اس باب میں ''دفاعی جنگ کا مرحلہ'' کے عنوان کے تحت کیا ہے' یہ غزوات عملاً دفاعی نوعیت کے تھے' جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے ہر غزوہ مشرکین کی طرف سے ابتداء کی گئی کسی جارحیت یا سازش کا ہی منہ توڑ جواب تھا۔ اسی لیے غزوات کا یہ سلسلہ عہد نبوی میں دعوتِ اسلامی کے مراحل میں سے ایک مرحلہ کی نمائندگی کرتا ہے' اور غزوات کے اس مرحلے کو اُس حکم سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا جس کی بنیاد پر اسلام میں جہاد کی مشروعیت اور جواز ہوا' یہ دفاعی غزوات بھی دعوت کے اُن مختلف مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں' مثلاً خفیہ دعوت کا مرحلہ' اعلانیہ دعوت کا مرحلہ وغیرہ۔

وہ آخری مرحلہ جو اپنے ماقبل مراحل سے مل کر مکمل اسلامی حکومت کی تشکیل کرتا ہے' یہ آخری مرحلہ اُن واقعات پر مشتمل ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد پیش آئے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مرحلے کی طرف اشارہ اُس وقت فرمایا جب آپ غزوہ بنی قریظہ سے واپس لوٹ رہے تھے' امام بخاری نے اس کو روایت کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> اب ہم اُن پر حملہ کریں گے اور وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے۔ (بخاری)

اب ہم اس مرحلہ کے واقعات کو بیان کریں گے جو دعوتِ اسلامی کی راہ میں پیش آئے' ان میں سے ہم صرف انہی واقعات کے بیان کرنے پر اکتفاء کریں گے جن سے کوئی حکم متعلق ہوگا یا جن سے کوئی درس یا نصیحت مرتب ہوگا' اور غیر اہم تفصیل یا طویل بحث والے اختلافات سے گریز کریں گے۔

جنگ کی ابتداء

پہلا غزوہ

احادیث طیبات اور آثارِ صحابہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جنگ کی مشروعیت اور اجازت ہجرتِ مدینہ کے ساتھ ہی ہو گئی تھی، لیکن اس مشروعیت اور جواز کو ہجرتِ مدینہ کے بارہ ماہ بعد ماہِ صفر میں اُس وقت عملی جامہ پہنایا گیا جب رسول اللہ ﷺ پہلی مرتبہ جنگ کے ارادے سے غزوۂ ودان کے لیے نکلے، اس میں قریش اور بنوحمزہ سے لڑائی کا ارادہ تھا، جو حملہ کے لیے آئے تھے لیکن اس میں لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ بنوحمزہ نے آپ ﷺ سے صلح کر لی تھی۔ اس لیے حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام جنگ کیے بغیر واپس مدینۃ المنورہ لوٹ آئے۔

غزوۂ بدر الکبریٰ

اس کا سبب یہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں ملکِ شام سے آ رہا ہے، تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اس قافلہ کے تعاقب پر اُبھارا تاکہ مسلمانوں کو قریش کا یہ مال مل جائے، اُس مال کے بدلے جو مسلمانوں نے ہجرت کے وقت مکہ المکرمہ میں چھوڑا تو کچھ لوگ پیچھے رہ گئے اور کچھ لوگ اُس قافلے کا تعاقب کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، کیونکہ ان کو یہ تصور بھی نہ تھا کہ جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اُدھر ابوسفیان نے مکہ واپس جاتے ہوئے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا تو اُس کو کسی طرح یہ خبر ہو گئی کہ مسلمان اس کے قافلے کے تعاقب میں نکلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، اُس نے ضمضم بن عمرو الغفاری کو مکہ بھیجا تاکہ وہ قریش کو اس سے آگاہ کرے اور انہیں اپنے اموال کی حفاظت کے لیے نکلنے پر اُبھارے۔

چنانچہ جب یہ خبر قریش تک پہنچی تو انہوں نے جلد ہی تیاری کی اور جنگ کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے، حتیٰ کہ قریش کے سرداروں میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہا، سب کے سب اس میں شامل ہوئے، اور یہ تقریباً ایک ہزار جنگ جو افراد کا لشکر تھا۔

حضور اکرم ﷺ رمضان المبارک کے ابتدائی دنوں میں اپنے صحابہ کرام کی معیت میں نکلے، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ لشکر تین سو چودہ افراد پر مشتمل تھا، اس میں ستر

کے قریب اونٹ تھے' ایک اونٹ پر یکے بعد دیگرے دو یا تین صحابہ کرام سوار ہوتے تھے' لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو قریش کے ارادے کا اور ان کے لڑائی کے لیے نکلنے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی' دوسری جانب ابوسفیان کو اپنے قافلہ کو بہ حفاظت بچا کر لے جانے کی فکر تھی' اُس نے بدر کے چشمے کو اپنے بائیں جانب چھوڑ کر ساحلِ سمندر والا راستہ اختیار کیا اور قافلے کو تیزی کے ساتھ وہاں سے گزارتے ہوئے ہر قسم کے خطرات سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

اِدھر جب حضور اکرم ﷺ کو قریش کی مکہ سے جنگ کی غرض سے روانگی کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھ شامل صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا' تو مہاجرین نے اس بارے میں بہت عمدہ گفتگو کی اور ہر حالت میں آپ ﷺ کا ساتھ دینے کا عزم ظاہر کیا' اُن میں سے حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے وہ کر گزریئے' ہم آپ کے ساتھ ہیں' لیکن آپ ﷺ نے اس کے بعد دوبارہ صحابہ کرام کو دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے لوگو! مجھے اس معاملے میں مشورہ دو' تو ایک انصاری صحابی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! شاید آپ ہم انصار سے مشورہ طلب فرما رہے ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: بے شک ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی اور ہم نے گواہی دی کہ جو دین آپ لے کر تشریف لائے ہیں وہ حق ہے' اس پر ہم نے آپ کے ساتھ وعدے کیے ہیں اور آپ کا حکم سننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا پکا عہد و پیمان باندھ چکے ہیں' لہٰذا آپ کر گزریئے جس کام کا آپ ارادہ فرما چکے ہیں' ہم آپ کے ساتھ ہیں' قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! اگر آپ ہمیں سمندر کے پاس لے جائیں اور خود اس میں داخل ہو جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں چھلانگ لگا دیں گے۔

آپ ﷺ' حضرت سعد کی اس گفتگو سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا: روانہ ہو جاؤ! میں تمہیں خوش خبری دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو گروہوں میں سے ایک گروہ پر غلبہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے' اللہ کی قسم! گویا میں ابھی دیکھ رہا ہوں کہ اس دشمن قوم سے کون کس جگہ قتل ہو گا۔

حضور اکرم ﷺ نے پھر قریش کی نقل و حمل اور ان کے لشکر کی تعداد کے بارے جاسوسوں کے ذریعے معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں حتیٰ کہ پتا چلا کہ کفار کی تعداد نو سو اور ہزار کے درمیان ہے' اور ان میں مشرکین کے جملہ سردار اور زعماء شامل ہیں۔

اُدھر جب ابوسفیان بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو اُس نے قریش مکہ کی طرف پیغام بھیجا کہ اب وہ مکہ واپس لوٹ جائیں' آگے آنے کی ضرورت نہیں! لیکن ابوجہل نے آگے بڑھنے پر ہی اصرار کیا اور کہنے لگا: بخدا! ہم واپس نہیں لوٹیں گے' ہم ضرور بدر تک جائیں گے' وہاں تین دن ٹھہریں گے۔ ہم اونٹ ذبح کریں گے اور خوب کھانے کھلائیں گے' شراب پلائیں گے' ناچ گانے کی محفلیں جمائیں گے اور عربوں کو جب ہمارے یہاں آنے اور یہاں پر جمع ہونے کی خبر ملے گی تو وہ ہم سے ڈریں گے' پھر وہ کفار آگے بڑھے یہاں تک کہ وادی بدر کے دوسرے کنارے پر قبضہ جما لیا' رسول اللہ ﷺ بھی بدر کے مقام پر پہنچ گئے اور میدانِ بدر کے قریبی چشموں میں سے ایک چشمے کے پاس پڑاؤ کر لیا' اس پر حضرت خباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ نے جس جگہ پر اُترنے کا خیال کیا ہے کیا یہ ایسی جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو پڑاؤ کا حکم دیا ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو ہم یہاں سے نہ آگے چلیں گے نہ پیچھے ہٹیں گے' یا یہ کوئی خفیہ تدبیر' جنگی حربہ یا ذاتی رائے ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ جنگی تدبیر میری رائے اور خفیہ جنگی حربہ ہے' حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! پھر یہ جگہ قیام کے لیے مناسب نہیں' لوگوں کے ساتھ یہاں سے اٹھیے اور قومِ قریش کے نزدیک والے کنوئیں پر پڑاؤ ڈالیں' پھر اس کے علاوہ دیگر سارے کنویں بند کر دیں اور پھر اپنے کنویں پر ایک حوض بنا کر اس میں پانی بھر لیں پھر جب ہم قریش سے جنگ شروع کریں گے تو اس طرح ہم تو پانی پی سکیں گے لیکن دشمن کو پانی نہیں مل سکے گا۔

پھر حضور ﷺ وہاں سے اٹھے اور اُسی مقام پر تشریف لے گئے جہاں کا مشورہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے دیا تھا[1]

---

[1] ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں حضرت خباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی گفتگو والی یہ حدیث ابن اسحاق سے اور انہوں نے قبیلۂ بنو سلمہ کے بعض لوگوں سے روایت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر دوسری تجویز پیش کی کہ یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک چھپر بنادیا جائے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں پر محفوظ رہیں اور جنگ کے بعد یہاں سے محفوظ و مامون واپس مدینہ کے مسلمانوں کی طرف لوٹ جائیں اور تاکہ مدینہ کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مفقود ہونے کا صدمہ نہ اٹھائیں' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا (اور چھپر بنادیا گیا)' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کو اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت سے مطمئن کرنے لگے' یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین پر جگہ جگہ ہاتھ رکھ کر مختلف جگہوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یہ فلاں (مشرک) کی قتل گاہ ہے' یہ فلاں کی قتل گاہ ہے۔

جنگ کے بعد جب دیکھا تو ہر کافر کی لاش اُسی جگہ پڑی تھی جس جگہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک سے نشان دہی فرمائی تھی۔ (رواہ مسلم ج ۶ ص ۱۷۰)

سترہ رمضان المبارک شبِ جمعہ' سرِ شام ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ربِ تعالیٰ کے حضور تضرع سے دعا کرنے لگے:

اے اللہ! یہ قریش جو اپنے فخر اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ساتھ آئے ہیں یہ تیرے دشمن ہیں اور تیرے رسول کو یہ جھٹلاتے ہیں' اے اللہ! جس مدد و نصرت کا تو نے وعدہ کیا ہے وہ نازل فرما اور کل ان کو ہلاک کردے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوں انتہائی خشوع و خضوع اور تضرع سے دعائیں کرتے رہے اور اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرکے عرضِ حال کرتے رہے حتیٰ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور ازراہِ شفقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت مبارک سے لپٹ گئے اور عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کو خوش خبری ہو' قسم بخدا! اللہ تعالیٰ نے جو آپ سے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کی ہے۔ ابن ہشام نے یہ روایت مجہول لوگوں سے کی۔ حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب "الاصابہ" میں اسے عن ابن اسحاق عن یزید بن رومان عن عروۃ بن الزبیر وغیر واحد کی سند سے ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر اپنی روایات اور منقولات میں ثقہ ہیں۔

(دیکھئے: الاصابہ ج ۱ ص ۳۰۲)

پھر دیگر مسلمان بھی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے لگے اور بارگاہِ الٰہی میں استغاثہ پیش کرنے لگے اور نہایت خلوص سے دعائیں کرنے لگے۔[1]

(ابن ہشام ج ا ص ۲۰۵' زاد المعاد ج ۲ ص ۸۷)

۲ ہجری جمعہ کے دن صبح کے وقت جب مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو آپ ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں اٹھائیں اور کفارِ قریش کی جانب رخِ انور کر کے فرمایا: ''شاھت الوجوہ'' (چہرے بگڑ جائیں) پھر وہ کنکریاں ان کی طرف پھینک دیں اور مشرکین کے ہر آدمی کی آنکھیں اُس سے بھر گئیں' اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد و نصرت اُن فرشتوں سے فرمائی جو مسلمانوں کے ساتھ اس جنگ میں پہلو بہ پہلو تھے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے اس جنگ میں مسلمانوں کو فتحِ کبیر عطا فرمائی' اس موقعہ پر ستر مشرک سردار قتل ہوئے اور ستر کافر ہی گرفتار ہوئے' جب کہ مسلمانوں کے چودہ آدمی شہید ہوئے۔

اس جنگ میں ہلاک ہونے والے مشرکوں کی لاشوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا' اُن میں اکثر مکہ کے سرداروں کی لاشیں تھیں' ان سب لاشوں کو ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا' آپ ﷺ اُس گڑھے کے کنارے کھڑے ہو کر مقتولین کو ان کے ناموں اور ان کے باپوں کے ناموں سے یوں پکارنے لگے: اے فلاں! اے فلاں بن فلاں! تم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں کی تو کیا تم آج مسرور ہو؟ بے شک ہمارے ساتھ جو وعدہ ہمارے رب نے کیا تھا ہم نے سچا پایا' کیا تمہارے رب نے جو تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا وہ تم نے سچا پایا؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ ان بے روح جسموں سے کلام فرما رہے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! تم (زندہ لوگ) میری بات کو اُن سے زیادہ نہیں سن رہے (یعنی وہ تم سے زیادہ میری بات کو سن رہے ہیں)۔ (البخاری ج ۵ ص ۸' و روی المسلم نحوہ فی ج ۸ ص ۱۶۳)

حضور اکرم ﷺ نے قیدیوں کے بارے اپنے صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا' حضرت

---

[1] غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ کی اپنے رب سے مدد طلب کرنے والی روایت متفق علیہ ہے۔

[2] غزوۂ بدر میں فرشتوں کے ذریعے اہل ایمان کی مدد والی حدیث متفق علیہ ہے۔ (بخاری و مسلم کی ہے)

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان میں سے ہر قیدی سے فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے' اُس فدیہ کے مال سے مسلمانوں کو تقویت حاصل ہوگی اور ان کو فدیہ کے بدلے آزاد کرنے سے شاید اللہ ان کو ہدایت دے دے اور یہ مسلمان ہو جائیں' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے کیونکہ یہ کفار کے سردار اور بڑے ہیں' اس سے کفار کی طاقت ختم ہو جائے گی' لیکن آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا اور اس کے مطابق فیصلہ فرمایا۔

لہٰذا آپ ﷺ نے اُن سے فدیہ لے کر آزاد کرنے کا حکم دے دیا' لیکن بعد میں جو آیاتِ بینات نازل ہوئیں' اُن میں فدیہ والی رائے پر عتاب کیا گیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے کی تائید کی گئی تھی' اُس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔ (مسلم ج ۵ ص ۱۵۷)

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌO لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌO فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌO (الانفال: ۶۹-۶۷)

نہیں مناسب نبی کے لیے کہ ہوں اس کے پاس جنگی قیدی یہاں تک کہ غلبہ حاصل کر لے زمین میں' تم چاہتے ہو دنیا کا سامان اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے (تمہارے لیے) آخرت اور اللہ تعالیٰ بڑا غالب دانا ہےO اگر نہ ہوتا حکمِ الٰہی پہلے سے (کہ خطاء اجتہادی معاف ہے) تو ضرور پہنچتی تمہیں بوجہ اس کے جو تم نے لیا ہے بڑی سزا' سو کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی ہے حلال (اور) پاکیزہ اور ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہےO

اسباق ونصائح

غزوۂ بدر الکبریٰ بے شمار دروس اور نصائح اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس میں وہ معجزاتِ باہرہ بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اُن

مواقع پر پہنچتی ہے جن موقعوں پر مسلمان اپنے ایمان و یقین کے ساتھ اور اخلاص کے ساتھ دین پر کار بند رہتے ہیں۔

ہم ان اسباق و نصائح کو اختصار کے ساتھ مندرجہ ذیل سطور میں بیان کرتے ہیں:

(۱) غزوۂ بدر کا پہلا سبب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ کی معیت میں مسلمانوں کے نکلنے کا محرک جنگ یا قتال نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ابوسفیان کی زیرنگرانی شام سے آنے والے قریش کے تجارتی قافلے پر قبضہ کیا جائے' جب کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اس کے بندوں کو بہت بڑا مالِ غنیمت اور عظیم فتح و نصرت ملے اور وہ ایسا عمل سرانجام دیں جو زیادہ باعث شرف ہو اور وہ مقصد جسے ایک مسلمان کو اپنی پوری زندگی میں ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے' یہ اس کام سے ملتا جلتا ہو' پس اللہ تعالیٰ نے اس تجارتی قافلے کو اُن سے دور کر دیا جس پر قبضہ کے لیے وہ نکلے تھے' اور اس کے بدلے ایک ایسا لشکر ان کے حوالے کر دیا جس کی انہیں کوئی توقع نہیں تھی۔

اس واقعہ میں دو اُمور کی طرف راہنمائی ہے:

پہلا امر: یہ کہ حربیوں کی عمومی مملوکہ اشیاء مسلمانوں کے لیے غیر محترم اور حلال ہیں' ان کے لیے جائز ہے کہ وہ ان پر قبضہ کرلیں اور جو ہاتھ آئے اسے لے لیں اور ایسی چیزیں ان کی ملکیت ہوں گی' یہ حکم تمام فقہاء کے نزدیک متفقہ ہے' اس وجہ سے کہ وہ مہاجرین جن کو ان کے وطن مکہ سے اور اہل و عیال سے نکالا گیا تھا ان کے لیے قریش کے اس تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے اور اس کو لوٹنے کا ایک اور عذر بھی تھا' وہ یہ کہ یہ مہاجرین اپنا مال و اسباب اور جائیداد جو مکہ چھوڑ آئے تھے اور قریش مکہ نے اُس پر قبضہ کر لیا تھا' اب یہ مہاجرین اپنی لٹی ہوئی دولت کے بدلے میں قریش مکہ کا یہ قافلہ لوٹ سکتے تھے۔

دوسرا امر: مسلمانوں نے جو تجارتی قافلہ لوٹنے کا قصد کیا تھا اگرچہ وہ بھی جائز تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کو اس سے بھی بڑی کامیابی دینے کا ارادہ فرمایا اور ان کو اُس حقیقی امر کی طرف راغب کیا جو ان کی تخلیق کا مقصد تھا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت' اس کے راستے میں جہاد اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے مال اور جان کی قربانی دینا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے قافلے کو تو نجات دی اور اس کے بدلے اللہ تعالیٰ نے قریش کو میدانِ

بدر میں مسلمانوں کے آمنے سامنے لا کر مسلمانوں کو فتحِ عظیم سے نوازا اور قریش کو بدترین شکست سے دوچار کیا' مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسی حقیقت سے روشناس کرایا ہے:

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ O (الانفال: ۷)

اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لیے ہے اور تم پسند کرتے تھے کہ نہتہ گروہ تمہارے حصے میں آئے اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو حق کر دے اپنے ارشادات سے اور کاٹ دے کافروں کی جڑ O

(۲) جب ہم اس واقعہ پر غور کرتے ہیں کہ کس طرح وہ چھوٹا تجارتی قافلہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور پھر ایک بہت بڑے اسلحے سے لیس لشکر کے آنے کی اطلاع ملتی ہے تو اس صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ جس انداز سے اپنے صحابہ سے مشاورت کرتے ہیں' اس سے ہمیں دو قانونی و شرعی راہنمائیاں حاصل ہوتی ہیں جو بڑی اہمیت کی حامل ہیں:

پہلی راہ نمائی: حضور ﷺ کا اپنے صحابہ کرام کے ساتھ مشورہ کرنا' جب ہم آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو دیکھتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر وہ کام جس کے متعلق کلامِ الٰہی میں کوئی واضح نص موجود نہیں ہوتی اور وہ کام یا وہ معاملہ حکمتِ عملی یا غور و تدبر سے متعلق ہو تو آپ ﷺ ایسے معاملات میں صحابہ کرام سے باہمی مشاورت لازمی طور پر اپناتے تھے' اسی وجہ سے جملہ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جن اُمور اور جن معاملات کے متعلق کتاب و سنت میں کوئی نص موجود نہ ہو اُن کے متعلق شوریٰ کا فیصلہ مستقل قانونی حیثیت رکھتا ہے جو قابلِ قبول ہو گا اور شریعت کا جزو ہو گا جس کو کسی صورت میں بھی معمولی نہیں سمجھا جائے گا لیکن جو حکم کتاب و سنت سے ثابت ہو اس کے برعکس شوریٰ کا فیصلہ قبول نہیں اور نہ ہی شوریٰ کو ایسے ثابت شدہ حکم کو کالعدم کر کے اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا فیصلہ کرنے کی اجازت ہے۔

دوسری راہنمائی: جنگی حالات میں' معاہدات میں اور مسلمانوں کے اغیار کے ساتھ صلح کے

معاملات میں سیاست شرعیہ کی پابندی کرنا اس کو حکم الامامہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جہاد کے فرض ہونے کی مشروعیت تو اصل کے اعتبار سے ایک تبلیغی حکم ہے جو کسی صورت میں نہ تبدیل ہو سکتا ہے اور نہ ہی منسوخ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صلح کرنے اور معاہدات کی مشروعیت بھی ثابت ہے جس کا ابطال کرنا یا احکامِ شریعت سے خارج کرنا جائز نہیں' لیکن اس کے علاوہ جو مختلف تطبیقی جزئیات ہیں' ان میں زمان و مکان' مسلمانوں اور کفار کی حالت کو دیکھ کر ان کے مطابق کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے' اس صورت میں فیصلہ کن بات اُس حاکم کی ہوگی جو دین دار' عادل' صاحب بصیرت' سیاسی حکمتِ عملی رکھنے والا اور احکامِ دین میں رسوخ رکھنے والا ہو' اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں سے باہمی مشاورت کرتا ہو اور ان کی مختلف آراء اور خبروں سے استفادہ کرتا ہو۔

اس صورت میں جب مذکورہ شرائط پر پورا اترنے والا حاکم جب یہ کہے کہ مسلمانوں کی بہتری دشمنوں کے ساتھ لڑائی اور جنگ نہ کرنے میں ہے اور یہ بات باہمی مشاورت اور مذاکرہ سے بھی ثابت ہو جائے تو پھر اس صورت میں لڑائی اور جنگ کا راستہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ دشمنوں کے ساتھ کسی طرح صلح اختیار کر لینی چاہیے' لیکن جب حالات مناسب ہوں اور جہاد کے لیے موزوں ہوں اور سیاسی حکمت عملی اور مصلحت بھی موجود ہو تو حاکم کو چاہیے کہ وہ اس صورت میں اپنی رعیت کو جہاد پر اُبھارے اور جنگ کے لیے تیار کرے۔

اس مؤقف پر عامۃ الفقہاء کا اتفاق ہے اور حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے متعدد پہلو بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔

جب کوئی دشمن مسلمانوں کے گھروں اور ان کے شہروں پر حملہ کر دے تو اس صورت میں مسلمانوں پر لازم ہے کہ حالات کیسے ہی ہوں' وہ ہر طریقے اور ہر ذریعے سے دفاع کریں' اس صورتِ حال میں مسلمان مردوں اور عورتوں دونوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے' اس شرط پر کہ جہاد کی ضرورت ہو اور اُن مسلمانوں میں جہاد کے مکلف ہونے کی شرائط بھی پائی جائیں۔

باہمی مشاورت سے فیصلہ کرنے کی صورت میں عامۃ الفقہاء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ مسلم حاکم کے لیے اس شوریٰ کے مشورے اور آراء کو قبول کرنا مشروع اور جائز تو ہے

لیکن لازم نہیں، یعنی حاکم اس مشاورت کو اپنی رائے اور فیصلے کی مضبوطی کے لیے استعمال کرے لیکن اگر اکثر لوگ حاکم کی رائے کی مخالفت کرتے ہیں اور حاکم کو اپنی رائے پر پورا یقین اور شرح صدر ہو تو ان کی آراء کو بعینہ قبول کر لینا اس پر لازم نہیں۔

امام قرطبی اس ضمن میں فرماتے ہیں:

مشورہ طلب کرنے والا جملہ آراء کو دیکھے اور ممکن ہو تو یہ دیکھے کہ اُن آراء میں سے کتاب وسنت کے زیادہ قریب کون سی ہے، پھر جب اللہ تعالیٰ اس کی راہنمائی کسی ایک طرف فرما دے تو اُسی رائے پر پختہ ارادہ کر لے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اس کو نافذ کر دے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۴ ص ۲۵۲)

(۳) کوئی غور وفکر کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب آپ ﷺ نے میدانِ بدر میں مشرکینِ مکہ کے ساتھ جنگ کرنے کے بارے میں صحابہ سے مشورہ طلب کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی طرف سے مثبت جواب آ جانے کے باوجود آپ ﷺ صحابہ کے چہروں کو کیوں دیکھنے لگے؟ یہاں تک کہ جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو اُس وقت آپ ﷺ مطمئن ہوئے اور خوش ہوئے۔

جواب: حضور ﷺ چاہتے تھے کہ وہ اس معاملے میں انصار کی رائے سے بھی مطلع ہوں کیونکہ انصارِ مدینہ سے جو معاہدہ پہلے ہو چکا تھا، اس کے تناظر میں انصارِ مدینہ کو مدینہ سے باہر جنگ یا دفاع کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ میثاقِ مدینہ میں مدینہ کے اندر رہ کر دفاع کرنے کی شق موجود تھی۔ اس لیے آپ ﷺ کے شایانِ شان تھا کہ اُس معاہدے پر قائم رہیں اور انصار بھی اس معاہدے کے مطابق اپنی ہر قربانی پیش کرنے کو تیار رہیں اور انصار کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اس معاہدے کے حقوق کی انجام دہی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں اور اس کی تمام ذمہ داریاں سرانجام دیں۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر جو جواب عرض کیا اُس میں ہم غور وفکر کریں تو پتا چلتا ہے کہ مکۃ المکرمہ میں انصار نے جو بیعت، رسول اللہ ﷺ سے کی وہ بیعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھی، اور اس میں اللہ تعالیٰ سے جو آپ ﷺ کے مدینہ

ہجرت فرمانے کے بعد آپ کے دفاع کا جو وعدہ تھا اسے وہ اللہ کے دین اور شریعت کا ہی دفاع سمجھتے تھے' یہاں پر میثاق مدینہ کی دفعات کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ اہم مسئلہ یہ تھا جو انصار مدینہ نے مندرجہ ذیل آیت کے تحت عظیم مقصد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا عزم اور عہد اللہ تعالیٰ سے کر رکھا تھا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ. (التوبہ:١١١)

یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمان داروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔

اسی حکم کے تحت حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا: تحقیق ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی اور اس پر گواہی دی ہے کہ جو آپ لے کر آئے ہیں وہ حق ہے' پس آپ کر گزریئے جو آپ کا ارادہ ہے ہم آپ کے ساتھ ہیں' یعنی ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے اُس عظیم معاہدہ کے مطابق جو بیعتِ عقبہ میں کیے جانے والے معاہدے سے بھی بڑا ہے۔

(۴) سربراہ کے لیے جائز ہے کہ وہ جہاد میں یا دیگر اہم اُمور میں مخبروں اور جاسوسوں سے مدد حاصل کرے' سربراہ کو چاہیے کہ وہ جاسوسوں کو دشمن کے درمیان بھیجے تاکہ مسلمان ان جاسوسوں کے ذریعے دشمن کی نقل و حرکت' دشمن کے احوال' ان کی تعداد اور ان کے مال و اسباب اور اسلحے سے مطلع ہوں' اس کام کے لیے دیگر ذرائع اور وسائل اپنانا بھی جائز ہیں' بشرطیکہ ان ذرائع کو اپنانے سے اپنا کوئی نقصان نہ ہو' اس مقصد کے لیے جو ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں ان میں دھوکا دینا' حیلہ کرنا اور پوشیدہ طریقے سے معلومات حاصل کرنا بھی شامل ہیں۔ جنگ کے دوران ایسا کرنا جائز ہے اور مستحسن ہے کیونکہ ان ذرائع کو استعمال کرنا مسلمانوں کی مصلحت اور حفاظت کے لیے ضروری ہے۔

کتبِ سیرت میں یہ بات آئی ہے کہ جب حضور ﷺ نے بدر کے قریب پڑاؤ کیا تو اس وقت آپ ﷺ اور آپ کے ساتھ ایک صحابی نے سواری پر سوار ہو کر اردگرد کے اطراف کا جائزہ لیا تو وہاں پر ایک عربی بوڑھے سے ملاقات ہوئی' آپ ﷺ نے اُس سے قریش کے بارے میں بھی پوچھا اور محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب کے متعلق بھی دریافت کیا' اُس عربی باشندے نے کہا: میں اُس وقت تک آپ کو کوئی خبر نہیں دوں گا جب تک آپ دونوں نہیں بتائیں گے کہ آپ دونوں کا تعلق کس سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم ہمیں خبر دو گے تو ہم بھی تمہیں خبر دیں گے' اُس نے کہا: کیا آپ اس کے بدلے وہ خبر دیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں!

پس اُس عربی بوڑھے نے مشرکین کے بارے بھی سب کچھ بتایا اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے اصحاب کے متعلق بھی جو اُس نے سنا تھا وہ سب کچھ بھی بتا دیا' جب وہ اپنے کلام سے فارغ ہوا تو اُس نے پوچھا: اب آپ بتائیں آپ کس طرف ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم پانی سے ہیں' اور پھر اُس عربی بوڑھے سے پلٹ کر دور ہو گئے' تو اس پر وہ عربی بوڑھا کہنے لگا: پانی سے کیا مراد؟ کیا عراق کے پانی سے ہیں؟

(۵) آپ ﷺ کے مختلف تصرفات

صحیح حدیث میں یہ واقعہ آیا ہے کہ جب حضور ﷺ میدانِ بدر میں صحابہ کرام کے ساتھ تشریف لائے تو اُس وقت جس جگہ پر آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا تھا' حضرت خباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے دوسری جگہ پڑاؤ کا مشورہ دیا تو آپ ﷺ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی بتائی ہوئی جگہ پر منتقل ہونے کا حکم دے دیا' اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے بتقاضائے بشریت غور وفکر کر کے جس جگہ کا چناؤ فرمایا' حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق اس کو تبدیل کر دیا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے جملہ تصرفات آئینی و تشریعی نوعیت کے نہیں ہوتے تھے' وہ تصرفات جو تشریعی نوعیت کے نہیں تھے' انہی میں سے ایک "یہ" بھی تھا کہ آپ ﷺ نے میدانِ بدر میں جہاں پڑاؤ کیا' حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں پوچھا کہ کیا یہاں پر پڑاؤ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں! تو پھر حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے دوسری جگہ پڑاؤ کرنے کی رائے

پیش کی جو آپ ﷺ نے پسند فرمائی اور حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی بتائی ہوئی جگہ پر منتقل ہونے کا حکم دے دیا کیونکہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں تھا بلکہ یہ معاملہ سیاسی حکمت عملی میں داخل ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے کئی ایسے تصرفات فرمائے جو نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے نہ تھے بلکہ سربراہِ مملکت اور قائد لشکر ہونے کی حیثیت سے تھے فقہاء نے اس کی بحث تفصیل بیان کی ہے جس کو بیان کرنا یہاں ممکن نہیں۔

(۶) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رو رو کر دعا کرنا اور اُسی سے مدد طلب کرنا

ہم نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو مطمئن کیا تھا کہ فتح و نصرت ہماری ہی ہو گی یہاں تک کہ آپ ﷺ نے میدانِ بدر میں مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ یہ فلاں مشرک کی قتل گاہ ہے یہ فلاں کی ہے۔

اور پھر دوسرے دن ویسے ہی ہوا جیسے کہ آپ ﷺ نے پہلے فرما دیا تھا' جن جن جگہوں کی آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک سے نشان دہی فرمائی تھی بالکل انہی جگہوں پر وہ مشرکین قتل ہو کر گرے' جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

لیکن اس یقین اور اطمینان کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جمعہ کی ساری رات طویل قیام فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کیں' آپ ﷺ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے اور وعدۂ خداوندی کے مطابق فتح و نصرت کی دعا کر رہے تھے حتی کہ اسی اثناء میں آپ ﷺ کی چادر مبارک کندھے مبارک سے نیچے گر گئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' آپ ﷺ پر شفقت کرتے ہوئے آپ ﷺ سے لپٹ کر عرض کرنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ! بس اسی پر اکتفاء فرمائیں بے شک اللہ تعالیٰ آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا فرمائے گا۔

اب یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف آپ ﷺ نہایت درجہ مطمئن ہیں اور یقین کے ساتھ فرماتے ہیں کہ میں ان ان جگہوں پر فلاں فلاں کافر کو قتل ہو کر گرتے دیکھ رہا ہوں اور فتح و نصرت کا بھی یقین دلاتے ہیں جب کہ دوسری طرف ساری رات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہیں اور مدد و نصرت کی طلب کرتے ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: حضور ﷺ کا اطمینان اور فتح و نصرت پر یقین اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنے رسول کے ساتھ فتح ونصرت کا وعدہ فرمایا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بتا دیا ہو کہ میدانِ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوگی۔

لیکن جہاں تک گڑگڑا کر عاجزی وانکساری سے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعائیں کرنے کا تعلق ہے تو یہ وظیفۂ عبودیت ہے جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق فرمایا ہے اور یہی دعا واستغاثہ اور اظہارِ بندگی ہی فتح ونصرت کی کنجی ہے۔

وسائل واسباب خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں لیکن کامیابی وکامرانی تو محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی تائید سے ہی حاصل ہوتی ہے' ہم سے اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ ہم طبعی و اختیاری طور پر اس کے عاجز بندے بن جائیں' کیونکہ انسان صفت عبودیت سے بڑھ کر کسی اور صفت کے ذریعے اپنے خالق ومالک کے قریب نہیں ہو سکتا' انسان اُسی وقت قربِ خداوندی کی منزل تک پہنچتا ہے جب اس کی دعائیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہیں اور دعائیں اُسی وقت قبولیت کا درجہ اختیار کرتی ہیں جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ اظہارِ بندگی کیا جائے۔

اس دنیوی زندگی میں انسان پر جتنی بھی مشکلات اور مصائب آتی ہیں' یہ سب کے سب انسان کو اس کی عبودیت اور بندگی سے آگاہ کرنے کے اسباب وعوامل ہیں' یہ مشکلات اور تکالیف انسان کی فکر اور سوچ کو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرتِ کاملہ کی طرف پھیرتی ہیں تاکہ انسان اپنے خالق ومالک کے سامنے حد درجہ اظہارِ بندگی کرے اور اپنی کمزوری کا اظہار کرے۔ ایسا کرنے سے انسان کی مشکلات اور تکالیف ختم ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت اس کے شاملِ حال ہوتی ہے۔

جب انسان پر اپنی زندگی میں یہ حقیقت آشکارا ہو جائے اور وہ اس عبودیت اور بندگی کے راستے پر چل پڑے اور اپنے آپ کو اس رنگ میں رنگ لے تو پھر انسان ایک نہ ایک دن قرب کی اُس منزل پر فائز ہو جاتا ہے جہاں تک پہنچنے کا اللہ نے اپنے تمام بندوں کو حکم دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قیامِ لیل' گڑگڑا کر دعائیں کرنے' اظہارِ عبودیت اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ کے مطابق مدد ونصرت طلب کرنے کی صورت میں جو اپنی بندگی اور عبودیت کا

مظاہرہ کیا۔یہی وہ قیمت تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُس معرکے میں مسلمانوں کو اپنی مدد ونصرت اور تائید سے نوازا' اور اللہ تعالیٰ نے اس پر ارشاد فرمایا:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ○ (الانفال:۹)

یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اُس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا:) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں○

یہ جو مدد ونصرت نازل ہوئی یقیناً یہ آپ ﷺ کی دعاؤں اور اظہارِ بندگی کی وجہ سے تھا' اسی وجہ سے آپ ﷺ مطمئن تھے کہ یقیناً فتح ونصرت مسلمانوں کی ہی ہوگی' جب ہم اس موقع پر آپ ﷺ کی عاجزی وانکساری اور اظہارِ عبودیت کو دیکھتے ہیں اور ان کی گڑگڑا کر مانگی ہوئی دعاؤں کو دیکھتے ہیں اور پھر اس جنگ کے نتائج کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عاجز بندوں کو فتح ونصرت سے نوازا جب کہ دوسری طرف کفار ومشرکین کے غرور وتکبر اور سرکشی کو دیکھتے ہیں اور پھر نتائج کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ طاغوت وجبروت چاہے بہ ظاہر جتنا بھی طاقت ور ہو بالآخر وہ شکست ہی کھاتا ہے۔ابوجہل نے اس موقع پر اپنی سرکشی اور تکبر کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

ہم ہرگز بدر سے واپس نہیں لوٹیں گے حتیٰ کہ ہم وہاں اونٹ ذبح کریں گے اور خوب کھانے کھلائیں گے' شراب پلائیں گے' ناچ گانے کی محفلیں سجائیں گے' تمام قبائلِ عرب ہمارے بارے میں' ہمارے اس سفر کے بارے میں اور ہمارے یہاں پر جمع ہونے کے بارے میں سنیں گے تو وہ ہم سے ڈرتے رہیں گے۔

لیکن جب ہم نتائج دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ عبودیت اور عاجزی وانکساری کا نتیجہ فتح ونصرت' عزت وسربلندی اور دنیا میں شانِ وشوکت کی صورت میں سامنے آیا جس کے سامنے پوری دنیا جھک گئی۔ جب کہ سرکشی اور غرور وتکبر کا نتیجہ ذلت ورسوائی کی صورت میں یہ ہوا کہ جہاں شراب وکباب اور شباب ومستی کے منصوبے بنے تھے' وہاں ذلت کا مقبرہ بن گیا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے کہ جب عبودیت اور عاجزی وانکساری کا مقابلہ

طغیان و جبروت اور سرکشی سے ہوتا ہے تو فتح و نصرت اور کامیابی عاجزی و انکساری کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

(۷) غزوۂ بدر میں فرشتوں کی امداد

میدانِ بدر میں ایک عظیم معجزہ رونما ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے اور مخلص بندوں کی تائید و نصرت فرمائی' اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتوں کو نازل فرمایا' جنہوں نے مؤمنوں کے ساتھ مل کر جنگ کی' یہ ایسی حقیقت ہے جو کتاب و سنت کے صریح دلائل سے ثابت ہے۔

ابن ہشام روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عریش (چھپر) میں ہی تھے کہ آپ کے سرمبارک کو ایک جنبش ہوئی' پھر آپ بیدار ہوئے اور فرمایا: اے ابوبکر! خوش خبری ہو! تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی مدد آ گئی' یہ جبریل ہیں جو ایک گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور اس گھوڑے کے پاؤں گرد آلود ہیں۔

امام بخاری نے بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے[1]

اللہ تعالیٰ نے جو فرشتوں کو نازل فرما کر مسلمانوں کی مدد و نصرت فرمائی' بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ فرشتوں کے نزول سے مراد فرشتے نہیں بلکہ روحانی امداد یا قوتِ معنویہ یا اسی طرح کی کوئی چیز ہے۔ جب کہ ہم دلائلِ قطعیہ سے اس خیال کا بطلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر فرشتے ہی بہ نفسِ نفیس نازل فرمائے' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تعداد کو مندرجہ ذیل آیت میں ایک ہزار ذکر فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّي مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ○ (الانفال:۹)

پس سن لی اُس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا:) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں○

عدد اور تعداد کے لیے ضروری ہے کہ وہ چیز کمیت رکھتی ہو اور وہ علیحدہ علیحدہ چیز ہو' یہ

[1] بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ جبریل ہیں گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے اور جنگی ساز و سامان سے لیس ہیں۔ (بخاری ج ۵ ص ۱۴)

کمیت اور انفصال (علیحدہ علیحدہ ہونا) تو صرف اور صرف مادی اور محسوس چیزوں میں ہوتا ہے' اس سے پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے جو نزولِ ملائکہ کا ذکر فرمایا ہے تو اس سے مراد واقعۃً فرشتے ہی ہیں جو میدانِ بدر میں نازل ہوئے' اس سے مراد روحانی و معنوی قوت لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

پھر جو فرشتے میدانِ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لیے نازل ہوئے وہ جنگ کے دوران مسلمانوں کے شانہ بشانہ دکھائی دے کر مسلمانوں کے دلوں کو اطمینان دلانے کے لیے تھے' کیونکہ مسلمان پہلی مرتبہ میدانِ جنگ میں اترے تھے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے کا مسلمانوں کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ فرشتے نازل ہوئے اور مسلمانوں کے اردگرد دکھائی دینے لگے جس سے مسلمانوں کو اپنی تعداد دشمن کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ دکھائی دینے لگی' فرشتے اسی مقصد کے لیے نازل ہوئے تھے جب کہ حقیقی مدد و نصرت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے تھی' فرشتوں کا اس فتح میں کوئی ذاتی اثر نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کا ذکر یوں فرمایا:

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ (الانفال:۱۰)	اور نہیں بنایا فرشتوں کے نزول کو اللہ نے مگر ایک خوش خبری اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی طرف سے بے شک اللہ بہت غالب ہے حکمت والا ہے۝

(۸) مرنے والوں کی برزخی زندگی

مشرکین کے مُردوں کو جب ایک کنویں میں پھینک دیا گیا تو آپ ﷺ نے اُس کنویں کی منڈیر پر کھڑے ہو کر اُن مقتولین کو پکارا اور اُن سے بات کی' پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُن مقتولین کے سننے کے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا' تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تم سے بہتر سنتے ہیں۔

یہ ساری بات ایک واضح دلیل ہے کہ میت کی مخصوص روحانی زندگی ہوتی ہے' لیکن ہم اُس روحانی زندگی کی حقیقت اور کیفیت کو نہیں جانتے' اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مُردوں

کی روحیں ان کے جسموں کے اردگرد بھی آتی ہیں' اسی سے ہی ہم عذاب قبر اور انعام قبر کا بھی تصور کر سکتے ہیں لیکن ان چیزوں کے ایسے پیمانے ہیں جن کا اندازہ ہم اپنی عقول اور دنیوی ادراکات سے نہیں کر سکتے' اسی لیے اس کو عالمِ ملکوت کا نام دیا جاتا ہے جو ہمارے عقلی و مادی تجربات اور مشاہدات سے بعید ہے۔

لیکن چونکہ اس بارے میں ہمیں جو خبریں پہنچی ہیں وہ صحیح طریقے سے ثابت ہیں اس لیے ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم اس سب کو تسلیم کرتے ہیں۔

(۹) قیدیوں کا مسئلہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام سے اُن قیدیوں کے بارے مشورہ کیا جو میدانِ بدر میں قید ہوئے تھے' بعض صحابہ کرام نے یہ مشورہ دیا کہ ان سے فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جائے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رائے کو قبول فرما لیا' پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت مبارکہ نازل ہوئی جس میں یہ فدیہ والا حکم اختیار کرنے پر عتاب کیا گیا' ہم اس مسئلہ کے کچھ پہلو یہاں ذکر کرتے ہیں:

اوّل: قیدیوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اجتہاد

اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر اجتہاد فرمایا تھا۔ جمہور علماء اصول بھی یہی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے متعلق اجتہاد فرمایا تھا۔ علماء اصول اسی واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر یہ صحیح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجتہاد کرتے تھے تو اس سے مستنبط ہونے والی یہ بات درست ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی مسئلہ کے بارے اجتہاد کیا کرتے تو اس میں خطا بھی ہو سکتی تھی اور وہ اجتہاد صحیح بھی ہوتا تھا' لیکن خطاء دیرپا نہیں رہتی تھی بلکہ اس کے بعد آیتِ قرآنی نازل ہو جاتی جو اُس اجتہاد کی تصحیح کر دیتی اور اگر اجتہاد کے بعد آیت قرآنی نازل نہ ہوتی تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو اجتہاد ہے یہ اُس حق کے مطابق ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

شارح اللمع کہتے ہیں: آپ کی اجتہادی خطاء جائز تھی لیکن اس پر قائم نہیں رہتے تھے بلکہ جلد ہی اس پر تنبیہ کر دی جاتی تھی۔

ابو اسحاق شیرازی کہتے ہیں: اور ہمارے اصحاب میں سے ایک نے کہا کہ آپ نے

لیے اجتہادی خطا جائز نہیں تھی' لیکن یہ بات غلط ہے کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ. اے نبی! اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے کیوں انہیں رخصت دے دی۔ (التوبہ: ۴۳)

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ سے اجتہادی خطاء سرزد ہو جاتی تھی۔

(شرح اللمع لابی اسحاق الشیرازی ص ۸۲۴)

علامہ اسنوی منہاج پر اپنی شرح میں لکھتے ہیں:

آمدی اور ابن حاجب نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کی اجتہادی خطاء جائز ہے بشرطیکہ آپ اس پر قائم نہ رہیں' یہی بات آمدی نے ہمارے کثیر اصحاب' حنابلہ اور اصحاب حدیث سے نقل کی ہے۔ (الاسنوی علی المنہاج ج ۴ ص ۵۴۷)

امام بیضاوی اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى. (الانفال: ۶۷) نہیں مناسب نبی کے لیے ہوں اس کے پاس جنگی قیدی۔

یہ آیت مبارکہ اس بات پر دلیل ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اجتہاد کرتے ہیں اور اگر اس میں خطاء ہو تو اُس حکم پر وہ قائم نہیں رہتے۔

بعض لوگ اس خطاء کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہوئے خیال کرتے ہیں کہ یہ اجتہادی خطاء گناہ ہے یا انحراف ہے یا اسی طرح کی کوئی چیز ہے جو عصمتِ انبیاء کے منافی ہے۔ جب کہ ایسی بات نہیں ہے' یہاں پر خطاء (اجتہادی خطاء) سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اجتہاد اُس کمال کے مطابق نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ثابت ہے اور یہ بات عصمتِ انبیاء کے منافی نہیں' بلکہ جو اجتہادی خطاء ہوتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلد ہی اس کی تصحیح ہو جاتی ' کیونکہ تمام لوگ آپ ﷺ کی ہر حال میں اور ہر حکم میں اتباع کرنے کے مکلف ہیں' اس لیے آپ ﷺ کی طرف سے جاری کردہ وہ احکامات جو آپ ﷺ نے اجتہادی رائے سے قائم فرمائے' اگر ان کے بعد کوئی آیت نازل نہ ہوئی ہو تو ان احکام پر بھی عمل کرنے کے سب لوگ مکلف ہیں' معلوم ہوا کہ آپ ﷺ جو بھی اجتہاد کرتے جس کے بارے کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو' اس کے دو پہلو ہوتے ہیں' ایک پہلو تو لوگوں سے متعلقہ ہے

اور دوسرے پہلو کا تعلق اللہ تعالیٰ کے علم سے موافقت کے ساتھ ہے۔

آپ ﷺ کے اجتہاد کا جو پہلو لوگوں کے لیے ہے، اس میں خطاء سرے سے ہی نہیں کیونکہ تمام لوگ آپ ﷺ کے ہر حکم کی اتباع کرنے کے مکلف ہیں جس طرح آپ کے بعد آنے والے مجتہدین کی اتباع کے مکلف ہیں، اس لیے کہ ان کے پاس ایسا کوئی راستہ نہیں کہ وہ جان سکیں کہ آیا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے خفی علم میں ثابت ہے یا نہیں، جب کہ آپ ﷺ کے اجتہاد کا دوسرا پہلو جو اللہ تعالیٰ کے علم سے متعلق ہے، اس لحاظ سے اس میں صحت اور خطاء دونوں صفتیں ہو سکتی ہیں کہ کیا یہ اجتہاد اللہ تعالیٰ کے علمِ کمال کے مطابق و موافق ہے یا نہیں، کیونکہ کمالِ مطلق تو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ آپ ﷺ کمال کے مدارج طے کرتے رہتے تھے، جو مدارجِ کمال آپ طے کر چکے تھے وہ بعد میں آنے والے مراحل کے مقابلے میں ناقص اور کم تر معلوم ہوتے تھے، اور آپ ﷺ اس دوران ہر التباس اور شک سے بھی استغفار کرتے، جس طرح ہم اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔

آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

میرے دل پر غبار چھا جاتا ہے، پس میں ہر دن اور ہر رات میں ستر مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔

ثانی: مسلمان جو اُس وقت کمزور اور ضعیف تھے اور ان کی تعداد بھی کم تھی، اس صورتِ حال میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان کا جنگ کرنا اور جان و مال کی قربانی پیش کرنے کا پہلا تجربہ تھا، اس طرح یہ بھی ان کے لیے پہلا تجربہ تھا کہ انہوں نے طویل فقر و فاقہ اور غربت کے بعد جنگ کے اختتام پر کثیر مالِ غنیمت کو اپنی آنکھوں کے سامنے پایا۔

کمزوری و ضعف کے باوجود جب وہ میدانِ بدر میں جنگ کے لیے آئے تو حکمتِ الٰہیہ نے مختلف خوارق کے ذریعے مدد و نصرت نازل فرما کر ان کے دلوں کو اطمینان بخشا، اور پھر فقر و فاقہ کے بعد جنگ کے اختتام پر جب انہوں نے مالِ غنیمت پایا تو اس کا علاج بھی حکمتِ الٰہیہ نے اپنے احکامات نازل فرما کر بروقت دقیق تربیتی وسائل کے ذریعے فرمایا۔

اس تجربے کا اثر اس غزوہ کے بعد دو مواقع پر ظاہر ہوا۔

پہلا موقع: جب مشرکین کو شکست ہوئی اور وہ اپنے مال و اسباب پیچھے چھوڑ کر بھاگے تو بعض

مسلمان اُن اموال و اسباب پر قبضہ کرنے کے لیے بھاگے تو اس صورتِ حال میں بعض کا بعض سے ان اموال و اسباب کے استحقاق پر اختلاف ہو گیا اور اس صورتِ حال میں وہ جھگڑنے لگے' کیونکہ ابھی تک مالِ غنیمت کی تقسیم کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ مسلمان آپ ﷺ سے اس تقسیم کے متعلق مختلف سوالات کرنے لگے اور اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کروانے کے لیے حاضر ہوئے۔

اُس وقت یہ آیاتِ بینات نازل ہوئیں:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۝ (الانفال: ۲۔۱)	دریافت کرتے ہیں آپ سے غنیمتوں کے متعلق' آپ فرمایئے: غنیمتوں کے مالک اللہ اور رسول ہیں' پس ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور اصلاح کرو اپنے باہمی معاملات کی اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اگر تم ایمان دار ہو۝ صرف وہی سچے ایمان دار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیتیں تو یہ بڑھا دیتی ہیں ان کے ایمان کو اور صرف اپنے رب پر وہ بھروسا رکھتے ہیں۝

ان دونوں آیات میں ان کے سوالات کے جوابات نہیں ذکر کیے گئے بلکہ ان میں ان کے موضوع کو ہی بدل دیا گیا ہے' اُن سے کہا گیا ہے کہ یہ انفال (مالِ غنیمت) اُن میں سے کسی کے نہیں بلکہ یہ سب اللہ اور اس کے رسول کی ملکیت ہیں' جب کہ اُن سوال کرنے والے مسلمانوں کو اپنی اصلاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے' اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات اور اوامر کی پیروی اور ان کے نواہی سے رکنے کا حکم دیا گیا ہے' کیونکہ یہی ان کا اصل وظیفۂ زندگی ہے۔ مال و دولت اور دنیا کے بارے میں ان کو اللہ تعالیٰ پر ہی اعتماد کرنا

چاہیے۔ جب ان آیات میں مسلمانوں کو مالِ غنیمت کی تقسیم کے باہمی جھگڑوں کو ختم کرنے کا حکم دیا تو مسلمانوں نے ان آیات سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے ان اختلافات سے اپنی توجہ ہٹالی تو پھر اس کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم کے احکامات نازل ہوئے' اس کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان اپنی زیادہ توجہ اطاعت و اتباع کی طرف رکھیں' مال کی تقسیم کے جھگڑوں میں اُلجھیں ہی نہ' جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی تربیت کا بہترین اور دقیق طریقہ تھا۔

دوسرا موقع: یہ وہ وقت ہے جب حضور ﷺ نے صحابہ کرام کے ساتھ ان قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا تو زیادہ تر صحابہ کرام کا یہی خیال تھا کہ فدیہ کے بدلے ان کو چھوڑ دیا جائے' اس میں دو باتیں تھیں' ایک یہ کہ قیدیوں پر رحم و شفقت کرتے ہوئے ان کو چھوڑنے کا کہا گیا تاکہ شاید وہ بعد میں ایمان و اسلام کی طرف راغب ہو جائیں' اور دوسری بات یہ تھی کہ مہاجرین اپنا جو مال مکہ چھوڑ کر آئے تھے اس کے بدلے کچھ مال ان قیدیوں کے فدیہ کی صورت میں حاصل ہو جائے' جس سے ان مہاجرین کی معاشی حالت کچھ بہتر ہو سکے۔

حضور ﷺ نے بھی صحابہ کرام پر شفقت کرتے ہوئے اس رائے کو پسند فرمایا کہ فدیہ لے کر ان قیدیوں کو چھوڑ دیتے ہیں' آپ ﷺ کی صحابہ کے ساتھ شفقت کا پتا اُس دعا سے بھی چلتا ہے جو آپ ﷺ نے میدانِ بدر کی طرف نکلتے وقت صحابہ کے فقر و فاقہ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنے رب تعالیٰ سے مانگی' آپ ﷺ نے اُس وقت یہ دعا مانگی:

اے اللہ! یہ پیدل چل رہے ہیں ان کو سواری پر سوار کر' ان کے بدنوں پر کپڑے نہیں ان کو لباس عطا فرما' یہ بھوکے ہیں انہیں آسودگی عطا فرما۔ (ابوداؤد عن جمع الفوائد ج ۲ ص ۹۰)

حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان اپنے ان معاملات میں جو خالصۃً دینی نقطۂ نظر کی بنیاد پر قائم ہیں' ان دینی معاملات میں کوئی فیصلہ کرنے کے لیے مال و دولت کے نظریہ کو مکمل طور پر یا جزئی طور پر پیمانہ نہ بنائیں' خواہ حالات کتنے ہی سخت اور مشکل ہوں' کیونکہ قریب تھا کہ اگر اس نوعیت کے اوّلین تجربے میں ان کو یہ مادی نظریہ اختیار کرنے کی آزادی دے دی جاتی تو یہ مادی نظریہ ایک عام قاعدہ کی حیثیت اختیار کر لیتا' اور مادی نقطۂ نظر غالب آ جاتا حالانکہ ان احکامِ دینیہ کو اتنا بلند ہونا چاہیے کہ دنیاوی اغراض و مقاصد میں سے کوئی چیز ان

تک رسائی نہ حاصل کر سکے' کیونکہ جو شخص دنیا کے پیچھے چند قدم چلے اور اس کا ذائقہ چکھ لے تو ایسی چیز کو چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔

امام مسلم نے روایت کیا ہے:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قیدیوں سے فدیہ لینے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور رو رہے تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے بتائیں کس چیز کی وجہ سے آپ اور آپ کے صاحب (ابوبکر) رو رہے ہیں؟ تاکہ اگر میں رو سکوں تو آپ کے ساتھ مل کر میں بھی روؤں اور اگر مجھے رونا نہ آئے تو کم از کم آپ دونوں کی اتباع کرتے ہوئے رونے والی شکل بنا لوں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیرے دوستوں نے فدیہ لینے کا جو مشورہ دیا تھا' میں اس کے لیے رو رہا ہوں اس رائے کے باعث جو عذاب انہیں دیا جانے والا تھا' وہ اس درخت سے بھی نزدیک تر میرے سامنے پیش کیا گیا۔ ایک درخت جو آپ ﷺ کے قریب ہی تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیاتِ مبارکہ نازل فرمائی تھیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ○ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ○ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا.

(الانفال: ۶۹-۶۷)

نہیں مناسب نبی کے لیے کہ ہوں اس کے پاس جنگی قیدی یہاں تک کہ غلبہ حاصل کر لے زمین میں' تم چاہتے ہو دنیا کا سامان اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے (تمہارے لیے) آخرت اور اللہ تعالیٰ بڑا غالب (اور) دانا ہے○ اگر نہ ہوتا حکمِ الٰہی پہلے سے (کہ خطاء اجتہادی معاف ہے) تو ضرور پہنچتی تمہیں بوجہ اس کے جو تم نے لیا ہے بڑی سزا' سو کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی ہے حلال (اور) پاکیزہ۔

(صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۵۸)

بنوقینقاع اور مسلمانوں کے ساتھ پہلی یہودی خیانت

ابن اسحاق کہتے ہیں: بنوقینقاع کا معاملہ یہ تھا کہ جب انہوں نے کھلم کھلا معاہدے کو کالعدم کہنے کی باتیں شروع کر دیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روز ان کے بازار میں تشریف لے گئے اور ان سب کو قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور ان کو فرمایا: اے گروہِ یہود! اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرو! کہیں تم پر بھی ویسے ہی سزا نازل نہ کر دے جیسی سزا اُس نے مکہ کے قریش پر نازل کی' اسلام قبول کر لو! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہوں' یہ بات تم اپنی کتاب تورات میں بھی پاتے ہو اور اس بارے میں تمہارا اللہ سے عہد بھی ہے۔

یہ سن کر انہوں نے جواب دیا:

اے محمد! (فداہ ابی وامی) تم خیال کرتے ہو کہ ہم بھی تمہاری قوم کی طرح ہیں؟ آپ نے اُس قوم کو شکست دے کر فتح و نصرت حاصل کی ہے جس قوم کو فنِ حرب کا کوئی علم نہ تھا' اس سے دھوکے میں نہ پڑو! اگر تم نے ہم سے جنگ کی تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔

یہودیوں نے اس طرح کرخت لہجے میں جواب دیا اور پھر اس کے بعد ایک واقعہ پیش آیا جس سے غزوۂ بنی قینقاع کی ابتداء ہوئی۔

حضرت ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ نواحی گاؤں کی ایک عرب (مسلم) خاتون اپنی کچھ چیزیں[1] فروخت کرنے کے لیے بنوقینقاع کے بازار میں آئی' اس نے اپنا سامان بیچا اور ایک رنگ ساز کی دکان پر آ بیٹھی' یہود نے باتوں باتوں میں بڑی کوشش کی کہ وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹائے لیکن اُس مسلم خاتون نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا' رنگ ساز اٹھا اور اس کے کپڑوں کا ایک گوشہ پکڑ کر اس کی پیٹھ کے ساتھ گرہ لگا دی' جب وہ اٹھی تو اس کا ستر ننگا ہو گیا' یہ دیکھ کر وہ یہودی قہقہہ لگانے لگے' اس خاتون نے بلند آواز سے فریاد کی اور شور مچایا' یہ سن کر ایک مسلمان اُس یہودی پر جھپٹا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس بازار کے سارے یہودی جمع ہو کر اُس مسلمان پر تشدد کرنے لگے اور اسے شہید کر دیا' اس پر مسلمان

---

[1] عربی روایت میں "جلب" کا لفظ آیا ہے' جس کا معنی ہے: وہ سامان جسے بیچنے کے لیے بازار لے جایا جائے۔

کے اقرباء نے یہودیوں کے خلاف فریاد کی جس پر سب مسلمان غضب ناک ہو گئے اور اس طرح مسلمانوں اور بنو قینقاع کے درمیان ہنگامہ کھڑا ہو گیا' وہ یہودی ہی تھے جنہوں نے پہلے رسول اللہ ﷺ سے کیے ہوئے معاہدے کو توڑا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۷)

طبری اور واقدی نے روایت کیا ہے کہ یہ غزوہ وسط شوال ۲ ہجری میں ہوا۔

(الطبری ج ۲ ص ۴۸۰' طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۶۷)

پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک مدت تک یہودیوں کا محاصرہ کر لیا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے فیصلہ کے لیے حضور ﷺ کو اپنا حکم تسلیم کر لیا لیکن عبداللہ بن ابی ابن سلول (منافق) آیا اور آپ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر کہنے لگا:

اے محمد ﷺ! میرے حلیفوں کے ساتھ اچھا معاملہ کیجئے' (کیونکہ یہ سب قبیلہ بنو خزرج کے حلیف تھے) یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے اس کی طرف کوئی التفات نہ فرمایا' اُس نے یہ سوال دوسری مرتبہ دہرایا لیکن آپ ﷺ نے اپنا چہرۂ اقدس اُس سے موڑ لیا۔ اُس نے آپ ﷺ کی زرہ رکھنے کی جگہ پر ہاتھ ڈالا اور پکڑ لیا' آپ ﷺ نے اسے فرمایا: مجھے چھوڑ دو! اور اس کے اس رویہ پر آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر غصہ کے آثار ظاہر ہوئے۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: تیرا بُرا ہو! مجھے چھوڑ دو! وہ کہنے لگا: نہیں! خدا کی قسم! میں آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ آپ میرے موالی پر احسان کریں۔ یہ چار سو غیر زرہ پوش اور تین سو زرہ پوش ایسے ہیں جنہوں نے ہر سرخ اور سیاہ انسان سے میری حفاظت کی' آپ ایک ہی دن میں ان سب کی گردنیں اُڑا دیں گے؟ بے شک اس کے نتیجے میں آپ پر آنے والی مصیبتوں اور حوادثِ زمانہ سے میں ڈرتا ہوں' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جا! میں نے تیری خاطر ان کی جان بخشی کر دی' پھر آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ سب مدینہ سے نکل جائیں۔

پس وہ سب وہاں سے نکل کر ملک شام کے علاقے اذرعات نامی بستی میں چلے گئے اور ان میں سے اکثر لوگ اپنی بقیہ زندگی وہیں گزار کر وہیں ہلاک ہوئے۔

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بھی عبداللہ بن ابی کی طرح بنو قینقاع کے حلیف تھے' لیکن آپ رضی اللہ عنہ یہودیوں کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں یہ کہتے

ہوئے حاضر ہوئے: میں اللہ کو اس کے رسول کو اور مومنوں کو اپنا ولی (حلیف) بنانے کا اعلان کرتا ہوں اور ان کفار کے معاہدے اور ولایت سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ابی کے بارے میں ہی یہ آیاتِ مبارکہ نازل ہوئیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ○ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ○ (المائدہ: ۵۲_۵۱)

اے ایمان والو! نہ بناؤ یہود اور نصاریٰ کو (اپنا) دوست (و مددگار) وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے دوست بنایا انہیں تم میں سے سو وہ انہیں میں سے ہے بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو○ سو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے کہ وہ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں یہود و نصاریٰ کی طرف' کہتے ہیں: ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے' وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ (تمہیں) دے دے فتح کامل یا (ظاہر کر دے کامیابی کی) کوئی بات اپنی طرف سے تو پھر ہو جائیں گے اس سے جو انہوں نے چھپا رکھا تھا اپنے دلوں میں نادم○

اسباق ونصائح

بحیثیتِ مجموعی اس واقعہ سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ بدعہدی' غدر اور خیانت کرنا شروع سے ہی یہودیوں کی فطرت وطبیعت میں شامل ہے' یہ جس قوم کے ساتھ ہی پڑوس میں اکٹھے رہے ہیں انہوں نے ہر موقع پر شرانگیزی' وعدہ خلافی اور مکر وفریب کا ہی مظاہرہ کیا ہے' یہ اپنے جمیع وسائل واسباب بھی اسی غدر اور وعدہ خلافی میں استعمال کرنے کی

پوری استعداد رکھتے ہیں۔ بنوقینقاع کے ساتھ رونما ہونے والے حادثے سے جو اسباق و دروس حاصل ہوتے ہیں' ہم یہاں پر اجمالاً ان کا ذکر کرتے ہیں:

اوّل: مسلمان عورت کا حجاب

ہم نے دیکھا کہ بنوقینقاع کے ساتھ جو نزاع کا واقعہ پیش آیا اس کا اصل سبب یہ تھا کہ ایک عربی مسلمان عورت گردونواح سے خرید وفروخت کے سلسلے میں بنوقینقاع کے بازار میں آئی' جس نے مکمل طور پر پردہ کیا ہوا تھا' ایک یہودی نے اس عورت کو بے پردہ کر دیا' جس وجہ سے بنوقینقاع کے ساتھ بالآخر جنگ کا واقعہ پیش آیا' جنگ کا یہ سبب ابن ہشام نے روایت کیا ہے' جب کہ دوسرے علماء سیرت نے دوسرا سبب بیان کیا ہے' وہ یہ کہ جب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے میدانِ بدر میں فتح ونصرت سے نوازا تو اس پر یہود حقد وحسد کرنے لگے اور چیلنج کرتے ہوئے کہنے لگے: بخدا! اگر تم نے ہم سے جنگ کی تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ ہم کس قسم کے جنگ جو لوگ ہیں۔

ان دونوں اسباب میں کوئی تضاد نہیں۔

زیادہ غالب یہی بات ہے کہ یہ دونوں اسباب اکٹھے ہی واقع ہوئے تھے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کا معاون ثابت ہوا جس سے بالآخر لڑائی کی نوبت آ پہنچی۔

غزوۂ بدر کے بعد یہودیوں نے جو غلیظ زبان استعمال کی' اس کی بنیاد پر یہ بات بعید تھی کہ رسول اللہ ﷺ اُن سے معاہدہ کو توڑ دیں حالانکہ یہودیوں نے اس عہد کو توڑنے کا عندیہ دے دیا تھا۔

لیکن ابن ہشام کی روایت کے مطابق جب یہودیوں نے مسلمان عورت کو بے پردہ کرنے والے واقعہ میں ایک مسلمان کو شہید کر دیا تو اب یہودیوں نے عملاً اس معاہدہ کو توڑ ڈالا' لہٰذا اب یہودیوں کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

اس واقعہ سے جو اہم بات سامنے آتی ہے' وہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے عورت کے لیے جو حجاب مشروع کیا ہے اس میں پورے چہرے کا پردہ کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ اگر یہ حکم نہ ہوتا تو پھر عورت کو چہرہ ڈھانپنے کی کوئی ضرورت نہ تھی' اسی طرح اگر شریعتِ اسلامیہ نے تاکیداً چہرہ ڈھانپنے کا حکم نہ دیا ہوتا تو وہ عورت چہرہ ننگا کر کے آتی جس پر وہ یہودی اُس

عورت کو چہرہ ننگا کرنے کے بارے میں نہ کہتا' وہ عورت چونکہ حکم شریعت کے مطابق اپنا چہرہ ڈھانپ کر آئی' جس پر یہودی نے اُس عورت کے دینی شعور پر اس کو غضب ناک کرنے کے لیے اپنی گھٹیا حرکت کا مظاہرہ کیا۔

ممکن ہے یہاں ایک بات یہ بھی کہی جائے کہ ابن ہشام نے جو یہ روایت نقل کی ہے' اس میں وہ اکیلے ہیں اور کسی دوسرے راوی نے یہ روایت نقل نہیں کی اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت میں کچھ کمزوری بھی ہے' جس کی بنیاد پر اس قسم کے حکم پر اس کی دلالت قوی نہ ہو گی' لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس واقعہ کے علاوہ بے شمار دوسری احادیث طیبات ایسی موجود ہیں اور ان میں کوئی طعن والی بات بھی نہیں ہے۔

ان روایات میں سے ایک روایت وہ ہے جسے امام بخاری نے اپنی کتاب ''صحیح بخاری'' کے باب ''ما یلبس المحرم من الثیاب'' میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے' آپ فرماتی ہیں:

عورت نہ چہرہ ڈھانپے گی' نہ برقع اوڑھے گی اور نہ ہی ورس اور زعفران میں رنگے ہوئے کپڑے پہنے گی۔ (صحیح بخاری ج ۳ ص ۱۴۶)

اسی طرح کی ایک روایت امام مالک علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب ''موطاً'' میں حضرت نافع سے نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: احرام والی عورت نہ چہرے پر نقاب کرے اور نہ ہی دستانے پہنے۔ (موطاً ج ۱ ص ۳۲۸)

ان احادیثِ طیبات میں حج کے دوران احرام کی حالت میں عورت کو چہرے پر نقاب ڈالنے اور چہرہ پر برقع اوڑھنے سے کیوں منع کیا جا رہا ہے؟ اور یہ نہی (منع کرنا) مردوں کی بجائے خاص عورتوں کے لیے ہی کیوں ہے؟

احرام کی حالت میں عورت کو نقاب کرنے' چہرہ ڈھانپنے' چہرے پر برقع اوڑھنے سے جو منع کیا گیا ہے' اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ احرام کے علاوہ عورت کو شریعتِ اسلامیہ نے عام حالات میں چہرے پر نقاب اوڑھنے' چہرہ ڈھانپنے اور برقع اوڑھنے کا حکم دیا ہے' جس کی بناء پر حج کے دوران اس حکم سے عورت کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔

اسی موضوع کی ایک روایت امام مسلم نے نقل کی ہے کہ جب فاطمہ بنت قیس کو ان کے

خاوند نے طلاق دے دی تو اس طلاق کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ بنت قیس کو حکم دیا کہ وہ اپنی عدت کی مدت اُمِ شریک کے گھر میں گزاریں' پھر آپ ﷺ نے پیغام بھیجا کہ چونکہ اُمِ شریک کے گھر صحابہ کرام کا آنا جانا رہتا ہے' لہٰذا تم اپنی عدت کی مدت اپنے چچا کے بیٹے ابن اُمِ مکتوم کے گھر میں گزارو! کیونکہ اُمِ مکتوم بصارت سے محروم ہیں تو وہاں رہتے ہوئے اگر کبھی تم اپنی چادر اتار دو گی تو وہ تمہیں دیکھ نہیں سکیں گے۔

مذکورہ بالا احادیثِ طیبات جو پردہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں' ان دلائل کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ اجنبی مردوں کے سامنے اپنا چہرہ اور جسم ڈھانپنا عورت پر واجب ہے۔

اس ضمن میں رہی یہ بات کہ شریعتِ اسلامیہ نے اجنبی عورتوں پر نظر ڈالنا مردوں پر حرام قرار دیا ہے' اس بارے میں بھی متعدد احادیثِ طیبات وارد ہوئی ہیں۔

مثلاً امام احمد' ابوداؤد اور امام ترمذی نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے' وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو فرمایا: اے علی! کسی عورت پر ایک نگاہ پڑ جانے کے بعد دوسری نگاہ نہ ڈال کیونکہ پہلی نگاہ کی تمہارے لیے رخصت ہے' دوسری نگاہ کی تمہارے لیے رخصت نہیں ہے۔

اسی موضوع کی ایک حدیثِ طیبہ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ یومِ نحر میں سواری پر فضل بن العباس کو اپنے پیچھے بٹھائے ہوئے تھے کہ فضل ایک عورت کی طرف بار بار دیکھنے لگے تو آپ ﷺ نے فضل کی ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ موڑا اور عورت کی طرف دیکھنے سے روکا۔

آپ نے دیکھا کہ ان احادیثِ طیبات میں دو ممانعتیں جمع ہو گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اجنبی مردوں کے سامنے عورت کو اپنا چہرہ ننگا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور چہرہ ڈھانپنے کا حکم دیا گیا ہے اور دوسری یہ کہ مردوں کو بھی اجنبی عورتوں کے چہرے پر نگاہ ڈالنے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ مکمل طور پر اور واضح دلیل ہے کہ اجنبی مردوں کے حق میں عورت کا چہرہ بھی ستر ہے اور اجنبی مردوں کے سامنے عورت پر واجب ہے کہ وہ اپنا چہرہ بھی ڈھانپے' لیکن چند صورتوں میں چہرہ ننگا کرنے کی اجازت ہے مثلاً علاج کروانے' علم حاصل کرنے اور گواہی دینے اور اس کے علاوہ اشد ضرورت کے پیشِ نظر' ان سب صورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

بعض ائمۂ مذاہب نے کہا ہے کہ عورت کا چہرہ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں پردے میں شامل نہیں' لہٰذا ان کا ڈھانپنا واجب نہیں مذکورہ احادیث طیبات سے استدلال کرتے ہوئے (جو مفہومِ مخالف پر دال ہیں) اس کو وجوب کی بجائے استحباب پر محمول کیا ہے' یعنی ان کے نزدیک چہرے اور ہاتھوں کا پردہ کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔

جب کہ ان چند ائمہ کے علاوہ دیگر جمیع فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ شہوت کے ساتھ عورت کے جسم کے کسی حصے پر بھی نظر ڈالنا جائز نہیں اور یہ کہ جب فسق و فجور عام ہو جائے اور اکثر لوگ گناہ کے ارادے سے اور شہوت کے ساتھ عورتوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیں تو اس صورتِ حال میں عورت کو اپنا چہرہ ڈھانپنا بھی واجب ہے۔

آج مسلمانوں کی حالت پر غور و فکر کریں تو پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں میں فسق و فجور' بداخلاقی اور تربیت کا فقدان اس قدر ہے کہ ان بُرے حالات میں عورتوں کے لیے چہرہ ننگا کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہ پرخطر اور انحطاط کا دور جس سے آج اسلامی معاشرہ گزر رہا ہے' اس کا تقاضا ہے کہ عورت اپنی سلامتی اور تحفظ کے لیے چلنے پھرنے میں مزید احتیاط سے کام لے اور اس کے لیے مزید مناسب وسائل اپنانے کی پوری کوشش کرے' یہاں تک کہ مسلمان ان خطرات سے پار گزر جائیں اور اپنے معاملات کو خود نپٹانے اور بحرانوں کو خود حل کرنے پر قدرت حاصل کر لیں۔

مختصر الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ دینی معاملات میں رخصتیں اور تسہیلات کی پیروی کرتے ہیں' ان کے قدم راہِ اعتدال سے پھسل جاتے ہیں اور وہ اصل واجبات و فرائض کی پرواہ نہیں کرتے' ان رخصتوں پر اس وقت تک عمل ممکن نہیں جب تک کہ معاشرے میں اجتماعی دینی ماحول نہ ہو جو ان رخصتوں کو عام اسلامی طریقہ کے مطابق کنٹرول کرے اور ان کو مشروع حدود سے تجاوز کرنے سے محفوظ رکھے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بعض لوگ جو ان رخصتوں اور سہولتوں کے خواہاں ہیں' وہ اس کو یوں بیان کرتے ہیں: زمانہ کے بدلنے سے احکام بدلتے ہیں۔ یہ لوگ اس قاعدہ سے مراد صرف تخفیف' تسہیل اور فرائض و واجبات سے پہلوتہی اختیار کرنا ہی لیتے ہیں لیکن جب معاملہ اس کے برعکس ہو تو ان کو اس قاعدے کا اطلاق کرنا یاد نہیں رہتا۔ ہمارے پاس کوئی

ایسی مثال نہیں کہ جس میں انہوں نے کہا ہو کہ زمانہ بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں' لہٰذا اب حالات کا تقاضا اور ضرورت یہ ہے کہ عورت ضرور اپنا چہرہ ڈھانپے' لغزشوں اور برائیوں کے امکانات کے پیش نظر ضروری ہے کہ عورت چلنے پھرنے میں مزید احتیاط سے کام لے' اور اپنا ہر قدم دیکھ کر اٹھائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مطلوب اسلامی معاشرے مہیا فرما دے۔

دوم: بنوقینقاع کے یہودیوں کی طرف سے جو حادثہ پیش آیا' یہ حادثہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہودیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف حسد اور حقد کے جذبات پوشیدہ تھے' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بُرے جذبات کا اظہار وانکشاف تقریباً تین سالوں کے بعد ہی کیوں ہوا اور یہود کیوں ان بُرے جذبات کو اپنے اندر دفن کیے ہوئے تھے اور کیوں اپنی اس سازش کو چھپائے رکھا؟

جواب: جب مسلمانوں کو میدانِ بدر میں اللہ تعالیٰ نے فتح ونصرت سے نوازا تو اس واقعہ کو دیکھ کر یہودی مزید آگ بگولا ہوئے اور اس طرح ان کے دلوں میں حسد اور کینہ کے جو جذبات پوشیدہ تھے وہ کھل کر سامنے آ گئے' اور یہودیوں نے برملا اس کا اظہار کیا کیونکہ یہودی مسلمانوں کے بارے میں ایسی فتح ونصرت کی توقع نہیں رکھتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے میدانِ بدر میں ان کو عطا فرمائی' اس لیے یہ دیکھ کر یہودیوں کے سینے مزید تنگ ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اس اقدام سے اپنے اندر پائے جانے والے حسد اور کینہ کا کھلم کھلا عملی اظہار کر دیا بلکہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح ونصرت کے بعد سے ہی ان کی باتوں اور ان کے تبصروں سے مسلمانوں کے خلاف ان کی نفرت اور بغض کا اظہار ہونے لگا تھا۔

ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ جب مسلمان غزوۂ بدر میں کامیابی کے بعد مدینۃ المنورہ واپس لوٹے تو مدینہ کے یہودی مالک بن الصیف نے بعض مسلمانوں کو یوں کہا: کیا تم اس بات پر غلط فہمی کا شکار ہو کہ تم نے قریش پر فتح حاصل کی ہے جو جنگ وجدال جانتے ہی نہیں؟ اگر ہمیں اس طرح کا معاملہ درپیش ہوا تو ہم اس پر پختہ عزم کر کے ایسی لڑائی کریں گے کہ تمہیں ہمارے ساتھ لڑائی میں کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

اگر یہودی اُس معاہدے اور میثاق کا احترام کرتے جو ان کے اور مسلمانوں کے

درمیان طے پایا تھا تو وہ مسلمانوں میں سے اُن کے بارے میں کوئی بُری بات نہ کہتے اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی اقدام کرتے لیکن یہود نے خود شر کا راستہ اختیار کیا' جس کا خمیازہ انہیں خود بھگتنا پڑا۔

سوم: دین اسلام میں منافق کا معاملہ

اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد عبداللہ بن ابی (منافق) نے جس شکل میں یہودیوں کا دفاع کیا' اس ساری صورتِ حال سے اُس منافق کا نفاق چھپا نہیں رہا بلکہ اس کی منافقت سب پر عیاں ہوگئی کہ اس شخص نے بناوٹی طور پر محض دکھاوا کرتے ہوئے اسلام قبول کر رکھا ہے' جب کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ بغض اور عناد پوشیدہ تھا۔

لیکن پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے اُس کے ساتھ بحیثیت ایک مسلمان ہی معاملہ فرمایا' اُس نے یہودیوں کا جو ذمہ اٹھایا تھا' آپ ﷺ نے اُس کو رد نہیں فرمایا اور نہ ہی اس کے ساتھ مشرک' مرتد یا منافق جیسا معاملہ فرمایا بلکہ اُس نے آپ ﷺ کو جس بات پر مجبور کیا تھا' آپ ﷺ نے مثبت طریقے سے اس کا جواب دیا۔

یہ معاملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے اور جیسا کہ علماء کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے ایک منافق کے ساتھ اس دنیا میں مسلمان جیسا ہی معاملہ کیا جائے گا اگرچہ اس کا نفاق قطعی اور کھلم کھلا ہو۔

اس کا سبب یہ ہے کہ احکامِ اسلامیہ کی مجموعی طور پر دو جہتیں ہیں:

ایک دنیوی اور دوسری اُخروی۔

پہلی جہت جو دنیا سے متعلق ہے' اس اعتبار سے مسلمان اس بات کے مکلف ہیں کہ دنیا میں ان سب اُمور کو اپنے اوپر اور اپنے معاشرے میں نافذ کریں اور ان دنیوی اُمور کا سربراہ' خلیفہ یا رئیسِ مملکت ہوتا ہے جس کی نگرانی اور قیادت میں یہ اُمور طے پاتے ہیں۔

جب کہ ان اُمور کی دوسری جہت آخرت سے متعلق ہے' جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے ساتھ ہے' اور اللہ تعالیٰ ہی اس کا فیصلہ فرمائے گا۔

پس پہلی جہت جس کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے' اس کے متعلق ہر کام کا فیصلہ مادی' ظاہری

اور محسوس دلائل کے مطابق ہوگا اور انہی ظاہری شواہد کے مطابق ہی احکام کے نتائج مرتب ہوں گے، اس میں پوشیدہ اور وجدانی دلائل و شواہد کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

جب کہ دوسری جہت جس کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے، اس سے متعلق ہر کام کا فیصلہ دلوں میں پوشیدہ اور سینوں میں جاگزیں احساسات اور نیتوں کے مطابق ہوگا۔

اسی قاعدہ کو بیان فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارے اعمال میں سے جو ظاہر ہے ہم اس کے مطابق تمہاری پکڑ کریں گے۔ اس حدیث طیبہ کو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح شیخین نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بے شک تم لوگ اپنے جھگڑوں کے فیصلے مجھ سے کروانے آتے ہو، شاید کہ تم میں سے کوئی ایک شخص اپنے فریق کے مقابلے میں دلیل پیش کرنے میں زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کی باتیں سن کر اس کے حق میں فیصلہ کردوں تو اگر کسی شخص کے حق میں اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کردوں (جس کا حقیقت میں وہ حق دار نہیں) تو وہ اس میں سے کچھ نہ لے کیونکہ یہ اس کے لیے آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔

اس قاعدہ کی مشروعیت میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کا نظام قائم رہے اور یہ لوگوں کے درمیان کھیل بننے اور پامال ہونے سے محفوظ رہے۔ اس طرح یہ ہوسکتا تھا کہ بعض حکام وجدانی اور استنتاجی دلائل کو حجت بنا کر ناحق لوگوں کو تکلیف پہنچاتے۔

اسی قاعدہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ بغیر کسی تفریق کے عام شرعی احکام میں منافقین کے ساتھ بھی مسلمانوں جیسا ہی سلوک کرتے حالانکہ آپ ﷺ بذریعہ وحی الٰہی منافقین کے بہت سے احوال اور ان کے دلوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا بحث اس بات کے منافی نہیں کہ مسلمانوں کو منافقین سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہیے اور ان کے تصرفات اور سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ رہنا چاہیے، یہ ہر زمانے اور ہر مقام پر مسلمانوں کی بدیہی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

چہارم: غیر مسلموں سے موالات اور دوستی

جب ہم اس واقعہ کے قانونی وتشریعی نتیجے پر غور کرتے ہیں اور ان آیاتِ قرآنیہ میں جو اس کے بعد تبصرہ کے طور پر نازل ہوئیں' تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی غیر مسلم کو اپنا ولی اور دوست بنائے' یعنی اس کو اپنا ایسا دوست بنائے کہ دونوں کے درمیان ولایت اور تعاون کی ذمہ داری ہو' احکامِ اسلامی میں سے یہ وہ حکم ہے جس میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔ اس حکم پر قرآن مجید کی بہت سی صریح آیات موجود ہیں' اور اس حکم کی تاکید میں احادیثِ نبوی کی تعداد معنوی تواتر تک پہنچتی ہے۔ ان دلائل کو یہاں ذکر کرنے کا موقع ومحل نہیں' یہ ہر محقق پر واضح اور معروف ہیں۔ اس مذکورہ حکم سے صرف ایک حالت مستثنیٰ ہے' وہ یہ کہ جب مسلمانوں کو اپنی شدید کمزوری کی وجہ سے اس قسم کے معاہدات پر مجبور کیا جائے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی رخصت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً. (آل عمران:۲۸)

نہ بنائیں مؤمن کافروں کو اپنا دوست مؤمنوں کو چھوڑ کر اور جس نے کیا یہ کام پس نہ رہا (اس کا) اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ۔

یہاں پر یہ بات جاننا بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں سے موالات (دوستی وتعاون) منع کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اُن سے بغض رکھا جائے کیونکہ مسلمان کو کسی انسان سے بھی بغض و نفرت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی پر غیض وغضب کرنا اور بغیر کسی وجہ سے کسی سے بغض ونفرت کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے کسی پر غیض وغضب کرنے کا سبب یہ ہے کہ غیر مسلم یا کسی بھی شخص میں ایسا کوئی بُرا عمل موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں' اس لیے اُس بُرے فعل کی وجہ سے اُس شخص پر غیض وغضب کا اظہار کیا جاتا ہے جس میں وہ بُرا عمل پایا جاتا ہے۔

لیکن بغیر کسی شرعی وجہ کے محض ذاتی یا شخصی سبب سے کسی سے نفرت یا بغض کرنا اسلام میں منع کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے کسی پر غیض و غضب کرنا حقیقت میں گناہ گار' مجرم یا کافر پر شفقت کا اظہار ہے کیونکہ مؤمن کی یہ شان ہے کہ وہ جو چیز اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے' وہی چیز دوسرے سب لوگوں کے لیے بھی پسند کرے' مسلمان تو اپنے لیے یہی پسند کرتا ہے کہ وہ آخرت میں عذابِ جہنم سے بچ جائے اور جنت کی سعادتِ ابدی کو حاصل کرے' تو جب ایک مؤمن مسلمان کسی پر اللہ تعالیٰ کے لیے غیض و غضب کا اظہار کرتا ہے تو اُس میں اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ گناہ گار' مجرم یا یہ کافر اپنے گناہوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرے تاکہ یہ انسان بھی آخرت میں عذابِ جہنم سے محفوظ رہے اور جنت کا مستحق ہو' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی پر سختی کرنا تاکہ وہ بندہ راہِ راست پر آ جائے اس میں کوئی ذاتی دشمنی یا بغض کا عنصر نہیں بلکہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ بہتر ثابت ہوتا ہے' یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو راہِ راست پر لانے کے لیے یا ایک بھائی اپنے بھائی کو گمراہی سے بچانے کے لیے اُس پر سختی کرتا ہے تاکہ وہ کامیاب و کامران ہو اور اپنی ناسمجھی کی وجہ سے برائیوں میں مبتلا ہو کر اپنی عاقبت خراب نہ کر لے' اس چیز کو نفرت نہیں شمار کرتے۔

اسی طرح کفار و مشرکین کے معاملہ میں اکثر موقعوں پر سختی اور غیض و غضب کا اظہار کرنا مشروع ہے کیونکہ ان پر کی گئی اس سختی میں ان کی اصلاح پوشیدہ ہے اور یقیناً یہ اُن پر شفقت اور مہربانی کا ہی نتیجہ ہے' جیسا کہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ؎

فقسا لیزدجروا ومن یک راحمًا فلیقس احیانًا علٰی من یرحم

(ترجمہ:) تم سختی کرو تاکہ وہ لوگ باز آ جائیں اس لیے کہ جو رحم کرتا ہے اُسے کبھی کبھی ان پر سختی بھی کرنی چاہیے جن پر وہ رحم کرتا رہتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ کفار و مشرکین کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلقات قائم کرنے سے منع کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے ساتھ کیے گئے معاہدات کا احترام نہ کیا جائے یا عدل و انصاف قائم کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے۔

بلکہ عدل و انصاف ہر صورت میں قائم رہے گا' مسلمانوں اور کافروں کے درمیان فیصلے

عدل وانصاف کی بنیاد پر ہی ہوں گے' اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے غیض وغضب اور سختی کے اظہار کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عدل وانصاف کے تقاضے ہی پورے نہ کیے جائیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر صورت میں عدل قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوْا اللّٰهَ. (المائدہ:۸)

اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو یہی زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے' اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے۔

اس ساری بحث کا مقصد یہ ہے کہ امت مسلمہ دوسری اقوام کے مقابلے میں ایک الگ قوم اور ایک امت ہے جیسا کہ میثاقِ مدینہ میں بھی اس کی تشریح کی گئی' اس لیے مسلمانوں کی دوستی' گہرے تعلقات اور رشتہ داریاں صرف اور صرف اپنی ہی امت اور قوم میں ہونے چاہئیں' لیکن دوسری قوموں کے ساتھ معاملات قائم ہو سکتے ہیں' دوسری اقوام کے ساتھ جملہ معاملات ومعاہدات' عدل وانصاف' خیر کی طرف رغبت اور تمام انسانیت کی رشد وہدایت اور اصلاح کی بنیاد پر مبنی ہونے چاہئیں۔

غزوۂ اُحد

غزوۂ اُحد کا سبب یہ تھا کہ وہ سردارانِ قریش جو غزوۂ بدر میں قتل ہونے سے بچ گئے' انہوں نے جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کہ ہر صورت مسلمانوں سے اپنے مقتولوں کا بدلہ لینا چاہیے' سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ مسلمانوں سے جنگِ بدر کا بدلہ لیا جائے اور طے یہ پایا کہ ابوسفیان کی سربراہی میں آنے والے تجارتی قافلے کا سارا مال رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے ایک مضبوط اور قوی فوج کی تیاری میں صرف کیا جائے۔

جملہ قریش مکہ نے اس بات کی تائید کی' لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کے لیے ایک لشکر جرار کی تیاری شروع کر دی' قریش کے علاوہ وہ لوگ بھی اس میں شامل ہوئے جن کو ''احابیش'' کہا جاتا تھا' اس لشکر کی تیاری میں قریش نے کثیر تعداد میں عورتوں کو بھی اپنے

ساتھ تیار کیا تاکہ قریش کو مسلمانوں سے جب ہزیمت ہو تو عورتیں ان کفار و مشرکین کو میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرنے سے روکیں۔

بالآخر تین ہزار کی تعداد کا یہ لشکر مکہ سے لڑائی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے مشاورت کی اور انہیں دو باتوں کا اختیار دیا کہ (۱) یا تو کفار کے ساتھ لڑائی کے لیے مدینہ سے باہر نکلیں (۲) یا مدینہ میں ہی رہ کر دفاع کیا جائے اور جب کفار مدینہ میں داخل ہوں تو اُن سے جنگ کریں۔

مسلمانوں کے بعض شیوخ نے اس رائے کو پسند کیا کہ مدینہ کے اندر ہی رہ کر دفاع کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول کی بھی یہی رائے تھی۔

جب کہ صحابہ کرام کی وہ کثیر تعداد جن کو غزوۂ بدر میں جہاد کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا ان کی رائے یہ تھی کہ مدینۃ المنورہ سے باہر نکل کر کسی میدان میں کفار کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کی جائے۔ ان سب صحابہ کرام نے جمع ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ہمیں ہمارے دشمنوں کی طرف لے چلیں، اگر ہم نہ نکلے تو وہ سمجھیں گے کہ ہم کمزور ہو گئے ہیں اور اُن سے ڈر گئے ہیں۔

متعدد صحابہ کرام کی یہی رائے تھی، بالآخر آپ ﷺ نے بھی اس رائے پر رضامندی کا اظہار فرمایا اور آپ ﷺ اپنے گھر تشریف لے گئے، اپنی زرہ باندھی اور اسلحہ لیا، اس دوران وہ صحابہ کرام جنہوں نے آپ ﷺ کو مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے پر اصرار کیا تھا، انہوں نے خیال کیا کہ شاید ہم نے حضور ﷺ کو مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے پر مجبور کیا ہے، اس پر وہ سب نادم ہو رہے تھے۔ جب آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام اسلحہ زیب تن فرما کر گھر سے باہر تشریف لائے تو اب انہوں نے دوبارہ عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم نے آپ کو اس بات پر مجبور کیا ہے حالانکہ ہمیں ایسا کرنا مناسب نہیں تھا، لہٰذا اگر آپ چاہیں تو شہر کے اندر ہی تشریف رکھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی نبی کو یہ زیبا نہیں کہ ہتھیار پہننے کے بعد اتار دے جب تک کہ دشمن کے ساتھ جنگ نہ کر لے۔[1]

[1] اسے ابن اسحاق اور امام احمد نے روایت کیا ہے اور طبری کی روایت بھی اس کے قریب قریب ہے۔ دیکھیے: سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۳، تاریخ الطبری ج ۲ ص ۵۰۰، مسند امام احمد ج ۲۲ ص ۵۲۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہزار کے لشکر کی قیادت فرماتے ہوئے مدینۃ المنورہ سے نکلے' یہ سات شوال ہفتہ کا دن تھا اور ہجرت کے بعد بتیس (۳۲) مہینے مکمل ہوئے تھے۔

(طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۸۷' سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۲)

یہاں تک کہ جب لشکر اسلام مدینۃ المنورہ اور اُحد کے درمیان (شوط کے مقام پر) پہنچا تو عبداللہ بن ابی ابن سلول اپنے ایک تہائی حواریوں کے ساتھ مسلمانوں سے الگ ہو کر واپس جانے لگا' اس وقت وہ بڑبڑا رہا تھا کہ انہوں نے ناسمجھ لوگوں اور بچوں کی بات مانی ہے اور میرے مشورے کو مسترد کر دیا ہے' ہم اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈالیں؟

حضرت عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے آئے اور ان کو اللہ کی قسم دے کر کہنے لگے کہ وہ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوں نہ چھوڑیں' لیکن ان لوگوں نے ان کی ایک بات نہ سنی' ان کے قائد نے کہا: اگر ہمیں جنگ ہونے کا علم ہوتا تو ہم ضرور آپ کی معیت میں ہوتے (لیکن جنگ نہیں ہوگی)۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں کا ان کے بارے میں اختلاف ہو گیا جو لشکرِ اسلام کو چھوڑ کر گئے تھے' مسلمانوں کا ایک گروہ کہنے لگا کہ ان (منافقین) کو ہم قتل کر دیں گے' جب کہ بعض مسلمان کہنے لگے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اس ضمن میں یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی:

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ. (النساء:۸۸)

سو کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ منافقوں کے بارے میں (تم) دو گروہ بن گئے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اوندھا کر دیا ہے انہیں بوجہ ان کرتوتوں کے جو انہوں نے کیے' کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اُسے راہ دکھاؤ جسے گمراہ کر دیا اللہ نے۔

(صحیح البخاری ج ۵ ص ۳۱)

بعض صحابہ کرام نے اس موقع پر میثاقِ مدینہ میں باہمی مدد کرنے کے معاہدے کی بناء پر یہودیوں سے مدد طلب کرنے کی رائے دی' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہم اہلِ شرک

سے اہلِ شرک کے خلاف مدد طلب نہیں کریں گے۔

(طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۸۰' ابن اسحاق کی روایت بھی اسی کے مثل ہے: ج ۲ ص ۶۵)

حضور اکرم ﷺ نے اُحد کی ایک گھاٹی پر پہنچ کر تقریباً سات سو صحابہ کرام پر مشتمل لشکر کی صف بندی فرمائی' لشکر اسلام کی پشت جبلِ احد کی طرف کی اور مدینۃ المنورہ کی طرف اُن کا رخ کیا اور مسلمانوں کے پیچھے پہاڑ پر پچاس تیرانداز مقرر فرمائے' ان تیراندازوں کا امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو بنایا اور ان کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تمہیں جہاں متعین کیا گیا ہے' وہیں اپنی جگہ پر ڈٹے رہنا (اگر ہمارے پیچھے سے ہم پر حملہ ہو جائے تو) تم ہماری پشت سے حفاظت کرنا' اگر تم دیکھو کہ ہم نے فتح حاصل کر لی ہے تب بھی تم ہمارے ساتھ آ کر شریک نہ ہونا اور اگر دیکھو کہ ہم شہید کیے جا رہے ہیں تو پھر بھی تم ہماری مدد کو نہ آنا[1]

غزوۂ اُحد کے روز رافع بن خدیج اور سمرہ بن جندب جو دونوں اس وقت پندرہ پندرہ سال کی عمر کے تھے' ان دونوں نے لڑائی میں شرکت کے لیے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں درخواست پیش کی اور اصرار کیا۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کی عمریں کم ہونے کی وجہ سے ان کو لڑائی میں شرکت سے روک دیا اور ان کو واپس لوٹا دیا' لیکن آپ ﷺ سے عرض کی گئی: یارسول اللہ ﷺ! رافع تو ماہر تیرانداز ہے' چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں اجازت مرحمت فرمادی' جب حضرت رافع رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی تو حضرت سمرہ بن جندب بھی حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! اللہ کی قسم! میں کشتی کے مقابلے میں رافع کو پچھاڑ سکتا ہوں' چنانچہ آپ ﷺ نے ان کو بھی لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک تلوار پکڑی اور فرمایا: کون ہے جو اس تلوار کا حق ادا کرے گا؟

یہ سن کر حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور عرض کرنے لگے: میں اس تلوار کا

---

[1] ابن سعد ج ۳ ص ۸۰' ابن ہشام کے الفاظ بھی اس سے ملتے جلتے ہیں اور امام بخاری نے بھی اسی طرح کی ہی روایت نقل کی ہے: ج ۵ ص ۲۹۔

حق ادا کروں گا' تو آپ ﷺ نے وہ تلوار ان کو عطا فرما دی' پس ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے ایک سرخ رنگ کا رومال نکالا اور اپنے سر پر باندھ لیا (یہ سرخ کپڑا حضرت ابو دجانہ اُس وقت سر پر باندھتے جب لڑنے مرنے کے لیے تیار ہوتے)۔

پھر آپ رضی اللہ عنہ صفوں کے درمیان بڑے فخریہ انداز میں ٹہلنے لگے' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ ایسی چال ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے سوائے اس قسم کے موقع کے۔[1]

پھر رسول اللہ ﷺ نے جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا اور یوں جنگ کی ابتداء ہوئی۔

جب کہ دوسری طرف مشرکین کے لشکر کے میمنہ کی کمان خالد بن ولید (جو اس وقت مسلمان نہیں تھے) کے سپرد تھی اور میسرہ کی قیادت عکرمہ بن ابی جہل کے حوالے تھی۔

دونوں طرف سے لڑائی شروع ہوئی اور گھمسان کا رَن پڑا' جنگ خوب گرم ہوئی' مسلمان مجاہدین نے مشرکین کے لشکر کے چھکے چھڑا دیئے' مشرکین پے در پے قتل ہونے لگے۔

مسلمانوں میں سب سے آگے حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ' حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے' جو دعوتِ مبارزت دے رہے تھے اور قتال کر رہے تھے' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ کی حفاظت کر رہے تھے اور لشکر اسلام کے علم بردار بھی تھے' شہید ہو گئے' پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکر کے پرچم کو پکڑ لیا۔

جنگ یوں ہی جاری رہی' اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی فتح کے ساتھ مدد فرمائی اور مشرکین شکست سے دوچار ہوتے ہوئے میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے اور ان کو ایسی ہزیمت اٹھانا پڑی جو کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر تھی' یہ دیکھ کر مشرکین کی عورتیں ان کو لعن طعن کرنے لگیں'

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۲۲۳' امام مسلم نے بھی حماد بن سلمہ کی سند سے اسی طرح کی ایک روایت نقل کی ہے لیکن اس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد موجود نہیں کہ یہ چال ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے' دیکھئے: صحیح مسلم ج ۷ ص ۱۵۔

غم وغصہ کا اظہار کرنے لگیں اور ان کو بددعائیں دینے لگیں۔

مسلمانوں کا لشکر اُن بھاگتے ہوئے مشرکین کا پیچھا کر کے انہیں قتل کرنے لگا اور مالِ غنیمت اکٹھا کرنے لگا' یہ دیکھ کر پہاڑی کے درّے پر متعین تیر اندازوں میں سے بعض نے نیچے اُترنے کا ارادہ کیا لیکن اس بات پر اُن میں اختلاف ہو گیا بالآخر اُن تیر اندازوں میں سے اکثر پہاڑی سے نیچے اُتر آئے' یہ گمان کرتے ہوئے کہ شاید جنگ ختم ہو چکی ہے اور فیصلہ ہو چکا ہے' اور یہ تیر انداز بھی دوسرے صحابہ کے ساتھ مل کر مالِ غنیمت لوٹنے لگے' لیکن ان تیر اندازوں کے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ چند صحابہ کرام کے ساتھ اُسی جگہ پر ثابت قدم رہے اور آپ رضی اللہ عنہ یہ فرما رہے تھے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ اُدھر خالد بن ولید نے بھاگتے ہوئے دیکھا کہ پہاڑی کا وہ درّہ خالی ہے اور وہاں صرف چند افراد موجود ہیں تو انہوں نے گھوم کر وہاں سے حملہ کر دیا' اُن کے پیچھے عکرمہ بھی حملہ آور ہوئے تو ان سب نے مل کر باقی ماندہ تیر اندازوں اور ان کے امیر پر حملہ بول دیا' جس میں ان تیر اندازوں کے امیر سمیت سب صحابہ کرام شہید ہو گئے اور پھر مشرکین پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔[1]

پیچھے سے اس اچانک حملہ کی وجہ سے مسلمان منتشر ہو گئے اور ان کے دلوں میں رعب داخل ہو گیا' اس روز بہت سے مسلمان شہید ہوئے یہاں تک کہ دشمن نے رسول اللہ ﷺ پر حملہ کر دیا اور آپ ﷺ کو بھی کئی پتھر لگے' جس سے آپ کے ایک پہلو میں چوٹیں آئیں۔ ایک پتھر آپ ﷺ کے ہونٹ مبارک پر لگا جس سے آپ ﷺ کے دانت مبارک رباعیۃ (نوکیلے دانت کے ساتھ والا) پر بھی چوٹ لگی' اور آپ ﷺ کا چہرۂ انور بھی زخمی ہوا۔ چہرۂ انور سے خون بہنے لگا' آپ ﷺ بہتا ہوا خون صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے: وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون سے رنگا حالانکہ وہ نبی انہیں ان کے رب کی طرف بلاتا ہے۔

(جب جنگ رُکی تو) حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا آئیں اور آپ ﷺ کے

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۸۳' امام بخاری نے یہ روایت حضرت براء سے کتاب الجہاد میں نقل کی ہے: ج ۵ ص ۲۸۔

چہرۂ اقدس سے خون صاف کرنے لگیں اور سیدنا علی المرتضٰی سپر سے پانی ڈالتے جا رہے تھے جب حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ خون کا بہاؤ زیادہ ہو رہا ہے اور رُکنے میں نہیں آ رہا تو انہوں نے چٹائی کا ایک ٹکڑا لیا' اس کو جلایا حتیٰ کہ جب اس کی راکھ بن گئی تو اسے زخموں پر چپکا دیا اور خون رِسنا بند ہو گیا[1]

اسی اثناء میں لوگوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ شہید ہو گئے ہیں' اس افواہ کے پھیلنے کی وجہ سے کئی کمزور ایمان والے مسلمانوں کے دلوں میں رعب طاری ہو گیا اور وہ کہنے لگے: جب رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے ہیں تو پھر ہمارا اس مقام پر ٹھہرنا کیسا ہے؟ وہ یہ بات کہہ کر میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر کر چلے گئے۔

لیکن اسی موقع پر حضرت انس بن النضر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: رسول اللہ ﷺ کے بعد اب تمہاری زندگی کا کیا فائدہ؟ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے بعض منافقین اور کمزور ایمان والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اے مولا! میں لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں اس بات سے جو یہ (کمزور ایمان والے) کہہ رہے ہیں اور میں تجھ سے معذرت کا خواہاں ہوں جو یہ کہتے ہیں۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے اور مشرکین پر تابڑ توڑ حملے کر دیئے' حتیٰ کہ اسی دوران وہ شہید ہو گئے۔ (متفق علیہ)

اس نازک حالت میں صحابہ کرام نے آپ ﷺ کے گرد حلقہ بنا لیا اور تیروں اور تلواروں کے وار اپنے جسموں پر سہتے ہوئے جان نثاری و قربانی کے بڑے عجیب منظر پیش کیے' آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے کرتے کئی صحابہ نے شہادت کا جام نوش کیا۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں کو کچھ پسپائی ہوئی اور وہ رسول اللہ ﷺ سے دور ہو گئے تو اُس وقت حضرت ابوطلحہ آپ ﷺ کے سامنے خود کو جھکائے ہوئے اپنی چمڑے کی ایک سپر سے آپ کے سامنے آڑ بنائے ہوئے تھے' حضرت ابوطلحہ ایک ماہر تیرانداز تھے۔ آپ ﷺ جب بھی اپنا سرِ انور اُٹھا کر دشمن قوم کو دیکھتے تو حضرت ابوطلحہ عرض کرتے: میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ ان کی طرف نہ جھانکیں!

---

[1] امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے ملتے جلتے الفاظ میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

مبادا دشمن کا کوئی تیر آپ کو آ لگے' آپ کی بجائے میری جان حاضر ہے۔ (بخاری ج ۵ ص ۳۲)

حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے اور آنے والے سب تیر ان کی پشت میں پیوست ہوتے رہے لیکن آپ سرِ مو بھی اِدھر اُدھر نہ سر کے۔

حضرت زیاد بن سکن بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لیے لڑتے رہے اور تیر اپنے جسم پر برداشت کرتے رہے حتیٰ کہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔

ابن ہشام کی روایت کے مطابق ان کے آخر میں حضرت عمارہ بن یزید بن السکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دشمن سے لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر گر گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو میرے قریب لاؤ' تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم مبارک پر اپنا سر رکھ دیا اور اسی حالت میں جامِ شہادت نوش کر گئے۔

پھر جب دونوں طرف سے جنگ رُک گئی اور مشرکین فتح کی خوشی میں واپس جانے کے لیے ایک طرف چلے گئے تو اب مسلمان اپنے شہداء کی تلاش میں نکلے' جن شہداء کو دیکھ کر مسلمان دم بہ خود ہو گئے اُن میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب' حضرت یمان' حضرت انس بن النضر' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم اور دیگر بہت سے صحابہ کرام تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی نعش کو دیکھ کر دل گرفتہ ہو گئے اور گہرا اثر لیا' کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کی نعش کا مُثلہ کیا گیا تھا' پیٹ چاک تھا' کان اور ناک کاٹے ہوئے تھے۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہداء کی نعشوں کو جمع کرنے لگے اور ایک ایک کپڑے میں دو دو آدمیوں کی نعشوں کو لپیٹتے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے: ان میں سے کون زیادہ قرآن کا یاد کرنے والا ہے؟ جب کسی کی طرف اشارہ کیا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لحد میں اُسے آگے رکھتے اور فرماتے: میں اِن پر یومِ قیامت گواہ ہوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن شہداء کو خون آلود جسم کے ساتھ جوں کا توں ہی دفن کرنے کا حکم دیا' نہ ہی ان کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور نہ ہی ان کو غسل دیا گیا۔ (البخاری ج ۵ ص ۴۹)

جب لشکر اسلام مدینہ پہنچا تو یہودی اور منافقین مسلمانوں کو طعن و تشنیع کرنے لگے' عبداللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے ساتھی منافقین' مسلمانوں سے کہنے لگے: اگر تم ہماری بات مانتے تو آج تمہارے یہ اصحاب قتل نہ ہوتے۔ اور پھر سوال کرنے لگے کہ تم تو رسول اللہ ﷺ کی معیت میں فتح و نصرت کا خیال لے کر یہاں سے رخصت ہوئے تھے' اب کیا ہوا ہے؟

تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی یہ آیات یہود و منافقین کے ردّ میں اور غزوۂ اُحد میں پوشیدہ حکمت کو بیان کرتے ہوئے نازل فرمائیں۔

یہ آیات سورۂ آل عمران: ۱۲۱' سے لے کر ۱۶۸ تک ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ O (آل عمران: ۱۲۱)

اور یاد کرو (اے محبوب!) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپ اپنے گھروں سے (اور میدانِ اُحد میں) بٹھا رہے تھے مؤمنوں کو مورچوں پر جنگ کے لیے اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے O

سورۂ آل عمران: ۱۶۸ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O (آل عمران: ۱۶۸)

جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں حالانکہ وہ خود (گھر) بیٹھے تھے کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے' آپ فرمائیے: ذرا دور تو کر دکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو O

رسول اللہ ﷺ میدانِ اُحد سے ہفتہ (پندرہ شوال) کی شام واپس لوٹے' آپ ﷺ نے اور آپ کے صحابہ نے یہ رات مدینۃ المنورہ میں گزاری' اس رات مسلمان اپنے زخموں پر مرہم پٹی کرتے رہے' پھر اتوار (سولہ شوال) کی صبح جب آپ ﷺ نے نمازِ فجر ادا فرمائی تو اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ منادی کرو کہ رسول اللہ ﷺ نے

تمہیں دشمن کا تعاقب کرنے کا حکم دیا ہے' اور ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ نکلیں جو گزشتہ روز جنگ میں ہمارے ساتھ شریک تھے۔

آپ ﷺ نے جھنڈا منگوایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا' صحابہ کرام اگرچہ زخموں سے چور تھے' ان کے جسموں پر نیزوں اور تیروں کے گہرے زخم تھے لیکن اس سب کے باوجود وہ سب کے سب اپنے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حکم سنتے ہی اُفتاں وخیزاں بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو گئے اور کشتگانِ خنجر تسلیم ورضا کا یہ عدیم المثال لشکر اپنے آقا کی قیادت میں اتوار' سولہ شوال کو مشرکین مکہ کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا اور مدینۃ المنورہ سے تقریباً دس میل دور ''حمراء الاسد'' کے مقام پر پڑاؤ کیا' اس جگہ مسلمانوں نے بہت بڑا آگ کا الاؤ روشن کیا' جس کو دور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں بہت بڑا لشکر موجود ہے۔

مسلمانوں کے اس لشکر کے پاس سے قبیلہ بنی خزاعہ کے معبد بن معبد الخزاعی کا گزر ہوا' جو ابھی تک مشرک تھا۔ معبد الخزاعی لشکرِ اسلام کے پاس ٹھہرا اور پھر آگے بڑھ گیا' جب وہ مشرکین کے لشکر کے پاس پہنچا تو روحاء کے مقام پر مشرکینِ مکہ جنگِ اُحد میں کامیابی پر خوشی اور جشن منا رہے تھے اور مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن صفوان بن امیہ مشرکین کو ایسا کرنے سے منع کر رہا تھا۔

ابوسفیان نے جب معبد کو دیکھا تو پوچھنے لگا: اے معبد! سناؤ! کیا خبر لائے ہو؟ معبد نے کہا: اے ابوسفیان! تمہارا بُرا ہو! بے شک محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی تمہارے تعاقب کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے ہیں اور وہ اتنا بڑا لشکر ہے کہ ایسا لشکر آج تک میں نے نہیں دیکھا' وہ غصے سے تم پر آگ بگولا ہو رہے ہیں اور تم پر اس قدر غضب ناک ہیں کہ ایسا غصہ میں نے پہلے کبھی کسی میں نہیں دیکھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس بات سے مشرکین کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب طاری کر دیا اور وہ سامان سمیٹ کر اسی حالت میں جلدی جلدی مکہ کی طرف واپس پلٹ گئے۔

جب کہ رسول اللہ ﷺ حمراء الاسد کے مقام پر دوشنبہ' سہ شنبہ اور چہار شنبہ تین دن ٹھہرنے کے بعد پھر مدینۃ المنورہ روانہ ہو گئے۔ (طبقات ابن سعد' سیرت ابن ہشام' تاریخ الطبری)

اسباق و نصائح

غزوۂ احد کے واقعات اپنے اندر ایسے عظیم دروس لیے ہوئے ہیں جو ہر زمانے میں مسلمانوں کے لیے نہایت اہمیت کے حامل ہیں' ان واقعات میں پائی جانے والی حکمتوں کو جس شکل میں ہم نے بیان کیا ہے' اس سے ہمیں تطبیقی و عملی دروس حاصل ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے اس میں راہ نمائی ہے کہ جنگوں کے میدانوں میں فتح و نصرت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے اور کس طرح شکست اور ہزیمت کی کیفیت سے کامیابی کے ساتھ فتح و نصرت کی طرف نکلا جا سکتا ہے؟ اس لیے ہم غزوۂ اُحد سے حاصل ہونے والے نتائج پر یکے بعد دیگرے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں:

اوّل: اس دوران بھی وہ بنیادی اصول جو رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے سامنے آتا ہے' وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ہر قابلِ مشورہ کام اور ہر معاملے میں اپنے صحابہ سے مشاورت کو قائم و دائم رکھا لیکن غزوۂ اُحد کے لیے مشاورت کے دوران ایک ایسی بات سامنے آتی ہے جس میں غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ ہم نے ملاحظہ کیا کہ جب آپ ﷺ غزوۂ اُحد کے بارے اپنے صحابہ سے مشاورت کر رہے تھے تو اُس وقت اگرچہ آپ ﷺ کی مرضی نہیں تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑائی کی جائے لیکن پھر بھی آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کی بات سے موافقت کرتے ہوئے مدینۃ المنورہ سے باہر نکل کر دشمن کا سامنا کرنے کا پروگرام بنایا' اور مشاورت ہو جانے کے بعد جب آپ ﷺ اپنے گھر سے اسلحہ زیب تن فرما کر باہر تشریف لائے تو وہی صحابہ دوبارہ حاضرِ خدمت ہوئے اور مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے اپنے اصرار پر ندامت کرنے لگے اور مدینہ میں ہی رہ کر دفاع کرنے پر رضا مندی کا اظہار کرنے لگے' لیکن آپ ﷺ نے اب اُن کی اِس تجویز کو نہ مانا اور مدینۃ المنورہ سے باہر نکل کر دشمن کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی تیاری مکمل فرمائی' اگرچہ مشاورت کے وقت آپ ﷺ کا میلان اِسی طرف تھا کہ مدینۃ المنورہ میں رہ کر ہی دفاع کیا جائے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔

اس سارے واقعہ میں حکمت یہ تھی کہ جب جہاد کی تیاری مکمل ہو چکی اور جب رسول اللہ ﷺ اسلحہ وغیرہ زیب تن فرما کر اپنی قوم میں جلوہ افروز ہو چکے تو اب دوبارہ پھر

مشاورت کی ابتداء کرنا اور بالخصوص فوجی وعسکری معاملے میں ایسا کرنا اصول وحدود سے تجاوز کرنے اور تاخیر کا سبب ہے' کیونکہ جنگی وعسکری معاملات میں سب سے زیادہ جوش وجذبہ اور عزم بالجزم کی ضرورت ہوتی ہے' تو اس لیے ایسی صورتِ حال میں جب ایک قوم اور ان کا قائد لشکر کشی کی تیاری مکمل کر چکا ہو تو اب یکدم ارادہ بدل لینا اور جنگ کی تیاری ترک کر دینا خوف اور ڈر کی علامت ہوتا ہے' جس سے کمزوری اور ضعف پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے جب آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری مکمل فرمالی تو اب اُن صحابہ کی بات مان کر اسلحہ نہیں اتارا اور نہ ہی جنگ کا ارادہ ترک فرمایا بلکہ ایسا مضبوط جواب دیا کہ جو پختہ عزم وجزم سے معمور تھا' آپ ﷺ نے فرمایا: نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہتھیار پہننے کے بعد اتار دے جب تک کہ دشمن کے ساتھ جنگ نہ کر لے۔

دوم: منافقین کا اس غزوہ میں اہم کردار رہا' منافقین کے اس گھناؤنے کردار سے بے شمار اسباق ونصائح حاصل ہوتے ہیں' اُن میں سے سب سے اہم بات یہ سامنے آئی کہ پتا چل گیا کہ مؤمنین کون ہیں اور منافقین کون ہیں اور منافقین خود بخود ہی ایک عذر کی بنیاد پر مؤمنین سے علیحدہ ہو گئے' منافقین کے اس کردار میں مؤمنوں کے لیے بے شمار فوائد پوشیدہ تھے' جو بعد میں ظاہر ہوئے۔

اس سارے واقعہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی ابن سلول لشکرِ اسلام کی مدینۃ المنورہ سے روانگی کے بعد ہی اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ کیسے لشکرِ اسلام سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے اور عذر یہ بیان کرتا ہے کہ نبی ﷺ نے نوجوان لڑکوں اور ناتجربہ کار لوگوں کی بات مان کر جنگ کے لیے نکلنے کا پروگرام بنایا ہے جب کہ عمر رسیدہ' باشعور' تجربہ کار لوگوں کی بات نہیں مانی' لہٰذا میں اور میرے ساتھی لشکرِ اسلام کا ساتھ نہیں دیں گے۔

جب کہ حقیقتِ حال اور اصل واقعہ یہ تھا کہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین جنگ کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا' کیونکہ وہ اپنے آپ کو خوف وخطر' مشکلات جنگ کے بُرے انجام سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی منافقین کی علامات ہوتی ہیں کہ وہ اسلام کے فوائد اور منافع تو حاصل کرتے ہیں لیکن اسلام کے راستے میں تکالیف اور مشکلات برداشت نہیں کرتے' اسلام پر قائم رکھنے میں انہیں دو چیزوں میں سے ایک چیز محرک ہوتی ہے' یا تو وہ اسلام کے

ذریعے فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں یا مصیبتوں اور تکلیفوں سے بچنا چاہتے ہیں۔

سوم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہونے اور قلت کے باوجود کسی غیر مسلم سے مدد حاصل کرنے کا ارادہ نہیں فرمایا' ابن سعد نے طبقات میں روایت کیا ہے کہ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم مشرکین کے مقابلے میں مشرکین سے مدد حاصل نہیں کریں گے۔[1]

اسی طرح امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ جب غزوۂ بدر کے موقع پر ایک شخص جنگ میں شریک ہونے کے لیے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے پوچھا: کیا تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو؟ تو اُس نے جواب دیا: نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو فرمایا: تم واپس لوٹ جاؤ! میں ہرگز کسی مشرک کی مدد حاصل نہیں کروں گا۔

اس بنیاد پر جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ جنگ میں کفار سے مدد حاصل کرنا جائز نہیں' جب کہ امام شافعی نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ حاکمِ وقت اگر دیکھے کہ کافر مسلمانوں کے معاملات میں اچھی رائے رکھتا ہے اور امانت داری سے پیش آتا ہے اور اس کی مدد کی حاجت اور ضرورت بھی ہو تو ایسے کافر سے مدد حاصل کرنا جائز ہے لیکن اگر وہ امانت دار اور اچھی رائے والا نہیں تو اس سے مدد حاصل کرنا جائز نہیں۔ (مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۲۱)

شاید یہی بات قواعد وضوابط اور مجموعی دلائل سے متفق ہے' اس لیے کہ ایک دوسری روایت بھی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ حنین کے موقع پر صفوان بن امیہ کی معاونت کو قبول فرمایا' لیکن یہ معاونت والا مسئلہ اُس سلسلے سے تعلق رکھتا ہے جس کو حکمتِ عملی یا سیاستِ شرعیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ ہم عنقریب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوۂ بدر و اُحد اور غزوۂ حنین کے موقع پر کیے گئے فیصلوں پر بحث کریں گے۔

چہارم: غزوۂ اُحد کے دوران جہاں تک حضرت سمرہ بن جندب اور رافع بن خدیج کے

---

[1] یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس موقع پر تو یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کا اظہار کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسے یہودیوں کو مشرک قرار دیا؟

• جواب: یہاں پر شرک کا اطلاق اپنے اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نہیں بلکہ یہاں شرک کا عمومی معنی ہے جو جمیع کافرین پر صادق آتا ہے۔

معاملے کا تعلق ہے تو یہ بھی غور طلب ہے اور اس ضمن میں وضاحت یہ ہے کہ یہ دونوں اصحاب ابھی بچے ہی تھے جن کی عمریں پندرہ سال سے زائد نہ تھیں' لیکن یہ دونوں بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں حاضر ہوئے اور استدعا کرنے لگے اور قسمیں دے کر عرض کرنے لگے کہ ہمیں بھی جنگ میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائیں اور جنگ بھی کون سی؟ ایسی جنگ جو فیصلہ کن تھی' جس میں زندگی اور موت آمنے سامنے تھیں اور جانوں پر کھیل کر جس میں مقابلہ کرنا تھا' اور یہ جنگ بھی دو ایسے فریقوں کے درمیان تھی جن میں بہ ظاہر کوئی برابری نظر نہیں آتی تھی کہ جس میں ایک طرف مسلمانوں کی تعداد تقریباً سات سو تھی اور ان کے مقابلے میں مشرکین کی تعداد تین ہزار جنگ جوؤں پر مشتمل تھی اور یہ سامانِ جنگ سے بھی لیس تھے۔

یہاں پر ایک عجیب بات ہے کہ اسلام کے خلاف فکری یلغار کرنے والے سازشی اس موقع پر مدنی نوجوانوں کے جنگ میں شمولیت اختیار کرنے پر اصرار کرنے والے واقعہ سے یہ بات اخذ کرتے ہیں کہ چونکہ عرب لمبی لمبی جنگوں اور طویل لڑائیوں کے سائے میں پروان چڑھے تھے' اس لیے وہ چاہے بوڑھے ہوں' نوجوان ہوں' یا بچے ہوں' جنگ و جدل اور لڑائی کو بغیر کسی خوف وڈر کے ایک عام طبعی عمل کے طور پر ہی دیکھتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس واقعہ کی یہ تاویل کرنے والے سازشی یقیناً اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں' اسی لیے وہ اس طرح کی عجیب وغریب ہرزہ سرائی کرتے ہیں' حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اگر واقعی عرب جنگ وجدل کے شوقین ہوتے تو پھر اس غزوۂ اُحد میں عبداللہ بن ابی ابن سلول (منافق) اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ راستے سے ہی خوف وڈر محسوس کرتا ہوا واپس کیوں چلا گیا؟ اور اسی موقع پر کچھ دوسرے لوگ موسمِ گرما کی حرارت اور تپش کے دوران مدینہ کے سائے' پھل اور پانی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جہاد کے لیے نکلنے کا اعلان فرمایا تو ان لوگوں نے جہاد پر جانے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے: گرمی اور حرارت میں نہ جاؤ۔

اسی طرح اگر عرب جنگ وجدل کے ماحول میں ہی پلے بڑھے تھے تو پھر اپنی فوج کی کثرت اور اسلحہ کی کثرت کے باوجود مشرکین غزوۂ بدر میں ذلت آمیز شکست سے کیوں دوچار ہوئے؟ اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب و دبدبہ کیوں بیٹھ گیا؟ یہ بھی تو وہی

عرب تھے جن کی نشوونما جنگوں کے سائے اور ماحول میں ہوئی اور جنگوں کی مشکلات اور تکالیف کو دیکھا تھا اور جنگ جن کی گھٹی میں تھی۔

کوئی بھی منصف اور کوئی بھی تجزیہ نگار اس واضح اور روشن حقیقت سے کسی صورت انکار نہیں کر سکتا کہ بے شک ان نوجوانوں نے جنگ میں شامل ہونے پر اصرار کر کے موت کو گلے لگانے کا جو اقدام کیا' اس میں راز اور حقیقت یہ پوشیدہ ہے کہ یہ سب کچھ انہوں نے اپنے دلوں میں پائے جانے والے مضبوط ایمان کے بل بوتے پر کیا تھا' اور اسی مضبوط ایمان اور اسی مضبوط ایمان کے نتیجے میں اُن صحابہ کرام میں رسول اللہ ﷺ سے شدید محبت پیدا ہو گئی' پس جس جگہ بھی ایمان پایا جائے گا اور یہ محبتِ رسول بھی ہو گی تو وہاں ایسے ہی اقدام اور جان قربان کرنے کے عملی مظاہرے ہوں گے اور جہاں ایمان کمزور ہو گا اور دل میں محبتِ رسول کمزور ہو گی تو وہاں یہ اقدام ہزیمت میں بدل جائے گا اور بہادری کا جذبہ سستی اور نامردی میں بدل جائے گا۔

پنجم: میدانِ اُحد میں جب ہم رسول اللہ ﷺ کے احوال پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کی صفوں کو منظم کرتے ہیں اور فوجی دستوں کو ترتیب دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی پشت کو مضبوط کرتے ہوئے وہاں ایک تیر انداز دستے کو متعین کرتے ہیں اور تیر اندازوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان کے دیگر جہاد کرنے والے ساتھیوں کو چاہے فتح ہو یا شکست جو بھی حال ہو وہ تا حکمِ ثانی اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس عمل پر ذرا بھی غور کریں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور اس کے پیچھے دوسرا اہم مظہر بھی واضح ہو جاتا ہے۔

آپ ﷺ کے اس عمل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ جنگی معاملات اور عسکری سٹریٹیجی کے ماہر' عظیم فوجی کمانڈر بھی تھے' بلکہ آپ ﷺ جنگی و حربی فنون اور عسکری مہارت رکھنے والے فوجی منصوبہ سازوں میں سرفہرست تھے' اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں بھی آپ ﷺ کو بے مثل اور عبقری بنایا تھا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ہر میدان میں عبقریت' انفرادیت اور عظمت سب کچھ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے ذریعے سے ہی تھی۔ جس طرح آپ ﷺ نبوت و رسالت کے مرکز ہیں' اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ جنگی د

حربی فنون کے بھی ماہر عبقری اور بے مثل ہوں' اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ ہر طرح کی لغزش' انحراف اور آلائش سے پاک اور ہر گناہ سے معصوم ہوں۔

اس بات کی وضاحت ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں کر چکے ہیں' اس لیے یہاں اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بہر کیف آپ ﷺ نے لشکرِ اسلام کے پیچھے ایک گھاٹی پر تیراندازوں کا جو دستہ متعین فرمایا اور اس کو جو سخت ہدایات جاری فرمائیں اور پھر جب اُن تیراندازوں نے آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر اپنی جگہ چھوڑی اور اس کے نتیجے میں لشکرِ اسلام کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یعنی بعض تیراندازوں نے آپ ﷺ کی ہدایات پر پوری طرح عمل نہ کیا۔ اس سارے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا نبی اکرم ﷺ کو فراستِ نبوی یا بذریعہ وحی الٰہی اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ بعد میں کیا واقعہ پیش آئے گا۔ اسی لیے تاکید کے ساتھ آپ ﷺ نے انہیں ہدایات اور احکام دیئے تھے۔ گویا کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کو ان کے دشمن جو نفس' اس کی خواہشات اور مال و دولت اور مالِ غنیمت کے طمع و لالچ کی صورت میں ان کے اندر تھا' اس اندرونی دشمن کے ساتھ کشتی لڑا رہے تھے اور اس کشتی کا نتیجہ جو بھی ہو لیکن اس سے بہت بڑا فائدہ ہوتا ہے' اور بسا اوقات سلبی نتیجہ فائدے کے لحاظ سے ایجابی نتیجہ سے زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے۔

ششم: حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے جو تلوار لی' اس شرط پر کہ وہ اس کا صحیح حق ادا کریں گے وہ تلوار لے کر حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ مجاہدین کی صفوں کے درمیان فخر و تکبر سے اکڑ کر چلنے لگے' آپ ﷺ نے حضرت ابو دجانہ کو اُس موقع پر ایسا کرنے سے منع نہ فرمایا بلکہ ارشاد فرمایا: اس طرح فخر سے چلنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے سوائے اس طرح کے مواقع کے۔

آپ ﷺ کے اس ارشادِ گرامی سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ عام حالات میں غرور و تکبر کے جو مظاہر حرام ہیں' جنگی حالات میں ان کی حرمت زائل ہو جاتی ہے' مسلمان کے لیے زمین پر اکڑ کر چلنا یہ غرور و تکبر کے مظاہر میں سے ایک ہے' لیکن میدانِ جنگ میں اکڑ کر چلنا اور دشمن پر بڑائی کا اظہار کرنا' یہ پسندیدہ اور مستحسن امر ہے۔ اسی طرح سونے اور

چاندی کے برتن اور اشیاء استعمال کرنا یہ بھی غرور و تکبر اور مظاہرِ فخر و مباہات میں سے ہے۔ لیکن جنگ کے لیے اپنے اسلحہ اور جنگی آلات کو سونے اور چاندی سے مزین کرنا ممنوع نہیں' کیونکہ جنگ کے دوران فخر و مباہات کا جو مظاہرہ ہے اس سے دشمنوں پر اسلام کی شان و شوکت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ دشمن کے مقابلے میں نفسیاتی جنگ کا بھی ایک حربہ ہے جس کی اہمیت مسلمانوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے۔

ہفتم: جب ہم غزوۂ اُحد کے دوران مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہونے والی جنگ کے کُل دورانیے کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

پہلا حصہ: اس دوران مسلمان مجاہدین اپنی اپنی جگہوں پر اور اپنے اپنے مورچوں پر ڈٹے رہے' اپنے قائد اور سپہ سالار رسول اللہ ﷺ کے احکامات اور ہدایات کے مطابق لڑائی کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فتح و نصرت تیزی سے مسلمانوں کے پلڑے میں آنے لگی اور شکست و ہزیمت مشرکین کی صفوں کی طرف بڑھنے لگی' مشرکین کے تین ہزار فوجیوں' جنگ جوؤں کے دلوں میں رعب طاری ہو چکا تھا' جس وجہ سے وہ اپنی جگہوں سے پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے' جنگ کے اس دورانیے اور اس حصے کے متعلق یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ. (آل عمران:۱۵۲)	اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جب کہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے۔

دوسرا حصہ: اس حصے میں مسلمان مجاہدین' بھاگتے ہوئے مشرکین کے پیچھے گئے تاکہ ان کا چھوڑا ہوا مال و اسباب جمع کریں' اسی دوران پہاڑی کے اوپر متعین کردہ تیراندازوں نے جب اپنے مسلمان بھائیوں کو کفار و مشرکین کا پیچھا کرتے اور مال و اسباب اکٹھا کرتے ہوئے دیکھا تو ان کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی اور اُن میں سے بعض نے اپنی جگہ کو چھوڑا اور وہ بھی یہ سوچ کر کہ اب پابندی نہیں رہی' مال و اسباب جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح ان حالات میں بعض مسلمانوں نے آپ ﷺ کی طرف سے اجازت اور حکم کا انتظار نہ کیا اور اپنی خواہش پر عمل کیا' وہ یہ کہہ رہے تھے کہ یہ اب ہمارے لیے حلال ہے اور آپ

ﷺ کی طرف سے جاری کردہ حکم کا انتظار کیے بغیر اپنی جگہ کو چھوڑ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے' لیکن اُن تیراندازوں کے دستہ میں سے بعض نے اس اجتہاد کو صحیح قرار نہ دیا اور اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم آپ ﷺ کے حکم کا انتظار کریں' سرفہرست اس دستہ کے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر نے ان کے اس عمل کی مخالفت کی اور اپنی اپنی جگہوں پر ڈٹے رہنے پر مُصر رہے۔ جب اُن بعض تیراندازوں نے اپنی جگہ کو چھوڑ کر مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کیا تو اُس وقت جنگ کے حالات بدل گئے اور اس کا کیا نتیجہ نکلا؟

اب وہ رعب جو مشرکین کے دلوں میں طاری تھا' اس کی جگہ شجاعت اور نئی جنگی چال پیدا ہوئی' خالد بن ولید نے بھاگتے ہوئے جب واپس مڑ کر غور سے دیکھا تو ان کو وہ جگہ خالی نظر آئی' جہاں مسلمانوں کے تیراندازوں کا دستہ حفاظت ونگہبانی کے لیے متعین تھا' تو اب یک دم ان کے ذہن میں ایک جنگی چال نے انگڑائی لی' تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چکر لگا کر پچھلی طرف سے مسلمانوں پر حملہ بول دیا اور جو چند تیرانداز محافظ وہاں رہ گئے تھے' وہ شہید ہو گئے' مسلمانوں پر پیچھے سے تیروں اور نیزوں کی بارش ہو گئی' اب وہ رعب مسلمانوں پر طاری ہو گیا اور وہاں افراتفری پھیل گئی' اس دوران مسلمانوں کو کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔

جنگ کے اس حصے اور اس دورانیے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ. (آل عمران:۱۵۲)

یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اللہ نے دکھا دیا تھا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے' بعض تم میں سے طلب گار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلب گار ہیں آخرت کے' پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ آزمائے تمہیں۔

آپ غور کریں اس غلطی اور لغزش کا کتنا بھیانک نتیجہ نکلا اور کتنا نقصان اٹھانا پڑا!

مسلمانوں کے چند افراد کی غلطی کا وبال پورے لشکر اسلام پر آیا' حتیٰ کہ آپ ﷺ بھی اس کے نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے۔

اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے کہ جب کوئی بھی نافرمانی ہوتی ہے تو اس کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب ﷺ اُس میدان میں بذات خود موجود تھے لیکن جب چند صحابہ کی غلطی کی وجہ سے نتائج کا سامنا ہوا تو آپ ﷺ تک بھی اس کے نقصانات پہنچے۔

غزوۂ اُحد میں صرف چند افراد نے غلطی کی اور اس کا خمیازہ سارے لشکر کو بھگتنا پڑا' اس کے مقابلے میں آج اس دور میں اگر ہم مسلمانوں کی غلطیوں' خطاؤں اور گناہوں کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ موجودہ حالات میں چند افراد ہی نہیں بلکہ امت کے اکثر افراد خطاؤں اور لغزشوں کے عادی ہو چکے ہیں لیکن یہ رب تعالیٰ کا فضل وکرم اور لطف وعنایت ہی ہے کہ اُس نے ابھی تک مسلمانوں کے گناہوں کی وجہ سے ان کو ہلاک نہیں کیا' آج ہمیں اپنے اعمال پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور اپنے اعمال کو درست کرنے میں ہی امت مسلمہ کی بقاء اور ترقی ہے' اگر آپ اس میں غور وفکر کریں گے تو اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ آج اگر ہم پوری دنیا کی اقوام پر نظر دوڑائیں تو پتا چلتا ہے کہ مسلم ممالک دن بدن اپنی نافرمانیوں اور دین سے دوری کی وجہ سے مغلوب ہوتے چلے جا رہے ہیں جب کہ دوسری باغی اقوام کفر کے باوجود اپنا غلبہ اور تسلط مضبوط کرتی جا رہی ہیں حالانکہ یہ کافر ہیں اور وہ مسلمان!

ہشتم: غزوۂ اُحد کے دوران ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ کو بھی سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا' آپ ﷺ کے پہلو اور چہرۂ انور پر زخم آئے' سر مبارک پر ضرب لگی' آپ ﷺ کا دانت مبارک شہید ہو گیا اور چہرے پر سے کافی خون بہا' یہ سب کچھ اُس غلطی اور خطا کا ایک نتیجہ تھا' یہ غلطی اُن چند افراد کی تھی جنہوں نے اپنے سپہ سالار قائد کی حکم عدولی کی۔

لیکن یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ کی شہادت کی خبر پھیلنے کی کیا حکمت تھی؟

جواب: بے شک مسلمانوں کا رسول اللہ ﷺ سے گہرا تعلق اور مضبوط رشتہ تھا اور آپ ﷺ کا اُن کے درمیان موجود ہونا ہی مسلمانوں کی قوت کی علامت تھا' اس وجہ سے مسلمان

کسی صورت میں بھی یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ شہید ہو گئے ہیں اور وہ کسی صورت میں یہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آپ ﷺ کے بعد وہ اپنا اتحاد قائم رکھنے اور لڑائی کرنے کی قدرت رکھ سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے آپ ﷺ کی وفات کی خبر کو دل و دماغ میں جگہ ہی نہ دی اور اس کو ایسے ہی ایک جھوٹی خبر سمجھا' اس بات میں شک نہیں کہ اگر حضور ﷺ کی وفات کی حقیقی خبر پر وہ بیدار ہوتے تو اس خبر سے ان کے دل پھٹ جاتے اور ان کے ایمان کی بنیاد متزلزل ہو جاتی بلکہ اُن میں سے اکثر لوگوں کے دلوں سے ایمان کا ہی خاتمہ ہو جاتا۔

اسی لیے اس میں واضح اور روشن حکمت تھی کہ یہ افواہ عام پھیلے' اور یہ اُن عظیم عسکری دروس میں سے ایک درسی تجربہ ہوتا کہ اس کے ذریعے مسلمان اُس حقیقت سے روشناس ہوں جو ان کے دلوں میں جاگزیں ہونی چاہیے اور یہ کہ اگر وہ پائیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان موجود نہیں رہے تو اُلٹے پاؤں نہ پلٹ جائیں۔

آپ ﷺ کی وفات کی خبر سن کر بعض مسلمانوں نے جو ہمت ہار دی اور ان میں جو کمزوری پیدا ہوئی' اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق مسلمانوں کی راہنمائی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ O (آل عمران: ۱۴۴)

اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول' گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول تو کیا! اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیے جائیں' پھر جاؤ گے تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) اور جو پھرتا ہے الٹے پاؤں تو نہیں بگاڑ سکے گا اللہ کا کچھ بھی اور جلدی اجر دے گا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو O

اس آیت مبارکہ میں پائے جانے والے درس کا مثبت اثر اُس وقت واضح ہوا' جس دن واقعی رسول اللہ ﷺ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے' حالانکہ اس سے پہلے غزوۂ اُحد کے موقع پر آپ ﷺ کی وفات کی خبر پھیلی تو اُس وقت مسلمانوں میں جو کیفیت پیدا ہوگئی' اس

کے تناظر میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ کہا گیا کہ اگر آپ ﷺ کا وصال ہو جانے تو تم اس حالت میں اپنے دین کو ہی نہ چھوڑ دینا جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں فرمایا گیا۔

لیکن جس دن واقعی آپ ﷺ کا وصال ہو گیا تو اُس وقت اس آیت مبارکہ نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور حقیقت کی طرف راہ نمائی کی' پس مسلمانوں نے غمگین وحزین دلوں کے ساتھ آپ ﷺ کو الوداع کہا اور پھر اپنے دین سے نہ پھرے بلکہ اُس امانت کا بوجھ اٹھانے کی طرف متوجہ ہوئے' جو آپ ﷺ چھوڑ گئے تھے۔ یہ امانت جہاد فی سبیل اللہ اور دعوتِ دین کی امانت تھی' پھر مسلمانوں نے اپنے عقیدے اور ایمان کو مضبوط رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اس امانت کا بوجھ اٹھانے کا حق ادا کر دیا۔

نہم: ہمیں اس میں غور وفکر کرنا چاہیے کہ غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں پر سخت حملہ ہوا تو اس دوران صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جس طرح آپ ﷺ کی حفاظت کی یہ منظر دیدنی تھا۔ صحابہ کرام آپ ﷺ کے اردگرد جمع ہو گئے اور دشمن کی طرف سے آنے والا ہر نیزہ' ہر تیر اور ہر تلوار کا وار اپنے جسموں پر کھاتے گئے' اس طرح کئی صحابہ کرام نے جسموں کو ڈھال بنائے رکھا اور یکے بعد دیگرے شہید بھی ہوتے گئے' اس دوران انہوں نے مال و جان کا خیال کیے بغیر صرف اور صرف آپ ﷺ کی حفاظت پر ہی توجہ رکھی' باقی سب کچھ بھول گئے اور یوں متعدد صحابہ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی اس عظیم اور عجیب قربانی کے پیچھے کیا مقصد کارفرما تھا' انہوں نے اپنی جانوں کو آپ ﷺ پر کیوں قربان کر دیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے نمبر پر تو وہ اللہ اور اس کے رسول پر پکا ایمان رکھتے تھے اور دوسرے نمبر پر انہیں آپ ﷺ کے ساتھ بے پناہ محبت تھی۔ یہ ایمان اور محبت دونوں ہی ایسی چیزیں تھیں جن کے سبب سے صحابہ کرام نے یہ حیرت انگیز قربانی دی' کیونکہ ایک مسلمان میں یہ دونوں چیزیں اکٹھی پائی جانی چاہئیں' کسی مسلمان کے ایمان کا دعویٰ اُس وقت تک صحیح اور کامل نہیں ہوتا جب تک کہ اُس میں اس عقیدۂ ایمان کے تقاضے کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت نہ پائی جائے۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من مالہ وولدہ والناس اجمعین۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے مال، اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اس کی وضاحت اس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر عقل اور دل دو چیزیں رکھی ہیں، عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان غور وفکر کرے اور اُن چیزوں پر صحیح طریقے سے ایمان لائے جن پر ایمان لانا ضروری ہے اور دل کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی محبوب چیزوں کی محبت رکھے اور اللہ تعالیٰ کی مبغوض چیزوں سے بغض رکھے۔ اللہ تعالیٰ کے محبوبوں سے محبت رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد ﷺ، جملہ انبیاء اور اولیاء سے بھی محبت رکھی جائے، اگر انسان اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے محبوبوں کی محبت نہیں رکھے گا تو پھر اس کا دل شہوات، ہوا وہوس اور حرام چیزوں کی محبت کی طرف مائل ہو جائے گا، اور جب دل میں شہوات اور نفسانی خواہشات کی محبت بھر گئی تو پھر اُس میں کسی قسم کی قربانی کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔

یہ ایسی بنیادی حقیقت ہے جس کا اقرار اخلاق وتربیت کے ماہرین بھی کرتے ہیں اور بے شمار تجرباتِ بدیہیہ بھی اس حقیقت پر دلیل ہیں۔

مثلاً جان جاک روسو اپنی کتاب ''اِمیل'' میں لکھتا ہے:

کتنی مرتبہ یہ کہا گیا اور یہ بات دہرائی گئی کہ اچھا کام کرنے کی رغبت محض عقل کی بنیاد پر ہے، کاش! اس بات کی کوئی مضبوط اور پختہ بنیاد ہوتی! یہ کون سی بنیاد ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ اچھا کام نظام کی بنیاد پر ہوتا ہے، لیکن نظام پر ایمان کیا میری خاص مسرت پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے؟ یہ نام نہاد اصول ومبادی محض الفاظ کا کھیل ہیں، اس لیے کہ بُرا فعل بھی تو نظام سے محبت کی وجہ سے ہوتا ہے مختلف شکلوں میں۔

اسی حقیقت کی بنیاد پر امریکی حکومت اس چیز کو نافذ نہ کر سکی جس پر وہ ایمان لائی اور جس کے فوائد کو اس نے تسلیم کیا۔ وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۳ء میں جب امریکہ میں ہر قسم کی تقریبات

[1] اس موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھئے: ہماری کتاب ''تجربۃ التربیۃ الاسلامیۃ فی میزان البحث''۔

اور تمام کلبوں میں شراب کو ممنوع قرار دیا گیا تو اس وقت سب لوگوں نے اس کے فوائد کو مانا اور تسلیم کیا' لیکن بالکل تھوڑا عرصہ ہی گزرا کہ اُن قانون سازوں نے اس آرڈر سے روگردانی اختیار کرنا شروع کر دی اور بالآخر اس قانون کو منسوخ کرتے ہوئے سب دوبارہ شراب نوشی کی طرف مائل ہو گئے' اور وہ قانون دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے صرف اس قانون کے فوائد کو ہی مانا تھا' اس سے محبت نہیں کی تھی۔

جب کہ دوسری طرف اصحابِ رسول جو تہذیب و تمدن' ثقافت اور شراب کے فوائد و نقصانات کے جاننے میں آج کے امریکیوں کی طرح نہیں تھے لیکن انہوں نے جوں ہی شراب کی حرمت کا سنا کہ شراب کی حرمت کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے' وہ صحابہ کرام اپنے شراب کے بھرے ہوئے مٹکوں کی طرف بھاگے' ان کو توڑ دیا' شراب کو بہا دیا حتیٰ کہ شراب پینے والے برتنوں کو بھی توڑ دیا اور سب مل کر اونچی آواز سے یہ پکار اُٹھے: ہم نے چھوڑ دیا اے رب! ہم نے چھوڑ دیا۔

ان دونوں واقعات میں فرق یہ ہے کہ امریکی قانون کو لوگ صرف مانتے تھے لیکن اُس نظام سے محبت نہیں تھی جب کہ یہاں صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اوامر کو مانتے بھی تھے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے ٹوٹ کر محبت بھی کرتے تھے' اس لیے یہاں تو ایسا پکا عمل ہوا جس کی مثال نہیں ملتی' لیکن وہاں عمل صرف چند دن رہا پھر قانون توڑ دیا گیا۔

یہ محبت ہی تھی کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی جانیں آپ ﷺ کی خاطر قربان کر دیں' آپ ﷺ کی خاطر اپنا خون بہایا اور آپ ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے موت کو گلے لگا لیا۔

غزوۂ احد کے دوران کئی ایسے واقعات رونما ہوئے کہ جن سے عشق و محبت کی ایسی داستانیں رقم ہوتی ہیں کہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ جب محبت کسی دل میں گھر کر لیتی ہے تو اس کے کیا کیا اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

ابن ہشام روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: تم میں کون سعد بن ربیع کی خبر لائے گا کہ وہ زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں؟ ایک انصاری صحابی نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میں دیکھ کر آتا ہوں کہ سعد کا کیا بنا ہے؟ وہ شخص تلاش کے لیے گیا'

انہوں نے جا کر دیکھا تو وہ شہداء کے درمیان زخمی حالت میں پڑے تھے اور وہ جاں بلب تھے۔
صحابی کہتے ہیں: میں نے حضرت سعد بن ربیع سے کہا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے تمہاری خبر گیری کا حکم دیا ہے کہ آیا تم زندہ ہو یا وفات پا چکے ہو؟ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب تو میں قریب المرگ ہوں' میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں سلام پیش کرنا اور عرض کرنا کہ سعد بن ربیع آپ سے عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے بہترین جزاء عطا فرمائے ویسی ہی جزاء جیسی کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بھی نبی کو اس کی امت کی طرف سے دیتا ہے اور اپنی قوم کو میری طرف سے سلام پہنچانا اور انہیں کہنا کہ سعد بن ربیع نے تمہیں یہ کہا ہے کہ اگر کوئی دشمن تمہارے نبی ﷺ تک پہنچ گیا اور تم میں سے ایک آدمی بھی آنکھیں جھپک رہا ہوا (زندہ ہوا) تو تم اللہ تعالیٰ کی جناب میں کوئی عذر پیش نہیں کر سکو گے۔
انصاری صحابی کہتے ہیں: یہ کہنے کے بعد انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دی۔

ہمارے آج کے اس زمانے میں جس دن بھی مسلمانوں کے دل اس طرح کی محبت سے معمور ہو گئے اور اس محبت نے انہیں ان کی خواہشاتِ نفس اور انانیت سے کچھ دور کر دیا اور یہ محبت کا جذبہ ان پر غالب آ گیا تو میں کہتا ہوں جس دن یہ محبتِ رسول مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہو گئی' اُسی دن یہ ایک نئی مخلوق کے طور پر اُبھریں گے' اور فتح و کامرانی موت کے جبڑوں سے بھی نکال لائیں گے اور اپنے دشمنوں پر غلبہ پالیں گے خواہ اس میں کتنی ہی رکاوٹوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑے۔

اگر آپ پوچھیں کہ ایسی محبت پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ تو اس کے متعلق جانئے کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کثرت سے ذکرِ الٰہی اور کثرت سے رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام بھیجنے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور عطاؤں میں غور و فکر کرنے اور کثرت سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور اخلاق و شمائل میں غور و خوض کرنے سے محبت کی یہ معراج حاصل ہوتی ہے' اور یہ سب کچھ خشیتِ الٰہی اور حضورِ قلب کے ساتھ عبادات پر استقامت کے بعد اور وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور انابت کے بعد کیا جائے۔

دہم: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حضور ﷺ نے مسلمان شہداء کو ان کے خون آلود کپڑوں سمیت دفن کرنے کا حکم دیا اور ان پر نمازِ جنازہ بھی نہ پڑھی اور آپ نے

ایک ایک قبر میں دو دو شہداء کو دفن کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل مبارک سے فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ معرکۂ جہاد میں شہید ہونے والے کو نہ غسل دیا جائے اور نہ ہی اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے بلکہ اس کو خون آلود کپڑوں کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ متعدد احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدانِ جنگ میں شہید ہونے والوں کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔

لیکن ایک روایت جو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس دس شہداء اُحد پر نمازِ جنازہ پڑھی اور ہر بار دس شہداء میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی شامل کیا جاتا' یوں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی' یہ روایت ضعیف اور غلط ہے۔

(دیکھیے: مغنی المحتاج ج۱ ص۳۴۹)

یہاں سے فقہاء نے ایک استدلال یہ بھی کیا ہے کہ بامرِ مجبوری ضرورت کے وقت ایک قبر میں ایک سے زیادہ میتیں بھی دفنائی جا سکتی ہیں لیکن اگر ضرورت نہ ہو تو ایسا کرنا جائز نہیں۔

یازدہم: جب ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس عمل پر غور کرتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدانِ اُحد سے مدینۃ المنورہ پہنچے تو دوسرے دن دوبارہ دشمن کا پیچھا کرنے کا حکم صادر فرمایا اور سب صحابہ دوسرے دن پھر اسلحہ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں مشرکین کا پیچھا کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس واقعہ سے ہمیں جنگ کرنے اور فتح پانے کے کئی دروس ملتے ہیں' اور اس کے سلبی وایجابی نتیجہ کے بارے میں آگاہی ملتی ہے' اور اس واقعہ سے روزِ روشن کی طرح عیاں اور واضح ہو گیا کہ بے شک فتح ونصرت حاصل کرنے کے لیے صبر وبرداشت' اطاعتِ امیر اور خالصۃً دینی مقصد کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم نے ملاحظہ کیا کہ صحابہ کرام کے مدینۃ المنورہ پہنچنے کے دوسرے روز ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دوبارہ مشرکین کا پیچھا کرنے کا حکم صادر فرما دیا' حالانکہ سب صحابہ کرام زخمی تھے اور تکلیف میں تھے' لیکن جونہی دوسرے روز انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم سنا' وہ اپنے گھروں میں آرام واستراحت کیے بغیر' اپنے زخموں کی پرواہ کیے بغیر' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی

کرتے ہوئے مشرکین کا پیچھا کرنے کے لیے نکل پڑے کیونکہ فتح و نصرت کا جذبہ اب بھی ان کے ذہنوں میں ماند نہیں پڑا تھا' اس کا شعلہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

اس دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وہی لوگ نکلے جو نہ تو مالِ غنیمت کا طمع رکھتے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی دنیوی مقصد تھا' بلکہ ان کا صرف اور صرف دینی مقصد تھا' وہ یا تو فتح و نصرت کی اُمید رکھتے تھے اور یا اللہ کے راستے میں شہادت کے خواہش مند تھے' اسی وجہ سے وہ اپنے گہرے اور تکلیف دِہ زخموں کے باوجود دوبارہ میدانِ عمل میں نکل پڑے۔

اس سے کیا نتیجہ ظاہر ہوا؟

مشرکینِ مکہ جن کے ذہن فتح و نصرت کے خیال سے معمور تھے اور دلوں میں اپنے دشمن پر غلبہ پانے کی خواہشات مچل رہی تھیں' وہ بالآخر فتح و نصرت اور غلبہ پانے سے قاصر رہے اور وہ مسلمان جو زخموں سے چور چور تھے اور کرب میں مبتلا تھے' وہ بالآخر شکست سے دوچار نہ ہوئے۔

اس کے لیے حکمتِ عملی کیا تھی؟

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھی جس میں مسلمانوں کے لیے درس اور نصیحت ہے۔

یہ سب کچھ اس طرح واقع ہوا کہ مشرکین کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب طاری ہو گیا' اور جب وہ مدینۃ المنورہ پر حملہ کی تیاری کر رہے تھے تو ان کے پاس سے گزرنے والے ایک مسافر نے انہیں مسلمانوں کی بھرپور تیاری اور ان کا پیچھا کرنے کی خبر دی اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے صحابہ اب کی بار موت بکھیرنے کے لیے آرہے ہیں' یہ سنتے ہی مشرکین نے مدینۃ المنورہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ ترک کر کے جلدی جلدی مکہ کی طرف الٹے پاؤں لوٹ گئے۔

وہ مشرکین جنہوں نے ایک دن ہی پہلے مسلمانوں کو کافی حد تک زخمی کیا اور ان کو کافی نقصان پہنچایا' انہیں بُری طرح قتل کیا اور فتح و نصرت کے نشے میں چور تھے' ان کے دلوں میں یک دم مسلمانوں کا رعب کیسے طاری ہو گیا؟

اس میں مشیتِ الٰہی ہی کارفرما تھی' جس نے اس پورے واقعہ کو مسلمانوں کے لیے ایک بلیغ درس بنا دیا' جس میں بیک وقت ایجابی اور سلبی دونوں مظہر جمع ہو گئے ہیں۔

آخر میں غزوۂ احد سے حاصل ہونے والے مواعظ کی تکمیل کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ ۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ۝ (آل عمران: ۱۷۲-۱۷۴)

جنہوں نے لبیک کہا اللہ اور رسول کی دعوت پر اس کے بعد کہ لگ چکا تھا انہیں (گہرا) زخم ان کے لیے جنہوں نے نیکی کی ان میں سے اور تقویٰ اختیار کیا اجرِ عظیم ہے ۝ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کہا انہیں لوگوں نے کہ بلاشبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لیے (بڑا سامان اور لشکر) سو ڈرو ان سے تو (اس دھمکی) نے بڑھا دیا ان کے (جوشِ) ایمان کو اور انہوں نے کہا: کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ اور وہ بہترین کارساز ہے ۝

واقعہ رجیع و بئرِ معونہ

اوّل: واقعہ رجیع (ہجرت کا تیسرا سال)

غزوۂ اُحد کے بعد قبیلہ عضل اور قبیلہ قارہ کے چند لوگ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارے قبائل تک اسلام کا پیغام پہنچا ہے' لہٰذا ہمیں کچھ ایسے افراد کی ضرورت ہے جو ہمیں اسلام کی تعلیمات سے پوری طرح آگاہ کریں' چنانچہ آپ ﷺ نے چند صحابہ کرام پر مشتمل ایک وفد ان کے ساتھ روانہ کیا' جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مرثد بن ابی مرثد' خالد بن البکیر' عاصم بن ثابت' خبیب بن عدی' زید بن الدثنہ اور عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہم۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کے اس وفد کا امیر حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بنایا۔

امام بخاری، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مبلغ صحابہ کرام کا یہ وفد مدینۃ المنورہ سے روانہ ہوا، یہاں تک کہ مکہ اور عسفان کے درمیان پہنچا تو انہوں نے (بدعہدی کرتے ہوئے) قبیلہ ھذیل کی ایک شاخ بنولحیان کو اُکسایا تو اس قبیلے کے لوگوں نے سو سے زائد تیر اندازوں کے ساتھ ان مبلغ صحابہ کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ پیچھا کرتے کرتے ایک ایسی جگہ پر پہنچے جہاں ان کو کچھ کھجوروں کی گٹھلیاں ملیں، جو مبلغ صحابہ مدینۃ المنورہ سے لائے تھے۔ حملہ آور یہ دیکھ کر پہچان گئے کہ یہ کھجوریں یثرب ہی کی ہیں، اسی طرح وہ حملہ آور پیچھا کرتے ہوئے مبلغ صحابہ کرام کے مزید قریب پہنچ گئے حتیٰ کہ حملہ آوروں نے مبلغ صحابہ کے وفد کو جالیا، حضرت عاصم اور ان کے ساتھیوں کو پتا چلا کہ ان کا پیچھا کیا جارہا ہے تو انہوں نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر پناہ لی، تیر انداز حملہ آوروں نے آکر انہیں گھیر لیا اور اُن کفار نے کہا: ہم آپ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر آپ ہمارے پاس نیچے اتر آئیں گے تو ہم آپ کو قتل نہیں کریں گے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں کسی کافر کا ذمہ قبول کر کے نہیں اتروں گا، پھر دعا کی: اے اللہ! تو اپنے رسول کو ہمارے حال سے مطلع فرما دے، پھر وہ جذبہ جہاد سے بھرے ہوئے ٹیلے سے اترے اور کفار سے جہاد شروع کر دیا، حتیٰ کہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سمیت سات صحابہ کرام نے اُن سے لڑ کر جامِ شہادت نوش کر لیا۔

تین صحابہ، حضرت خبیب، حضرت زید اور ان کے ایک اور ساتھی ٹیلے پر باقی رہ گئے، کفار نے ان صحابہ کرام کو امان کا عہد اور میثاق دیا، یہ صحابہ کرام کفار کے اس عہد اور میثاق پر اعتماد کرتے ہوئے نیچے اُتر آئے تو کفار نے بدعہدی کرتے ہوئے اپنی کمان کی تانتوں سے ان کو باندھنا شروع کر دیا، یہ منظر دیکھ کر ان صحابہ کے تیسرے ساتھی حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تم لوگوں کی پہلی بدعہدی ہے، انہوں نے ان تیر اندازوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا، ان لوگوں نے انہیں گھسیٹ کر لے جانا چاہا اور خوب مارا پیٹا بھی، مگر وہ ان کے ساتھ نہ گئے تو انہیں شہید کر دیا گیا۔

جب کہ حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کو انہوں نے باندھ دیا تھا، اس لیے یہ دونوں صحابہ کرام مجبور ہو گئے تھے، کافروں نے ان دونوں صحابہ کرام کو مکہ لے جا کر مشرکین

مکہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث کے بیٹوں نے خریدا کیونکہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے ہی بدر کے روز حارث کو قتل کیا تھا' اس لیے حارث کے خاندان والے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ بنو حارث کے ہاں قید رہے' جب بنو حارث ان کو شہید کرنے پر متفق ہو گئے اور آپ کو شہید کرنے کا وقت متعین کر لیا تو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے حارث کی ایک بیٹی سے اُسترا منگوایا تاکہ وہ شہادت سے قبل صفائی کر لیں' وہ عورت کہتی ہے کہ میں اپنے بچے سے تھوڑی دیر کے لیے غافل ہو گئی' وہ بچہ آہستہ آہستہ خبیب کے قریب ہو گیا تو خبیب نے بچے کو اپنی ران پر بٹھا لیا' جب اچانک میں نے یہ منظر دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں اُسترا ہے اور میرا بچہ ان کی گود میں ہے تو میں چیخنے چلانے لگی' اس پر خبیب نے کہا: اے عورت! کیا تو خوف زدہ ہے کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؟ لیکن میں ان شاء اللہ ایسا کرنے والا نہیں ہوں' یہ سن کر وہ عورت کہنے لگی: میں نے خبیب سے بڑھ کر کوئی اچھا قیدی نہیں دیکھا۔

وہ کہتی ہے: میں نے ایک دن دیکھا کہ یہ قید کے دوران انگوروں کا بڑا سا گچھا کھا رہے تھے حالانکہ اُن دنوں مکہ میں یہ پھل موجود نہیں تھا' حالانکہ وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ رزق انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی جنابِ خاص سے عطا فرمایا تھا' پھر جب حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے جایا گیا تو آپ نے فرمایا: مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو' پھر نماز پڑھنے کے بعد جب کفار کی طرف متوجہ ہوئے تو فرمایا: اگر تم لوگ یہ خیال نہ کرتے کہ میں موت کے ڈر سے نماز لمبی کر رہا ہوں تو میں اس کو مزید لمبا کرتا۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنی پھانسی سے قبل دو رکعتیں نماز پڑھی۔

اس کے بعد آپ نے یہ اشعار پڑھے:

ولست ابالی حین اقتل مسلما ۔۔۔ علی ای شق کان فی اللہ مصرعی

(ترجمہ:) جب میں مسلمان ہو کر قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں کس پہلو پر قتل کیا جاؤں گا۔

وذلک فی ذات الالہ وان یشاء ۔۔۔ یبارک علی اوصال شلو ممزع

(ترجمہ:) یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے اگر وہ چاہے گا تو میرے کٹے پھٹے جسم کے ٹکڑوں پر برکت نازل فرمائے گا۔

پھر عقبہ بن حارث اٹھا اور اُس نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

اُدھر قریش نے چند لوگوں کو بھیجا کہ وہ رجیع کے مقام سے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے جسم کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر لائیں تاکہ وہ کسی طرح پہچان سکیں کہ واقعی حضرت عاصم قتل ہو چکے ہیں کیونکہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں قریش کے ایک سردار کو قتل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی رکھوالی کے لیے شہد کی مکھیوں کا ایک غول بھیج دیا' جس نے اُن پر پردہ ڈال دیا اور کفار آپ رضی اللہ عنہ کی لاش تک نہ پہنچ سکے اور ناکام واپس لوٹے۔

(صحیح البخاری ج ۵ ص ۴۱)

طبری نے یہاں کچھ اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتا چلا کہ مشرکین نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش کو سولی پر لٹکا رکھا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تن تنہا جاسوس کو قریش کی جاسوسی کے لیے بھیجا' وہ فرماتے ہیں: لوگوں کی نظروں سے بچتے بچتے میں جب حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی سولی والی لکڑی کے قریب پہنچا تو اس پر چڑھ کر میں نے بندھن کھولے' حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش سولی سے زمین پر گر پڑی' میں قریب ہی تھا' پھر میں نے دوبارہ لاش کو دیکھا تو وہاں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش موجود نہیں تھی' گویا کہ ان کی لاش کو زمین نے نگل لیا تھا' اور میں نے ان کے کسی جسم کے حصے کو نہ پایا۔ اس لیے اب قیامت تک حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش کو نہیں ڈھونڈا جا سکے گا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: جب کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ جو کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے ساتھی تھے' ان کو مکہ کے صفوان بن امیہ نے خریدا' جب ان کو قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لایا گیا تو ان کو ابوسفیان نے کہا: اے زید! اللہ کے واسطے مجھے بتاؤ! کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اس وقت تیری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوتے اور ہم ان کی گردن مار دیتے اور تم بخیر و عافیت اپنے اہل و عیال میں ہوتے؟

آپ نے جواب دیا:

خدا کی قسم! میرے لیے تو یہ امر بھی ناقابل برداشت ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت

جہاں ہیں، وہیں ان کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے اور میں گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں۔

یہ جواب سن کر ابوسفیان کہنے لگا:

میں نے کسی آدمی کو کسی سے اتنی محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد (ﷺ) کے اصحاب محمد (ﷺ) سے کرتے ہیں۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۲)

دوم: واقعۂ بئر معونہ (ہجرت کا چوتھا سال)

قبیلہ کلاب کا سردار عامر بن مالک جو ملاعب الاسنۃ (نیزوں سے کھیلنے والا) کے لقب سے مشہور تھا، مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے اُس پر دینِ اسلام پیش کیا لیکن اُس نے نہ تو اسلام قبول کیا اور نہ ہی اسلام سے برہمی کا اظہار کیا، اُس نے عرض کی: اے محمد (ﷺ)! اگر آپ اپنے صحابہ کی ایک جماعت اہل نجد کی طرف روانہ کریں جو انہیں آپ کے اس دین کی دعوت دیں تو مجھے اُمید ہے کہ وہ آپ کی اس دعوت کو قبول کرلیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

انی اخشی علیهم اهل نجد. مجھے اندیشہ ہے کہ اہل نجد ان کو نقصان پہنچائیں گے۔

عامر نے کہا: میں ان کو اپنی پناہ دیتا ہوں، آپ انہیں روانہ فرمائیں تاکہ یہ صحابہ اُن لوگوں کو آپ کے دین کی دعوت دیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے جلیل القدر صحابہ کرام میں سے ستر (۷۰) کو اس کے ساتھ روانہ فرمایا۔

ابن کثیر اور ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ واقعہ غزوۂ اُحد سے چار ماہ بعد ماہِ صفر میں ہوا، پس صحابہ کرام کا یہ وفد روانہ ہوا اور چلتے چلتے بئر معونہ کے پاس پہنچ گئے، جب انہوں نے یہاں پڑاؤ کرلیا تو انہوں نے حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کا مکتوبِ گرامی دے کر عامر بن طفیل کے پاس بھیجا، جب آپ رضی اللہ عنہ اُس کے پاس مکتوبِ گرامی لے کر آئے تو اُس اللہ کے دشمن نے مکتوبِ گرامی کو دیکھنا تک بھی گوارا نہ کیا اور حضرت حرام بن ملحان پر حملہ کرکے آپ کو شہید کر دیا۔

امام بخاری، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یوں نقل کرتے ہیں کہ حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کو جب نیزہ مارا گیا اور آپ کے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑے

تو آپ نے پکارا: ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ (بخاری ج ۵ ص ۴۳)

پھر عامر بن طفیل نے مسلمانوں کے خلاف بنی عامر کو اُکسایا تاکہ وہ بقیہ مبلغین کو بھی قتل کریں، لیکن بنو عامر نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا: ابو براء نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور ان کو پناہ دی ہے، ہم اس کے معاہدے کو نہیں توڑیں گے، پھر اُس نے مسلمانوں کے خلاف بنو سلیم کی شاخوں عُصیہ، رعل اور ذکوان کو للکارا، ان قبائل نے اس کی للکار پر لبیک کہی اور سب نے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور ان کے خیموں کا محاصرہ کر لیا، جب مسلمانوں نے انہیں دیکھا تو اپنی تلواریں بے نیام کر لیں اور ان کے ساتھ جنگ کی، یہاں تک کہ سب کے سب شہید ہو گئے۔

عمرو بن امیہ الضمیری اور ان کے ایک ساتھی (عمرو بن عوف) یہاں سے دُور چراگاہ میں اپنے اس وفد کے اونٹ چرا رہے تھے، ان کے ساتھیوں پر جو گزری اس کا علم انہیں بعد میں ہوا، جب وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدافعت کے لیے آئے تو حضرت عمرو بن امیہ الضمیری کے ساتھی کو تو یہاں پر شہید کر دیا گیا جب کہ آپ بچ نکلے، پھر انہوں نے مدینہ واپسی کا سفر شروع کیا، جب حضرت عمرو بن امیہ ضمیری مدینہ جا رہے تھے تو راستے میں دو مشرکوں سے ملاقات ہوئی، آپ نے خیال کیا کہ یہ بنی عامر کے لوگ ہیں، آپ نے ان دونوں کو اپنے مسلمان بھائیوں کا بدلہ لیتے ہوئے قتل کر دیا، پھر جب آپ مدینۃ المنورہ میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچے اور سارے واقعہ کی خبر دی تو پتا چلا کہ وہ دونوں مشرک، قبیلہ بنی کلاب سے تھے اور نبی اکرم ﷺ نے انہیں امان دی تھی، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

لقد قتلت قتيلين لا دينهما — تم نے دو آدمی قتل کر دیے ہیں جن کی دیت میں ضرور ادا کروں گا۔

آپ ﷺ کو ان مبلغ صحابہ کرام کی شہادت کا گہرا دُکھ ہوا، اس لیے آپ اس کے بعد ایک مہینہ تک نمازِ فجر میں دعاءِ قنوت پڑھتے رہے اور قبیلہ رعل، ذکوان، بنی لحیان اور عصیہ کے خلاف دعاءِ ضرر کرتے رہے۔[1]

---

[1] دیکھیے: سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۳، رسول اللہ ﷺ کے دعاءِ قنوت پڑھنے اور قبائل سلیم کے خلاف دعائے ضرر کرنے کی روایت بخاری و مسلم نے بھی نقل کی ہے۔

اسباق ونصائح

ان دونوں حادثات سے چند اہم اسباق ونتائج حاصل ہوتے ہیں، جنہیں ہم سطورِ ذیل میں بیان کرتے ہیں:

اوّل: واقعہ رجیع اور واقعۂ بئرِ معونہ کے دونوں واقعات میں جو بات مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان دعوتِ دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے دوسرے علاقوں میں گئے اور کفار کی غداری کی وجہ سے مسلمان مبلغین کو یہ حادثات پیش آئے۔ معلوم ہوا کہ دعوتِ دین کی ذمہ داری اور دینِ اسلام کے احکام وحقائق دوسروں تک پہنچانے کا کام صرف انبیاء، رسل، اولیاء و علماء کا ہی نہیں بلکہ یہ ذمہ داری سب مسلمانوں پر برابر عائد ہوتی ہے۔

اس سے محسوس ہوتا ہے کہ دعوتِ دین کی ذمہ داری کا قیام کتنا اہم اور ضروری ہے۔ یوم الرجیع کے واقعہ میں چھ صحابہ کرام کی شہادت کو ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عامر بن مالک کے کہنے پر اہلِ نجد کی طرف ستر نوجوان قراء اور جلیل القدر صحابہ کو پھر روانہ فرما دیا، اس دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ تحفظات کا اظہار بھی فرمایا لیکن عامر بن مالک کے بار بار اصرار کرنے اور صحابہ کرام کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لینے کا عہد کرنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتِ دین کے لیے ستر بہترین صحابہ کرام کی جماعت کو روانہ فرمایا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھتے تھے کہ چاہے حالات کیسے ہی ہوں دعوت دین اور تبلیغ اسلام کا کام سب سے ضروری اور اہمیت کا حامل ہے۔ دعوتِ دین کو پھیلانا ہم سب کی ذمہ داری ہے، یہ کسی صورت میں بھی رُک نہیں سکتی، اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطرے کا اظہار فرمایا لیکن پھر بھی بہترین صحابہ کرام کی جماعت روانہ کی اور نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑا کہ آگے جو اللہ تعالیٰ چاہے گا وہی ہوگا، اور اس دعوت کے راستے میں جو مقدر ہوا اس کو بہ خوشی قبول کریں گے۔

دوم: ہم نے اس کتاب کے پہلے حصے میں یہ ذکر کیا ہے کہ مسلمان کے لیے دار الکفر یا دار الحرب میں اس صورت میں رہنا جائز نہیں اگر اپنے دین پر اعلانیہ عمل کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو، اسی طرح اگر اپنے دین کا اظہار اور اعلانیہ اس پر عمل ممکن بھی ہو تب بھی دار الکفر یا دار الحرب میں قیام کرنا مکروہ ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سیرت طیبہ کے اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ اگر ایک مسلمان دین کی تبلیغ اور دین کی ترویج کے لیے دار الکفر میں قیام کرتا ہے تو یہ

صورت جائز ہے' کیونکہ یہ جہاد کی ہی ایک صورت ہے۔ سب مسلمانوں پر اس کی یہ ذمہ داری فرضِ کفایہ کی صورت میں لازم آتی ہے یعنی اگر چند مسلمان تبلیغِ دین کا فریضہ ادا کر رہے ہیں تو یہ سب کی طرف سے بھی ادا ہو جائے گا اور اس صورت میں سب مسلمان گناہ گار نہیں ہوں گے' لیکن اگر کوئی بھی اسے انجام نہیں دیتا تو سب مسلمانوں پر اس کا گناہ ہوگا۔

(دیکھیے: مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۳۹)

سوم: واقعہ رجیع اور واقعہ بئر معونہ دونوں سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ مشرکین کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کتنی نفرت اور بُغض بھرا ہوا تھا' جس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف بدعہدی اور غداری جیسے افسوس ناک عمل کا اظہار کیا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ہم ذرا اس پہلو کو چھوڑ کر اس واقعہ کے دوسرے پہلو کو دیکھیں تو یہ انتہائی دل کش اور روشن ہے اور اپنی ماہیت کے لحاظ سے اس سے بالکل مختلف ہے' جس کا مظاہرہ ان مسلمانوں کی جانب سے ہوتا ہے جو مشرکین کی اس غداری اور بدعہدی کا شکار ہوئے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ بنو حارث کے ہاں قید میں کیسے اپنی پھانسی کا انتظار کر رہے ہیں' انہوں نے استرا مانگا تا کہ وہ پاک صاف ہو کر موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہو جائیں' گھر میں ایک چھوٹا بچہ ہے جو ماں کی غفلت کے باعث آہستہ آہستہ چل کر ان کے پاس آ جاتا ہے' یہ وقت اس شخص کے نزدیک جسے زندگی اور انتقام کی فکر ہو' غداری کے مقابلے میں غداری کا ایک سنہرا موقع تھا اور تمام گھر والے بھی اسی انداز میں سوچتے تھے' جب ماں کو بچے کا خیال آیا تو اُس نے دیکھا کہ بچہ تو حضرت خبیب کے پاس ہے تو وہ بہت خوف زدہ ہوگئی اور بچے کو یقینی موت کے ان پنجوں سے نجات دلانے کے لیے بے چین ہوگئی' لیکن اُس وقت اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ حضرت خبیب بچے کو اپنی گود میں بٹھا کر شفیق باپ کی طرح پیار کر رہے ہیں' اسی عالم میں جب حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے اُس عورت کو دیکھا تو انہوں نے اُس عورت کو خوف زدہ پایا اور اس کے خوف کی وجہ بھی بھانپ گئے' وہ پورے سکون سے ایک حلیم اور مطمئن مؤمن کے انداز میں اُس سے پوچھنے لگے: اے عورت! کیا تو اس لیے ڈر رہی ہے کہ میں اس بچے کو قتل کر دوں گا؟ ان شاء اللہ میں ایسا کرنے والا نہیں ہوں۔

آپ غور کریں کہ اسلام نے کس طرح ایک انسان کی بہترین تربیت کی ہے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اس کی خوب صورت مثال ہیں' جب کہ دوسری طرف مشرکین کا کردار بھی دیکھیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا عہد بھی توڑا' ان سے بغض اور کینہ بھی رکھا اور غدر کرتے ہوئے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو موت کے گھاٹ اتارنے والے ہیں' یہ دونوں عرب تھے' ایک ہی زمین پر پیدا ہوئے اور پروان چڑھے' عرب کی سرزمین جہاں کے یہ سب باشندے تھے' ان کی روایات طبیعتیں اور عادات ایک جیسی تھیں' جو حقد و کینہ اور ظلم پر مبنی تھیں' لیکن انہی عرب باشندوں میں سے ایک حضرت خبیب رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا اور اسلامی تربیت نے ان کو معراجِ انسانیت تک پہنچا دیا' اور انہیں ایک دوسرا اعلیٰ انسان بنایا' جب کہ اُسی علاقے کے رہنے والے وہ مشرکین جو اپنی گمراہی' ظلم اور وحشت زدہ عادات کا اظہار کرر ہے تھے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اسلام کے ذریعے انسانی طبیعت میں کتنی عظیم تبدیلی واقع ہوئی ہے!

چہارم: گزشتہ واقعہ سے یہ استدلال بھی کیا جاتا ہے کہ قیدی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ دشمن کی امان قبول کرنے سے انکار کر دے اور اپنے اوپر کافر دشمن کو کلی اختیار نہ دے یعنی کافر کا حکم اپنے اوپر روا نہ رکھے اور اپنے آپ کو کافر کے ماتحت نہ لائے اگرچہ اس دوران قتل ہی کیوں نہ ہو جائے' جیسے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے کیا جیسا کہ وہ لڑتے لڑتے شہید تو ہو گئے لیکن اپنے آپ کو کافر کے حوالے نہیں کیا۔

لیکن اگر مسلمان کو امید ہو کہ نجات مل جائے گی اور خلاصی ہو جائے گی تو اس صورت میں خلاصی اور رہائی کی اُمید کرتے ہوئے دشمن کی امان کو قبول کر لینے کی رخصت ہے جیسے حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما نے کیا' لیکن اگر قیدی بھاگ سکتا ہے تو اسے ضرور ایسا کرنا چاہیے' یہی صحیح رائے ہے۔

خواہ حالت قید میں رہتے ہوئے اس کے لیے دین پر عمل کرنا اور اظہار کرنا ممکن بھی ہو' کیونکہ کفار کے ہاتھوں میں مسلمان قیدی پر ظلم و ستم' جبر اور ذلت مسلط کی جاتی ہے' اس لیے مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہر صورت میں ذلت و رسوائی والی قید سے نجات حاصل کرے۔

(نہایۃ المحتاج للرملی ج ۸ ص ۸۷)

پنجم: جب ہم حضرت زید بن الدثنہ رضی اللہ عنہ کے اُس جواب پر غور کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی پھانسی سے قبل ابو سفیان کو دیا' جس میں آپ نے کہا: خدا کی قسم! میرے لیے تو یہ امر بھی ناقابل برداشت ہے کہ میرے آقا کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں اس وقت تشریف فرما ہیں' ان کے پاؤں کے تلوے میں کانٹا بھی چبھے اور میں گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ صحابہ کرام کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کتنی محبت موجزن تھی' بے شک یہ اُن اہم اسباب میں سے تھی جنہوں نے ان کے دلوں میں اللہ کے دین کے راستے میں اور اس کے رسول کے دفاع کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانی کو پسندیدہ بنا دیا' کوئی بھی مسلمان اپنے ایمان میں کتنے ہی بلند مرتبے پر فائز ہو جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اس قسم کی شدید محبت کے بغیر اس کا ایمان ناقص ہے۔

اس کی تصریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے ہوتی ہے' ارشادِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من مالہ وولدہ ووالدہ والناس اجمعین. (متفق علیہ)	تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے مال' باپ' اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ششم: حضرت خبیب رضی اللہ عنہ جس دوران مکہ میں قید رہے' اُس دوران جو محیر العقول واقعات رونما ہوئے' اس کے بارے میں وضاحت یہ ہے کہ کوئی خرقِ عادت اور خلاف معمول کام جو نبی سے سرزد ہوتا ہے اس کو معجزہ کہتے ہیں اور ایسا ہی کام جو اللہ تعالیٰ کے ولی سے سرزد ہوتا ہے اُس کو کرامت کہتے ہیں۔

لیکن معجزہ نبی کے دعویٰ نبوت سے ملا ہوا ہوتا ہے' جب کہ اولیاء و صالحین کی کرامات بغیر کسی دعویٰ کے سرزد ہوتی ہیں' یہ مؤقف جمہور اہل سنت و جماعت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو عزت و کرامت حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو ان کی شہادت سے ذرا پہلے عطا فرمائی' یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے' یہ بات اس صحیح حدیث طیبہ سے ثابت ہے جسے امام بخاری اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔

ہفتم: بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ نوجوان صحابہ کرام جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اپنے گھروں سے اسلام کی تبلیغ و ترویج کے لیے نکلے تھے' ان پر کفار نے غلبہ حاصل کر لیا' ان کے ساتھ غداری کی اور ان کو شہید کر دیا' اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ان پر غلبہ کیوں دیا؟ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے دشمنوں پر کیوں نہ غالب کیا' اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اس بات کا جواب ہم نے پہلے بھی کئی مرتبہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بالخصوص دو اُمور سرانجام دینے کا پابند ٹھہرایا ہے:

(۱) اسلامی معاشرے کا قیام

(۲) اس کام کے لیے ہر مشکل اور کٹھن راستے پر چل کر ہر قسم کی کوشش بروئے کار لانا

اس میں حکمت یہ پوشیدہ ہے کہ انسان کی بندگی اور عبودیت اللہ تعالیٰ کے لیے مضبوط اور واضح ہو جائے' اور دین کے راستے میں آنے والی مشکلات کے نتیجے میں صادقین اور منافقین میں فرق ہو جائے' کیونکہ جو ان مشکلات کو برداشت کرلے گا وہ صحیح مسلمان ہوگا اور جو ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے روگردانی اختیار کرے گا وہ منافق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پھر ان میں سے شہداء کو مختص فرماتا ہے' تاکہ اُس معاہدے کو عملی شکل دی جا سکے' جو معاہدہ اللہ تعالیٰ اور بندۂ مؤمن کے درمیان ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اُس معاہدے کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ. (التوبہ:۱۱۱)	یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمان داروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے' لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔

اس معاہدے پر دستخط کرنے کا اُس وقت کیا مقصد رہ جاتا ہے' جب اس میں پائے جانے والے مضمون اور دفعات پر عمل نہ ہو' بلکہ یہ معاہدہ اُسی صورت میں متحقق ہوتا ہے جب اہل ایمان پہلے اپنی جانیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان کریں اور پھر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ ان

سے لڑیں گے۔

یہ پیغام سن کر جو یہودی نکلنے کی مکمل تیاری کر چکے تھے وہ بھی لوٹ آئے اور سب کے سب اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے' اُدھر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو لڑائی کی تیاری کرنے اور بنو نضیر کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا' پس آپ ﷺ بنی نضیر کی طرف روانہ ہوئے' یہود اپنے قلعوں میں بند ہو گئے تھے' انہوں نے تیر اور پتھر جمع کر لیے' ابن ابی یہود کو دھوکہ دے گیا اور وعدہ خلافی کی' رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے کھجوروں کے درختوں کو کاٹنے اور تلف کرنے کا حکم دے دیا۔ (متفق علیہ)

یہود نے یہ دیکھ کر پکارا: اے محمد (ﷺ)! آپ تو فتنہ فساد سے روکتے تھے اور فتنہ فساد کرنے والے کو معیوب سمجھتے تھے تو اب کھجوروں کو کاٹنے اور ان کو آگ لگانے کی کیا وجہ ہے؟

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ O (الحشر: ۵)

جو کھجور کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جن کو تم نے چھوڑ دیا کہ کھڑے رہیں اپنی جڑوں پر تو یہ (دونوں باتیں) اللہ کے اذن سے تھیں تاکہ وہ رسوا کرے فاسقوں کو O

اب ان یہودیوں کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ جیسے آپ کا ارادہ ہے ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں' لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اب پہلے کی طرح کوچ کرنے کی آزادی نہیں' اب اگر تم یہاں سے نکلو گے تو کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے بلکہ جتنا سامان اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہو' اسی قدر سامان لے جانے کی اجازت ہوگی۔

یہود نے آپ ﷺ کی اس شرط کو قبول کر لیا اور اتنا مال و متاع اونٹوں پر لاد لیا جتنا ان کے اونٹ اٹھا سکتے تھے۔ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ ان کی حالت یہ تھی کہ اُن میں سے کچھ آدمی اپنے گھروں کو گرا رہے تھے اور دروازوں کی چوکھٹیں اُکھیڑ کر اپنے اونٹوں کی پیٹھوں پر لاد رہے تھے اور اپنے ساتھ لے گئے' کچھ یہود خیبر کو چلے گئے اور باقی ملکِ شام کو چلے گئے'

اُن میں سے صرف دو کو اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا' وہ دو خوش نصیب یہ ہیں: یامین بن عمیر بن کعب' جو عمرو بن حجاش کے چچا زاد ہیں اور دوسرے ابو سعد بن وہب' ان دونوں نے اپنے اموال کی شرط پر اسلام قبول کیا اور ان کو حاصل کر لیا۔

(طبقات ابن سعد' سیرت ابن ہشام' تاریخ الطبری' تفسیر ابن کثیر سورۂ حشر کی تفسیر کے تحت)

رسول اللہ ﷺ نے انصار کے مشورے سے تمام اموال مہاجرین اولین میں تقسیم فرما دیئے' انصار کے صرف دو آدمیوں کو ان کے فقر کی بناء پر اس مال سے حصہ دیا گیا اور وہ ہیں حضرت سہل بن حنیف اور ابو دجانہ سماک بن خرشہ رضی اللہ عنہما۔

بنو نضیر کی جائیداد رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھی' بلاذری نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ وہاں کھجوروں کے نیچے زمین میں کاشت کاری کرواتے اور وہاں سے اپنے اہل و عیال اور اپنی ازواج مطہرات کے لیے سال بھر کا غلہ جمع کرتے' اور جو کچھ زائد ہو جاتا اُس سے اسلحہ اور گھوڑے خرید لیتے۔ (عیون الاثر ج ۲ ص ۵۱)

اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے بارے میں سورۂ الحشر کی مکمل آیات نازل فرمائیں اور بنو نضیر کے اموال کی تقسیم کے متعلق آپ ﷺ کی حکمت عملی پر بطور تبصرہ یہ آیات نازل ہوئیں' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ	اور جو مال پلٹا دیئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف ان سے لے کر تو نہ تم نے اس پر گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ بلکہ اللہ تعالیٰ تسلط بخشتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ۝ جو مال پلٹا دیئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف ان گاؤں کے رہنے والوں سے تو وہ اللہ کا ہے اس کے رسول کا ہے اور رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ

الْعِقَابِO (الحشر: ۷۔۶)

مال گردش نہ کرتا رہے تمہارے دولت مندوں کے درمیان اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لےلو اور جس سے تمہیں روکیں تو رُک جاؤ اور ڈرتے رہو اللہ سے' بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہےO

اسباق ونصائح

یہود کے نفوس میں پائی جانے والی خیانت اور غداری کا یہ دوسرا واقعہ ہے' اس سے پہلے ہم نے یہی خیانت و غداری بنوقینقاع کے یہودیوں میں ملاحظہ کی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے' جس کی تصدیق بے شمار واقعات سے ہوتی ہے' یہی وہ لعنت الٰہی کا طوق ہے جو یہودی اپنے گلے میں ڈالے نظر آتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَO (المائدہ: ۷۸)

لعنت کیے گئے وہ جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل سے داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان پر یہ بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے اور زیادتیاں کیا کرتے تھےO

پھر اس واقعہ میں کئی اہم دروس اور متعدد ایسے دلائل ہیں جو احکام شریعت اسلامیہ سے تعلق رکھتے ہیں' یہاں ہم ان کا ذکر کرتے ہیں:

اوّل: یہودیوں کی خفیہ سازش کے متعلق جو خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو دی گئی' یہ بات بھی اُن کثیر خوارق عادت اُمور اور معجزات میں سے تھی جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد عزت و تکریم سے نوازا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کے ظہور سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایمان پختہ ہوتا ہے' اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے علاوہ دیگر بے شمار خصوصیات اور صفات سے بھی نوازا ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کی خفیہ سازش

کے متعلق جو خبر دی گئی، بعض سیرت نگاروں نے اس کی تعبیر یہ کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام تھا، جب کہ الہام کا کلمہ تمام لوگوں کے درمیان مشترک معنی پر دلالت کرتا ہے کہ حاسۂ الہام ایک طبعی حاسہ ہے جو تمام قسم کے لوگوں میں پایا جاتا ہے، خاص لوگوں میں ہی یہ نہیں پایا جاتا، لیکن جو کلمہ ہمارے علماءِ سیرت نے استعمال کیا ہے، وہ ہے ''خبرِ الٰہی'' یہ بات صرف اور صرف نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اس کو ''خبرِ الٰہی'' ہی کہا جائے گا کیونکہ الہام کا لفظ زیادہ عام ہے جس میں اولیاء بھی شامل ہوتے ہیں اور دیگر لوگ بھی، جب کہ ''خبرِ الٰہی'' کہنے سے صرف نبوت کی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے، ہم جانتے ہیں کہ اس امتیازی خصوصیت کی بناء پر ہی نبی اکرم ﷺ کو یہود کی غداری کا علم ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے مکر اور ان کی خفیہ سازش کے متعلق یہ جو خبر رسول اللہ ﷺ کو دی، اس میں اللہ تعالیٰ نے اُس وعدے کو وفا کیا جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی حفاظت کا فرمایا تھا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.	اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے۔

(المائدہ: ٦٧)

جب اصل معاملہ یہ ہے تو پھر بعض حاسدین کی طرف سے اس کی تعبیر میں ملمع سازی اور حقائق کی پردہ پوشی کی کیا حقیقت ہے؟ ایسی بات کہنا سراسر آپ ﷺ کے معجزات کے انکار کا مظہر ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آپ ﷺ کے معجزات جو قطعی طور پر اخبارِ متواترہ سے ثابت ہیں، ان کا انکار کرنا آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان کی کمزوری کی علامت اور نشانی ہے۔

دوم: بنو نضیر کے کھجوروں کے درختوں کو کاٹنا اور ان کو جلا دینا جو بالاتفاق ثابت ہے، اس ضمن میں بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بعض درختوں کو تلف کرنے کا حکم دیا جب کہ باقی درختوں کو چھوڑ دینے کا کہا تھا، آپ ﷺ کے اس اقدام کی تائید وتصویب میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا	جو کھجور کے درخت تم نے کاٹ

فَـآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوۡلِهَا فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ. ڈالے یا جن کو تم نے چھوڑ دیا کہ کھڑے رہیں اپنی جڑوں پر تو یہ اللہ کے اذن سے تھا (الحشر: ۵) تا کہ وہ رسوا کرے فاسقوں کو۔

عام طور پر علماء نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ دشمن کے علاقے میں پائے جانے والے درختوں کے کاٹنے اور تلف کرنے کے متعلق حکمِ شرعی یہی ہے کہ یہ بات دشمن کے غلبہ کے پروگرام کو سامنے رکھتے ہوئے فوج کے کمانڈر یا مسلم حکمران کی صوابدید پر ہے' لہٰذا اس صورت میں یہ مسئلہ ''سیاسی حکمتِ عملی'' کے تحت داخل ہوگا۔

علماء کرام کا یہ کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے جو بعض کھجوروں کے درخت تلف کرنے اور بعض کو چھوڑ دینے کا حکم جاری فرمایا' یہ سب اُن حالات اور جنگی مصلحت کے پیشِ نظر تھا' آپ ﷺ کا یہ عمل بعد میں آنے والے فوجی کمانڈروں کے لیے درس و تعلیم ہے کہ جنگی مصلحت کے پیشِ نظر کسی حد تک ایسا کرنا ممکن ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ اسی طرح کی توجیہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو طلیحہ اور بنو تمیم کی طرف جنگ کی غرض سے بھیجا تو آپ نے ان کے درخت کاٹنے اور ان کو جلا دینے کا حکم دیا' جب کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہی ملکِ شام کی جنگ میں درخت کاٹنے سے قطعی طور پر منع بھی فرمایا۔ امام شافعی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو پھل والے درخت کاٹنے سے منع کیا تھا' وہ اس وجہ سے تھا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے چونکہ بلادِ شام کے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے کی خوش خبری سن رکھی تھی' اس لیے آپ نے درختوں کو کاٹنے سے منع کیا تا کہ وہ بعد میں مسلمانوں کے کام آ سکیں کیونکہ ان کے لیے جائز تھا کہ وہ درختوں کو کاٹیں یا ترک کر دیں۔[1]

یہ جو ہم نے کہا کہ جنگی مصلحت کے پیشِ نظر دشمن کے درختوں کو کاٹنا اور جلا دینا مباح ہے' یہ مذہب حضرت نافع مولیٰ ابن عمر' حضرت امام مالک' امام ثوری' امام ابوحنیفہ' امام شافعی'

[1] الام ج ۷ ص ۳۲۴' مزید دیکھئے: اس موضوع پر مؤلف کی کتاب ''ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ'' ص ۱۷۱۔۱۷۰۔

امام احمد' امام اسحاق اور جمہور فقہاء کا ہے' جب کہ لیث بن سعد' ابوثور' امام اوزاعی کا قول عدمِ جواز کا ہے۔ (شرح النووی علی صحیح مسلم ج ۱۲ ص ۵۰)

سوم: ائمہ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دشمن کا جو مال جنگ کیے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے' جسے "مالِ فئی" کہتے ہیں' یہ مال امام اور قائدِ لشکر جن کاموں میں مناسب سمجھے خرچ کرنے اور تقسیم کرنے کا مجاز ہے۔ اس مال کے بارے میں سربراہ یا قائد پر یہ بات لازم نہیں ہے کہ وہ یہ مال بھی اُسی طرح فوج ہی میں تقسیم کرے جو مال جنگ کرنے کے بعد حاصل ہونے کی صورت میں تقسیم کرنا لازم ہے (کیونکہ جو مال جنگ کرنے کے بعد حاصل ہو' اُسے مالِ غنیمت کہتے ہیں اور یہ مال تمام فوجیوں پر حصے کے مطابق تقسیم کرنا لازم ہے' جب کہ مالِ فئی کے لیے یہ بات لازم نہیں ہے)۔

یہ استدلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُس عمل مبارک سے کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنونضیر کا مال جو جنگ کے بغیر حاصل ہوا' اُس مال کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف مہاجرین کے لیے خاص فرما دیا' اس کی تائید میں قرآن پاک کی دو آیات بھی نازل ہوئیں جو ہم نے پیچھے ذکر کردی ہیں۔

البتہ فقہاء نے اُن زمینوں کی تقسیم اور عدمِ تقسیم میں اختلاف کیا ہے' جو زمینیں جنگ کے بعد مالِ غنیمت کی صورت میں مسلمانوں کے ہاتھ آئی ہوں۔

امام مالک علیہ الرحمۃ کا مؤقف ہے کہ اس اراضی کو مطلقاً تقسیم نہ کیا جائے' بلکہ ان کی زراعت کی صورت میں جو پیداوار وصول ہو اس کو مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کیا جائے' لیکن اگر سربراہِ حکومت ان زمینوں کی تقسیم میں ہی مصلحت محسوس کرے تو وہ ایسا کرسکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مذہب بھی اس کے قریب قریب ہے۔

جب کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ کا مؤقف ہے کہ وہ زمینیں جو مالِ غنیمت کی صورت میں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں انہیں بھی دوسرے مالِ غنیمت کی طرح قواعد وضوابط کے مطابق سب میں تقسیم کرنا واجب ہے۔

امامِ احمد بن حنبل کا بھی یہی مذہب ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ نے جو مؤقف اختیار کیا ہے' وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ رسول

اللہ ﷺ نے بنونضیر کے اموال کی جو تقسیم صرف مہاجرین میں فرمائی' یہ مالِ غنیمت کی تقسیم نہ تھی' یعنی یہ مال دشمن کے ساتھ جنگ کے بعد حاصل نہیں ہوا تھا (بلکہ یہ مالِ فئی تھا' اس لیے آپ ﷺ کا یہ عمل ہمارے لیے مالِ فئی کی تقسیم کی صورت میں ہی رہنمائی کرتا ہے بلکہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق واضح طور پر آیاتِ بیّنات نازل ہوئی ہیں' آپ ﷺ نے بنی نضیر کے اموالِ فئی تقسیم کرنے کی جو حکمت اختیار فرمائی) اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ. (الحشر:٦)

اور جو مال پلٹا دیئے اللہ نے اپنے رسول کی طرف ان سے لے کر تو نہ تم نے اس پر گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اراضی کی عدمِ تقسیم کا جو حکم تھا وہ صرف مالِ فئی کے بارے میں ہے جب کہ یہ حکم مالِ غنیمت کے بارے میں نہیں' اس لیے جب یہ صورتِ حال نہیں ہوگی تو یہ حکم بھی نہیں ہوگا' لہٰذا مالِ غنیمت کی صورت میں اس کا منصوص علیہ حکم ہی نافذ ہوگا تو اس صورت میں دوسرے اموالِ غنیمت کی طرح اراضی بھی قواعد کے مطابق تقسیم کی جائیں گی۔

جب کہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ علیہما الرحمہ نے جو موقف اختیار کیا ہے' اس کی دلیل کے طور پر متعدد واقعات ذکر کیے گئے' ان میں سے صرف ایک اہم واقعہ پیش کیا جاتا ہے' وہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی فتح کے موقع پر وہاں کی اراضی کو تقسیم کرنے سے منع کر دیا بلکہ اُس اراضی کو وقف کر دیا اور وہاں سے آنے والی پیداوار کو مسلمانوں کی خوش حالی و بہتری کے لیے خرچ کرنے کا حکم دیا۔

اس کے علاوہ اور بھی دلائل ہیں لیکن اختصار کے ساتھ چند باتیں پیش کر دی گئی ہیں۔

اس ساری بحث میں جو بنیادی چیز ہمارے لیے اہم ہے' وہ دو آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے وہ علّت بیان فرمائی ہے' جس کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کے اموالِ فئی کی تقسیم فرمائی جس میں مہاجرین اور چند انصاری صحابہ کرام کو تو حصہ دیا گیا جب کہ دیگر کو اس میں شامل نہ کیا گیا' اللہ تعالیٰ نے اس کی حکمت اور تعلیل ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ. (الحشر: ۷)

تاکہ وہ مال گردش نہ کرتا رہے تمہارے دولت مندوں کے درمیان۔

وہ حکمت یہ تھی کہ مال و دولت صرف اور صرف امراء اور اغنیاء تک محدود نہ رہے بلکہ دیگر طبقوں میں بھی اس کی ترسیل ہونی چاہیے۔

اس حکمت اور علت کی بنیاد پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بے شک مال و دولت کے معاملات میں اسلامی شرعی پالیسی مجموعی طور پر اسی اصول پر قائم ہے اور شریعت اسلامیہ کی جملہ کتب سے ماخوذ احکام جو اقتصاد اور مال و دولت کے مختلف معاملات سے متعلق ہیں ان سب کے پیچھے بنیادی طور پر جو حکمت کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے میں ایک عادلانہ دولت کی تقسیم کی جائے جس سے معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان قربت پیدا ہو اور سب لوگوں کے دل ایک دوسرے کے قریب ہوں اگر شریعت اسلامیہ کے ان جملہ احکام کو منظم و یکجا کیا جائے جو زکوۃ کے مالی امور سود سے روکنے سے متعلق اور لوگوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذخیرہ اندوزی سے متعلق ہیں تو اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ تمام احکام رزق اور معاش کے معاملات درست کرنے سے متعلق ہیں جو معاشرے کے ہر فرد سے متعلق ہیں اور اس میں معاشرے کے سب لوگ خود کفیل ہوں گے اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ بنے گا۔

بلکہ ہر فرد دوسرے سے باہمی تعاون کرتے ہوئے زندگی بسر کرے گا۔ یہاں پر یہ بات جاننا بھی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس دنیا میں اپنی شریعت کی حکمت کے طور پر ایک ایسے معاشرے کا قیام بیان فرمایا ہے تو اپنے معاشرے کے لیے کچھ معینہ اسباب و وسائل بھی بیان فرمائے اور ہمیں ان کی اتباع کرنے اور ان سے تجاوز نہ کرنے کا پابند بنایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقصد اور وسیلہ دونوں کی اکٹھے ہی پابندی لازم قرار دے دی اس لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ بے شک اسلام کا مقصد اجتماعی عدل کو قائم کرنا ہے اس کے لیے ہم جو مناسب سمجھیں اسباب و ذرائع اختیار کریں بلکہ یہ مقصد اور وسیلہ دونوں کے سلسلے میں حد سے متجاوز شمار ہوگا' اللہ تعالیٰ نے جو مقصد اور غایت متعین کی ہے اس تک رسائی حاصل کرنا صرف اسی ذریعہ کو اختیار کر کے ہی ہوگا' تاریخ اور واقعات اس کے سب سے بڑے ثبوت اور شاہدِ اعظم ہیں۔

یہاں پر مناسب ہوگا کہ آپ مکمل سورۂ حشر کا دوبارہ مطالعہ کریں تا کہ آپ غور کر سکیں کہ اس پورے واقعہ اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کیا بیان فرمایا ہے' یہود اور منافقین کے بارے میں کیا بیان کیا گیا ہے' مال اور جنگ کے متعلق رسول اللہ کی کیا پالیسی رہی ہے' اس طرح اس سورۂ مبارکہ سے اس واقعہ اور اس سے حاصل ہونے والے اسباق و نصائح سے بخوبی واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

غزوۂ ذات الرقاع

یہ واقعہ ہجرت کے چوتھے سال بنونضیر کی جلاوطنی کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد پیش آیا۔ اکثر علماء سیر و مغازی کا یہی مؤقف ہے' جب کہ امام بخاری اور بعض محدثین کے نزدیک یہ واقعہ غزوۂ خیبر کے بعد ہوا۔

اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ بہت سے قبائلِ نجد مسلمانوں کے ساتھ غداری اور بدعہدی کا منصوبہ بنا چکے تھے' اس کا اظہار اُس وقت ہوا کہ جب ستر صحابہ کرام دین کی دعوت کے لیے نکلے تو اہلِ نجد نے غداری کرتے ہوئے اُن ستر صحابہ کرام کو شہید کر دیا' اب یہ قبائل دوبارہ شر انگیزی کا منصوبہ بنا رہے تھے' پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جانثار صحابہ کرام کے ساتھ قبیلہ محارب اور بنوثعلب کی گوشمالی کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے' حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ کا عامل مقرر فرمایا۔ نجد کے علاقے میں غطفان کے مقام پر ایک جگہ جس کا نام ''نخل'' ہے' وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑاؤ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان قبائل کے دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رعب طاری کر دیا۔ ابن ہشام کے مطابق ان قبائل کا وہاں پر بہت بڑا مجمع تھا لیکن وہ سب کے سب مسلمانوں کے پہنچنے سے پہلے ہی منتشر ہونے لگے' اور بالآخر جنگ کی نوبت نہ آئی۔

لیکن اس کے باوجود اس غزوہ میں کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے کئی نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں' جن کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے' اس لیے ہم غزوہ کی دیگر تفصیلات کی بجائے ان دروس کو بیان کرتے ہیں:

اوّل: بخاری و مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' آپ فرماتے ہیں:

ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس غزوہ میں نکلے' ہمارے چھ چھ افراد کے پاس ایک ایک اونٹ تھا' ہم اُس پر باری باری سوار ہوتے' ہمارے پاؤں زخمی ہو گئے' میرے دونوں پاؤں بھی زخمی ہو گئے اور میرے ناخن گر گئے' جس کی وجہ سے ہم نے اپنے اپنے پاؤں پر کپڑے لپیٹ لیے' پس اس بناء پر اس غزوہ کو ذات الرقاع کہا گیا' کیونکہ ہم اپنے پاؤں پر پٹیاں لپیٹے ہوئے تھے' حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یہ بات بیان کی' پھر اس بات کو ناپسند کیا اور نادم ہوئے' گویا آپ نے ناپسند فرمایا کہ اپنا کوئی عملِ خیر لوگوں پر ظاہر کریں۔

دوم: امام بخاری و امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے غزوۂ ذات الرقاع میں صلوٰۃِ خوف پڑھی' وہ اس طرح کہ ایک گروہ نے آپ ﷺ کے پیچھے صف بنا کر نماز شروع کی اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابل کھڑا رہا' پہلے گروہ نے ایک رکعت آپ ﷺ کی معیت میں پڑھی' پھر آپ ﷺ کھڑے رہے اور انہوں نے اپنی دوسری رکعت خود مکمل کر کے سلام پھیر کر دشمن کے مقابل چلے گئے اور دوسرا گروہ آ کر آپ ﷺ کے ساتھ دوسری رکعت میں شامل ہو گیا' جب رکعت مکمل ہو گئی تو آپ ﷺ بیٹھے رہے اور انہوں نے اپنی دوسری رکعت مکمل کی' پھر آخر میں اکٹھے سلام پھیرا[1]۔

سوم: امام بخاری نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ جب قافلے کی صورت میں اس غزوہ سے جا رہے تھے تو راستے میں دوپہر کا وقت ہو گیا'

[1] صحیح بخاری ج ۵ ص ۵۳' باب غزوۂ ذات الرقاع' صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۱۴' باب صلوٰۃ الخوف۔
امام مسلم نے اس کے بعد حضرت جابر سے صلوٰۃِ خوف کے بارے میں ایک روایت نقل کی' وہ یہ ہے کہ اذان دی گئی' پھر آپ ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعت نماز پڑھائی' پھر وہ لوگ دشمن کے سامنے چلے گئے اور پھر آپ ﷺ نے دوسرے گروہ کو جو پہلے دشمن کے مقابل تھا' اس کو دو رکعت نماز پڑھائی' اس طرح آپ ﷺ کی چار رکعتیں اور دوسروں کی دو دو رکعتیں مکمل ہوئیں۔
صلوٰۃ خوف کی ان دونوں احادیث میں مطابقت اس طرح ہے کہ یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے صلوٰۃ خوف متعدد مرتبہ پڑھائی' ایک بار پہلے طریقے کے مطابق پڑھائی اور دوسری مرتبہ دوسرے طریقے کے مطابق۔ حدیث مسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ مسافر چار رکعتوں والی نماز کو پوری پڑھ سکتا ہے اور قصر بھی کر سکتا ہے۔ یہ مؤقف امام شافعی' امام مالک اور امام احمد کا ہے جب کہ احناف کا مؤقف اس کے برعکس ہے۔

یہ ایک ایسی وادی تھی جہاں خاردار درخت "ببول" کثرت کے ساتھ تھے' پس رسول اللہ ﷺ نے یہاں پڑاؤ کیا' سب لوگ درختوں کے سائے میں آرام کے لیے بکھر گئے' آپ ﷺ ببول کے ایک درخت کے نیچے تشریف لے گئے اور اپنی تلوار اُس پر لٹکا دی اور آرام فرما ہو گئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم سب سو گئے' اچانک ہم نے سنا کہ آپ ﷺ ہمیں بلا رہے ہیں' ہم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہاں پر آپ ﷺ کے پاس ایک اعرابی بیٹھا تھا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ شخص ہے کہ جب میں سویا ہوا تھا تو اس نے میری تلوار درخت سے اُتاری اور جب میں اچانک بیدار ہوا تو اس نے یہ تلوار مجھ پر سونتی ہوئی تھی' پھر اس نے مجھے کہا: اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ تو میں نے اُسے کہا: اللہ! (مجھے بچائے گا! یہ سن کر اس پر رعب طاری ہو گیا) اب یہ یہاں بیٹھا ہوا ہے' رسول اللہ ﷺ نے اسے کوئی سزا نہ دی۔ (صحیح بخاری ج ۵ ص ۵۴۔ ۵۳۔ ۵۲)

چہارم: ابن اسحاق اور احمد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ہم غزوۂ ذات الرقاع میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ روانہ ہوئے' تو کسی نے ایک مشرک عورت کو مار ڈالا' جب رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لائے تو اُس کا خاوند جو وقوعہ کے وقت غائب تھا' اب پتا چلنے پر اُس نے قسم کھائی کہ وہ اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کہ محمد (ﷺ) کے اصحاب میں سے کسی ایک کا خون نہ بہا لے' پس وہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل پڑا' آپ ﷺ ایک مقام پر قیام پذیر ہوئے تو فرمایا: آج رات کون ہماری نگہبانی کرے گا؟ اس پر ایک مہاجر اور ایک انصاری[1] صحابی نے حامی بھری اور عرض کی: یا رسول اللہ! ہم حاضر ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تم اس گھاٹی کے دہانے پر پہرے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت جابر فرماتے ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے اس وادی کی گھاٹی میں قیام کیا۔

جب وہ دونوں شخص گھاٹی کے دہانے پر پہنچ گئے تو انصاری صحابی نے اپنے مہاجر ساتھی سے پوچھا: آپ رات کے کون سے حصے میں آرام کریں گے کہ میں اس دوران پہرہ دوں'

[1] ابن اسحاق اس روایت میں اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ دونوں صحابی عمار بن یاسر اور عباد بن بشر تھے۔

پہلے حصے میں یا پچھلے حصے میں؟ مہاجر ساتھی نے جواب دیا: بلکہ رات کے اوّل حصے میں' چنانچہ مہاجر لیٹ گیا اور محو استراحت ہو گیا' انصاری صحابی پہرہ دینے لگے اور ساتھ نماز بھی پڑھنے لگے' وہ شخص آیا جس کی بیوی قتل ہوئی' جب اُس نے انصاری کو دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ اس قوم کا پہرے دار ہے' اُس نے ایک تیر مارا' جو انصاری کو لگا اور جسم میں پیوست ہو گیا' انصاری نے کھینچ کر اُسے نکال دیا اور ثابت قدمی سے کھڑا نماز پڑھتا رہا' پھر اُس نے دوسرا تیر مارا' انصاری نے یہ بھی کھینچ کر نکال دیا اور کھڑے نماز پڑھتا رہا' پھر اس شخص نے تیسرا تیر مارا' انصاری نے یہ بھی نکال دیا' پھر انصاری نے رکوع وسجود کیے' نماز مکمل کی اور اپنے مہاجر ساتھی کو بیدار کرتے ہوئے کہا: اٹھ بیٹھو! میں زخمی ہو چکا ہوں' مہاجر صحابی اچھل کر کھڑا ہو گیا' جب اُس شخص نے ان دونوں کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ ان دونوں نے اُسے دیکھ لیا ہے اور لشکر کو اطلاع ہو گئی ہے' وہ شخص وہاں سے فوراً بھاگ کھڑا ہوا[1] جب مہاجر نے انصاری کو خون میں لت پت دیکھا تو کہا: سبحان اللہ! تم نے پہلا تیر لگتے ہی مجھے کیوں نہ جگایا؟ انصاری نے کہا: میں ایک سورت کی تلاوت کر رہا تھا' میں نے پسند نہ کیا کہ اسے ختم کیے بغیر نماز چھوڑ دوں' جب مجھے مسلسل تیر لگے تو میں نے رکعت مکمل کی اور تمہیں آگاہ کیا' اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ جس نگرانی اور نگہبانی کا حکم مجھے رسول اللہ ﷺ نے دیا ہے میں اس کو ضائع کر رہا ہوں تو یا تو سورت کو مکمل کرنے سے پہلے میری جان چلی جاتی یا پھر میں اسے ختم کر کے ہی رہتا۔[2]

پنجم: امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں' ابن سعد نے اپنی کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' میں اور ابن ہشام نے اپنی کتاب ''سیرت'' میں روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں غزوۂ ذات الرقاع میں شمولیت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ہمراہی میں ایک کمزور اور لاغر اونٹ پر سوار ہو کر نکلا' جب آپ ﷺ واپس تشریف لا رہے تھے تو میرے ساتھی آگے بڑھتے گئے اور میں پیچھے رہ گیا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ

---

[1] عربی روایت میں ''نذر بہ'' کا لفظ ہے' جس کا معنی ہے: کسی امر کا انکشاف ہونا' بھید کھل جانا۔

[2] احمد والطبری و ابوداؤد' ان سب نے اس سند سے روایت کیا ہے: عن ابن اسحاق عن صدقۃ بن یسار عن عقیل بن جابر عن جابر بن عبداللہ۔

پیچھے سے تشریف لے آئے اور فرمایا: "ما لك يا جابر؟" اے جابر! تمہیں کیا ہوا ہے؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اپنے اس اونٹ کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہوں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسے بٹھاؤ! میں نے اسے بٹھادیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی اونٹنی کو بٹھا دیا' پھر فرمایا: "اعطني هذه العصا من يدك" اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی یہ چھڑی مجھے دے دو' میں نے حکم کی تعمیل کی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھڑی لے کر اونٹ کو چبھویا اور کچو کے دیئے' پھر فرمایا: "اركب" سوار ہو جاؤ! پس میں سوار ہو گیا' مجھے اس ذات کی قسم ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! اب یہی اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کے ساتھ ساتھ گردن لمبی کر کے تیز رفتاری سے چلنے لگا[1] اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ باتیں کرنے لگا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا: اے جابر! کیا تم اپنا یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچو گے؟ میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بلکہ میں یہ اونٹ آپ کی خدمت میں بطورِ ہبہ پیش کرتا ہوں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! بلکہ اسے میرے ہاتھ بیچ دو' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پھر آپ ہی اس کی قیمت طے کیجئے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اسے ایک درہم کے بدلے لیتا ہوں' میں نے عرض کیا: نہیں! یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پھر تو مجھے گھاٹا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چلو! دو درہم کے بدلے؟ میں نے عرض کی: نہیں! پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے لیے اس کی قیمت بڑھاتے گئے حتیٰ کہ ایک اوقیہ (سونے) تک پہنچ گئے پھر میں نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا آپ اس پر راضی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں میں نے عرض کی: پھر یہ آپ کا ہو گیا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے اسے لے لیا' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: اے جابر! کیا تم نے شادی کر لی ہے؟ میں نے عرض کی: ہاں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! فرمایا: کسی کنواری لڑکی سے شادی کی ہے یا شوہر دیدہ سے؟ میں نے عرض کی: نہیں! بلکہ شوہر دیدہ سے (دوسرے نکاح والی)' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا کوئی کنواری لڑکی نہ ملی جس سے تم دل لگی کرتے اور وہ تم سے دل لگی کرتی؟

میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! غزوۂ اُحد میں میرے والد شہید ہو گئے تھے اور پیچھے اپنی سات بیٹیاں چھوڑ گئے' اس لیے میں نے ایسی عورت سے شادی کی جو میری ان

[1] عربی روایت میں "یواهق" کا لفظ ہے' جس کے معنی ہیں: مقابلہ کرنا۔

بہنوں کی کنگھی چوٹی کر سکے اور ان کی دیکھ بھال کرے' حضور ﷺ نے فرمایا: ''اصبت ان شاء اللّٰہ'' تم نے درست فیصلہ کیا ہے' ان شاء اللہ اس میں خیر ہوگی' آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ہم جب صرار[1] (گاؤں کا نام) پہنچیں گے تو وہاں اونٹ ذبح کرنے کا حکم دیں گے اور اونٹ ذبح ہوگا' وہاں ہم دن بھر ٹھہریں گے' جب وہ (تمہاری بیوی) ہماری آمد کی خبر سنے گی تو (مہمان نوازی کے لیے) گاؤ تکیے[2] ٹھیک کر دے گی' میں نے عرض کی: بخدا! یارسول اللہ ﷺ! ہمارے پاس کوئی گاؤ تکیے نہیں' حضور ﷺ نے فرمایا: ''انھا ستکون'' ایک وقت یہ تمہارے پاس ضرور ہوں گے' تم جب گھر پہنچو تو ہوشیاری سے کام لینا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب ہم صرار (گاؤں) پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کے حکم پر اونٹ ذبح کیے گئے' ہم نے وہاں سارا دن گزارا' جب شام ہوئی تو رسول اللہ ﷺ اور ہم سب مدینۃ المنورہ میں داخل ہوئے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب اگلے دن صبح ہوئی تو میں نے اپنے اونٹ کی نکیل پکڑی اور رسول اللہ ﷺ کے درِ اقدس پر اُسے لاکر بٹھا دیا' پھر میں خود قریب ہی مسجد میں جا کر بیٹھ گیا' رسول اللہ (گھر سے) باہر تشریف لائے اور اونٹ کو دیکھا تو فرمایا: یہ کس کا ہے؟ لوگوں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! یہ اونٹ حضرت جابر لائے ہیں' آپ ﷺ نے پوچھا: جابر! کہاں ہیں؟ مجھے آپ ﷺ کی خدمت میں بلایا گیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے بھتیجے! اپنا یہ اونٹ لے لو! یہ تمہارا ہے' پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں فرمایا: تم جابر کو لے جاؤ اور اسے ایک اوقیہ دے دو۔ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ گیا' انہوں نے مجھے ایک اوقیہ (سونا) دیا اور کچھ تھوڑا سا زیادہ بھی دیا' اللہ کی قسم! وہ عطا کردہ مال میرے پاس بڑھتا رہا اور ہمارے گھر میں اس کی اتنی برکت ہوگئی جو دکھائی دیتی تھی۔[3]

---

[1] ''صرار'' مدینہ کے مضافات میں ایک جگہ کا نام ہے۔

[2] عربی روایت میں ''نمارق'' کا لفظ آیا ہے' جو ''نمرقۃ'' کی جمع ہے' اس کا معنی ہے: گاؤ تکیہ۔ اس سے آپ ﷺ نے یہ مراد لیا ہے کہ جب تمہاری بیوی کو تمہارے واپس آنے کی خبر ہوگی تو وہ تمہارے استقبال کے لیے گھر کو صاف ستھرا کر دے گی۔

[3] ابن اسحاق نے یہ واقعہ انہی الفاظ میں بیان کیا جیسا کہ سیرت ابن ہشام میں مذکور ہے اور یہ بخاری و مسلم کے الفاظ کے قریب قریب ہے۔

اسباق ونصائح

غزوۂ ذات الرقاع کی تاریخ کے بارے تحقیق

علماء سیر ومغازی کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع غزوۂ خیبر سے پہلے واقع ہوا تھا' پھر ان علماء میں سے اکثر نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بنی نضیر کے بعد ہجرت کے چوتھے سال وقوع پذیر ہوا' جب کہ بعض علماء سیرت مثلاً ابن سعد اور ابن حبان کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے پانچویں سال پیش آیا۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ خیبر کے بعد واقع ہوا۔ حافظ ابن حجر نے بھی امام بخاری کی رائے کو ترجیح دی ہے' اس بات سے استدلال کرتے ہوئے کہ صلوٰۃ الخوف غزوۂ ذات کے موقع پر مشروع ہوئی اور پڑھی گئی جب کہ غزوۂ خندق کے موقع پر آپ ﷺ نے صلوٰۃ الخوف نہیں پڑھی تھی بلکہ اس غزوہ میں آپ ﷺ کی متعدد نمازیں قضاء ہو گئیں (لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ غزوۂ ذات الرقاع' غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا)۔

اسی طرح ایک اور واقعہ سے انہوں نے استدلال کیا کہ جو صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' جس میں وہ اپنے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سفر کے دوران سواریاں کم ہونے کی وجہ سے پیدل چل چل کر ہمارے پاؤں زخمی ہو گئے اور ناخن گھس گئے' جس وجہ سے ہم نے اپنے پاؤں پر کپڑے لپیٹ لیے' اسی لیے اس غزوہ کو غزوۂ ذات الرقاع کہا جاتا ہے' اس سے پتا چلا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس غزوہ میں موجود تھے' حضرت ابوموسیٰ اشعری ملکِ حبشہ سے غزوۂ خیبر کے بعد لوٹے تھے' کیونکہ یہ مہاجرینِ حبشہ میں سے تھے۔

ان دلائل کی روشنی میں ابن قیم کو اس معاملے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑا' پس انہوں نے کہا: یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع شاید غزوۂ خندق کے بعد پیش آیا۔ (دیکھئے: فتح الباری ج ۷ ص ۲۹۴' عیون الاثر ج ۲ ص ۵۳' زاد المعاد ج ۲ ص ۱۱۱)

میری رائے یہ ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع کا واقعہ غزوۂ خندق سے پہلے وقوع پذیر ہونا بعض قرائن سے متعین ہے جیسے کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ سے آپ ﷺ کی اور صحابہ کرام کی بھوک کے

بارے میں ذکر کیا اور پھر حضرت جابر نے آپ ﷺ کی اور بعض صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی اپنے گھر کھانے کی دعوت کی۔ اس دعوت کے موقع پر آپ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی زوجہ کو ارشاد فرمایا: یہ تم بھی کھالو اور باقی ہدیہ کر دو کیونکہ لوگ بھوک اور قحط کی حالت میں ہیں۔

اس حدیث طیبہ سے پتا چلا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ شادی شدہ تھے۔

اسی طرح صحیحین سے ہی ثابت ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: کیا تم نے شادی کر لی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں! یا رسول اللہ ﷺ! یہ حدیث طیبہ تفصیل کے ساتھ پیچھے گزر چکی ہے۔

یعنی اس سے معلوم ہوا کہ اس سے قبل حضور ﷺ کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی شادی کا علم نہ تھا۔ یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع، غزوۂ خندق سے بھی پہلے واقع ہوا، چہ جائیکہ یہ کہا جائے کہ یہ غزوۂ خیبر سے قبل واقع ہوا، میں نہیں جانتا کہ مختلف آراء رکھنے والے علماء نے اس حدیث سے کوئی استدلال کیا یا نہیں، لیکن بہر حال جن علماء نے استدلال کرتے ہوئے غزوۂ ذات الرقاع کو غزوۂ خندق کے بعد قرار دیا، ان کے مقابلے میں پیش کردہ میری دلیل قطعی ہے۔

حافظ ابن حجر نے جو استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر صلوٰۃ الخوف نہ پڑھی بلکہ آپ ﷺ نے ایک نماز کا وقت گزر جانے کے بعد اس کی قضا کی تھی۔

حافظ ابن حجر کی اس دلیل کا جواب یوں دیا جاتا ہے:

(۱) کہ اس موقع پر آپ ﷺ کی نمازیں مؤخر ہونے کا سبب یہ تھا کہ یہاں مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان مسلسل تیر اندازی ہو رہی تھی اور جنگ جاری تھی، جس وجہ سے آپ ﷺ نماز کی ادائیگی کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔

(۲) یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ شاید اس موقع پر دشمن قبلہ کی جانب ہو اور اس وجہ سے صلوٰۃ الخوف نہ پڑھی گئی ہو، جب کہ غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر دشمن قبلہ کی طرف نہیں تھا بلکہ کسی دوسری جانب تھا۔

(۳) یا شاید غزوۂ خندق کے موقع پر آپ ﷺ نے جنگ کے پیش نظر نمازیں مؤخر کر دیں ہوں تاکہ امت کو قضاء نمازیں پڑھنے کا بھی طریقہ بتلایا جا سکے' یعنی اس کی مشروعیت بیان کرنے کے لیے ایسا کیا ہو۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ان کے استدلال کا بہت سے علماء سیر و مغازی نے جواب دیا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جو بات بیان فرمائی' وہ اس غزوۂ ذات الرقاع کی نہ ہو بلکہ انہوں نے وہ بات کسی دوسرے غزوہ کے بارے میں ارشاد فرمائی ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روانہ ہوئے' ہماری تعداد چھ تھی اور ہمارے پاس ایک اونٹ تھا' جس پر ہم یکے بعد دیگر سوار ہوتے۔ الخ

جب کہ یہ جو غزوۂ ذات الرقاع ہے' جس کی ہم بات کر رہے ہیں' اس میں مسلمانوں کی تعداد حضرت ابوموسیٰ اشعری کی بتائی ہوئی تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔

حافظ ابن حجر نے اس بات کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن یہ سب کچھ اس کے لیے کافی نہ تھا' اس لیے کہ جو ہم نے دلائل پیش کیے ہیں وہ قطعی ہیں۔ بالخصوص غزوۂ احزاب اور غزوۂ ذات الرقاع دونوں غزووں کے حوالے سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی جو بات ہم نے ذکر کی وہ قاطع ثابت ہوئی ہے اور علماء سیر و مغازی کی اختیار کردہ ہے۔

حضور ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر نماز میں جو تاخیر فرمائی' اس کی تفصیل اور اس کے احکام و مسائل ہم مناسب جگہ ذکر کریں گے۔

غزوۂ ذات الرقاع میں جیسا کہ ذکر ہو چکا کہ اس موقع پر مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان جنگ نہ ہوئی اور نہ ہی کوئی جھڑپ ہوئی بلکہ جنگ اور لڑائی کے بغیر ہی یہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا' لیکن اس موقع پر اور اس سفر کے دوران چند واقعات پیش آئے' جن سے اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں' ان سے عبرت حاصل کرنا ضروری ہے' ہم نے ان میں سے پانچ واقعات کا تذکرہ کیا ہے' اب ہم ان سے حاصل ہونے والے اُن دروس کا ذکر کرتے ہیں جو ہر کوئی اس سے سمجھ سکتا ہے۔

اوّل: امام بخاری و مسلم علیہما الرحمۃ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے جو احادیث

روایت کی ہیں، جن میں غزوۂ ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی گئی اس کے علاوہ دیگر غزوات کے بارے بھی بیان کیا گیا۔ ان سب روایات سے ایک چیز واضح طور پر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ اس غزوہ کے دوران صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے رب کے پیغام کو پہنچانے اور اس کے راستے میں جہاد کے سلسلے میں کتنی مشکلات و تکالیف کا سامنا کیا، ایک چیز جو بالکل روزِ روشن کی طرح عیاں ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مالی حالت بہت کمزور تھی حتیٰ کہ ان کے پاس پوری سواریاں بھی نہ تھیں، جس وجہ سے چھ چھ یا سات سات صحابہ ایک ایک اونٹ پر باری باری سواری کرتے تھے۔

اس غربت اور فقر کے باوجود صحابہ کرام نے اپنے رب کا پیغام پہنچانے میں کسی قسم کی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا، دعوت الی اللہ کا کام بھی کیا اور جہاد فی سبیل اللہ بھی کرتے رہے۔ اس رستے میں انہیں بے شمار مشکلات درپیش ہوئیں، نوکیلے پتھروں پر چلنے اور کانٹوں پر چلنے کی وجہ سے ان کے پاؤں پھٹ گئے اور چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ان کے پاؤں کے ناخن بھی ٹوٹ گئے، ان کے پاؤں کا گوشت اتر گیا، ان کے پاس صرف کپڑوں کے چیتھڑے تھے، جو انہوں نے اپنے پاؤں پر باندھ لیے تھے، اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

اس سب کے باوجود انہیں جب بھی اللہ تعالیٰ کے رستے میں نکلنے کے لیے کہا گیا، نہ انہوں نے کمزوری کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی سستی کا مظاہرہ کیا، دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان کے اوپر جو بھاری ذمہ داری ڈالی گئی اس کی انجام دہی کی راہ میں انہوں نے ہر طرح کی تکلیف اور مشکل کا مقابلہ کیا، وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عملی تصویر بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ الخ. (التوبہ:111)	یقیناً اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہیں ایمان داروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، وعدہ کیا ہے اللہ نے

اس پر پختہ وعدہ تورات اور انجیل اور قرآن
(تینوں کتابوں) میں اور کون زیادہ پورا
کرنے والا ہے اپنے وعدہ کو اللہ تعالیٰ سے
(اے ایمان والو!) پس خوشیاں مناؤ اپنے
سودے پر جو کیا ہے تم نے اللہ سے اور یہی تو
سب سے بڑی فیروزمندی ہے O

یہ وہ معاہدہ ہے جس پر وہ صحابہ کرام قائم رہے اور اپنی جانوں اور مالوں کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے غزوۂ ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ والی حدیث بیان کرتے ہوئے جب اپنی مالی کمزوری اور اپنے پاؤں کے زخموں اور ناخنوں کے ٹوٹنے کا ذکر کیا تو پھر آپ نے خود ہی اس بات کے بیان پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا کیونکہ انہوں نے اس پر ندامت محسوس کی کہ میں نے اپنے اُس عمل کو افشاء کر دیا ہے جس کا اجر وہ اللہ تعالیٰ سے چاہتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا یہ عمل اس بات پر دلیل ہے جو حضرت امام نووی علیہ الرحمۃ نے فرمائی کہ مسلمان کے لیے مستحب ہے کہ وہ اپنے اعمالِ صالحہ کو چھپائے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں پہنچنے والی تکالیف کو مخفی رکھے اور ان میں سے کسی چیز کا اظہار نہ کرے سوائے اس کے کہ کوئی مصلحت ہو یعنی اس چیز کا حکم بیان کرنا ہو یا اس عمل کی پیروی پر دوسروں کو ابھارنا ہو۔

اگر اسلاف میں سے کوئی اپنے اعمالِ صالحہ اور اپنے اعمالِ خاص کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہمیں ان کے ان اعمالِ صالحہ سے آگاہی ہوتی ہے اور ہمیں اپنی زندگی گزارنے میں ان کے ان اعمال سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ (دیکھئے: النووی علی صحیح مسلم ج ۱۲ ص ۱۹۸۔۱۹۷)

دوم: غزوۂ ذات الرقاع میں جس طریقے سے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی جماعت کو نمازِ خوف پڑھائی یہی وہ اساس اور بنیاد ہے جس کی بناء پر نمازِ خوف کی مشروعیت ہوئی۔

نمازِ خوف کے دو طریقے ہیں:

اوّل: خاص وہ کیفیت جب دشمن قبلہ کی جانب صف آراء ہو۔

دوم: وہ کیفیت جب دشمن قبلہ کی جانب کے علاوہ کسی دوسری جانب ہو۔

دوسری کیفیت میں نماز کا طریقہ

غزوہ ذات الرقاع میں جب نماز کا وقت ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو جو نماز پڑھائی' اُس وقت کیفیت یہ تھی کہ دشمن کی فوج قبلہ کی جانب نہیں تھی بلکہ دوسری اطراف میں تھی' اس لیے خوف یہ تھا کہ نماز کے دوران دشمن پیچھے سے یا کسی دوسری جانب سے حملہ آور نہ ہو' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے صحابہ کرام کے دو گروہ تشکیل دیئے' ایک گروہ کو آپ ﷺ نماز پڑھانے لگے اور دوسرا گروہ مختلف جہتوں میں دشمن کی تاک میں بیٹھ گیا' حتیٰ کہ جب نصف نماز ہوئی یعنی ایک رکعت مکمل ہوئی اور آپ ﷺ جب دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے تو پیچھے موجود صحابہ کے گروہ نے دوسری رکعت علیحدہ علیحدہ مکمل کیا اور واپس میدانِ جنگ میں مورچوں کی طرف لوٹ گئے' آپ ﷺ ابھی دوسری رکعت میں کھڑے ہی ہیں کہ صحابہ کرام کا دوسرا گروہ جو پہلے دشمن کے مقابلے میں تھا' اس دوسری رکعت میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا' آپ ﷺ نے اپنی اس دوسری رکعت کو مکمل کرتے ہوئے جب آخری قعدہ کیا تو پیچھے موجود صحابہ کرام کے گروہ نے اپنی دوسری رکعت اٹھ کر مکمل کی' اُدھر آپ ﷺ نے اپنا آخری قعدہ لمبا فرمایا تو پیچھے موجود صحابہ کرام کے گروہ نے اپنی دوسری رکعت مکمل کر کے آخری قعدہ میں آپ ﷺ کے ساتھ شمولیت اختیار کر لی' اور پھر انہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ سلام پھیرا اور یوں نماز باجماعت پڑھی گئی۔

دو علیحدہ علیحدہ جماعتیں کروانے کے امکان کے باوجود اس طرح ایک جماعت سے دو گروہوں کا نماز پڑھنا' دو اسباب کی بنیاد پر ہے:

پہلا سبب: تمام صحابہ کرام کا حضور ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا ارادہ تھا کیونکہ یہ ایک ایسی فضیلت تھی جو اس کیفیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرا سبب: بقدرِ امکان جماعت کی وحدت کا استحباب: اس صورت میں قوم کا خود بخود کسی فریضہ کی ادائیگی کے لیے اس کیفیت میں متعدد جماعتوں میں نماز ادا کرنا بغیر

ضرورتِ شرعی کے مکروہ ہے۔

ائمۂ احناف نے ان میں سے پہلے سبب کو قبول کیا ہے کیونکہ یہ کیفیت آپ ﷺ کی وفات کے بعد مشروع نہیں ہے۔

اس لیے اس کیفیت میں نماز پڑھنے کا پہلا سبب ہی ہو سکتا تھا' جواب ممکن نہیں۔

سوم: اُس مشرک کا قصہ جس نے آپ ﷺ کی تلوار اٹھا کر سونت لی جب کہ آپ ﷺ آرام فرما تھے۔

یہ قصہ روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے' اس سے پتا چلتا ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنے پیارے نبی ﷺ کی کس قدر حفاظت اور نگہبانی فرمائی۔ اس واقعہ سے آپ ﷺ کی عظمت وشان اور خوارقِ عادت کاموں پر یقین کا بھی اظہار ہوتا ہے جس سے آپ ﷺ کی شخصیتِ نبویہ پر یقین اور ایمان مزید پختہ ہوتا ہے۔

حالانکہ بظاہر جو کیفیت تھی اُس صورتِ حال میں تو اُس مشرک کے لیے طبعی طور پر یہ آسان ہی تھا کہ وہ تلوار اٹھا کر پے در پے وار کر کے (معاذ اللہ) آپ ﷺ کو شہید کر دیتا کیونکہ آپ ﷺ اُس وقت بظاہر سوئے ہوئے تھے' اور وہ مشرک تلوار اٹھائے وہاں کھڑا تھا۔ (لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کا فرمانِ عالی شان ہے کہ جب میں سوتا ہوں تو میری آنکھیں سو رہی ہوتی ہیں لیکن میرا دل جاگ رہا ہوتا ہے) یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے تھا۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کیفیت میں اُس مشرک کو اس سنہری موقع سے روکنے والی کوئی چیز نہیں تھی' اسی لیے اُس نے اعتماد کے ساتھ کہا: آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ اس کے بعد کون سی ایسی چیز تھی جو اُس مشرک کے آڑے آئی جس نے اُس کو اپنا ارادہ پورا کرنے سے روک دیا؟ بے شک جو چیز آڑے آئی' وہ اُس مشرک کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی' وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور فضل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے حبیب کریم ﷺ کی حفاظت فرمائی' یہی وہ عنایتِ الٰہیہ تھی کہ اُس مشرک کے دل میں رعب طاری ہو گیا اور وہ کانپنے لگا جس وجہ سے تلوار اس کے ہاتھوں سے نیچے گر گئی' پھر وہ مشرک نہایت باادب ہو کر سر جھکا کر خاموشی سے آپ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس حادثے میں جس چیز نے اہم کردار ادا کیا' اس کا مصداق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے۔ (المائدہ:٦٧)

اس آیت مبارکہ میں جو "حفاظت وعصمت" کا کلمہ آیا ہے' اس سے یہ مراد نہیں کہ آپ ﷺ کو قوم کی طرف سے کوئی ایذاء یا تکلیف نہیں پہنچے گی' اس لیے کہ یہ تو سنتِ الٰہی ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو بہرصورت قتل ہونے سے محفوظ رکھے گا' تاکہ جو دعوت آپ ﷺ لے کر مبعوث ہوئے تھے' وہ صحیح طریقے سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے اور اس دعوت کا کام نہ رُک سکے۔

چہارم: ہم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قصہ اور مدینۃ المنورہ کی طرف لوٹتے ہوئے راستے میں رسول اللہ ﷺ کے اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ بھی پچھلے صفحات میں بیان کی۔ اگرچہ اس بات چیت کا تعلق اس غزوہ سے نہیں تھا لیکن اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ کا صحابہ کرام کے ساتھ کس قدر کامل صورت میں اخلاقِ کریمانہ کا مظاہرہ تھا۔ اس بات چیت سے آپ ﷺ کے خلق کریم کے جو پہلو نظر آتے ہیں' وہ یہ ہیں کہ آپ ﷺ کی اپنے صحابہ کے ساتھ معاشرت و معاملات میں لطافت کس قدر تھی' بات چیت میں کتنی نرمی و رقت تھی' باہمی گفتگو میں خوش طبعی' اور اپنے صحابہ کے ساتھ کتنی شدید محبت تھی۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے گھر میں جو تکالیف و مشکلات آئیں' آپ ﷺ اس سے بہت متاثر ہوئے' جس وجہ سے آپ ﷺ' حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ساتھ شدید محبت کا اظہار فرماتے ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد محترم غزوۂ اُحد میں شہید ہو گئے اور اپنے پیچھے کثیر اولاد چھوڑ گئے۔ حضرت جابر اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے اپنے خاندان کی عزت وشان اور اپنے بہن بھائیوں کی تربیت و پرورش کے لیے کوشاں ہوئے' اور گھر کی ساری ذمہ داریاں آپ کے سر آن پڑیں' جس وجہ سے آپ مفلوک الحال تھے اور

مال و اسباب کی شدید قلت تھی۔ اس سفر کے دوران حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس کمزور اونٹ ہونے کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ اپنے قافلے سے پیچھے رہ گئے' آپ ﷺ نے جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حالت کو محسوس کیا تو آپ ﷺ بھی پیچھے اپنے صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلنے لگے' کیونکہ آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ سفر کے دوران قافلے میں آگے چلنے والے' درمیان میں چلنے والے اور آخر میں چلنے والے سب صحابہ سے ملتے اور ان کے حال احوال سے باخبر رہتے' اسی طرح اس سفر کے دوران آپ ﷺ پیچھے رہ جانے والے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ اپنی سواری کو چلانے لگے اور اپنے اس صحابی سے نہایت نرمی اور خوش طبعی کے انداز میں گفتگو بھی کرنے لگے تاکہ اس کا دل مطمئن ہو' پھر آپ ﷺ نے اُن کے اونٹ کو خریدنے کی بات چیت شروع کی تاکہ اس طرح ان کی عزت افزائی ہو اور اس ذریعہ سے اُن کی کچھ معاونت ہو سکے۔

پھر آپ ﷺ نے اُن کی بیوی اور گھریلو اُمور کے متعلق خوش طبعی اور مزاح کے اسلوب میں پوچھا جس پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ اپنی نئی بیوی کے متعلق بتانے لگے' جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

جب یہ قافلہ مدینۃ المنورہ کے قریب پہنچا تو یہ مدینۃ المنورہ کے باہر کچھ دیر ٹھہرے رہے' تاکہ اہل مدینہ کو ان کی آمد کی خبر مل جائے اور یہ کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بیوی بھی آپ کی آمد کی خبر سن لے' تاکہ وہ گھر کی زیب و زینت کر لے اور آپ کے لیے گاؤ تکیے لگا دے' اسی اثناء میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں: یارسول اللہ ﷺ! خدا کی قسم! ہمارے پاس گاؤ تکیے نہیں ہیں' حضور ﷺ نے جواب دیا: عنقریب یہ تمہارے پاس ہوں گے۔

یہ سارا واقعہ کیا خوب صورت اور دلکش منظر پیش کرتا ہے کہ جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے پیارے صحابی سے حسنِ معاشرت فرماتے ہیں' پیار اور محبت بھرے لہجے میں گفتگو فرماتے ہیں' بات چیت کے دوران خوش طبعی اور مزاح بھی فرماتے ہیں' آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے یہ پہلو لکھنے اور سننے کے بعد دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہائے کاش! ہم

اُس وقت کیوں موجود نہ تھے کہ ہم بھی آپ ﷺ کی معیت اور مجلس اختیار کرتے' ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ غزوات کے سفروں میں شریک ہوتے اور وہ حسین اور پرسوز نظارے خود ملاحظہ کرتے۔ جوں جوں ہم سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں یا سنتے ہیں توں توں اس شوق میں اضافہ ہوتا ہے' لیکن افسوس کہ ہمیں یہ شرف حاصل نہیں ہوا' لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ مولا تعالیٰ! ہمیں اس سب کے بدلے جنتِ معلیٰ میں آپ ﷺ کی مجلس کا شرف عطا فرمانا اور دنیا میں ہمیں توفیق دینا کہ ہم تیرے دین کی خاطر ہر قسم کی قربانی پیش کر سکیں اور دین کی ترویج و تنفیذ میں اپنی ہر قسم کی قوت و طاقت صرف کرنے میں آپ ﷺ کے طریقے کو مضبوطی سے تھامے رہیں اور آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلیں۔

پنجم: ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ تھوڑی دیر توقف کرے اور سوچے کہ آپ ﷺ نے اس غزوہ کے دوران ایک موقع پر جب قافلے نے ایک جگہ پڑاؤ کیا تو دو صحابہ کرام کو رات کے وقت پہرے پر متعین فرمایا اور وہ دونوں صحابی رات بھر آپ ﷺ کے حکم کے مطابق پہرہ دیتے رہے اور عبادت میں مشغول رہے۔

اس میں جہاد کی طبعی حالت اور مزاج کی تعلیم دینا مقصود تھا کہ جہاد صرف اور صرف عسکری نقل و حرکت اور لڑائی جھگڑے کا ہی نام نہیں جس میں صرف اور صرف مادی اسلحہ سے ہی لڑا جاتا ہے' کوئی بھی مسلمان اسلامی جہاد کے بارے ایسا تصور اور ایسی سوچ ہرگز نہ رکھے' بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو جہاد کی جو تعلیم دی ہے یا جہاد کے متعلق جو بات سمجھائی ہے وہ یہ کہ جہاد ایک بہت بڑی عبادت ہے' جس میں ایک بندۂ مسلم پورے خشوع خضوع' عاجزی و انکساری سے ربِ تعالیٰ کے ساتھ جُڑ جاتا ہے اور اسی کی مدد چاہتا ہے اور اُسی سے لَو لگاتا ہے اور اپنی خواہشات اپنی جان' اپنا مال اور اپنی ہر چیز قربان کرنے کے جذبے سے خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دنیا سے منہ پھیر کر موت کو گلے لگانے کے لیے آگے بڑھتا ہے' اس وقت مؤمن سب سے زیادہ اپنے رب کے قریب ہوتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت عباد بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہ جن کو رات کے وقت پہرے پر مامور کیا تھا' یہ چیز ان کے لیے فطری تھی کہ وہ پہرہ دیتے ہوئے رات کا ایک حصہ چند رکعات کے لیے مختص کر دیں' جس میں وہ خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں

اور ان کے تمام احساسات' آیاتِ قرآنی کی تلاوت کے ذریعے اس کی مناجات میں مشغول ہوں۔

یہ چیز بھی طبعی اور فطری تھی کہ انہیں اُس مشرک کے تیر کی بالکل بھی کوئی پرواہ نہ ہو' جو تیزی سے آ کر ان کے جسم میں پیوست ہو گیا اور نہ اس کے بعد آنے والے دیگر تیروں کی پرواہ ہو' اس لیے کہ اُس وقت ان کی بشریت اپنے تمام احساسات کے ساتھ اپنے رب تعالیٰ کی طرف پوری طرح متوجہ تھی اور عبد و معبود کے درمیان مناجات کی لذت میں پوری طرح غرق تھی۔

پھر ان کی توجہ اپنے جسم کی طرف لوٹی اور اپنے جسم میں تیر لگنے کا احساس ہوا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں تکلیف ہوئی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں خیال آیا کہ پہرہ دینے کی جو ذمہ داری انہیں سونپی گئی تھی' یہ ذمہ داری مسلسل خاموشی و سکوت یا جان چلی جانے کی وجہ سے کہیں ضائع اور فوت ہی نہ ہو جائے۔ اسی احساس نے انہیں نماز جلدی مکمل کرنے پر مجبور کر دیا اور یہ کہ وہ اپنے ساتھی کو بیدار کر دیں تا کہ اس گھاٹی پر پہرہ کی امانت جوان کے سپرد تھی وہ دوسرے ساتھی کے حوالے کر دیں۔

اُس وقت انہوں نے جو جملہ کہا یہ جملہ ہر مسلمان کے لیے غور و فکر کا باعث ہے۔ آپ نے کہا: خدا کی قسم! اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ جس نگرانی اور حفاظت کا حکم مجھے رسول اللہ ﷺ نے دیا ہے' میں اس کو ضائع کر رہا ہوں تو میں سورت کو مکمل کرتا اور نماز مختصر نہ کرتا خواہ میری جان چلی جاتی۔

یہ ہے وہ جہاد کی حقیقت جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہر میدان میں فتح و نصرت سے نوازا' دشمن چاہے کتنا ہی مضبوط ہو چاہے کتنی ہی زیادہ تعداد میں ہو' مسلمانوں میں جب تک یہ جذبۂ جہاد کارفرما رہا' فتح و نصرت ان کے قدم چومتی رہی۔

لہٰذا ذرا سوچیے اور اُس وقت کے جذبۂ جہاد اور موجودہ دور کے جہاد کے درمیان ذرا موازنہ کیجیے جس پر آج ہم فخر کرتے ہیں اور اس کا نعرہ لگاتے ہیں (تو پتا چلتا ہے کہ اُس وقت جہاد خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اور دین کی سربلندی کے لیے تھا جب کہ اب اس دور میں ہم اپنے ذاتی مفاد اور فخر و مباہات کے لیے جہاد کرتے ہیں) اور ان دونوں کے

درمیان موازنہ کیجیے تو آپ کو پتا چلے گا کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل قائم ہے اور عدل قائم کرنے والوں کی مدد فرماتا ہے' اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں فرماتا بلکہ لوگ خود اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

(مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ اب دین کے ساتھ لگاؤ' خلوص اور تعلق کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے' اور حقیقی اسلامی جہاد کی روح دم توڑتی جا رہی ہے) اس صورتِ حال میں پھر اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھائیں اور رب تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اہلِ باطل کے کرتوتوں کی پاداش میں نہ ڈالے اور اس دوران کوشش کریں کہ اپنی آنکھوں سے عاجزی وانکساری کے چند آنسو بھی ہاتھوں کو تر کر دیں' شاید کہ بندگی کا لبادہ اوڑھ کر ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخ رو ہو جائیں اور اپنی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کی بناء پر جو سزا ہمارا مقدر بن چکی ہے' اس سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

غزوۂ بنی مصطلق (غزوۂ مریسیع)

ابن اسحاق اور بعض دیگر علماءِ سیرت کے مطابق یہ غزوہ ہجرت کے چھٹے سال واقع ہوا' لیکن صحیح رائے یہ ہے جو جملہ محققین کا موقف ہے کہ یہ غزوہ ہجرت کے پانچویں سال ماہِ شعبان میں واقع ہوا۔ اس کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اس غزوہ کے موقع پر باحیات تھے اور اس غزوہ میں شریک تھے' واقعۂ افک میں بھی آپ کا ذکر موجود ہے' جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر ہوئی' اس کا سبب وہ زخم تھا جو آپ کو غزوۂ خندق کے دوران لگا تھا۔

غزوۂ بنی قریظہ جس میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی' یہ غزوہ ہجرت کے پانچویں سال واقع ہوا' اس کا تفصیلی ذکر ابھی آئے گا' تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت سعد بن معاذ اپنی وفات کے ایک سال بعد بھی زندہ ہیں؟ (لہٰذا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غزوہ بنی مصطلق ۵ ہجری میں ہی واقع ہوا تھا)[1]

---

[1] اس دلیل کی تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۴' زاد المعاد لابن القیم ج ۲ ص ۱۱۲' عیون الاثر لابن سید الناس ج ۲ ص ۹۳۔

اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ قبیلہ بنو مصطلق کے لوگ اپنے قائد حارث بن ضرار کی سرکردگی میں جمع ہونے لگے تاکہ مسلمانوں پر حملہ کریں' جب اس بات کی خبر آپ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ اپنے جان نثاروں کے ہمراہ ان کے مقابلے کے لیے نکلے حتیٰ کہ مریسیع کے چشمہ کے قریب دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے۔ دونوں لشکروں کے درمیان مزاحمت ہوئی اور خوب قتال ہوا' اللہ تعالیٰ نے بنو مصطلق کے مقابلے میں مسلمانوں کو فتح و نصرت سے نوازا' اور بنو مصطلق کے کافی لوگ مارے گئے' رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے چار حصے فوج میں تقسیم فرما دیئے' آپ ﷺ نے گھڑسواروں کو دو حصے اور پیدل فوجیوں کو ایک ایک حصہ عطا فرمایا۔ (طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۰۶' سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۹۰)

اس غزوہ میں مسلمانوں کے ساتھ کافی تعداد میں منافقین بھی شریک ہوئے تھے' اگرچہ اس سے قبل سابقہ غزوات میں ان کی تعداد کم ہی رہی تھی لیکن جب منافقین نے دیکھا کہ مسلمانوں کو ہر غزوہ میں فتح و نصرت ہوتی ہے تو اس لیے منافقین اب کی بار اس طمع اور لالچ سے شامل ہوئے تاکہ مالِ غنیمت سے وافر حصہ حاصل کر سکیں۔ امام بخاری اور امام مسلم نے دو مختلف سندوں سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب آپ ﷺ نے مجاہدین کے درمیان اس غزوہ میں حاصل ہونے والی قیدی عورتوں کو تقسیم فرمایا تو بعض صحابہ کرام نے آپ ﷺ نے یہ مسئلہ پوچھا کہ عزل کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے' قیامت تک جس روح کو بھی اس دنیا میں آنا ہے' وہ آ کر رہے گی۔

ابن سعد نے اپنی طبقات میں اور ابن ہشام نے اپنی سیرت میں روایت کیا ہے کہ اس غزوہ کے دوران ایک اور اہم واقعہ اُس وقت پیش آیا' جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے غلام جہجان بن سعید الغفاری اور سنان بن وبر الجہنی کے درمیان تنازع کھڑا ہو گیا' یہ دونوں مریسیع کے چشمے پر تھے کہ دونوں آپس میں لڑ پڑے حالانکہ حضور ﷺ خود بھی وہاں موجود تھے۔ اسی اثناء میں جہنی نے اپنے قبیلے کو صدا لگائی اور پکارا: "یا معشر الانصار" (اے گروہِ انصار!) جہجان نے بھی آواز لگائی اور کہا: "یا معشر المهاجرین" (اے گروہِ مہاجرین!) (یہ سن کر مہاجرین اور انصار دوڑ کر آئے اور وہاں جمع ہو گئے لیکن معاملہ رفع دفع

ہو گیا)۔

یہ جب بات رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول تک پہنچی تو وہ غصے اور حسد سے لال پیلا ہو گیا اور اپنے اردگرد جمع ساتھیوں کو کہنے لگا: کیا اب ان لوگوں کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے کہ یہ لوگ ہمارے وطن میں ہم سے برابری کرتے ہیں اور ہم پر فخر کرتے ہیں؟ اللہ کی قسم! ہمارا اور ان قریشیوں کا معاملہ ایسے ہی ہے (وہ قریش سے مراد مسلمان لے رہا ہے) جیسے کسی نے کہا تھا: ''سمن کلبك یاکلك'' اپنے کتے کو موٹا کرو تا کہ وہ تمہیں ہی کاٹ کھائے۔ پھر کہنے لگا:

وَاللّٰہِ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ.

بہ خدا! جب ہم مدینہ لوٹ کر گئے تو ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے باہر نکال دے گا۔

عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کا خیال تھا کہ صرف اس کے حواری ہی اس کی یہ ہرزہ سرائی سن رہے ہیں لیکن اتفاق سے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے یہ ساری بات سن لی۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ وہاں سے اٹھے اور حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور ساری بات بتادی' وہاں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے' آپ رضی اللہ عنہ یہ ساری بات سننے کے بعد عرض کرنے لگے: یارسول اللہ ﷺ! عباد بن بشر کو حکم دیں کہ اُس کی گردن اُڑا دے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

اے عمر! یہ کیسے ہو سکتا ہے' اگر ایسا کروں تو لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں؟ نہیں! البتہ لشکر کو کوچ کا حکم دو۔

حالانکہ اُس وقت سخت دھوپ تھی' سرکارِ دو عالم ﷺ کا ایسے وقت سفر کرنے کا عام معمول نہ تھا' لیکن آپ ﷺ نے کوچ کا حکم دیا تو سب لوگ کوچ کے لیے تیار ہو گئے اور لشکر روانہ ہو گیا۔

حضور ﷺ سارا دن مسلسل سفر کرتے رہے' آنے والی رات بھی سفر جاری رہا' دوسرے روز دوپہر تک قافلہ رواں دواں رہا حتیٰ کہ جب دوپہر کے وقت سورج کی دھوپ

سخت ہو گئی تو آپ ﷺ نے ایک جگہ قیام فرمایا' جب لوگوں کو آرام کرنے کی اجازت ملی تو زمین پر لیٹتے ہی تھکن کی وجہ سے سب پر فوراً نیند مسلط ہو گئی' لگا تار اس سفر میں مصروف رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ گزشتہ روز مریسیع کے چشمہ پر عبداللہ بن ابی ابن سلول نے جو دل آزار باتیں کی تھیں' ان کی تلخ یاد لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو جائے اور تبادلۂ خیال کا موقع ہی نہ ملے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی جو باتیں سن کر آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیں' ان کی تصدیق میں سورۃ المنافقین کی یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (المنافقون:٨)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر گئے مدینہ میں تو نکال دیں گے عزت والے وہاں سے ذلیلوں کو' حالانکہ (ساری) عزت تو صرف اللہ کے لیے' اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے مگر منافقوں کو (اس بات کا) علم ہی نہیں ○ [1]

جب آپ ﷺ مدینۃ المنورہ پہنچ گئے تو عبداللہ بن ابی ابن سلول کے صادق الایمان بیٹے حضرت عبداللہ خود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! مجھے خبر ملی ہے کہ آپ میرے ابا کو قتل کروانا چاہتے ہیں' اگر آپ ضرور ایسا کرنا چاہتے ہیں تو مجھے حکم دیں' میں ابھی اس کو قتل کر کے اس کا سر باپ کی خدمت میں پیش کر دیتا

[1] اس روایت کو مذکورہ طریقے پر ابن اسحاق نے مرسل روایت کیا ہے اور ان سے ابن سعد نے اور بیہقی نے حضرت جابر سے' احمد اور ابن جریر نے حضرت زید بن ارقم سے اور ابن ابی حاتم نے حضرت عمرو بن ثابت انصاری سے مختصراً روایت کیا ہے' یہ تمام روایات خلاصہ میں متفق اور تفصیل میں قریب قریب ہیں اور ابن اسحاق کی روایت کے علاوہ جو کہ مرسل ہے' باقی سب متصل الاسناد ہیں' نیز دیکھیے: تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۷۰' تاریخ ابن جریر ج ۲ ص ۲۰۶' الفتح الربانی ج ۲۱ ص ۲۰۷۔ ج ۱۸ ص ۳۰۶' سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۹۱۔

ہوں، اللہ کی قسم! پورے قبیلۂ خزرج کو معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ اپنے باپ کا فرماں بردار کوئی نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کام کے لیے کسی اور کو حکم دیں اور وہ میرے باپ کو قتل کرے اور پھر جب بھی وہ شخص مجھے نظر آئے تو باپ کا قاتل سمجھ کر اس وقت میری آنکھوں میں خون اتر آئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مشتعل ہو کر کافر کے بدلے ایک مسلمان کو قتل کر دوں اور میں خود جہنم کا ایندھن بن جاؤں۔

رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے اس مخلص غلام کی عرض سن کر ارشاد فرمایا: ایسی بات نہیں! ہم ایسا نہیں کریں گے! بلکہ جب تک وہ ہمارے درمیان رہے گا ہم اس کے ساتھ نرمی اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کریں گے۔

اس کے بعد عبداللہ بن ابی جب بھی قوم میں بیٹھ کر کوئی بات کرتا تو اس کی اپنی قوم ہی اس کو خوب ملامت کرتی اور سخت سرزنش کرتی تھی۔

یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو فرمایا: اے عمر! تمہارا کیا خیال ہے؟ اللہ کی قسم! اگر میں نے اس کو اس دن قتل کروا دیا ہوتا جس دن تم نے اس کے قتل کا مشورہ دیا تھا تو اس کے حمایتی طوفان کھڑا کر دیتے، لیکن اگر آج میں اس کے قبیلے کو اسے قتل کرنے کا حکم دوں تو یہ فوراً اس کو قتل کر دیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اللہ کی قسم! میں نے جان لیا ہے کہ اس کے بارے میں اللہ کے رسول کا فیصلہ میری رائے سے زیادہ برکت والا ہے۔

واقعۂ اِفک

مسلمان جب غزوۂ مصطلق سے واپس مدینۃ المنورہ لوٹ رہے تھے تو اس دوران حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا (منافقین نے اس واقعہ کو غلط رنگ دیا اور جھوٹ و بہتان تراشی کی حد کر دی) اس واقعہ کو واقعۂ افک کہا جاتا ہے۔ (افک کا معنی ہے: ''الافک ابلغ ما یکون من الکذب والافتراء'' کذب بیانی اور بہتان تراشی کی انتہاء کو افک کہتے ہیں)۔ اس واقعہ کے متعلق صحیحین نے جو روایات بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ میں اس غزوہ (مصطلق) میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گئی تھی' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غزوہ سے فارغ ہوئے تو لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا گیا' اُس وقت پردہ کے احکام نازل ہو چکے تھے' تو رات کے وقت آپ نے کوچ کا حکم دیا' رات کے پچھلے پہر جب کوچ کی تیاری شروع ہو گئی' میں اُس وقت حاجت ضروریہ کے لیے باہر گئی' جب میں واپس آئی تو میں نے اپنا سینہ ٹٹولا تو میرا ہار ٹوٹ کر کہیں گر چکا تھا' میں اپنے ہار کی تلاش میں پھر واپس لوٹ گئی' ہار تلاش کرنے میں مجھے کچھ دیر ہو گئی' اُدھر میرا ھودج اُٹھانے والوں نے حسب عادت میرا ھودج اٹھا کر میری سواری والے اونٹ پر رکھ دیا' انہیں یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ میں ھودج کے اندر نہیں ہوں' اور وہ اونٹ لے کر وہاں سے روانہ ہو گئے' میں اپنا ہار تلاش کر کے جب وہاں پہنچی تو وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا' میں وہیں پہ اپنی جگہ پر موجود رہی کہ شاید قافلہ والے مجھے مفقود پا کر واپس مجھے لینے آئیں گے لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ حضرت صفوان بن المعطل رضی اللہ عنہ وہاں آ گئے جو لشکر کے پیچھے رہتے تھے' صبح کے وقت انہوں نے مجھے دیکھا تو قریب آ گئے اور انہوں نے مجھے پہچان لیا کیونکہ انہوں نے حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے مجھے دیکھا ہوا تھا' حالانکہ میں نیند کے غلبے کی بناء پر سو چکی تھی' انہوں نے جب مجھے سوتے ہوئے دیکھا تو اونچی آواز سے ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا' ان کی آواز سن کر میں بیدار ہوئی تو میں نے اپنی چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا' بخدا! نہ میں نے اُن سے کوئی بات کی اور نہ ہی اُن سے کوئی بات سنی' سوائے ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' کے۔

انہوں نے اپنا اونٹ میرے قریب کر کے بٹھا دیا' میں اٹھی اور اونٹ پر سوار ہو گئی' وہ اونٹ کی نکیل پکڑ کر آگے آگے چل دیئے' ہم دوپہر کے وقت لشکر سے جا ملے جب کہ لشکر ابھی ایک جگہ ٹھہرا ہی تھا' میری اس بات پر بہتان لگانے والوں نے بہتان تراشی کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا' ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن ابی تھا' جس نے بہتان تراشی اور جھوٹ کا طوفان کھڑا کر دیا۔

آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پھر جب میں مدینۃ المنورہ پہنچی تو میں تقریباً ایک ماہ بیمار رہی۔ لوگوں میں یہ بات خوب پھیلتی گئی لیکن مجھے قطعاً اس کے بارے کچھ علم نہیں تھا' البتہ

ایک بات میں محسوس کر رہی تھی کہ میری بیماری کے وقت جو لطف و عنایت حضور ﷺ اس سے پہلے مجھ سے فرمایا کرتے تھے' وہ اب مفقود تھا۔ اب کی بار آپ ﷺ جب بھی بیمار پرسی کے لیے میرے پاس تشریف لاتے تو سلام کرتے اور صرف اتنا ہی پوچھتے: ''کیف تیکم'' تمہارا کیا حال ہے؟ بیماری کے بعد میں بہت نقاہت محسوس کرنے لگی۔

ایک رات میں اُمِ مسطح (حضرت ابوبکر صدیق کی خالہ زاد بہن) کے ساتھ قضائے حاجت کے لیے باہر گئی' جب ہم فراغت کے بعد واپس آ رہی تھیں تو اُمِ مسطح چادر میں پاؤں پھنسنے کے باعث گر پڑیں' اور بے ساختہ کہہ دیا: مسطح ہلاک ہو! میں نے اُن سے کہا: یہ جو آپ نے کہا بُرا کہا ہے' کیا آپ اُس شخص کو بُرا کہہ رہی ہیں جو بدری صحابی ہے؟

انہوں نے کہا: اے عائشہ! کیا تم نے نہیں سنا اس مسطح نے کیا طوفان کھڑا کر رکھا ہے؟

پھر اُمِ مسطح نے مجھے اہلِ افک (بہتان تراشی کرنے والوں) کی پھیلائی ہوئی باتوں سے آگاہ کیا' یہ سب کچھ سن کر میری بیماری دوبارہ لوٹ آئی اور میں دوبارہ بیمار پڑ گئی' میں مسلسل ساری رات روتی رہی حتیٰ کہ صبح ہو گئی' میرے آنسو لگاتار جاری تھے اور ساری رات نیند نہ آئی۔

حضور ﷺ نے اس دوران اپنے کچھ اصحاب سے اس معاملہ کے متعلق مشورہ کیا کہ کیا اپنی اہلیہ کو چھوڑ دینا چاہیے یا نہیں؟ ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ آپ کے گھر والے ہیں' ہم ان کے متعلق خیر کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ اسی طرح ایک صحابی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر تنگی نہیں فرمائی' عورتیں بے شمار ہیں' اگر آپ تصدیق فرمانا چاہتے ہیں تو (بریرہ) لونڈی کو بلا کر دریافت فرمالیجئے' وہ آپ کو حقیقت سے آگاہ کر دے گی' چنانچہ آپ ﷺ نے بریرہ کو بلایا اور اس سے پوچھا: ''ھل رایت من شیء یریبك من عائشة'' کیا تم نے کوئی ایسی چیز ملاحظہ کی ہے جس سے تمہیں عائشہ کے بارے میں کوئی شک گزرا ہو؟ اُس نے عرض کی: میں اُن کے (عائشہ کے) متعلق خیر کے سوا کچھ نہیں جانتی۔

حضور ﷺ وہاں سے اٹھے اور مسجد میں تشریف لے گئے اور منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا:

یا معشر المسلمین! من   اے مسلمانوں کے گروہ! اس شخص

یعذرنی من رجل قد بلغ اذاہ فی اھل بیتی؟ فواللّٰہ ما علمت علی اھلی الا خیراً۔	کے حملوں سے کون میری عزت بچائے گا؟ جس کی اذیت رسانی میرے اہلِ خانہ کے بارے میں مجھ تک پہنچی ہے' بخدا! میں اپنے اہل کے بارے خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔

انہوں نے ایسے آدمی کے بارے میں یہ بہتان تراشی کی ہے جس کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میں اس کی طرف سے آپ کی عزت و ناموس کو بچاؤں گا' اگر وہ بہتان لگانے والا شخص قبیلہ اوس سے ہے تو ہم بلا تامل اس کی گردن اُڑا دیتے ہیں اور اگر ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو جو حکم آپ ہمیں دیں گے ہم اس پر پورا اُتریں گے۔ یہ بات سن کر مسجد میں موجود لوگوں میں تلخ کلامی شروع ہوگئی' قریب تھا کہ وہ لڑ پڑتے' آپ ﷺ نے انہیں خاموش کرا دیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں ان دنوں ہر وقت گریہ زاری میں ہی گزارتی اور اس قدر شدید روتی کہ میرے والدین کو خدشہ لاحق ہوگیا کہ کہیں میرا کلیجہ ہی نہ پھٹ جائے' پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے' میرے والدین بھی اُس وقت میرے پاس موجود تھے' تقریباً ایک مہینہ گزر چکا تھا اور جب سے یہ افواہ پھیلی تھی' آپ ﷺ میرے پاس نہیں بیٹھے تھے' اس مہینہ کے دوران میرے بارے میں کوئی وحی بھی نازل نہیں ہوئی تھی۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور بیٹھ گئے' اس سے پہلے میرے پاس نہیں بیٹھتے تھے۔ آپ ﷺ نے بیٹھتے ہی کلمہ شہادت پڑھا اور پھر فرمایا:

امابعد! یا عائشہ فانہ قد بلغنی عنک کذا وکذا فان کنت بریئۃ فسیبرئک اللّٰہ وان کنت المت بذنب فاستغفری اللّٰہ وتوبی الیہ۔	امابعد! اے عائشہ! تیرے بارے میں مجھے ایسی ایسی اطلاع ملی ہے' اگر تو پاک دامن ہے تو اللہ تعالیٰ تیری براءت فرمائے گا اور اگر تجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کر اور توبہ کرلے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب آپ ﷺ نے اپنی بات مکمل فرمالی تو

میرے آنسو رُک گئے' پھر میری آنکھوں سے کوئی قطرہ نہ نکلا' پھر میں نے اپنے والد گرامی سے کہا کہ آپ میری طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا جواب دیں' انہوں نے کہا: بخدا! میں کچھ جواب نہیں دے سکتا' پھر میں نے اپنی والدہ محترمہ سے کہا کہ آپ میری طرف سے اس بات کا جواب دیں تو انہوں نے بھی کہا کہ میں کچھ جواب دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ پھر میں نے عرض کی: خدا کی قسم! مجھے معلوم ہے کہ آپ سب لوگوں نے ایک بات سنی اور وہ آپ کے دلوں میں جم گئی' اگر میں یہ کہوں کہ میں بے قصور ہوں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں' تو آپ لوگ میری بات کی تصدیق نہیں کریں گے' اور اگر میں ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جس سے خدا تعالیٰ واقف ہے کہ میں بے قصور ہوں تو آپ لوگ میری تصدیق کریں گے' اب آپ کے لیے اور میرے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں کہ میں بھی وہی بات کہوں جو یوسف علیہ السلام کے باپ نے کہی تھی:

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ○ (یوسف: ۱۸)

میں اس پر بخوبی صبر کروں گا اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس پر اللہ سے مدد چاہوں گا○

آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پھر میں منہ پھیر کر بستر پر لیٹ گئی' اللہ کی قسم! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی وہیں تشریف فرما تھے اور گھر والوں میں سے بھی ابھی کوئی نہیں اٹھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل فرمائی' یکایک وہی آثار نمودار ہوئے جو وحی کے نزول کے وقت ظاہر ہوتے تھے کہ شدید سردی کے موسم میں بھی نزولِ وحی کے وقت موتیوں کی طرح آپ کے چہرے پر پسینے کے قطرے ڈھلکنے لگتے' جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خوشی ظاہر ہو رہی تھی اور آپ ہنس رہے تھے اور پہلی بات جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی' وہ یہ تھی:

ابشری یا عائشة اما واللّٰه فقد براك.

اے عائشہ! تجھے خوش خبری ہو اللہ تعالیٰ نے تمہاری براءت نازل فرما دی۔

میری والدہ محترمہ نے کہا: اے عائشہ! اٹھو! اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا: بخدا! نہ میں اٹھوں گی اور نہ میں شکریہ ادا کروں گی' میں تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہی شکر ادا

کروں گی جس نے میری براءت پر وحی نازل فرمائی' اُس وقت یہ آیات نازل ہوئیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌO (النور:11)

بے شک جنہوں نے جھوٹی تہمت لگائی ہے وہ ایک گروہ ہے تم میں سے' تم اسے اپنے لیے بُرا خیال نہ کرو بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے لیے' ہر شخص کے لیے اس گروہ میں سے اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا' اور جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا ان میں سے (تو) اس کے لیے عذابِ عظیم ہوگاO

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مسطح جو میرے والد کے قریبی رشتہ دار تھے' ان کی غربت کی وجہ سے میرے والد اُن کو خرچہ دیتے تھے لیکن جب یہ آیات نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے میری براءت فرما دی تو مسطح جو اس بہتان تراشی میں منافقین کا ساتھ دے رہے تھے' میرے والد اُن پر سخت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے: بخدا! اب میں اُس پر ہمیشہ کے لیے کوئی مال خرچ نہیں کروں گا کیونکہ اُس نے عائشہ کے بارے میں غلط باتیں کی ہیں' تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى (النور:22)

اور نہ قسم کھائیں جو برگزیدہ ہیں تم میں سے اور خوش حال ہیں اس بات پر کہ وہ نہ دیں گے رشتہ داروں کو۔

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌO (النور:22)

کیا تم پسند نہیں کرتے کہ بخش دے اللہ تعالیٰ تمہیں اور اللہ غفور رحیم ہےO

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سن کر فرمایا: کیوں نہیں! اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرما دے' چنانچہ وہ مسطح پر اسی طرح خرچ کرنے لگے جس طرح پہلے کرتے تھے۔

پھر آپ ﷺ باہر لوگوں کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں خطبہ ارشاد فرمایا' وہ آیات تلاوت کیں جو اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کے بارے نازل فرمائی تھیں۔

پھر مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش جو اس بہتان تراشی میں خواہ مخواہ شریک ہوئے، انہیں حد لگانے کا حکم دیا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن اسحاق وغیرہ)

اسباق ونصائح

ہمیں غزوۂ مصطلق اور اس واقعہ سے مندرجہ اسباق و دروس حاصل ہوتے ہیں:

پہلا: مالِ غنیمت میں سے "سلب" اور "خمس" (پانچواں حصہ) کے علاوہ باقی مال مجاہدین میں تقسیم کرنے کی مشروعیت

سلب: وہ مال یا اسلحہ جو قاتل نے جنگ کے دوران مقتول کے جسم سے اتارا ہو، قاتل کو یہ مال ذاتی طور پر لینا جائز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

جس نے (جنگ کے دوران) کسی کو قتل کیا تو اُس (مقتول) سے حاصل ہونے والی اشیاء اُس (قاتل) کی ہیں۔

خمس: پانچواں حصہ، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یوں ارشاد فرمایا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ. (الانفال: ۴۱)

اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لیے ہے اس کا پانچواں حصہ اور رسول کے لیے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔

پانچواں حصہ نکال کر باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جاتے ہیں جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ مصطلق میں کیا۔ اموالِ منقولہ میں تقسیم کا طریقہ ائمہ وفقہاء کے نزدیک بھی متفق علیہ ہے، جب کہ اموال غیر منقولہ مثلاً زمین اور باغات وغیرہ جو جنگ میں مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہوں، ان کی تقسیم کا طریقہ مختلف فیہ ہے، جیسا کہ ہم نے بنونضیر کی جلاوطنی کے ضمن میں پیچھے ذکر کر دیا ہے۔

دوسرا: جماع کے وقت عزل کا حکم یا خاندانی منصوبہ بندی

غزوۂ بنو مصطلق سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جماع کے وقت عزل کرنے کی اجازت ہے (یعنی عورت کی شرمگاہ سے باہر مادۂ منویہ کا اخراج)، اور اسی ضمن میں وہ مسئلہ بھی

آتا ہے کہ نطفہ یا علقہ (روح پڑنے سے قبل) کا اسقاط کرنا' اور اسی سے متعلق وہ بات بھی ہے' جسے آج عمومی طور پر "خاندانی منصوبہ بندی" کہتے ہیں۔

اس بارے میں جو حدیثِ طیبہ ہم نے پہلے ہی ذکر کردی ہے' اس میں عزل کرنے کا صراحتہً جواز پایا جاتا ہے۔ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عزل کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا (کہ ہم نے جنگ میں کچھ عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنالیا ہے' کیا ہم اُن سے عزل کرلیں؟)' تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ کرنا تمہارے لیے ضروری نہیں۔

مسلم کی روایت ہے:

تم اگر ایسا نہ بھی کرو تو پھر بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ قیامت تک جس روح نے پیدا ہونا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گی۔ (رواہ مسلم)

یعنی اگر تم عزل کرلو یا عزل نہ کرو تو تم پر کوئی حرج نہیں کیونکہ ہر دو صورتوں میں جس بچے کی پیدائش کو اللہ تعالیٰ نے مقدر کردیا ہے وہ پیدا ہو کر ہی رہے گا' اللہ تعالیٰ کے مقدر شدہ کو تمہارا اپنے عمل سے روکنا ناممکن ہے۔

اسی طرح امام بخاری و مسلم نے اس ضمن میں جو حدیث طیبہ روایت کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں:

كنا نعزل على عهد رسول الله والقراٰن ينزل.

ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عزل کیا کرتے تھے حالانکہ قرآنِ پاک بھی نازل ہو رہا تھا۔

(لیکن اس سے وحی کے ذریعے منع نہ کیا گیا۔)

جمہور ائمہ کا مؤقف

ان احادیث طیبات کی بناء پر جمہور ائمہ کا مؤقف ہے کہ عزل کرنا جائز ہے' لیکن اس کے ساتھ جملہ ائمہ شرط یہ لگاتے ہیں کہ اب عزل کرنا صرف اسی صورت میں جائز ہے جب بیوی عزل کرنے پر رضامند ہو' اس لیے کہ اس سے عورت کو ضرر پہنچنے کا امکان بھی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ائمہ وفقہاء اس بات پر بھی متفق ہیں کہ غربت اور تنگ دستی کے خوف سے عزل کرنا اور بچہ پیدا نہ کرنا بھی جائز نہیں۔

امام ابن حزم کا مؤقف

امام ابن حزم نے عزل کے متعلق بیان کیے گئے جمہور ائمہ کے جواز کے مؤقف کی مخالفت کرتے ہوئے عزل کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے۔ امام ابن حزم' امام مسلم کی روایت کردہ احادیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے کہ جب آپ ﷺ سے عزل کے بارے میں ایک مرتبہ پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ذلك الواد الخفي" یہ گویا کہ خفیہ طریقے سے درگور کرنے کے مترادف ہے۔

اسی طرح امام ابن حزم اس کے علاوہ متعدد ایسی احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جو صحابہ کرام کے عمل پر موقوف ہیں' انہی احادیث میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عزل نہیں کرتے تھے اور آپ فرماتے تھے کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میری اولاد میں سے کوئی عزل کرتا ہے تو میں اس کو (اس سے روکوں گا) اور سخت سزا دوں گا۔

اسی طرح انہوں نے حجاج بن المنہال سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی عزل کو پسند نہیں کرتے تھے۔

حضرت جابر کی وہ حدیث جمہور ائمہ نے جس سے استدلال کرتے ہوئے عزل کو جائز قرار دیا ہے' امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ وہ حدیث منسوخ ہے۔ (المحلی لابن حزم ج ۱۰ ص ۸۷)

ابن حزم کے مؤقف کا ردّ

امام ابن حجر نے امام ابن حزم کی رائے کو "فتح الباری" میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام ابن حزم کا مؤقف دو احادیث طیبات سے مطابقت نہیں رکھتا' پہلی حدیث طیبہ جسے امام ترمذی اور نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' وہ یہ کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی لونڈیوں سے عزل کرتے تھے تو یہودی کہنے لگے کہ یہ تو زندہ درگور کرنا ہے' تو پھر ہم نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا' آپ ﷺ نے فرمایا:

كذبت اليهود' لو اراد الله — یہود نے جھوٹ کہا' اگر اللہ تعالیٰ نے

خلقه لم تستطع ردہ. کسی کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمالیا ہے تو تم اس کو روک نہیں سکتے۔

اسی مضمون کی دوسری حدیث نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جو امام ابن حزم کے موقف کے خلاف ہے۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۲۴۵)

مصنف کا موقف

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو عزل کے بارے یہ فرمایا: ''الواد الخفی'' (زندہ درگور کے مترادف) اس سے مراد عزل کو حرام قرار دینا نہیں' بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو اس موضوع پر دیگر احادیث طیبات مروی ہیں' ان سب کے مطابق اس کو (مکروہ تنزیہی) نہی تنزیہی پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے جیسا کہ جمہور ائمہ کا موقف ہے۔

اور جہاں تک ابن حزم کے اس موقف کا تعلق ہے کہ عزل کے جواز کی احادیث منسوخ ہیں تو اس کے جواب کے لیے یہی کافی ہے کہ جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عزل کرتے رہے اور قرآن بھی نازل ہوتا رہا۔

امام مسلم کی روایت کے مطابق: یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی لیکن انہوں نے ہمیں اس سے منع نہ فرمایا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے پتا چلتا ہے کہ اگر عزل کرنا حرام ہوتا تو قرآن پاک کا واضح حکم اس کے حرام ہونے پر نازل ہو جاتا' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک ایسا کوئی حکم نازل نہ ہوا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہور ائمہ نے جو موقف اختیار کیا ہے' وہ بالکل واضح اور صاف ہے۔

روح پھونکے جانے سے پہلے نطفے کا اسقاط

جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ روح پھونکے جانے سے پہلے نطفے کا اسقاط بھی عزل کے حکم کی ہی طرح ہے' جب کہ بعض علماء نے عزل کے جواز کا فتویٰ دیا ہے لیکن انہوں نے (روح پھونکے جانے سے پہلے نطفے کے) اسقاط کو حرام قرار دیا ہے' شاید انہوں نے اس کو عزل پر قیاس نہیں کیا' بلکہ انہوں نے مُضغہ کو نطفہ کے مقابلے میں علوق سے پہلے بھی ذات انسانی کی تخلیق کی صلاحیت کے زیادہ قریب سمجھا ہے سوائے اس کے کہ عزل پر اس کو قیاس نہ کرنا حاملہ کی صحت کو نقصان پہنچنے کے سبب سے ہو۔

منصوبہ بندی کا جواز

گزشتہ مسائل جاننے کے بعد خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق بھی شرعی حکم واضح ہو جاتا ہے کہ علاج کی غرض سے یا کسی دائمی بیماری کی وجہ سے یا کسی شرعی و لازمی عذر کی بناء پر علماء نے منصوبہ بندی کی اجازت دی ہے اگر اس کے لیے وہ ذرائع اختیار کیے جائیں جن میں علماء نے جن کی اجازت دی ہے۔

تحدیدِ نسل یا خاندانی منصوبہ بندی سے مراد عزل کی بجائے منع حمل کے لیے کوئی علاجی تدبیر اختیار کرنا ہے۔ ائمہ نے اس کے لیے شرط لگائی ہے کہ اس میں بیوی کو کوئی ضرر اور نقصان لاحق ہونے کا خدشہ نہ ہو اور یہ کہ میاں بیوی دونوں کی باہمی رضامندی سے ہو۔[1]

مجھے معلوم نہیں کہ ہمارے ائمہ فقہاء میں سے کسی کی رائے اس حکم کے مخالف ہو۔

جب کہ حافظ ولی الدین العراقی نے شیخ عماد الدین بن یوسف اور شیخ عز الدین بن عبدالسلام کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ ضبط تولید کے لیے عورت کا کسی قسم کی بھی دوائی استعمال کرنا حرام ہے اور ابن یونس نے تو یہاں تک کہا کہ اگرچہ شوہر راضی بھی ہو تب بھی ایسا کرنا ناجائز ہے۔ (طرح التثریب وشرحہ للحافظ العراقی ج ۸ ص ۶۲)

لیکن سنت کی دلالت پر مبنی اور جمہور علماء کے موقف کے مطابق یہ رائے قابل حجت نہیں۔ اس ضمن میں جمہور ائمہ کا جو موقف ہے یہ درست ہے اور سنت کے مطابق ہے۔

---

[1] اس کے علاوہ علماء نے اس کے لیے مندرجہ ذیل شرائط بھی لاگو کی ہیں:

(۱) کوئی شخص تنگیٔ رزق کے خوف سے ضبط تولید نہ کرے کیونکہ قرآن پاک میں صراحۃً یہ بات موجود ہے:

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ. اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے۔ (الاسراء: ۳۱)

(۲) اگر سلسلہ تولید مسلسل جاری رکھنے سے عورت کو شدید بیماری یا موت کا خطرہ ہو تو اس صورت میں خاندانی منصوبہ بندی جائز ہے۔

(۳) مسلسل آپریشن سے بچے پیدا ہونے کی صورت میں جان کے خطرہ کے پیش نظر ضبط تولید جائز ہے۔ (مترجم)

اس کے متعلق جمہور علماء کے درست مؤقف کے علاوہ ایک مزید اہم بات جاننا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ عزل اور ضبطِ تولید یہ دونوں صورتیں بعض مذکورہ بالا شروط کے ساتھ میاں بیوی کے باہمی اتفاق سے ہی صحیح ہوں گی، کیونکہ یہ میاں بیوی کا ذاتی مسئلہ ہے، اس لیے شرعی عذر کی بناء پر عزل اور ضبطِ تولید کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں میاں بیوی دونوں پر کوئی بیرونی دباؤ یا خارجی حکم (حکومتی آرڈر) مسلط نہ کیا گیا ہو، بعض اوقات وہ کام جو کسی فرد سے انفرادی طور سے متعلق ہو اسے قانون بنا کر تمام لوگوں کو اسے انجام دینے پر مجبور کرنا جائز نہیں ہوتا، یہ متفقہ فقہی قواعد میں سے ہے۔

جس طرح طلاق دینا ایک ایسا حق ہے جو ایک شادی شدہ مرد کسی ضرورت یا شرعی مصلحت کے وقت استعمال کر سکتا ہے، لیکن کسی حکمران کو یہ اختیار نہیں کہ لوگوں کو جبری یا تادیبی طور پر یا ترغیب دلاتے ہوئے لوگوں کو حکم دے کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں، تحدیدِ نسل یا خاندانی منصوبہ بندی کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح ہے، اس اہم اور ضروری قاعدہ کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے تاکہ لوگوں کی باتوں سے آپ دھوکے میں نہ آ جائیں، وہ لوگ جو آج فتویٰ گھڑنے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں، اور کہتے ہیں کہ سنت نے تحدیدِ نسل کو جائز قرار دیا ہے اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ حکومت کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے جو چاہے طریقے اختیار کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس دلیل اور اِس مدلول کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے، محض خود ساختہ دلیل ہے اور محض التباس پیدا کرنا مقصود ہے۔

خلاصہ: اگر عزل یا تحدیدِ نسل کے معاملہ کو میاں بیوی کے باہمی تعلقات، حقوق اور مصالح کی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ایک آسان معاملہ ہے جس میں کوئی مشکل نہیں، جیسا کہ گزشتہ بحث میں آپ نے ملاحظہ کیا، لیکن اگر اس معاملہ کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ یہ ایک ایسی بنیاد ہے جس کی طرف عام لوگوں کو دعوت دی جائے اور اس کام کو اختیار کرنے پر انہیں ابھارا جائے اور اس کی بنیاد ایک ایسے رہنما فلسفہ پر ہو جس کی ترویج و اشاعت کے لیے تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال میں لایا جائے تو اس صورتِ حال میں یہ معاملہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے، اس وقت ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ مسلمان اس کی خطرناک صورت

حال کو سمجھتے ہوئے شدت سے اس کی مخالفت کریں۔ وہ ان مختلف فریب میں مبتلا کرنے والے منصوبہ جات کو سمجھیں جو دشمنانِ اسلام ان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے بناتے ہیں اور پیداوار کی قلت اور معاشی مشکلات کی جو افواہیں پھیلائی جاتی ہیں' ان سے مسلمانوں کو دھوکا نہیں کھانا چاہیے' اس لیے یہ بھی اُنہی کے منصوبوں کا ایک جزو ہے۔

تیسرا: رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے غزوۂ مصطلق سے واپسی پر جو ہرزہ سرائی کی اور وہاں پر جو فتنہ انگیزی کی سازش کی گئی' رسول اللہ ﷺ نے کمالِ حکمت و دانش' سیاسی اُمور سے گہری واقفیت اور مشکلات پر قابو پالینے کی اعلیٰ قابلیت کی بناء پر اس فتنہ کو ٹھنڈا کیا اور اس مسئلہ کو حل کیا' یہ ملکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔

حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کی جو گستاخانہ باتیں سنیں تو اُسی وقت عبداللہ بن ابی کو قتل کرنے کا حکم دے دیتے' لیکن آپ ﷺ نے جب دیکھا کہ معاملہ زیادہ بگڑنے لگا ہے تو آپ نے جذباتیت کی بجائے برداشت' معاملہ فہمی اور حکیمانہ انداز میں اس معاملہ کا حل نکالتے ہوئے فوراً وہاں سے دوپہر کے وقت میں ہی کوچ کا حکم دے دیا' حالانکہ عموماً دوپہر کے وقت سفر کی آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ نہ تھی' تاکہ انہیں اس موضوع پر بات چیت کا موقع ہی نہ ملے' اس طرح وہ پورا دن سفر جاری رہا' پھر رات کو بھی سفر جاری رہا' اگلے دن دوپہر تک مسلسل یہ سفر جاری رہا تاکہ منافقین فتنہ انگیزی کے لیے فرصت ہی نہ پاسکیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے اُلجھیں' اگلے دن دوپہر کو ایک جگہ قیام کرنے کا حکم دیا گیا' سب اہلِ لشکر جونہی سواریوں سے اُترے تو سب پر گہری نیند طاری ہوگئی اور سب سو گئے' پھر جب مدینۃ المنورہ پہنچے تو اُس وقت لوگ اس انتظار میں تھے کہ اب منافقین کے بارے میں کوئی سخت حکم آئے گا اور ساتھ ساتھ عبداللہ بن ابی کے قتل کیے جانے کی بھی خبریں گردش کرنے لگیں۔

یہ سب کچھ سن کر عبداللہ بن ابی کا صادق الایمان بیٹا عبداللہ بھی حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: یارسول اللہ ﷺ! اگر آپ میرے منافق باپ کو قتل کروانا چاہتے ہیں تو مجھے حکم دیں' میں خود اس کا سر آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں' لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات کا ایسا جواب دیا جو بالکل غیر متوقع تھا' آپ ﷺ نے فرمایا:

بلکہ وہ جب تک ہم میں موجود ہے ہم اس کے ساتھ نرمی اور حسنِ سلوک کا معاملہ کریں گے۔ یہی حکمت اس وقت بھی تھی جب آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کے قتل نہ کرنے کی علت بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اے عمر! لوگ کیا باتیں کریں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کروا دیتا ہے؟

اس حکمت اور دانش مندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جو عبداللہ بن ابی کا ساتھ دے رہے تھے اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے' آپ ﷺ کے اس حسنِ سلوک کو دیکھتے ہوئے وہ عبداللہ بن ابی کا ساتھ چھوڑنے لگے اور سب کے سب اُسی کو جھوٹا قرار دینے لگے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ دنیوی قضیات میں منافق کے ساتھ ایک مسلمان جیسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے' اگرچہ اُس سے محفوظ رہنا اور اُس سے احتیاط اختیار کرنا ہی واجب ہے۔

حکمت و دانائی اور معاملات کو خوب صورتی سے نمٹانے کی جن اعلیٰ صفات سے آپ ﷺ متصف تھے' ان میں غور و تامل کرنے سے قبل ایک مرتبہ پھر یہ یاددہانی کرا دینی ضروری ہے کہ یہ تمام صفات آپ کی صفتِ نبوت کا ہی عکس تھیں۔ ان سب کا سرچشمہ آپ کا شرفِ نبوت و رسالت سے بہرہ ور ہونا ہی تھا۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ کوئی تحقیق کرنے والا آپ کی حیاتِ طیبہ میں پائی جانے والی ان صفاتِ حمیدہ کا تجزیہ ان کے اوّلین بنیادی سرچشمہ' نبوت و رسالت سے جوڑے بغیر کرے' اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' یہ ایک منصوبہ ہے جسے فکری محاذ پر یلغار کرنے والوں نے تیار کیا ہے تاکہ مسلمانوں کو آپ کی نبوت میں غور کرنے کا موقع ہی نہ ملے اور ان کے اس منصوبے کو وہ لوگ آسانی سے ہی قبول کر لیں جو اندھی تقلید میں بندروں سے بھی بڑھ کر ہیں۔

چوتھا: جہاں تک واقعۂ افک کا تعلق ہے تو یہ بھی اُن ایذاؤں اور تکالیف کا ہی ایک حصہ تھا جو وقتاً فوقتاً دشمنانِ دین کی طرف سے آپ ﷺ کو دی جاتی تھیں' گزشتہ تمام آزمائشوں کی بہ نسبت اب کی بار جو بہتان تراشی اور طعن و تشنیع کی گئی' یہ اُن سابقہ تکالیف اور دل آزاریوں سے بڑی ایذاء اور دلی تکلیف تھی۔ اس سے منافقین کی شر انگیز طبیعت کا بھی پتا چلتا ہے کہ یہ ہمیشہ موقع ملتے ہی اپنی مکاری اور خباثت کا اظہار کرتے' واقعۂ افک منافقین کے ذریعے پیا

کیے گئے فتنہ کا ایک منفرد انداز تھا' اس واقعہ کے نتیجے میں جو ایذاء دی گئی اور تکلیف پہنچائی گئی اس کی نوعیت بہت مختلف تھی کیونکہ اس سے قبل جو بھی پروپیگنڈا کیا جاتا یا کوئی سازش تیار کی جاتی یا کسی طرح سے بھی تکلیف پہنچانے کا پروگرام بنایا جاتا' آپ ﷺ اور صحابہ کرام اُس متوقع پریشانی اور تکلیف سے بچنے کے لیے اس کا مناسب سد باب کرتے' لیکن اس دفعہ غیر متوقع طور پر اور اچانک ہی ایسی بہتان تراشی اور الزام تراشی کی گئی جس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جو الزام تراشی کی گئی' اگر خدانخواستہ یہ باتیں صحیح ہوتیں تو یہ بہت بڑا طعنہ ہوتا جو آپ کی عزیز ترین چیز پر ضرب کاری ہوتی' کسی بھی انسان کے نزدیک اس کی عزیز ترین چیز عزت و کرامت ہوتی ہے' آپ سوچتے تھے کہ معلوم نہیں یہ افواہ صحیح ہے یا غلط؟ اسی لیے اس اذیت کا اثر گزشتہ تمام اذیتوں سے زیادہ تھا' کیونکہ اس کی وجہ سے آپ کا نفسانی شعور سخت اضطراب کی کیفیت میں مبتلا تھا' جس سے چھٹکارا ممکن نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر وحی کے ذریعے جلد ہی اس کی حقیقت واضح کر دی جاتی اور منافقین کی بہتان تراشی سے پردہ اٹھا دیا جاتا تو آپ کو اس اضطراب اور ان شکوک و شبہات سے خلاصی مل جاتی۔ لیکن وحی کا سلسلہ ایک ماہ تک رُکا رہا اور اس کے ذریعے اس معاملہ کے متعلق کچھ بھی وضاحت نہ ہوئی' یہ قلق و اضطراب اور شکوک و شبہات کا دوسرا ذریعہ تھا۔

اس کے باوجود واقعۂ افک کی یہ آزمائش ایک الٰہی حکمت تھی' جس کا مقصد نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کو نمایاں کرنا اور واضح کرنا تھا اور یقیناً آپ ﷺ کی شخصیت اس تمام واقعہ میں نکھر کر سامنے آئی اور ہر التباس سے پاک اور صاف ہو گئی' اس بات کا احتمال تھا کہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں نبوت کا مفہوم بعض مؤمنین اور کافرین کے تصور میں واضح نہ ہو پاتا' اگر یہ واقعۂ افک رونما نہ ہوتا' لیکن اس واقعہ نے نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کا انسانی پہلو خالص نبوت کے مفہوم سے الگ ہو گیا' اس طرح نبوت اور وحی کا معنی و مفہوم نگاہوں اور افکار میں پوری طرح آشکارا ہو گیا' اور اس میں اس کے ساتھ دیگر کسی نفسیاتی یا شعوری معانی میں سے کسی معنی سے التباس کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

یہ افواہ اچانک رسول اللہ ﷺ نے بھی سنی' اس وقت آپ اپنی عام انسانیت سے

دائرہ میں تھے' انبیاء و رُسل کے لیے معروف عصمت کی حدود کے ضمن میں ایک عام آدمی کی طرح غور و فکر کرتے اور تصرف کرتے تھے۔ اس افواہ کا اثر آپ پر ایسے ہی ہوا جیسے دوسرے انسانوں پر ہوتا ہے' آپ کو پوشیدہ غیب کی کوئی اطلاع نہیں تھی اور نہ ہی آپ نے لوگوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھا' اور نہ ہی یہ بتایا گیا تھا کہ یہ آپ کے خلاف ایک گھڑا ہوا جھوٹ ہے' اسی لیے آپ ﷺ بھی اس افواہ کو سن کر دوسرے لوگوں کی طرح مضطرب ہوئے' اور آپ کے دل میں بھی ایسے ہی شک پیدا ہوا جیسے دوسرے لوگوں کے دلوں میں شک پیدا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ اس واقعہ کی مختلف وجوہات پر غور کرنے لگے' اور اس کے متعلق آپ نے اپنے صاحبِ رائے اصحاب سے مشورہ بھی طلب کیا[1] (یہ سب کچھ حکمتِ خداوندی کے تحت تھا)۔

آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات میں اس خالص انسانی پہلو کو اجاگر کرنے کی الٰہی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وحی کا نزول کچھ مدت تک مؤخر رہے' تاکہ لوگوں پر دو حقیقتیں واضح ہو جائیں' ان میں سے ہر حقیقت انتہائی اہم ہے۔

پہلی حقیقت: یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی نبوت و رسالت کی وجہ سے اپنی بشری انسانی حیثیت سے خارج نہیں ہوئے تھے' اس وجہ سے آپ ﷺ پر ایمان لانے والے کسی شخص کے لیے یہ تصور کرنا مناسب نہیں کہ نبوت نے آپ کو بشریت کی حدود سے متجاوز کر دیا ہے'

---

[1] فاضل مصنف اس بحث میں اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو نزول وحی سے قبل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کا علم نہ تھا حالانکہ علماء محققین نے تصریح فرمائی ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نزولِ وحی سے قبل بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کا علم تھا۔ جیسا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تصریح فرماتے ہیں کہ وحی کے نزول سے پہلے بھی حضور کریم ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کا علم تھا' کیونکہ نبی کا ایسے عیوب سے پاک ہونا جو لوگوں کو اس سے متنفر کر دیں' ضروریاتِ عقلیہ میں سے ہے جیسے اس کا جھوٹا ہونا' کمینہ خاندان کا فرد ہونا' اس کے والدین کا تہمتِ زنا سے متہم ہونا' اس طرح اس کی اہلیہ کی عصمت کا مشکوک ہونا' اگر نبی میں ان عیوب میں سے کوئی ایک عیب بھی پایا جائے گا تو لوگ اس سے متنفر ہو جائیں گے اور اس کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیں: ضیاء القرآن از حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری ج ۳ ص ۳۰۱ (مترجم)

اس لیے وہ شخص آپ کی طرف ایسے اُمور منسوب کر دے یا اشیاء میں آپ کی ایسی تاثیر کا قائل ہو جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی طرف کرنا جائز نہیں۔

دوسری حقیقت: وہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کسی نفسیاتی احساس کا نام نہیں' جو نبی ﷺ کے اپنے وجود سے خارج ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو آپ کے ارادے' خواہش یا آرزو کے تابع ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ کے لیے یہ آسان تھا کہ اس مسئلہ کو پیدا ہوتے ہی ختم کر دیتے اور نتائج و انجام سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں خیر اور بہتری کو قرآن کی شکل میں ڈھال کر پیش کر دیتے' جس سے آپ پر ایمان لانے والے مطمئن ہو جاتے' اور دوسرے لوگ بھی خاموش ہو جاتے' لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا' اس لیے کہ آپ اپنی مرضی سے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

اس حقیقت کے متعلق ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز نے اپنی کتاب ''النبأ العظیم'' میں جو کچھ تحریر کیا ہے' یہاں پر ہم نقل کرتے ہیں:

منافقین نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں طوفانِ بدتمیزی کھڑا کر رکھا تھا' اس حال میں وحی کے نزول میں بھی تاخیر ہوگئی' ادھر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین بھی پریشانی کے عالم میں ہر وقت کسی نئی خبر کے انتظار میں رہتے حتیٰ کہ ان کے کلیجے مونہوں کو آ گئے تھے۔ آپ ﷺ اس مدت میں پوری احتیاط اور تحفظ کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہی کہتے: ''انی لا اعلم عنها الا خیرًا'' میں ان کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔

اسی کشمکش کے عالم میں ایک مہینہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا' آپ ﷺ نے اس دوران اس معاملہ کی پوری چھان پھٹک کی' صحابہ کرام سے مشورے بھی طلب کیے' مختلف لوگوں سے سوالات بھی کیے' جملہ صحابہ کرام نے یہی کہا: ہم ان کے بارے میں کوئی بُری معلومات نہیں رکھتے۔ ان سب باتوں کے بعد آپ ﷺ' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ان کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا:

اے عائشہ! تیرے بارے میں مجھے ایسی ایسی خبر ملی ہے' اگر تو پاک دامن ہے تو اللہ تعالیٰ تیری براءت کر دے گا اور اگر تجھ سے کوئی قصور سرزد ہو گیا ہے تو توبہ کر لے اور اللہ تعالیٰ

سے بخشش طلب کر!

یہ کلام آپ ﷺ کا ذاتی کلام تھا' جو آپ ﷺ کے ضمیر کی بات تھی' یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کسی ایسے شخص کی بات ہو جو غیب سے واقفیت نہ رکھتا ہو اور یہ تحقیق کرنے والے ایسے دوست کی بات ہے جو نہ تو گمان کی پیروی کرتا ہو اور نہ ہی بغیر تحقیق کے کوئی بات کہتا ہو۔ ان کلمات کو فرمانے کے بعد آپ ﷺ ابھی اپنی جگہ سے ہٹے تھے کہ سورۂ نور کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں' جن میں آپ ﷺ کی جہتِ نبوت و رسالت کے مطابق آپ ﷺ کی شان و عظمت اور آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ کی پاک دامنی اور براءت کا اظہار خود خالقِ کائنات نے واضح اور واشگاف الفاظ میں فرمایا۔

حالانکہ اس سے قبل آپ ﷺ نے بالکل خاموشی اختیار فرمائی' اگر قرآن پاک خود بنا کر پیش کرنے کا ہی معاملہ ہوتا تو آپ ﷺ اُن فتنہ پرور منافقوں کی پھیلائی ہوئی باتوں کے ردّ میں اپنی عزت کے تحفظ اور اپنی شریکِ حیات کی عزت کا دفاع کرتے ہوئے کچھ باتیں گھڑ کر ان کو آسمانی وحی قرار دے دیتے تا کہ ان کی زبانوں کو لگام مل جاتی' لیکن غور کیجئے کہ آپ ﷺ وحی کے بارے میں کتنی احتیاط سے کام لیتے' لیکن آپ ایسے نہ تھے کہ جو لوگوں سے تو کبھی جھوٹ نہ بولتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کر دیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ (الحاقۃ: ۴۴-۴۷)	اور اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا ۝ تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے ۝ پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگِ دل ۝ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا ۝

حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وہ پہلی شخصیت ہیں جن کی وجہ سے یہ مذکورہ بالا دو حقیقتیں ظاہر کی گئیں' آپ رضی اللہ عنہا اپنے عقیدۂ توحید اور خدا وحدہٗ لاشریک کی بندگی میں پوری طرح مضبوط اور مخلص رہیں' اس کیفیت میں وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز اور ہر شخص کو بھول گئیں' اُن کی والدہ محترمہ نے براءت کی آیات کے نزول کے وقت جب ان کو کہا کہ

اے عائشہ! نبی ﷺ کا شکریہ ادا کرو' تو آپ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

میں نہ اٹھوں گی اور نہ کسی کا شکریہ ادا کروں گی' مگر صرف اللہ تعالیٰ کا ہی شکر ادا کروں گی جس نے میری براءت نازل فرمائی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس بات میں نبی ﷺ کے لیے کسی حد تک عدمِ لیاقت کا اظہار ہے۔

لیکن حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ کلام موقع ومحل کی مناسبت سے ہی تھا کیونکہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ قطع نظر واقعۂ افک کے اس سے مؤمنین کا عقیدۂ توحید پختہ ہو اور توحیدِ خداوندی اور عبودیتِ الٰہی کا اظہار ہو اور منافقین اور ملحدین کے بہتان کا خاتمہ ہو جائے۔

اس طرح اس واقعہ کو سمیٹا گیا اور حکمتِ الٰہی کے مطابق عقیدۂ اسلامیہ کو مضبوط کرنے کا ہدف پورا ہوا اور جو شکوک وشبہات پیدا کیے گئے تھے ان کے ردّ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے خیر اور بہتری کا اظہار یوں کیا گیا' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ. (النور:۱۱)

تم اسے اپنے لیے بُرا خیال نہ کرو بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے لیے۔

پانچواں: حدِ قذف کی مشروعیت

اس واقعہ سے ہمیں حدِ قذف کی مشروعیت اور اس کی تفصیل کا علم ہوتا ہے۔ جب یہ آیاتِ بیّنات نازل ہوئیں تو آپ ﷺ نے ان کو حدِ قذف لگانے کا حکم دیا' جو لوگ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بدکاری کی تہمت لگانے میں پیش پیش تھے' تو اس حکم کی تعمیل میں ان کو اسّی کوڑوں کی حد لگائی گئی' اس بات میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

ہاں! اشکال اس امر میں ہے کہ جو اس پورے معاملہ میں سرغنہ تھا' جھوٹی خبریں پھیلاتا رہا اور غلط باتیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کرتا رہا' اس کو حد قذف نہ لگائی گئی یعنی عبد اللہ بن ابی۔

اس کا سبب یہ تھا جیسا کہ ابن قیم نے کہا:

عبد اللہ بن ابی ابن سلول لوگوں کے درمیان اپنے خبثِ باطن کی وجہ سے بہتان تراشی

کی باتیں بڑھا چڑھا کر کرتا تھا' وہ اپنی باتوں کو اس طرح پیش کرتا کہ کوئی ان باتوں کو اس کی طرف منسوب نہ کر سکے۔ (زاد المعاد لابن قیم ج ۲ ص ۱۱۵)

آپ جانتے ہیں کہ حدِ قذف اُس پر لگائی جاتی ہے جس نے صریح اور واضح الفاظ میں بدکاری کی تہمت لگائی ہو۔

ہم واقعۂ افک اور اس سے اخذ ہونے والے دروس کو اس طرح سمیٹتے ہیں کہ آخر میں وہ دس آیاتِ بیّنات ذکر کی جاتی ہیں' جن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی اور براءت کا ذکر فرمایا اور منافقین کی خباثت اور جھوٹ سے پردہ اٹھا کر ان کو ذلیل وخوار کیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌO

بے شک جنہوں نے جھوٹی تہمت لگائی ہے وہ ایک گروہ ہے تم میں سے' تم اسے اپنے لیے بُرا خیال نہ کرو بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے لیے' ہر شخص کے لیے اس گروہ میں سے اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا اور جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا ان میں سے (تو) اس کے لیے عذابِ عظیم ہوگاO

لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا وَّقَالُوْا هٰذَا اِفْكٌ مُّبِیْنٌOلَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَOوَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِیْ مَآ اَفَضْتُمْ فِیْهِ عَذَابٌ عَظِیْمٌOاِذْ تَلَقَّوْنَهٗ

ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں نے اپنوں کے بارے میں نیک گمان' اور کہہ دیا ہوتا کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہےO(اگر وہ سچے تھے تو) کیوں نہ پیش کر سکے اس پر چار گواہ' پس جب وہ پیش نہیں کر سکے گواہ تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیںO

بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌO وَلَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ[1] هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌO يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَO وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌO اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَO وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌO (النور: ۲۰-۱۱)

اور اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو پہنچتا تمہیں اس سخن سازی کی وجہ سے سخت عذابO (جب تم ایک دوسرے سے) نقل کرتے تھے اس (بہتان) کو اپنی زبانوں سے اور کہا کرتے تھے اپنے مونہوں سے ایسی بات جس کا تمہیں کوئی علم ہی نہ تھا' نیز تم خیال کرتے کہ یہ معمولی بات ہے حالانکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی تھیO اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو تم نے کہہ دیا ہوتا: ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم گفتگو کریں اس کے متعلق' اے اللہ! تو پاک ہے یہ بہت بڑا بہتان ہےO نصیحت کرتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کہ دوبارہ اس قسم کی بات ہرگز نہ کرنا اگر تم ایمان دار ہوO اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے (اپنی) آیتیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہےO بے شک جو

---

[1] یہاں "سُبْحٰنَكَ" ذکر کر کے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور منزہ ہے کہ اس کے رسول کی زوجہ محترمہ کا دامن ایسے الزام سے آلودہ ہو۔ (بحر) گویا نبی مکرم ﷺ کی رفیقہ حیات پر الزام لگانا نبی مکرم ﷺ پر الزام لگانا اور نبی مکرم پر ایسا الزام آپ پر نہیں' بلکہ رب کریم پر ہے' جس نے ایسا نبی بنایا۔ یاد رہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کو ثابت کرنے کے لیے زبان قدرت نے وہی اسلوب اختیار کیا' جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والوں کی تردید کے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔ (ضیاء القرآن ج ۳ ص ۳۰۱)

لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ پھیلے بے حیائی ان لوگوں میں جو ایمان لائے ہیں (تو) ان کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ تعالیٰ (حقیقت کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو O اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان (اور) رحیم ہے O

غزوۂ خندق

اس کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ امام ابن اسحاق' عروہ بن الزبیر' قتادہ' امام بیہقی اور جمہور علماء سیرت کے نزدیک یہ غزوہ شوال ۵ ہجری میں واقع ہوا' ایک قول یہ بھی ہے کہ غزوہ ہجرت کے چوتھے سال واقع ہوا' یہ موقف موسیٰ بن عقبہ کا ہے۔ امام بخاری نے بھی ان سے روایت کیا ہے اور امام مالک نے بھی ان کی متابعت کی ہے۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۲۷۵' فتح الربانی بترتیب امام احمد ج ۲۱ ص ۷۶)

سبب: یہودی قبیلہ بنونضیر کے زعماء کا ایک وفد مکہ آیا اور قریش مکہ کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کرنے پر ابھارا اور کہنے لگے کہ ہم ہر موقع پر آپ کا ساتھ دیں گے حتیٰ کہ اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیں گے۔ قریش کو یہود نے کہا: بے شک تم محمد (ﷺ) کے دین کی بہ نسبت بہترین دین پر ہو۔ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نازل ہوا' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا O اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا O (النساء: ۵۲۔۵۱)	کیا نہیں دیکھا تم نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے' وہ (اب) اعتقاد رکھنے لگے ہیں جبت اور طاغوت پر اور کہتے ہیں ان کے بارے میں جنہوں نے کفر کیا کہ یہ کافر زیادہ ہدایت یافتہ ہیں ان سے جو ایمان لائے ہیں O

یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن پر لعنت کی ہے
اللہ تعالیٰ نے اور جس پر لعنت بھیجے اللہ تعالیٰ
تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کا کوئی مددگار O

مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر یہود اور قریش میں اتفاق ہو گیا اور ایک دوسرے کی مدد پر دونوں کا باہمی معاہدہ ہو گیا اور وقت مقرر کر لیا۔ یہودی زعماء کا یہ وفد وہاں سے نکلا اور قبیلۂ غطفان کے پاس آیا' انہیں بھی قریش کی طرح مسلمانوں کے خلاف جنگ پر ابھارا' یہود انہیں قائل کرتے رہے حتیٰ کہ یہ بھی ان کے ساتھ متفق ہو گئے' پھر یہ یہود کا وفد بنو فزارہ اور بنو مرہ سے بھی ملا اور اس طرح ان سے بھی جنگ کرنے کا وعدہ لیا' اس کے ساتھ ساتھ یہود کے اس وفد نے ان سب قبائل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف جنگ کی تاریخ اور جگہ کا تعین بھی کر لیا تھا۔ (سیرت ابن ہشام وطبقات ابن سعد)

مسلمانوں کی جنگ کے لیے تیاریاں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب اس جنگ کی خبر ملی اور پتا چلا کہ قریش مکہ جنگ کے لیے نکل چکے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سب لوگوں کو جمع فرمایا اور دشمن کے بارے میں انہیں خبر دی اور اس بارے میں اُن سے مشاورت کی' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا' سب لوگ اس بات پر متعجب ہو گئے کیونکہ اس سے قبل عرب میں جنگی حالات میں خندق کھودنے کا طریقہ رائج نہیں تھا۔ بہرکیف آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کی تجویز کو قبول فرمایا اور پھر سب صحابہ کرام کو لے کر مدینہ سے باہر نکل آئے' جبل سلع کو پیچھے رکھتے ہوئے اس کے دامن میں مورچہ بنانے کا حکم دے دیا' پھر سب کے سب مسلمان خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے' اُس دن مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی جب کہ قریش اور دیگر حملہ آور قبائل کی کل تعداد دس ہزار تھی۔ (طبقات ابن سعد وسیرت ابن ہشام)

خندق کھودنے کے دوران رونما ہونے والے واقعات

امام بخاری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: غزوۂ احزاب کے دوران جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خندق کھود رہے تھے' میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خندق کی مٹی منتقل کر رہے تھے حتیٰ کہ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شکم

مبارک کی جلد پر گردوغبار پڑی تھی اور میں نے دیکھا تو آپ کے جسم اطہر پر کافی بال نظر آ ئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جاتا ہے کہ انصار اور مہاجرین جب خندق کھود رہے تھے اور اپنی پیٹھوں پر مٹی لاد کر دوسری جگہ منتقل کر رہے تھے تو ساتھ ساتھ یہ رجز ان کی زبانوں پر جاری تھا ۔

نحن الذین بایعوا محمدًا　　　علی الاسلام ما بقینا ابدًا

ہم وہ ہیں جنہوں نے محمد (ﷺ) سے اس بات پر بیعت کی ہے کہ جب تک زندہ رہیں گے اسلام پر قائم رہیں گے۔

آپ ﷺ ان کے جواب میں فرما رہے تھے:

اے اللہ! آخرت کی خیر کے سوا کوئی خیر نہیں ہے' اے اللہ! انصار اور مہاجرین میں برکت عطا فرما! [1]

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم خندق کھود رہے تھے تو ایک سخت چٹان ظاہر ہوئی' لوگ نبی ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ ایک بہت سخت چٹان نمودار ہوئی ہے' آپ ﷺ نے فرمایا: میں خود خندق میں اُترتا ہوں' چنانچہ آپ ﷺ کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ کے شکم مبارک پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا (کئی دنوں کی فاقہ کشی کی وجہ سے) اور حال یہ تھا کہ ہم نے بھی تین دنوں سے کچھ کھایا تک نہ تھا' پس آپ ﷺ نے کدال لی اور اس زور سے اس پتھر پر ماری کہ وہ پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کچھ دیر مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں' پس (میں نے گھر جا کر) اپنی بیوی سے کہا: میں نے نبی ﷺ کو (بھوک کی) ایسی حالت میں دیکھا ہے جو میرے لیے قابلِ برداشت نہیں ہے' کیا تمہارے پاس کچھ (کھانے کی) چیز ہے؟

---

[1] بخاری ج ۵ ص ۴۶' امام مسلم نے اسے حضرت براء سے روایت کیا ہے' اس کے الفاظ بھی قریب قریب ہیں۔ مسلم ج ۶ ص ۱۸۷

انہوں نے کہا: میرے پاس کچھ جو اور ایک بھیڑ ہے'[1] پس میں نے بھیڑ کو ذبح کیا اور میری بیوی نے جو پیسے' حتیٰ کہ ہم نے گوشت پکنے کے لیے ہنڈیا میں ڈال دیا'[2] پھر میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے لگا جب کہ آٹا گوندھ کر رکھ لیا گیا اور ہنڈیا چولہے[3] پر پکنے کے قریب تھی' میں عرض گزار ہوا: یارسول اللہ! آپ کے لیے میں نے کھانا تیار کروایا ہے' پس آپ ایک دو صحابہ کو ساتھ لے کر تشریف لے چلئے' آپ ﷺ نے پوچھا: کیا کھانا ہے؟ میں نے اُس کے متعلق عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تو بہت زیادہ ہے اور اچھا ہے' پھر فرمایا کہ جا کر اپنی بیوی کو کہو کہ میرے آنے سے قبل ہنڈیا چولہے سے نہ اُتاریں اور نہ ہی تنور سے روٹیاں نکالیں' پھر آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کو نداء دی' بلایا اور فرمایا: (کھانے کے لیے) چلو! کھڑے ہو جاؤ! ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بہ آوازِ بلند فرمایا: اے اہلِ خندق! جابر نے تمہارے لیے ضیافت[4] کا اہتمام کیا ہے' لہٰذا آؤ چلو!

پھر حضرت جابر اپنی بیوی کے پاس گئے اور کہنے لگے: تیرا کچھ نہ جائے! نبی کریم ﷺ تو سارے مہاجرین اور انصار صحابہ کو ساتھ لے کر تشریف لا رہے ہیں' ان کی بیوی نے کہا: کیا آپ ﷺ نے آپ سے کھانے کے متعلق پوچھا تھا؟ حضرت جابر نے کہا: ہاں! وہ کہنے لگیں: پھر اللہ اور اس کا رسول بہتر جانیں (آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں) چنانچہ آپ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: اندر داخل ہو جاؤ! اور بھیڑ پیدا نہ کرنا' پھر آپ ﷺ روٹیاں توڑ کر اُن پر گوشت ڈال کر تقسیم کرنے لگے اور جب بھی ہنڈیا سے سالن اور تنور سے روٹیاں نکالتے تو اُسے ڈھک دیتے' اسی طرح آپ تقسیم کرتے جاتے اور اپنے صحابہ کے سامنے رکھتے جاتے' آپ ﷺ مسلسل روٹیاں توڑ کر اُن پر گوشت ڈال کر لوگوں کو دیتے گئے حتیٰ کہ سارے شکم سیر ہو گئے اور کھانا بچ بھی گیا' پھر آپ ﷺ

---

[1] عربی روایت میں ''عناق'' کا لفظ آیا ہے' اس کا معنی ہے: مادہ بھیڑ۔

[2] عربی روایت میں ''برمۃ'' کا لفظ آیا ہے' اس کا معنی ہے: ہنڈیا' دیگچی۔

[3] عربی روایت میں ''اثافی'' کا لفظ آیا ہے' اس سے مراد وہ پتھر ہیں جن کے اوپر ہنڈیا رکھی جاتی ہے۔

[4] عربی عبارت میں ''سور'' کا لفظ آیا ہے' اس کا معنی ہے: دعوتِ عام۔

نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بیوی کو فرمایا: اب یہ تم خود بھی کھالو اور دوسروں کو بھی بھیج دو کیونکہ آج کل لوگوں کو بھوک نے ستایا ہوا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سب نے جی بھر کے کھانا کھایا حتیٰ کہ وہ سیر ہوکر چلے گئے اور ہماری ہنڈیا اُسی طرح بھری ہوئی تھی اور ہمارا آٹا ویسے ہی باقی تھا جتنا پکنے کے لیے تیار رکھا تھا۔ (صحیح البخاری ج ۶ ص ۴۶ 'فتح الباری ج ۷ ص ۳۸۰-۳۷۶)

خندق کھودنے کے دوران منافقین کی سستی اور کام چوری

ابن ہشام روایت کرتے ہیں کہ خندق کھودنے کے دوران کچھ منافقین اس کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمانوں سے پیچھے ہٹ گئے اور کام میں تساہل و تاخیر کا مظاہرہ کرنے لگے' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بتائے بغیر چپکے چپکے اپنے اپنے گھروں کی طرف کھسکنے لگے' اس کے برعکس جب کسی مسلمان کو کوئی ضروری کام درپیش ہوتا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس ضروری کام کے لیے اجازت طلب کرتا' پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کو اس ضروری کام کے لیے اجازت دے دیتے' جب وہ اپنے ضروری کام سے فارغ ہو جاتا تو واپس آ کر دوبارہ اپنے اس عمل میں مصروف ہو جاتا۔

انہی خندق کھودنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیاتِ مبارکہ نازل فرمائیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النور: ۶۲)

بس سچے مؤمن تو وہی ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر اور جب ہوتے ہیں آپ کے ساتھ کسی اجتماعی کام کے لیے تو (وہاں سے) چلے نہیں جاتے جب تک کہ آپ سے اجازت نہ لے لیں بلاشبہ وہ لوگ جو اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ' پس جب وہ مانگیں اجازت آپ سے اپنے کسی کام کے لیے تو اجازت

دیجیے ان میں سے جسے آپ چاہیں اور
مغفرت طلب کیجیے ان کے لیے اللہ تعالیٰ
سے' بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہےO

بنوقریظہ کی عہد شکنی

بنونضیر کا سردار حیی بن اخطب النضری نکلا اور بنوقریظہ کے سردار کعب بن اسد القرظی کے پاس آیا' اور کعب کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑنے پر اُبھارا' اور کعب کو کہا کہ دیکھو میں تمہارے پاس قریش کے جنگ جو اور ان کے سردار لے کر آیا ہوں' یہاں تک کہ میں نے ان کو رومہ کے قریب وادیوں کے سنگم میں ٹھہرایا ہے' اور میں تمہارے پاس بنی غطفان کے جنگ جو اور سردار لے کر آیا ہوں اور ان کو میں نے اُحد کے قریب "ذنب نقمی" میں ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ یہ عہد اور پختہ وعدہ کیا ہے کہ وہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب کو جڑوں سے اکھیڑ کر دم لیں گے۔ یہ سن کر کعب نے اس کو کہا: بخدا! تم میرے پاس زمانے بھر کی ذلت لے کر آئے ہو' اے حیی! تیرا بُرا ہو! مجھے اپنے حال پر چھوڑ دے کیونکہ میں نے محمد (ﷺ) سے سچائی اور وفا کے سوا کچھ نہیں دیکھا' جب کہ حیی مسلسل کعب کو خیانت اور عہد شکنی پر مجبور کرتا رہا حتیٰ کہ کعب نے خیانت کرتے ہوئے عہد کو توڑ دیا' جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو اس خبر کی تصدیق کے لیے بھیجا' اور انہیں یہ نصیحت کی کہ اگر ان کی عہد شکنی کی خبر سچی ہوئی تو صرف مجھے ایسے اشارے سے بتانا جسے صرف میں سمجھ سکوں اور (علی الاعلان بتا کر) لوگوں کے بازوؤں کو کمزور نہ کرنا اور اگر عہد شکنی کی خبر جھوٹی ہوئی تو پھر اونچی آواز سے لوگوں کو اس کے متعلق بتانا' جب حضرت سعد بن معاذ نے اس خبر کے بارے معلومات حاصل کیں اور یہ خبر سچی نکلی تو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں واپس لوٹے اور عرض کی: "عضل والقارۃ" یعنی وہ لوگ اسی طرح غداری پر آمادہ ہیں جس طرح عضل اور قارہ قبیلوں نے حضرت خبیب اور آپ کے ساتھیوں سے غداری کی تھی' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللّٰہ اکبر ابشروا یا معشر المسلمین" اللہ اکبر! اے مسلمانوں کے گروہ! تمہیں خوش خبری ہو!

(طبقات ابن سعد' سیرت ابن ہشام)

عہد شکنی کی خبر سن کر مسلمانوں کا حال

جب بنو قریظہ کی عہد شکنی کی خبر مسلمانوں کو پہنچی اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کی منافقین کی چال سے پردہ اُٹھا' اب دشمن مسلمانوں کو اوپر اور نیچے سے گھیر چکا تھا' منافقین مدینہ میں ادھر اُدھر گھومنے لگے حتیٰ کہ اُن میں سے ایک کہنے لگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تو ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہوں گے' جب کہ آج صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی شخص قضائے حاجت کے لیے بھی اطمینان سے نہیں جا سکتا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پایا کہ مسلمانوں پر معاملہ اس قدر سخت ہو گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ قبیلۂ غطفان سے اس شرط پر مصالحت کر لی جائے کہ مدینہ کے پھلوں کے ایک تہائی حصے کے بدلے وہ مسلمانوں سے جنگ نہ کریں' ان دونوں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا یہ بات آپ نے خود پسند فرمائی ہے یا اللہ کا حکم ہے یا آپ ہمارے لیے ایسا کر رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بلکہ یہ بات میں نے خود تمہارے لیے کی ہے تاکہ میں تم سے ان دشمنوں کی طاقت کو توڑ دوں۔

اُس وقت حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: بخدا! ہمیں ایسی صلح کی کوئی حاجت نہیں ہے' اور خدا کی قسم! ہم انہیں تلوار کے سوا کچھ نہیں دیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک کھل اٹھا اور فرمایا: جیسے تم چاہو۔

ابن اسحاق' حضرت عاصم بن عمرو اور محمد بن مسلم بن شہاب الزہری سے روایت کرتے ہیں کہ نہ تو کوئی گواہی ہوئی تھی اور نہ مسلمانوں اور بنی غطفان کے درمیان صلح کا کوئی قطعی فیصلہ ہوا' صرف انہیں قائل کرنے کے بارے میں جدوجہد جاری تھی۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۳' تاریخ طبری ج ۲ ص ۵۷۳)

مشرکین نے جب مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے کی کوشش کی اور جب مدینۃ المنورہ کی طرف بڑھے تو خندق کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور کہنے لگے کہ یہ ایسی چال ہے کہ جس سے عرب پہلے واقف نہیں' پھر انہوں نے خندق کے اردگرد پڑاؤ کیا اور مورچہ بنا لیا تاکہ

مسلمانوں کا محاصرہ کر لیں، باقاعدہ کوئی جنگ نہ ہوئی سوائے اس کے کہ بعض مشرکین نے خندق کی تنگ جگہ سے خندق کو عبور کرنے کی کوشش کی اور چند مشرکین خندق عبور کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے، پس مسلمانوں نے ان کو خندق کے کنارے پر ہی آ لیا، کچھ مشرکین واپس لوٹ گئے اور بعض مارے گئے، جو مشرکین قتل ہوئے ان میں سے ایک عمرو بن عبدود بھی تھا جسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔

جنگ کے بغیر ہی مشرکین کی ہزیمت

اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی کفایت فرمائی، اُس نے دو ایسے وسائل پیدا فرمائے جن کی وجہ سے مشرکین کے اس بہت بڑے لشکر کو ہزیمت اور شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس میں مسلمانوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔

پہلا وسیلہ: مشرکین میں سے ایک آدمی جس کا نام نُعیم بن مسعود تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور مسلمان ہو گیا، اور عرض کیا کہ میں مسلمانوں کے لیے ان حالات میں ہر قسم کی خدمات پیش کرتا ہوں جو آپ چاہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو فرمایا: تم ہمارے اندر وہ واحد شخص ہو جو اگر کر سکو تو ہماری طرف سے دشمن میں انتشار پیدا کر دو کیونکہ جنگ ایک دھوکا ہے۔

حضرت نعیم بن مسعود نکلے اور بنو قریظہ کے پاس آئے، بنو قریظہ انہیں مشرک ہی سمجھ رہے تھے، حضرت نعیم نے بنو قریظہ کو اس بات پر ابھارا کہ تم قریش کے ساتھ مل کر اُس وقت تک جنگ نہ کرو جب تک کہ تم اُن سے کچھ آدمیوں کو بطورِ یرغمال نہ لے لو تاکہ وہ تم سے پیٹھ پھیر کر چلے نہ جائیں اور تمہیں اکیلا یہاں پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب کے رحم و کرم پر تنہا نہ چھوڑ جائیں، تو بنو قریظہ نے ان کو کہا: یہ ہوا نہ صحیح مشورہ! پھر حضرت نعیم رضی اللہ عنہ وہاں سے نکلے اور قریش کے پاس آئے، انہیں خبر دی کہ بنو قریظہ اپنے کیے پر نادم ہیں، اس لیے انہوں نے خفیہ طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کر لیا ہے کہ وہ قریش اور غطفان کے چند مقتدر لوگوں کو مسلمانوں کے حوالے کریں گے تاکہ وہ انہیں قتل کر دیں، لہٰذا اگر یہودی تمہاری طرف بطورِ رہن چند آدمی طلب کرنے کے لیے اپنا پیغام بھیجیں تو تم اپنا ایک آدمی بھی اُن کے حوالے نہ کرنا۔

پھر حضرت نعیم رضی اللہ عنہ وہاں سے نکلے اور غطفان کے پاس آئے' انہیں بھی وہی بات کہی جو انہوں نے قریش سے کی تھی' تو اس طرح حضرت نعیم رضی اللہ عنہ نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کیں اور ان کے آپس کے اعتماد کو مشکوک کر دیا' اس طرح ہر فریق دوسرے پر خیانت اور غداری کی تہمت لگانے لگا اور ان دشمنانِ اسلام کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔

دوسرا وسیلہ: دوسرا ذریعہ جو مشرکین کی ہزیمت کا سبب بنا وہ اچانک آنے والی وہ آندھی تھی جو اندھیری اور سرد رات میں بھیج دی گئی' یہ آندھی اتنی سخت تھی کہ مشرکین کی ہانڈیاں اُلٹ گئیں' خیمے ٹوٹ گئے اور خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں' یہ آندھی اس وقت آئی جب مشرکین کو مسلمانوں کا محاصرہ کیے تقریباً دس دن گزر چکے تھے۔

امام مسلم نے روایت کیا ہے: حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے وہ منظر یاد ہے کہ غزوۂ احزاب کی رات ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے' ہمیں اُس رات سخت سردی اور تیز ہوا کا سامنا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی ایسا شخص ہے جو کفار کے متعلق معلومات لائے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو میری رفاقت عطا فرمائے گا۔ ہم سب خاموش رہے اور ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا' آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا: کوئی ایسا شخص جو کفار کے متعلق معلومات لائے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو میری رفاقت عطا فرمائے گا' ہم سب خاموش رہے ہم میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا۔

یہی بات آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ دہرائی' پھر فرمایا: اے حذیفہ! اٹھو جاؤ! اور کفار کے بارے میں خبر لاؤ' جب آپ ﷺ نے میرا نام لے کر پکارا تو میرے لیے اٹھنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا' آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ! اور کفار کے متعلق معلومات لاؤ لیکن انہیں بھنک نہ لگے۔ جب میں آپ ﷺ کے پاس سے اُٹھ کر گیا تو یوں لگتا تھا جیسے میں حمام میں چل رہا ہوں' حتیٰ کہ میں کفار کے پاس پہنچ گیا' میں نے دیکھا کہ ابوسفیان اپنی پیٹھ آگ سے تاپ رہا ہے' میں نے کمان پر تیر چڑھا کر اُس کو مارنے کا ارادہ کیا تو مجھے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یاد آ گیا کہ انہیں تمہاری بھنک نہ لگے۔

اگر میں تیر پھینک دیتا تو بلاشبہ وہ نشانے پر لگتا' میں اسی طرح اطمینان سے واپس لوٹا'

مجھے چلتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں حمام میں چل رہا ہوں' پھر جب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس پہنچا اور کفار کے متعلق معلومات دیں' جب میں فارغ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خوش ہوئے اور مجھے اپنا ایک فالتو کمبل اوڑھا دیا' جسے نماز کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اوڑھتے تھے' میں صبح تک سویا رہا' جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا: اے بہت زیادہ سونے والے اُٹھ جاؤ! [1]

(مسلم ج ۵ ص ۱۷۷)

ابن اسحاق نے اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے روایت کیا ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر میں کفار کے لشکر میں گھس گیا' وہاں آندھی اور اللہ تعالیٰ کا لشکر اپنا کام کر رہے تھے' ان کی ہانڈیاں' آگ اور خیمے بکھر چکے تھے' ابوسفیان کھڑا ہوا اور کہنے لگا: اے گروہِ قریش! ہر شخص دیکھے کہ اُس کے پاس کون بیٹھا ہے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک شخص کا ہاتھ پکڑ کر اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اُس نے جواب دیا: فلاں بن فلاں' اطمینان کر لینے کے بعد پھر ابوسفیان نے کہا: اے گروہِ قریش! بخدا! اب تم مزید یہاں نہیں ٹھہر سکتے' تحقیق گھوڑے اور خچر ہلاک ہو چکے ہیں' بنوقریظہ نے بھی ہمیں چھوڑ دیا ہے اور بدعہدی کی ہے اور ان کی طرف سے ہمیں ایسا پیغام ملا ہے جو ہمیں سخت ناپسند ہے' اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہمیں ایسی سخت آندھی کا سامنا ہے (کہ جس نے تباہی بپا کر دی ہے) اس لیے سب کے سب کوچ کر دو اور میں تو جا رہا ہوں۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۱)

دوسرے دن صبح تک تمام مشرکین وہاں سے بھاگ چکے تھے' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے جملہ صحابہ مدینۃ المنورہ واپس لوٹ آئے۔

محاصرے کے ان دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دن رات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغاثہ اور

---

[1] بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دشمن کی مخبری کے لیے جانے والے صحابی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ تھے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان کا واقعہ دوسرا ہے' انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بنوقریظہ کی خبر لانے کے لیے بھیجا تھا' مشرکین کے احوال معلوم کرنے کے لیے جانے والے صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے' جیسا کہ عام علماء سیرت نے اس کی صراحت کی ہے۔ دیکھئے عیون الاثر' ابن سید الناس کی اور فتح الباری' ابن حجر کی۔

دعا کرتے رہے کہ مسلمانوں کو فتح سے نوازا جائے' آپ ﷺ کی دعا کا ایک جملہ یہ ہے:

اللھم منزل الکتاب سریع الحساب اھزم الاحزاب اللھم اھزمھم وزلزلھم. (بخاری)

اے اللہ! کتاب نازل فرمانے والے! جلدی حساب لینے والے! گروہوں کو شکست سے دوچار کرنے والے! ان مشرکین کو شکست دے اور ان کو متزلزل کر دے۔

اس غزوہ میں نبی کریم ﷺ کی نماز چھوٹ گئی' جو آپ ﷺ نے وقت نکل جانے کے بعد قضاء کر لی (بعض روایات کے مطابق آپ ﷺ کی اس غزوہ میں چار نمازیں قضاء ہوئیں)۔

بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ غزوۂ خندق کے دن غروبِ آفتاب کے بعد آئے اور قریش کے کفار کو بُرا کہنے لگے' پھر عرض کی: یارسول اللہ! میں غروبِ آفتاب تک نمازِ عصر نہیں پڑھ سکا' آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا! میں نے بھی نہیں پڑھی' پھر ہم وادیٔ بطحان کی طرف آئے' آپ ﷺ نے نماز کے لیے وضو فرمایا اور ہم نے بھی نماز کے لیے وضو کیا' پس آپ ﷺ نے غروبِ آفتاب کے بعد نمازِ عصر قضاء کی' پھر اس کے بعد نمازِ مغرب۔ (متفق علیہ اور الفاظ بخاری کے ہیں)

امام مسلم نے اس پر ایک حدیث کا اضافہ کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر ایک دن ارشاد فرمایا:

شغلونا عن الصلٰوۃ الوسطی صلٰوۃ العصر' ملأ اللّٰہ بیوتھم وقبورھم نارًا.

انہوں نے ہمیں نمازِ وسطیٰ (نمازِ عصر) پڑھنے سے روکے رکھا اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔

پھر آپ ﷺ نے اس نمازِ عصر کو عشائین یعنی نمازِ مغرب اور نمازِ عشاء کے درمیان قضاء کیا۔ (مسلم)

اسباق ونصائح

یہ غزوہ بھی یہودیوں کی غداری اور مکاری کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا' بنونضیر یہودی قبیلہ جس کو پہلے ہی عہد شکنی کی وجہ سے مدینہ بدر کر دیا گیا تھا' اسی قبیلہ کے سرکردہ لوگوں نے مکہ جا

کر قریش کو مدینہ پر حملہ کے لیے اُکسایا اور اپنی ہر ممکن مدد کا یقین دلایا' انہوں نے ہی عرب کے دیگر قبائل کو مدینہ پر حملہ کے لیے قائل کیا اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا' پھر جب یہ جملہ قبائل مدینۃ المنورہ پر حملہ آور ہوئے تو اُس وقت تک دوسرا یہودی قبیلہ بنوقریظہ میثاقِ مدینہ پر پابند تھا۔

لیکن محاصرے کے دوران بنونضیر کے لوگوں نے بنوقریظہ کو بھی اپنا ہم نوا بنالیا اور اس طرح بنوقریظہ نے عین جنگ کی حالت میں معاہدہ توڑنے کا اعلان کر دیا' حالانکہ مسلمانوں کی طرف سے ان کے ساتھ کوئی ایسی زیادتی نہیں کی گئی تھی جس کی بناء پر یہ معاہدہ توڑتے' بلکہ یہودیوں میں پائی جانے والی غداری اور مکاری ہی وجہ تھی جس کی بناء پر بنوقریظہ نے بھی مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے توڑ ڈالے۔

ہم اس پر زیادہ بحث نہیں کرتے کیونکہ یہ ایسی باتیں ہیں جو ہر زمانے میں تاریخ میں واضح طور پر موجود رہی ہیں کیونکہ یہود کی عہد شکنی اور غداری کوئی نئی بات نہیں۔

لہٰذا اب ہم اس غزوہ کے مناظر سے حاصل ہونے والے اہم دروس اور اسباق کا ذکر کرتے ہیں' ان کا خلاصہ درج ذیل نکات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

پہلا: اس غزوہ کے تناظر میں دیکھیں تو پہلی اہم بات جو ہمارے سامنے آتی ہے' وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس غزوہ میں وسائلِ حربیہ میں سے اہم ذریعہ جو استعمال کیا' وہ خندق کی کھدائی تھی۔

عربی اور اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ غزوۂ احزاب میں خندقیں کھودی گئیں جب کہ عجمیوں میں اس سے قبل بھی خندق کھودنے کا طریقہ رائج تھا۔ حضرت سلمان فارسی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا' رسول اللہ ﷺ نے اس مشورے کو بہت پسند فرمایا اور جلد ہی صحابہ کرام کو اس کے عملی جامہ پہنانے کا حکم دے دیا۔

یہ بات بھی اُنہی کثیر دلائل میں سے ہے' جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حکمت و دانش مؤمن کی گم شدہ متاع ہے' جہاں سے اُسے ملے اختیار کر لیتا ہے' بلکہ دوسروں کے مقابلے میں یہ اس کا زیادہ مستحق ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت جتنا اس چیز کو ناپسند کرتی ہے کہ مسلمان بغیر

سوچے سمجھے دوسروں کی پیروی اور تقلید کریں' اتنا ہی وہ یہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو جہاں بھی کوئی خیر اور بہتری نظر آئے اور جہاں بھی اسے پائیں اختیار کر لیں اور تمام مفید اصولوں کو اپنا لیں' اس ضمن میں عمومی اسلامی قاعدہ واصول یہ ہے کہ مسلمان اپنے طرزِ عمل اور عام احوال و معاملات میں اپنی آزاد عقل اور دقیق فکر کو معطل نہ کرے' اس صورت میں وہ اپنی نکیل کسی دوسرے کے ہاتھ نہیں تھما سکتا کہ وہ اس کو بغیر کسی بصیرت اور شعور کے جہاں چاہیں لے جائیں اور نہ کسی ایسے اصول' عمل یا نظام کو نظر انداز کر سکتا ہے جس کے ذریعے اس کی روشن عقل اور آزاد فکر محفوظ رہے اور جو شریعت اسلامی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو۔ یہ طرزِ عمل جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے بنایا ہے' اس کا منبع انسان کی وہ عظمت وشرف ہے جس کے ساتھ اس نے اس کی تخلیق کی ہے' اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ انسان مخلوقات کا سردار ہو' اللہ تعالیٰ کے لیے بندگی کے آداب کی بجا آوری اور اس کی شریعت کے احکام پر عمل اس کرامت وسیادت کی حفاظت کی ضمانت ہیں۔

دوسرا: خندق کھودنے کے دوران صحابہ کرام نے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر عمل کرتے ہوئے آپ کے شانہ بشانہ جس لگن سے کام کیا یہ بہت بڑی مثال ہے۔ اس سے مساواتِ انسانی کی وہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے جو اسلامی معاشرے میں جملہ مسلمانوں میں پائی جانی لازمی امر ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل اور مساوات یہ دونوں حقیقتیں محض اُن اسلامی شعائر میں سے نہیں ہیں جو اسلامی معاشرے کے صرف ظاہر کو مزین اور روشن کرتی ہیں بلکہ عدل اور مساوات دو ایسی مضبوط بنیادیں ہیں جن پر اسلام کے جملہ عمومی اصول وضوابط ظاہری اور باطنی طور پر قائم نظر آتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ خندق کھودنے کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ اپنے جملہ ساتھیوں کو خندق کھودتے اکیلا چھوڑ کر خود ان کی نگرانی کے لیے کسی آرام دہ' پُر سکون' بلند وبالا شاہی محل میں چلے گئے ہوں اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خندق کھودنے کے افتتاح کے طور پر ایک لمحے کے لیے کدال پکڑ کر پہلی ضرب لگا کر کام کی ابتداء کر کے اور پھر کدال کو وہیں چھوڑ دیا ہو کہ علامتی طور پر آپ کی بھی شرکت ہو گئی ہو اور پھر اپنے خوب صورت لباس پر

پڑنے والی گرد کو جھاڑتے ہوئے واپس چلے گئے ہوں۔

نہیں! بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عام صحابی کی طرح بذاتِ خود خندق کی کھدائی میں حصہ لیا حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے اور جسم مبارک بھی اُسی طرح غبار آلود اور گرد آلود ہو گئے، جس طرح جملہ صحابہ کرام مٹی اور غبار سے اَٹے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں اور بھائیوں سے الگ نہیں ہوئے۔

صحابہ کرام کھدائی کے دوران جذبۂ شوق بڑھانے کے لیے رجز پڑھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جواب میں رجز پڑھ کر اُن کی ہمت بڑھاتے، جس طرح جملہ صحابہ کرام بھوک پیاس اور تھکاوٹ کے باوجود کام میں لگے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی سرفہرست مسلسل کام میں مصروف تھے اور فاقہ کی حالت میں تھے۔ یہ عدل اور مساوات کی وہ حقیقت ہے جو شریعت اسلامیہ نے حاکم اور محکوم، غنی اور فقیر، اور شاہ و گدا کے درمیان قائم کی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ شریعت کی جملہ فروعات ایسی بنیادی اساس پر قائم ہیں اور جملہ شقوں میں اس حق کی ضمانت دی گئی ہے۔

آج کی جمہوریت اور ڈیموکریسی کا اس اسلامی نظام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، ان دونوں نظاموں کے درمیان بہت واضح فرق ہے۔

دینِ اسلامی میں عدل اور مساوات کا مصدر اور منبع اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور بندگی ہے، یہ صفت عام ہے جو جملہ لوگوں کو شامل ہے۔ دینِ اسلام اپنے ماننے والوں کو ہر لحاظ سے ایک ہی صف میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے اور تمام انسانوں کو یکساں درجہ اور حیثیت دیتا ہے۔[1]

جب کہ آج کی جمہوریت کا مصدر یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو دوسروں پر ٹھونس دینا اگرچہ اُس رائے کا مقصد و مدعا اور طبیعت کوئی بھی ہو، جس سے طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اکثریت کی رائے تقدس کا درجہ رکھتی ہے، دوسرے لوگوں کو جس کا قبول کرنا لازمی ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ لوگوں کے درمیان طبقات یا گروہوں کو امتیازات کی

[1] ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
(مترجم)

اجازت نہیں دیتی' اور نہ ہی کسی ایک جماعت اور کسی ایک طبقے کو تحفظ فراہم کرتی ہے خواہ ان کے جو بھی محرکات اور اسباب ہوں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور بندگی اختیار کرنے سے انسان میں عاجزی و انکساری اور دیگر لوگوں کے ساتھ برابری و مساوات کا جذبہ پروان چڑھتا ہے اور یہ صفتِ عبودیت تمام امتیازات کو ختم کر کے ناقابلِ اعتبار بنا دیتی ہے۔

تیسرا: اس واقعہ میں آپ ﷺ کی شخصیت سے کچھ ایسے اہم اُمور صادر ہوتے ہیں جو آپ ﷺ کی نبوت کا مظہر ہیں' ایک یہ کہ آپ ﷺ اس دوران اپنے صحابہ کرام کے ساتھ کمالِ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے ہیں اور اس کے علاوہ آپ ﷺ سے کچھ خوارق اور معجزات سرزد ہوتے ہیں' جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو عزت و تکریم سے نوازا۔

اس دوران آپ ﷺ کی شخصیتِ نبویہ کا اظہار اس چیز سے ہوا کہ آپ ﷺ نے خندق کی کھدائی کے دوران جملہ صحابہ کرام کے ساتھ خود بھی شدید بھوک کی مشقت اور تکلیف کو برداشت کیا حتیٰ کہ آپ ﷺ نے خود بھی اپنے شکم مبارک پر پتھر باندھا ہوا تھا' جملہ صحابہ کرام کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے طور پر۔ سب نے پتھر اس لیے باندھے ہوئے تھے کہ بھوک کے عالم میں معدہ خالی ہونے کی وجہ سے جو درد اور تکلیف ہوتی ہے اس سے بچا جائے اور مسلسل کام میں مصروف رہا جائے۔ کیا خیال ہے؟ یہ جملہ تکالیف اور مشقتیں جو آپ ﷺ نے برداشت کیں' یہ کس وجہ سے تھیں؟ کیا سرداری کے حصول کے لیے تھیں؟ یا کیا مال و دولت اور حکمرانی کے حصول کے لیے تھیں؟ یا کیا اپنے گرد بہت سے متبعین اور پیروکار جمع کرنے کی غرض سے یہ سب کچھ تھا؟ یہ تو سب دنیوی خواہشات ہیں' ان معمولی چیزوں کے لیے اتنی تکالیف اور مشقتیں نہیں جھیلی جا سکتیں' بلکہ آپ ﷺ نے جس وجہ سے ان سب تکالیف کو گلے لگایا اور صبر کے ساتھ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا' وہ آپ ﷺ کی رسالت کی ذمہ داری اور اُس عظیم امانت کو پہنچانے کی ذمہ داری تھی جس کی تبلیغ کا آپ کو حکم دیا گیا تھا' اور جسے ایسی ہی پرخطر راہ پر چل کر لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ بذاتِ خود دیگر صحابہ کرام کے ساتھ خندق کھودنے میں شامل رہے' آپ ﷺ کی شخصیتِ نبویہ کا یہ ایک روشن پہلو ہے۔

اس دوران جو صحابہ کرام کے ساتھ محبت و شفقت کا بھرپور اظہار ہوا' وہ آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل سے ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے کھانے کی دعوت پر آپ ﷺ نے جو مؤقف اختیار فرمایا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو کس چیز نے آپ ﷺ کی کھانے کی دعوت پر اُبھارا؟ جب انہوں نے دیکھا کہ دیگر صحابہ کرام کی طرح بھوک کی وجہ سے آپ ﷺ نے بھی اپنے شکمِ اطہر پر پتھر باندھا ہوا ہے' یہ دیکھ کر حضرت جابر نے چاہا کہ گھر میں جتنی مقدار میں کچھ کھانے کو موجود ہے' اُس کے مطابق آپ ﷺ اور چند دیگر اشخاص کی دعوت کر لی جائے' اس لیے انہوں نے صرف چند ہی لوگوں کو دعوت دی۔

لیکن یہ تصور کیسے کیا جا سکتا تھا کہ نبی کریم ﷺ اپنے جملہ صحابہ کرام کو بھوکے پیاسے کام کی حالت میں چھوڑ کر خود تین چار صحابہ کے ساتھ آرام سے دعوت کھانے اور آرام کرنے کے لیے چلے جائیں' حالانکہ آپ ﷺ اپنے صحابہ پر ایک ماں سے زیادہ شفیق اور رحیم تھے؟

اُدھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ مضطرب تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا' آپ رضی اللہ عنہ کا سوچنا اور فکر کرنا طبعی تھا' جیسے ایک عام انسان غور و فکر کرتا ہے کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ ان کے پاس اتنے زیادہ مادی وسائل نہیں اور جو کھانا ان کے پاس موجود تھا' وہ بھی صرف چند آدمیوں کے لیے ہی تھا۔ اس لیے آپ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ صرف چند صحابہ کو اپنے ساتھ لے کر دعوت پر تشریف لے آئیں' لیکن آپ ﷺ اپنے منصب کے پیشِ نظر حضرت جابر کی نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے' اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے لیے اپنے صحابہ کی بہ نسبت اپنی ذات کے لیے کسی نعمت اور راحت کو مختص کرنا پسند نہیں تھا۔ آپ کی محبت و شفقت سب کے ساتھ یکساں تھی' اور دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ آپ اپنے آپ کو مادی اسباب و حدود کے حصار میں اسیر کر لیں' جس سے تمام انسان مانوس ہیں۔ اللہ وحدہٗ تعالیٰ مسبب الاسباب اور خالق و مالک ہے' اللہ تعالیٰ کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ تھوڑے سے کھانے کو بھی بہت زیادہ کر دے' اور تھوڑے میں اتنی برکت دے کہ وہ ساری قوم کے لیے کافی ہو جائے۔

آپ ﷺ یہ بھی ملاحظہ فرما رہے تھے کہ جس طرح جملہ صحابہ کرام خندق کی کھدائی میں جس مشقت' تکلیف اور بھوک کو برداشت کر کے مسلسل کام میں مصروف ہیں' اسی طرح نعمت اور راحت میں بھی سب صحابہ کو مساوی حصہ ملنا چاہیے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو دعوت پکانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ خندق کھودنے والے جملہ صحابہ کرام کو بھی بلند آواز سے کہہ دو کہ آج جابر کے گھر کھانے کی دعوت ہے۔

اس واقعہ میں آپ ﷺ کا جو خارقِ عادت معجزہ ظاہر ہوا' وہ یہ تھا کہ جیسا آپ نے دیکھا کہ ایک بکری کے بچے کو ذبح کر کے پکایا گیا' وہ سالن اور تھوڑا سا کھانا بہت زیادہ مقدار میں ہو جاتا ہے جس سے سینکڑوں صحابہ نے سیر ہو کر کھانا کھایا لیکن پھر بھی کافی کھانا باقی بچ جاتا ہے' جس کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اب باقی کھانا اپنے دوست احباب اور ہمسائیوں میں بھیج دو۔ یہ عظیم معجزہ جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ سے ظاہر ہوا' یہ تقدیرِ الٰہی تھا جو اس وجہ سے رونما ہوا کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے جو شدید محبت کا اظہار فرمایا' مادی اسباب سے اعراض فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو آپ ﷺ کو شرف اور قرب حاصل ہے' یہ اس کا اظہار تھا۔ سب پڑھنے والوں سے میں یہ اُمید کرتا ہوں کہ ذرا سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مادی اسباب و وسائل سے ماوراء کتنی جگہوں پر اپنی خصوصی امداد اور تاثیر سے نوازا' ایک غور و فکر کرنے والے شخص کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ آپ ﷺ کی شخصیتِ نبویہ کے اس روشن پہلو کے نمایاں نقوش کو دیکھے۔

میں چاہتا ہوں کہ قاری اس حیثیت میں اتنا ہی غور کرے جتنا کہ بعض لوگ اسے نظر انداز کرنے میں پوری قوت صرف کرتے ہیں خواہ ان سے بحث کے دوران ان کے سامنے اس کے کتنے ہی محکم اور واضح دلائل کیوں نہ پیش کر دیئے جائیں۔

چوتھا: رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض صحابہ سے قبیلہ غطفان کے ساتھ مشروط صلح کرنے کا جو مشورہ طلب فرمایا اور اپنی یہ رائے دی کہ مدینہ کے پھلوں کے تیسرے حصے کے بدلے اُن سے صلح کر لیتے ہیں تاکہ وہ قریش اور ان کے ساتھیوں کی تائید چھوڑ دیں اور مسلمانوں سے جنگ نہ کریں۔

اس مشروط صلح کی تجویز میں کیا حکمت تھی؟ اور آپ ﷺ کی اس رائے سے کیا دلیلِ تشریعیہ اخذ کی جاسکتی ہے؟

اس بات میں حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کو ہر طرح سے مطمئن دیکھنا چاہتے تھے' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت' خدا تعالیٰ کی توفیق اور رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والی قوتِ معنویہ پر پوری طرح یقین اور ایمان رکھتے تھے لیکن اس سب کے باوجود آپ ﷺ پھر بھی اپنے اصحاب کی دلی رائے حاصل کرنا چاہتے تھے جس پر اُن سب کا اتفاق ہو کیونکہ اُس وقت زمینی حقیقت یہ تھی کہ کفار و مشرکینِ عرب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا لشکر جنگ کے لیے سامنے کھڑا تھا اور اس ہنگامی حالت میں مسلمانوں کا حلیف یہودی قبیلہ بنو قریظہ دفاعی معاہدہ اور عہد توڑ چکا تھا' لہٰذا اس نازک صورتِ حال میں آپ ﷺ نے اپنی ذاتی رائے دی تا کہ صحابہ کرام کی دلی کیفیات کا صحیح طریقے سے پتا چل سکے' کیونکہ آپ ﷺ کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی صحابہ کرام کو کسی ایسی جنگی مہم کے لیے مجبور نہیں کیا جس میں بھرپور طریقے سے ولولہ شجاعت کے ساتھ شامل ہونے کی صحابہ کرام میں سکت نہ ہوتی تھی' کیونکہ وہی فوج میدان میں کامیابی کا مظاہرہ کرسکتی ہے جس کا مورال بلند ہو اور جو جذبۂ شجاعت لے کر میدان میں کود ے۔ آپ ﷺ کے تربیتی اسالیب میں سے یہ ایک اہم تربیتی اسلوب تھا' یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کے سامنے اپنی اس ذاتی رائے کو پیش کیا اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ حکم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دیکھا جائے کہ اگر صحابہ کرام اپنے اندر ان دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں پاتے تو اس تدبیر کے ذریعے ان کی شوکت توڑ دی جائے۔

پس اس مشورہ کی قانونی اور تشریعی دلالت صرف یہ ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں کوئی نص موجود نہیں' ان کے متعلق مشورہ کرنا مشروع ہے' اس کے علاوہ اس میں ایسی کوئی دلالت موجود نہیں کہ اگر مسلمانوں کے دشمن ان کے کسی علاقے پر حملہ کردیں تو مسلمانوں کو اپنی سرزمین کا کچھ حصہ یا کچھ مال و دولت دے کر انہیں واپس جانے پر راضی کرلینا جائز ہے' اس لیے کہ شریعتِ اسلامیہ کے اصولوں میں سے اس چیز پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ کے

تصرفات میں صرف وہی اقوال و افعال حجت ہیں جن پر بعد میں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کوئی اعتراض وارد نہ ہوا ہو۔

جب کہ مذکورہ بالا جو صورت ہے اس میں صرف مشورہ اور رائے ہی دی گئی تھی، حکم نہیں دیا گیا تھا' اور اس کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام سے اس پر مشورہ بھی طلب کیا گیا تھا' اس کو شرعی دلیل کے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ محض باہمی مشورہ تھا' پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس بات سے صرف صحابہ کرام کے دلوں کی بات جاننے کی ہی غرض ہو' کیونکہ آپ ﷺ کی تربیت کا یہ پہلو تھا کہ آپ ﷺ صحابہ کرام سے مشورہ طلب کرتے اور یہاں یہ بات اس لیے کی گئی ہوتا کہ صحابہ کرام کے جذبۂ شجاعت کو معلوم کیا جائے' اور اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگر اس پر واقعی عمل کیا جاتا تو اس بات کا امکان تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی تائید یا تردید نازل ہوتی لیکن ایسا نہ ہوا' اس لیے اس میں کوئی شرعی دلالت باقی نہیں رہتی' جیسا کہ علماء سیرت نے بھی لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قبیلۂ غطفان کے ساتھ نہ صلح کی اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی دستاویز تیار ہوئی' بلکہ اس سلسلے میں محض ابتدائی طور پر بات چیت ہوئی تھی' اس سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔

اب ہم اس موضوع پر بات کرتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کچھ گم نام گروہ یہ خیال شنیع بھی رکھتے ہیں کہ ضرورت کا تقاضا ہو تو مسلمانوں کا غیر مسلموں کو ''جزیہ'' دینا واجب ہے' اس کی دلیل کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں آپ ﷺ نے غزوۂ احزاب میں اپنے صحابہ سے مشورہ کیا تھا (لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ کچھ اور تھی اور اس پر عمل بھی نہیں کیا گیا تھا)۔

قطع نظر اس کے جو ہم نے پیچھے بیان کیا' حقیقت یہ ہے کہ وہ رائے جو مشورہ کے لیے پیش کی جائے اس کو کسی صورت بھی دلیلِ شرعی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لیکن بہر طور ''جزیہ دینے کی بات کرنا'' اور فریقین کے درمیان کسی بات پر صلح ہونے کے مشورے'' کے درمیان کوئی تعلق اور مماثلت نہیں۔

اگر یہاں پر یہ سوال کیا جائے کہ اگر مسلمان کسی جگہ دورانِ جنگ یا دورانِ محاصرہ کسی وجہ سے کمزور ہو جائیں تو اس صورتِ حال میں غیر مسلم حملہ آوروں کو کچھ مال دینے کے

بدلے کیا وہ اپنی جان و مال کو محفوظ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: ایسے کثیر حالات ہو سکتے ہیں کہ مسلمانوں پر حملہ کیا جائے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اموال سلب ہو جائیں' دشمن ان کو لوٹ کر لے جائیں اور مسلمان ممالک پر قبضہ اور تسلط قائم کر لیا جائے لیکن یہ بات صراحت کے ساتھ معلوم ہے کہ مسلمان ایسے ہر قسم کے حالات میں کسی قسم کا بھی جزیہ دینے کی شرط کو ہرگز قبول نہیں کریں گے' نہ اپنی مرضی سے اور نہ ہی کسی فتویٰ کی اتباع کرتے ہوئے' بلکہ مسلمانوں پر مجبوراً اور ظلماً ایسی باتیں مسلط کی جائیں گی لیکن ان سب مشکلات کے باوجود غلامی کے اَدوار میں بھی مسلمان کسی غیر مسلم کا تسلط اپنے اوپر خوشی اور رضا سے ہرگز قبول نہیں کریں گے اور ہر موقع پر مسلمان اپنے علاقوں پر قابض استعماری طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہی رہیں گے اور جزیہ دے کر بہ خوشی غلامی کی زندگی گزارنے پر موت اور شہادت کو ہی ترجیح دیں گے۔

اس کے علاوہ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام نے جب بھی شرعی احکام نافذ کرنے کے لیے مسلمانوں کو خطاب کیا ہے تو ہر شرعی حکم میں عاقل' بالغ' آزاد اور خود مختار کو مخاطب کیا ہے' کہیں بھی اسلام نے کسی بچے' مجنون' غلام یا بے اختیار مجبور کو مخاطب نہیں کیا۔

اس لیے ایک ایسی حالت کو پیش کر کے جس میں انسان مکلف نہیں رہتا' اس کی بنیاد پر ایک ایسا حکم ثابت کرنا جس میں وہ مکلف ہوتا ہے اور جسے مشورہ' مصلحت یا مصالحت کی بنیاد پر اختیار کرتا ہے' ایک فعلِ عبث ہے۔

پانچواں: غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کو کس طرح اور کیسے فتح و نصرت حاصل ہوئی اور کفار و مشرکین کو کثیر تعداد کے باوجود ہزیمت اور شکست کیوں ہوئی' اس کی کیا وجوہات ہیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام نے اس جنگ میں بھی وہی ذریعہ اور وسیلہ اختیار کیا جو وسیلہ اور ذریعہ غزوۂ بدر میں اختیار کیا گیا' اور وہ وسیلہ یہ ہے کہ ربِ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر دعائیں کی گئیں اور عاجزی و انکساری سے اُس کی بارگاہ میں استغاثہ پیش کیا گیا' نہ صرف ان غزوات میں بلکہ جب بھی کوئی جنگ ہوتی یا دشمن سے سامنا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی و انکساری سے دعا کرتے اور مدد و نصرت طلب کرتے' یہی وہ ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کی تاثیر ہر قسم کے مادی وسائل و اسباب سے کہیں زیادہ بلند

ہے (جب بھی مسلمانوں نے اس وسیلہ کو اختیار کرتے ہوئے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے' اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح و نصرت سے نوازا ہے)۔

مسلمانوں نے غزوۂ احزاب میں ثابت قدمی اور صبر کا مظاہرہ کیا اور سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء اور دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کی کثرت کے باوجود مسلمانوں کو فتح و نصرت عطا فرمائی اور لشکرِ کفار شکست سے دوچار ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو اپنی کتابِ مبین میں کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًاO اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَاO (الاحزاب:۱۰۔۹)

اے ایمان والو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا جب (حملہ آور ہوکر) آ گئے تھے تم پر (کفار کے) لشکر' پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھاO جب انہوں نے ہلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئےO

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَّكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًاO (الاحزاب:۲۵)

اور (ناکام) لوٹا دیا اللہ تعالیٰ نے کفار کو درآں حالیکہ اپنے غصے میں (پیچ و تاب کھا رہے) تھے (اس لشکر کشی سے) انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا اور بچا لیا اللہ نے مؤمنوں کو جنگ سے اور اللہ تعالیٰ بڑا

طاقت ور ہر چیز پر غالب ہے O

غزواتِ رسول ﷺ میں یہی وہ حقیقت تھی جس پر مسلسل عمل کیا جاتا رہا' اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو استعداد اور اسباب کے بغیر ہی جنگ اور جہاد پر اُبھارا گیا ہے' اس سے صرف یہ وضاحت مقصود ہے کہ مسلمان ہر میدان میں اپنی استطاعت اور قدرت کے مطابق وسائل کو بروئے کار لا کر پھر صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کریں اور اخلاص کے ساتھ اس کی عبودیت اور بندگی کا اظہار کریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ فتح ونصرت سے نوازنے والا ہے' لیکن اگر بارگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے والا وسیلہ اختیار نہ کیا جائے تو ظاہری وسائل کے باوجود بھی فتح ونصرت شاملِ حال نہیں ہوتی' لیکن جب بھی مسلمانوں نے اپنے اعمال میں اخلاص اور اپنی دعاؤں میں عاجزی وانکساری کو اپنایا تو اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر ان کو فتح ونصرت سے ہمکنار فرمایا' غزوۂ احزاب میں بھی مددِ الٰہی معجزانہ طور پر آ پہنچی' ورنہ وہ ٹھنڈی ہوا کی زوردار آندھی کہاں سے آئی جس نے صرف مشرکین کی فوج کو ہی نشانہ بنایا' حالانکہ دوسری جانب لشکرِ اسلام کو اس کا احساس تک نہ ہوا؟ اس زوردار ٹھنڈی آندھی نے مشرکین کی ہانڈیوں کو اُلٹ دیا' ان کے خیموں کی طنابوں کو اکھیڑ دیا اور خیموں کو اُڑا کے لے گئی' جس سے اُن کے دل دہشت زدہ ہو گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے لیکن اسی آندھی نے مسلمانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا' اور یہ ہوا ٹھنڈی' خنک اور فرحت بخش رہی!

چھٹا: رسول اللہ ﷺ کی نمازِ عصر اس موقع پر شدید مشغولیت کی وجہ سے وقت پر ادا نہ ہو سکی حتیٰ کہ آپ ﷺ نے غروبِ آفتاب کے بعد نمازِ عصر کو قضاء کر کے پڑھا۔ صحیحین کے علاوہ چند دیگر روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کی ایک سے زائد متعدد نمازیں فوت ہوئیں' جو آپ ﷺ نے ان کے اوقات نکل جانے کے بعد اکٹھی قضاء کیں۔

یہ بات فوت ہو جانے والی نمازوں کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے' بعض ان لوگوں کے مؤقف سے اس کی تردید نہیں ہوتی جو یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی مصروفیت کی بناء پر نماز کو مؤخر کرنا پہلے تو جائز تھا لیکن بعد میں جب مسلمانوں کے لیے صلوٰۃِ خوف کی مشروعیت ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا' اگر ان لوگوں کی اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اس نسخ کا وقوع قضاء کی مشروعیت پر نہیں بلکہ مصروفیت کی وجہ سے نماز میں تاخیر کے جواز پر وارد ہوتا ہے یعنی

صلوٰۃِ خوف کی مشروعیت سے نماز کو مؤخر کر کے قضاء کرنے کا جواز منسوخ ہو گیا' لیکن اگر نماز چھوٹ جائے تو اس کی قضاء کی مشروعیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ اس سلسلے میں تو سکوت ہے کوئی حکم مذکور نہیں' اس لیے اس کی سابقہ مشروعیت برقرار رہے گی' یہ تو اس صورت میں ہے جب صلوٰۃِ خوف کی مشروعیت کو اس غزوہ کے بعد مانا جائے' لیکن دلیلِ قطعی سے یہ بات ثابت ہے کہ نمازِ خوف کی مشروعیت اس غزوہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی جیسا کہ غزوۂ ذات الرقاع کے بیان میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

فوت شدہ نماز کی قضاء کرنے کی مشروعیت پر ایک مزید دلیل یہ بھی ہے' صحیحین میں یہ بات موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ احزاب سے واپس لوٹنے کے بعد جب بنوقریظہ کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا تو ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر کوئی نمازِ عصر یا (دوسری روایت کے مطابق) نمازِ ظہر بنوقریظہ میں ہی ادا کرے۔

صحابہ کرام یہ حکم سنتے ہی عازمِ سفر ہوئے' صحابہ نے راستے میں ہی نماز کا آخری وقت پایا تو بعض نے کہا: ہم تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق قبیلہ بنوقریظہ کے علاقے میں ہی پہنچ کر نماز پڑھیں گے جب کہ بعض دوسرے صحابہ کرام نے کہا: نہیں! بلکہ ہم تو ابھی نماز کے وقت میں ہی نماز ادا کریں گے' تو اس طرح فریقِ اوّل نے بنوقریظہ کے علاقے میں پہنچ کر وہ نماز قضاء کر کے پڑھی۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ چھوٹ جانے والی فرض نمازوں کی قضاء واجب ہے تو چاہے نماز سو جانے کی وجہ سے فوت ہوئی ہو یا سستی وغفلت کی وجہ سے یا جان بوجھ کر چھوڑی ہو سب برابر ہے' اس لیے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضاء کے وجوب پر عمومی دلیل فراہم ہو جانے کے بعد کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو کہ قضاء کی مشروعیت کو نماز چھوٹنے کے بعض دیگر خاص اسباب کے ساتھ مختص کرتی ہو' جن لوگوں نے بنوقریظہ کے علاقے کی طرف جاتے ہوئے نماز چھوڑ دی تھی' وہ نہ تو سو گئے تھے اور نہ ہی بھول گئے تھے' اس لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ فوت شدہ فرض نماز کی قضاء کی مشروعیت کو جان بوجھ کر نماز چھوڑنے کے علاوہ دیگر اسباب کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے' اس لیے کہ تخصیص کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔

بعض لوگ یہ وہم کرتے ہیں کہ مشروعیتِ قضاء کے عمومی دلائل کو خاص کرنے والی

ایک دلیل موجود ہے اور وہ ہے مندرجہ ذیل حدیث کا مفہوم مخالف' حدیث طیبہ یہ ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جو شخص سو گیا یا بھول گیا اور نماز چھوٹ گئی تو جوں ہی اسے یاد آئے وہ نماز ادا کر لے

لیکن یہ ایک وہم ہی ہے جس میں کسی صاحبِ بصیرت طالبِ علم کو مبتلا نہیں ہونا چاہیے' کیونکہ حدیث سے مقصود بھول جانے یا سو جانے کی قضاء نماز کا حکم بیان کرنا نہیں بلکہ مقصود اُس قید پر زور دینا ہے جو حدیث شریف میں ہے کہ جونہی اسے یاد آ جائے' اور یہ بتانا ہے کہ جس شخص کی نماز کسی بھی وجہ سے چھوٹ جائے اور وہ اسے ادا کرنا چاہے تو اس کے لیے شرط یہ نہیں کہ اگلے دن اُسی وقت کا انتظار کرے' پھر اُس نماز کو ادا کرے بلکہ جس وقت ہی اسے یاد آ جائے فوراً وہ اُس کو ادا کر لے خواہ کوئی بھی وقت ہو' جب یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادِ گرامی کا مطلب یہی ہے جیسا کہ حدیث کے صیغہ کی بھی دلالت موجود ہے اور جیسا کہ حدیث کے ماہر علماء اور شارحین نے بیان کیا ہے تو یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث میں سو جانے یا بھول جانے کے مفہومِ مخالف سے متعلق کوئی قانونی دلالت موجود نہیں ہے۔

غزوۂ بنو قریظہ

بخاری و مسلم میں ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ خندق سے واپس لوٹے تو اسلحہ اتارا اور غسل فرمایا' اتنے میں حضرت جبریل امین علیہ السلام ان کے پاس آئے اور پوچھا: کیا آپ نے اسلحہ اُتار دیا ہے؟ لیکن بخدا! ہم (فرشتوں) نے تو ابھی نہیں اُتارا' پس آپ ان کی طرف جنگ کے لیے نکلیں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کس طرف؟ جبریل امین کہنے لگے: اُس طرف! اور بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا' پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو قریظہ کی طرف روانہ ہوئے۔

(متفق علیہ اور الفاظ بخاری کے ہیں)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں میں یہ اعلان فرما دیا کہ خبردار! تم میں سے ہر کوئی عصر کی نماز بنو قریظہ میں ہی جا کر پڑھے۔ یہ اعلان سن کر لوگ جوق در جوق ٹولیوں کی صورت میں نکلنے لگے' بعض حضرات کو راستے میں ہی عصر کا وقت ہو گیا' مگر وہ کہنے لگے کہ ہم تو منزلِ مقصود

پر پہنچ کر ہی نماز پڑھیں گے اور بعض حضرات نے راستے میں ہی نمازِ عصر پڑھ لی اور کہنے لگے کہ ہمیں نماز پڑھنے سے تو منع نہیں کیا گیا' اس صورتِ حال کا جب نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے کسی فریق پر بھی ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا۔ (رواہ البخاری)

حضور ﷺ نے بنوقریظہ کا محاصرہ کرلیا اور بنوقریظہ اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے [1]

یہاں تک کہ اس محاصرے نے ان کی کمر توڑ دی' ان کے حوصلے پست ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ جب کعب بن اسد نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ یقیناً ان کا قلع قمع کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے تو وہ یہود کو کہنے لگا: اے گروہِ یہود! جو مصیبت تم پر نازل ہو چکی ہے اسے تم دیکھ رہے ہو' میں تم پر تین تجاویز پیش کرتا ہوں' ان میں سے جو چاہو اختیار کرلو' انہوں نے پوچھا: وہ تجاویز کیا ہیں؟

اُس نے کہا: (پہلی تجویز یہ ہے کہ) ہم اِس شخص کی اطاعت قبول کرلیں اور اس کی تصدیق کریں۔ قسم بخدا! اب تم پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ نبی مرسل ہیں' اور یہ وہی رسول ہیں' جن کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو' اس طرح تم اپنی جانیں' اپنے اموال' اپنی اولاد اور اپنی عورتیں سب کچھ محفوظ کرلو گے' انہوں نے جواب دیا: ہم تورات کا حکم کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

کعب نے پھر (دوسری تجویز دیتے ہوئے) کہا: آؤ! (پہلے) ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالیں اور پھر بے نیام تلواریں لے کر محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب کے مقابلے میں پیدل ہی نکل کھڑے ہوں اور (تاکہ) کوئی بھی چیز یا آدمی پیچھے نہ رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان اور محمد (ﷺ) کے درمیان فیصلہ فرما دے' پس اگر ہم ہلاک ہو گئے تو ہو گئے' ہم اپنے پیچھے اپنی کوئی نسل نہ چھوڑیں گے جس کا ہمیں کوئی اندیشہ ہو (اور اگر ہم غالب آ گئے تو ہمیں عورتیں اور بچے دوبارہ مل جائیں گے)۔ یہ بات سن کر یہودیوں نے جواب دیا: ان مسکینوں کا کیا گناہ ہے جس پر ہم انہیں قتل کریں؟ کعب نے کہا: اگر تم میری

---

[1] ابن ہشام کی روایت کے مطابق یہ محاصرہ پچیس (۲۵) دن جاری رہا اور ابن سعد نے طبقات میں لکھا کہ یہ محاصرہ پندرہ یوم جاری رہا۔

اس تجویز کا بھی انکار کرتے ہو تو پھر (میری آخری تجویز یہ ہے کہ) آج سبت کی رات ہے اور قوی اُمید ہے کہ اس رات محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب ہم سے بالکل بے خوف وخطر بیٹھے ہوئے ہوں گے' لہٰذا تم اُن پر حملہ کر دو! ہو سکتا ہے ہم محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب کو دھوکا دے سکیں اور فتح حاصل کر لیں' انہوں نے اس تجویز کا بھی انکار کر دیا۔

پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے' بنو قریظہ مسلمان قبیلہ بنو اوس کے حلیف تھے' اس لیے آپ ﷺ نے یہی پسند فرمایا کہ قبیلہ بنو اوس کے رؤساء میں سے ہی ایک سردار کو فیصلہ کے لیے ثالث اور حکم مقرر کیا جائے' پس آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بنو قریظہ کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے حَکَم مقرر فرمایا' حضرت سعد بن معاذ غزوۂ احزاب میں تیر لگنے کی وجہ سے زخمی تھے اور ایک (رفیدہ نامی خاتون کے) خیمے میں ان کا علاج کیا جا رہا تھا' جب آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو فیصلہ کرنے کے لیے حکم مقرر فرمایا تو ان کو بلا بھیجا' حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایک گدھے پر سوار ہو کر آئے۔ جب وہ مسجد[1] کے قریب آئے تو آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا: اپنے سردار یا اپنے بہترین فرد کے لیے (تعظیماً) کھڑے ہو جاؤ' آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ تمہارے فیصلے پر راضی ہو گئے ہیں' اب تم فیصلہ کر دو۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ ان کے جنگ جوؤں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے اہل وعیال کو قیدی بنا لیا جائے' آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے حکمِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ (متفق علیہ)

پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ خداوندی میں یوں دعا کی:

اے اللہ! تو جانتا ہے کہ مجھے اس سے پیاری کوئی چیز نہیں کہ اُس قوم سے جہاد کرتا رہوں جس نے تیرے رسول کو جھٹلایا اور انہیں وطن سے نکالا' میرے خیال میں تو نے ہمارے اور کفارِ قریش کے درمیان لڑائی ختم کر دی ہے' اگر قریش سے لڑنا ابھی باقی ہے تو مجھے زندگی عطا فرما! تاکہ میں تیری راہ میں ان کے ساتھ جہاد کروں اور اگر تو نے ان کے ساتھ ہماری لڑائی ختم فرما دی ہے تو میرے اسی زخم کو جاری کر کے شہادت کی موت عطا فرما دے' پس ان

---

[1] اس روایت میں مسجد سے مراد مدینہ کی مسجد نبوی نہیں بلکہ جیسا کہ حدیث کے شارحین نے لکھا کہ یہ وہ جگہ ہے جسے آپ ﷺ نے بنو قریظہ سے قریب نماز با جماعت کے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔

کے سینے کے زخم سے خون جاری ہو گیا جو مسجد میں سے ان کے قریب ہی بنو غفار کے خیمے کی طرف بہہ کر جانے لگا' وہ کہنے لگے: اے خیمے والو! یہ تمہاری طرف سے کیا چیز آ رہی ہے؟ پھر انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے زخم کا خون ہے اور وہ اسی زخم کے باعث جامِ شہادت نوش کر گئے۔ (متفق علیہ اور الفاظ بخاری کے ہیں)

امام احمد کی روایت کے مطابق ان کا زخم کافی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا' بس کان کی بالی جتنی جگہ رہ گئی تھی لیکن ان کی اس دعا کے بعد دوبارہ زخم سے خون بہنے لگا اور وہ جامِ شہادت نوش کر گئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کے بعد یہود اپنے قلعوں سے لائے گئے اور ان کو مدینہ منورہ کی خندقوں کی طرف لے جایا گیا' وہاں پر ان کے اُن جوانوں کو قتل کر دیا گیا جو جنگ کرنے کے قابل تھے اور ان کے اہل و عیال کو قیدی بنا لیا گیا' یہود کے جملہ جوان جو وہاں لائے گئے ان کو قتل کر دیا گیا' حیی بن اخطب بھی قتل کر دیا گیا' جس نے کوشش کر کے بنو قریظہ کو غدر اور عہد شکنی پر آمادہ کیا۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ جب اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر کیا گیا تو اُس وقت اس کے دونوں ہاتھ رسّی کے ساتھ گردن سے بندھے ہوئے تھے' جب اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو کہنے لگا: ہاں! خدا کی قسم! میں نے آپ کی دشمنی میں اپنے نفس کو کبھی ملامت نہیں کی لیکن اللہ تعالیٰ جس کو رُسوا کرے وہی ذلیل و رسوا ہوتا ہے' پھر وہ بیٹھا اور اس کی گردن اُڑا دی گئی۔

اسباق و نصائح

علماء حدیث اور علماء سیرت نے بنو قریظہ کے اس واقعہ سے مندرجہ ذیل احکام مستنبط کیے ہیں:

پہلا: عہد توڑنے والے غدار کے قتل کا جواز

امام مسلم علیہ الرحمۃ نے غزوۂ بنو قریظہ کے عنوان کے طور پر یہی حکم اختیار کیا ہے' مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو بھی صلح' معاہدہ یا پیمانِ امن کیا جائے' اُس کا احترام مسلمانوں کو اُس وقت تک کرنا واجب ہے جب تک کہ غیر مسلم اُس عہد' صلح یا امان کو نہ توڑیں

اور جب فریقِ مخالف پہل کرتے ہوئے اُس کیے ہوئے معاہدے یا صلح کے عہد کو از خود توڑ ڈالے تو اُس وقت مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ اُن عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف جنگ کریں' اگر مسلمان اِسی میں ہی مصلحت دیکھتے ہوں۔

دوسرا: مسلمانوں کے اہم اُمور میں کسی حَکَم یا ثالث کو مقرر کرنے کا جواز

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو حضرت سعد بن عبادہ کو حَکَم اور ثالث مقرر فرمایا' اس بناء پر اس بات کا جواز موجود ہے کہ مسلمانوں کے اہم اور بڑے معاملات میں فیصلہ کرنے کے لیے کسی ایک شخص کو حتمی فیصلہ کرنے کا اختیار دینا جائز ہے' اس کام کے لیے کسی مسلمان' عادل' صالح اور صاحبِ بصیرت شخصیت کی طرف رجوع کرنا جائز ہے تاکہ وہ صحیح فیصلہ کر سکے' فیصلہ کرنے کے لیے حَکَم اور ثالث مقرر کرنے کے جواز پر علماء کا اجماع ہے' جب کہ خوارج نے اس سے انکار کیا ہے' خوارج نے اُس وقت ثالث مقرر کرنے کا انکار کیا' جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کے دوران فریقین کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے ثالث مقرر کیا جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے خلاف حجت قائم کی' اس لیے یہ بات جائز ہے کہ کسی بستی یا کسی قلعہ کے لوگوں کا اس بات پر مصالحت کر لینا کہ ایک ایسی شخصیت کو ثالث مقرر کریں گے اور اُس کے فیصلے کو قبول کریں گے جو مسلمان ہو' عادل ہو' صالح ہو اور اس معاملہ میں امین ہو۔ اُس حَکَم پر ضروری ہے کہ وہ ایسا فیصلہ کرے جو عدل کے مطابق ہو اور جس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو' اور پھر وہ ثالث جو فیصلہ کر دے اُس فیصلے کی پاسداری سب پر لازمی ہے۔ اس کے بعد امام اور لوگوں کے لیے اُس فیصلے سے رجوع کرنا یا پھرنا کسی صورت بھی جائز نہیں ہے' ہاں! فریقِ مخالف اُس فیصلے سے پہلے رجوع کر سکتا ہے لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد رجوع جائز نہیں۔

(النووی بر مسلم ج ۱۲ ص ۹۲)

تیسرا: فروعی احکام میں اختلاف کے وقوع کے وقت اجتہاد کا جواز

اس واقعہ کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام کو فرمایا:

الا لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظة.

تم میں سے ہر کوئی نمازِ عصر بنو قریظہ میں ادا کرے گا۔

اس حکم کے سمجھنے میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا' (صحابہ کی ایک جماعت نے اس حکم سے یہ سمجھا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر صورت میں نمازِ عصر بنو قریظہ میں ہی جا کر پڑھنے کا حکم ہے اگرچہ نمازِ عصر کا وقت راستے میں ہی ختم ہو جائے' اور دوسری جماعت نے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ کے اِس حکم سے مراد جلدی بنو قریظہ میں پہنچنا ہے' اس لیے انہوں نے راستے میں ہی جب نمازِ عصر کا وقت ختم ہونے لگا تو نمازِ عصر وقت پر ہی ادا کر لی' جب یہ دونوں گروہ بنو قریظہ میں پہنچے اور آپ ﷺ سے یہ ساری بات عرض کی گئی)' آپ ﷺ نے کسی ایک فریق کی نہ سرزنش کی اور نہ ہی اس فیصلے پر کسی کو کوئی عتاب کیا۔

یہ اہم دلیل ہے جو اہم شرعی اصولوں میں سے ایک اصل کے جواز کو ظاہری کرتی ہے' وہ یہ کہ فروعی مسائل میں اختلاف عین ممکن ہے' اور اسی بناء پر شرعی مسئلہ مستنبط کرنے والے فریقین میں سے ہر کسی کو معذور اور مستحق اجر تصور کیا جاتا ہے۔

خواہ ان میں صحیح رائے کسی ایک شخص کی ہو یا چند لوگوں کی۔ اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شرعی احکام کے استنباط میں اجتہاد مشروع ہے' اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ظنی دلالتوں پر مبنی فروعی مسائل میں اختلاف کا خاتمہ نا قابلِ تصور ہے' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو دو قسم کے احکام کا مکلف بنایا ہے۔

پہلی قسم: معین اور واضح احکام و اُمور جن کا تعلق عقیدہ اور عبادت وسلوک سے ہے' ان پر عمل کریں۔

دوسری قسم: وہ شرعی وفروعی مسائل جو عام مختلف دلالتوں سے مستنبط کیے جاتے ہیں' ان کو سمجھنے کی پوری کوشش کریں۔

اس کی مثال اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص میدان میں سفر کر رہا ہے اور نماز کا وقت ہو گیا ہے' اب اُس پر وقت میں نماز پڑھنا ضروری اور لازمی ہے لیکن جب نماز کا ارادہ کرتا ہے تو جہتِ قبلہ کا اس کو پتا نہیں چلتا' اب وہ اپنی سوچ اور علم کے مطابق اجتہاد کرے گا' وہ اپنے جملہ ذرائع علم سے جاننے کی کوشش کرے گا کہ قبلہ کس طرف ہے' کافی غور وفکر کے بعد اُس کا دل ایک طرف پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہی جہتِ قبلہ ہے تو اب اُس کو چاہیے کہ اُسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے' پھر اس کی متعدد روشن حکمتیں ہیں' بہت سے دلائل اور نصوصِ شرعیہ ظنی

الدلالۃ اور غیر قطعی ہیں' ان میں سب سے نمایاں حکمت یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں کیے جانے والے مختلف اجتہادات تمام کے تمام ازروئے شریعت معتبر دلائل سے مضبوطی سے جڑے ہوئے ہوں گے' حتیٰ کہ مسلمانوں کے لیے اس میں گنجائش ہو گی کہ وہ اپنے حالات و واقعات اور مصالحِ معتبرہ کے مطابق ان میں سے جسے چاہیں اختیار کر لیں' ایسا ہر زمانے اور ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر رحمت کے نمایاں مظاہر میں سے ہے۔

جب آپ اس حکمت میں غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ فروعی مسائل میں اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کرنا حکمتِ ربانی اور تدبیرِ الٰہی کے برعکس ہے۔ اس کے علاوہ مزید یہ فعل عبث اور فعلِ باطل ہے' ایک مسئلہ میں اختلاف اور انتزاع کیسے ختم کیا جا سکتا ہے جب کہ اس مسئلہ کا دارومدار دلیلِ ظنی پر ہو؟ اور اس میں صحیح اور غلط دونوں چیزوں کا احتمال ہو' اگر ایسا ہونا ہمارے اس زمانے میں ممکن ہے تو اس سے زیادہ امکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں تھا' اور لوگوں میں اختلاف نہ کرنے کے سب سے زیادہ مستحق صحابہ کرام تھے۔

لیکن اس کے باوجود ان لوگوں (صحابہ) کے درمیان اختلاف ہوا' جیسا کہ آپ نے دیکھا (مختلف روایات سے)۔

چوتھا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا یہود کو یقین تھا

کعب بن اسد یہودی نے اپنے یہودی بھائیوں سے مخاطب ہو کر جب بات کی تو اس دوران اُس نے ایسی باتیں بھی کیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہودیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے میں یقینی طور پر پتا تھا اور تورات میں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں بیان کی گئی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علامات اور بعثت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا' اُس سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں' لیکن ان سب دلائل و شوائد کے باوجود یہود اپنی عصبیت اور تکبر کے غلام تھے' جس وجہ سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔ ان کے کفر کا بھی یہی سبب تھا اور اس کے علاوہ جن قوموں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر عدم ایمان اور عدم فہم کا مظاہرہ کیا' اُن کے کفر کی وجہ بھی یہی سبب ہوتا ہے' یہ واضح اور بین دلیل ہے کہ دین اسلام اپنے عقائد اور جملہ عمومی شرعی احکام کی وجہ سے خالص دینِ فطرت

انسانی ہے۔ جو صاف اور شفاف بشری تقاضوں کے مطابق ہے۔ اسلامی عقائد عین انسانی عقل کے مطابق ہیں اور اسلامی شرعی احکام عین انسانی حاجات اور ضروریات کے مطابق ہیں، کسی بھی عقل مند کو جونہی اسلام کی حقانیت کا صحیح علم ہوا، اُس نے اُسی وقت اسلام قبول کر لیا لیکن اگر کسی نے اسلام کا انکار کر دیا تو اس سلسلے میں دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازمی ہوگی یا تو اس کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات ہی نہیں فراہم کی گئیں، اور یا اس کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات اور دلائل وشواہد تو ملے لیکن وہ مسلمانوں کے ساتھ نفرت یا اپنی عصبیت وتکبر کی وجہ سے اسلام نہ لایا، یا اسلام قبول کرنے کی صورت میں اسے اپنے کوئی مفاد حاصل نہ ہو پانے یا کوئی خواہشِ نفس پوری نہ ہو پانے کا ڈر ہے۔

پانچواں: آنے والے شخص کی عزت وتکریم کرتے ہوئے کھڑے ہونے کا حکم

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کو اُس وقت قیامِ تعظیمی کا حکم دیا، جب انصار کے ایک قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ان کی طرف اپنی سواری پر سوار ہو کر تشریف لا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کھڑے ہونے کا جو حکم دیا اُس کی علت پر یہ ارشادِ نبوی دلالت کرتا ہے: ''لسیدکم او خیرکم'' یعنی تم اپنے سردار یا اپنے بہترین شخص کے لیے (کھڑے ہو جاؤ)۔

جملہ علماء نے اس حدیثِ طیبہ اور اس کے علاوہ دیگر احادیثِ طیبات سے استدلال کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ علماء کرام اور صالحینِ عظام کی عزت وتکریم اور ان کی تعظیم کے لیے مناسب موقعوں پر کھڑے ہونا مشروع اور جائز ہے۔

امام نووی علیہ الرحمۃ اس حدیثِ طیبہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس حدیثِ طیبہ میں اہلِ علم وفضل کی تکریم اور ان کے آنے پر تعظیماً کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرنے کی تلقین ہے، اسی طرح جمہور علماء نے اس حدیثِ طیبہ سے قیامِ تعظیمی کے استحباب کا استدلال کیا ہے۔

قاضی فرماتے ہیں: اس قیام سے مراد وہ قیام نہیں جس سے منع کیا گیا ہے، جس قیام سے منع کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ کھڑے ہوں اور وہ شخص بیٹھا ہوا ہو اور اُس شخص کے طویل بیٹھے رہنے کے باوجود بھی لوگ مسلسل مجسمے کی طرح کھڑے رہیں (جیسے بادشاہوں کے

درباروں میں ہوتا ہے) ایسے قیام سے روکا گیا ہے۔

میں (امام نووی) کہتا ہوں: اہلِ علم و فضل کے تشریف لانے پر تعظیماً کھڑے ہونا مستحب ہے' متعدد احادیثِ طیبات سے یہ ثابت ہے اور واضح طور پر صریحاً اس سے منع کرنے والی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ (النووی بر مسلم ج ۱۲ ص ۹۳)

استحبابِ قیامِ تعظیمی پر دلالت کرنے والی متعدد احادیثِ طیبات میں سے ایک حدیثِ طیبہ وہ ہے جو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے' اس کو بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک سے اپنے پیچھے رہ جانے کے بارے میں واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ (بغیر وجہ کے غزوۂ تبوک پر نہ جانے کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مجھ سے ناراضگی ہوئی تو میں توبہ کرتا رہا' جب میری توبہ قبول ہوئی) میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کے لیے چلا تو راستے میں مجھے لوگ ٹولیوں کی صورت میں ملتے اور میری توبہ کی قبولیت پر مجھے مبارک باد دیتے' وہ مجھے کہتے: اللہ تعالیٰ نے جو تیری توبہ قبول کی ہے' اس پر تجھے مبارک ہو' میں یوں ہی چلتا چلتا جب مسجدِ نبوی میں داخل ہوا تو وہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف فرما تھے اور آپ کے اردگرد لوگ بیٹھے تھے' ان بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے طلحہ بن عبید اللہ میرے لیے کھڑے ہوئے اور میری طرف تیزی سے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کرنے لگے اور مجھے مبارک باد دینے لگے' بخدا! ان کے علاوہ مہاجرین میں سے کوئی شخص بھی میرے لیے کھڑا نہ ہوا۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ کے اس عمل کو کبھی نہ بُھلایا۔

اسی موضوع کی ایک اور حدیثِ طیبہ ہے جسے امام ترمذی' امام ابوداؤد نے اور امام بخاری نے ''الادب المفرد'' میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے بات کرنے میں' کلام کرنے میں اور بیٹھنے میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مشابہ نہیں دیکھا' حضرت عائشہ فرماتی ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب بھی حضرت فاطمہ کو آتے ہوئے دیکھتے تو ان کو مرحبا کہتے اور ان کے لیے کھڑے ہو جاتے اور اُن کا بوسا لیتے' پھر اُن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی نشست پر لے جا کر بٹھاتے' اسی طرح جب حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی طرف تشریف

لاتے ہوئے دیکھتیں تو وہ آپ ﷺ کو مرحبا کہتیں' پھر ان کے لیے (تعظیماً) کھڑی ہو جاتیں اور آپ کا بوسہ لیتیں [1]

قیامِ تعظیمی کے ثبوت والی جملہ احادیثِ طیبات اُس حدیث کے منافی نہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں' وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

اس حدیثِ طیبہ سے وہ فرق بالکل واضح ہو گیا کہ لوگ جن علماء اور صالحین کی تعظیم اور ادب کے لیے خود کھڑے ہوں وہ جائز ہے' کیونکہ یہ لوگ اہلِ فضل کے ساتھ دلی محبت کی بناء پر ادب و تعظیم کا مظاہرہ کرتے ہیں جب کہ اہلِ علم و فضل' صالحین ان کو کھڑا ہونے کا نہ حکم دیتے ہیں اور نہ دل میں خواہش کرتے ہیں کیونکہ صالحین اور علماء حق کی نمایاں صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ عاجزی و انکساری کے پیکر اور اپنے بھائیوں کے لیے منکسر المزاج ہوتے ہیں' وہ کبھی بھی اپنے بھائیوں سے اس بات کی خواہش نہیں کرتے کہ وہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں' مثلاً کسی فقیر اور محتاج ہی کو دیکھیں۔

ادبِ اسلامی تو اس کو یہ بات سکھاتا ہے کہ وہ کسی سے کوئی بھی سوال نہ کرے اور نہ ہی اپنے فاقہ اور حاجت کا لوگوں کے سامنے اظہار کرے بلکہ اسلام تو اغنیاء اور امراء کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ جو صاحبِ ثروت ہیں' وہ اپنے معاشرے میں غرباء و مساکین اور سفید پوش حاجت مندوں کو خود تلاش کریں اور ان کو عزت و تکریم کے ساتھ اپنے زائد مال سے حصہ دیں۔ اس لیے ہر چیز اور ہر شخص کا ادب اور عزت کامل اسلام سکھاتا ہے (ہر ایک کے کچھ نہ کچھ حقوق و فرائض ہیں اور ہر کام کا کوئی نہ کوئی دائرہ ہوتا ہے)' اس لیے ہم ہر چیز کو نہ تو خلط ملط کر سکتے ہیں اور نہ ہی ایک کو دوسری سے منسوخ کر سکتے ہیں۔ یہ جلد بازی اور جہالت کے بدترین مظاہر میں سے ہے۔ مثلاً قیامِ تعظیمی کو ہی لے لیں تو اس کو جائز حدود میں رہ کر کیا جائے تو یہ مستحب ہے اور اگر اس کی حدود کو پھلانگا جائے تو یہ گناہ میں شامل ہو جاتا ہے اور اس گناہ میں اسے کرنے والا اور اس پر خاموش رہنے والا دونوں شریک ہو جاتے ہیں۔

---

[1] یہ بخاری کے الفاظ ہیں' اس کے علاوہ دیگر روایات میں بعض جگہ الفاظ کا فرق اور معمولی اضافہ ہے۔

مثلاً بعض صوفیاء کی مجالس میں دیکھا گیا ہے کہ مریدین کھڑے ہوتے ہیں اور شیوخ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں' مرید اپنے شیخ کے سامنے عاجزی وانکساری سے سر جھکائے کھڑا رہتا ہے' جب تک شیخ اس کو بیٹھنے کا نہ کہے وہ نہیں بیٹھتا۔ اسی طرح بعض مرید اپنے شیخ کے پاس حاضر ہوتے وقت اپنے شیخ کے گھٹنے یا ہاتھ پر سجدے کی کیفیت میں اپنا سر رکھتے ہیں یا مجلس کے دوران اگر آتے ہیں تو بیٹھے بیٹھے حاضرِ خدمت ہوتے ہیں' ان سب چیزوں کے بارے کہا جاتا ہے کہ یہ مرید کی تربیت کا اسلوب ہے' یہ چیز آپ کو ہرگز دھوکے میں نہ ڈال دے۔ دینِ اسلام نے تربیت کے کچھ طریقے اور اسالیب متعین کیے ہیں' اور ان سے تجاوز کرنے سے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے' تربیت کے نبوی اسلوب کے بعد کسی اسلوب اور طریقے کی ضرورت نہیں۔

چھٹا: حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی امتیازی خصوصیات

غزوۂ بنو قریظہ کے واقعات کے مطالعہ کے دوران آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس دوران حضرت سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو امتیازی خصوصیات سے نوازا گیا' پہلی مرتبہ جب بنو قریظہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو حَکَم اور ثالث مقرر فرمایا اور فیصلہ کرنے کا اختیار عطا فرمایا اور ان کے کیے ہوئے ہر طرح کے فیصلے سے موافقت اور تائید کا عندیہ پہلے ہی دے دیا اور فی الواقع ایسا ہی ہوا کہ اُنہوں نے جو فیصلہ کیا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے من وعن اُسی طرح نافذ کرنے کا حکم دیا۔ دوسری مرتبہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اُس وقت پذیرائی ملی جب مجلس میں اُن کے آنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انصار کو ان کی تعظیم واکرام کے لیے کھڑے ہو کر اُن کا استقبال کرنے کا حکم دیا' یہ سب سے بڑی ان کی خصوصیت تھی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی عزت وتکریم کرنے کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے صادر ہوا تھا' پھر اس کے بعد جب آپ رضی اللہ عنہ کو غزوۂ خندق کے دوران گہرا زخم آیا تو جس دن آپ کو زخم آیا' آپ نے اُس دن یہ دعا کی:

اے اللہ! تو جانتا ہے کہ مجھے اس سے پیاری کوئی چیز نہیں کہ اس قوم سے جہاد کرتا رہوں جس نے تیرے رسول کو جھٹلایا اور انہیں وطن سے نکالا' اے اللہ! اگر قریش سے لڑنا ابھی باقی ہے تو مجھے زندگی عطا فرما تاکہ میں تیرے راستے میں ان کے ساتھ جہاد کرتا رہوں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دعا بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور ان کا زخم تیزی سے

بھرنے لگا اور شفا ملنے لگی اور قریب قریب ٹھیک ہو گیا' پھر غزوۂ خندق کے فوراً بعد ہی بنو قریظہ کو عہد شکنی کی سزا دینے کا وقت آ گیا' تو رسول اللہ ﷺ نے اس معاملے میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ثالث اور حَکَم مقرر فرمایا' آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے بالغ مردوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا جس کے نفاذ کا آپ ﷺ نے حکم دے دیا' اس طرح اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو یہود کے شر سے محفوظ کیا اور مدینۃ المنورہ کو اُن کی نجاست سے پاک فرمایا' اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ دوبارہ ہاتھ اُٹھا کر بارگاہِ الٰہی میں یوں دعا کرتے ہیں:

اے اللہ! میرے خیال میں تو نے ہمارے اور کفارِ قریش کے درمیان لڑائی ختم کر دی ہے اور اگر (واقعی) تو نے ان کے ساتھ ہماری لڑائی ختم فرما دی ہے تو میرے اِسی زخم کو جاری کر دے اور مجھے شہادت کی موت عطا فرما۔

• آپ رضی اللہ عنہ کی یہ دعا بھی بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی' آپ کے زخم سے اُسی وقت خون بہنے لگا اور اُسی رات آپ جامِ شہادت نوش کر گئے۔

فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خیال ٹھیک تھا (یعنی اللہ تعالیٰ نے قریش کی جنگ ختم کر دی اور پھر آپ کی دعا بھی قبول ہوئی اور اُسی رات وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے)' اور پھر غزوۂ خندق کے بعد مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان کوئی ایسی جنگ اور لڑائی نہ ہوئی جس کی ابتداء قریش نے حملہ کی صورت میں کی ہو' اس واقعہ کے بعد آپ ﷺ نے ایک دفعہ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے کے ارادے سے مکہ کی طرف سفر فرمایا لیکن کفارِ قریش نے آپ ﷺ کو مکۃ المکرمہ میں داخل ہونے سے روک دیا' قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جاتی لیکن ایسا نہ ہوا' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ. (الفتح:۲۴)	اور اللہ وہی ہے جس نے روک دیا تھا ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے وادیٔ مکہ میں باوجودیکہ تمہیں ان پر قابو دے دیا تھا' اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا۔

اس موقع پر صلح ہوئی (جسے صلح حدیبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جنگ بندی کا

معاہدہ ہوا)' آپ ﷺ نے اگلے سال عمرہ کیا' آپ ﷺ اسی معاہدے پر قائم رہے حتیٰ کہ مشرکینِ مکہ نے خود ہی اس معاہدے کو توڑ دیا' اب رسول اللہ ﷺ مکہ والوں کے خلاف جنگ کے لیے نکلے اور بالآخر مکۃ المکرمہ فتح ہو گیا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۲۹۲)

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ حضور ﷺ نے غزوۂ احزاب سے واپسی پر فرمایا تھا: اب ہم ان (کفار و مشرکین) پر حملہ کریں گے اور یہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے اور ہم ان کی طرف چل کر فوج کشی کریں گے۔ (رواہ البخاری)

بزاز نے اسنادِ حسن سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے احزاب کے دن جب کہ مشرکین نے بہت بڑی فوج اکٹھا کر لی تھی' ارشاد فرمایا: اب یہ (کفار و مشرکین) کبھی بھی تم پر حملہ آور نہ ہوں گے بلکہ اب تم ہی ان پر حملہ کرو گے۔

آخر میں حضرت سعد کا یہ واقعہ اپنے جملہ متعلقات سمیت یہ بات یاد دلاتا ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں' وہ یہ کہ اسلام میں دفاعی جنگ' دعوتِ نبوی کے مراحل میں سے ایک مرحلہ تھا' اس کے بعد اگلا مرحلہ تمام انسانوں کو دین اسلام کی دعوت دینے کا تھا' اس مرحلہ میں ملحدین اور مشرکین سے اسلام قبول کرنے کے سوا کچھ بھی قبول نہ کرنے کا ذکر تھا' اسی طرح اہل کتاب سے بھی کہا گیا کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا مکمل طور پر اس کے عام حکم کے تحت آ جائیں' پھر دعوت کے تمام معروف اور پُرامن ذرائع اختیار کرنے کے بعد بھی جو لوگ اسلام کے اس راستے میں رکاوٹ بنیں ان سے جنگ کرنا ممکن ہے۔

جہاد اور دعوت سے متعلق اسلامی احکام کی تکمیل کے بعد اب اس چیز کی کوئی ضرورت نہیں جسے ''دفاعی جنگ'' کا نام دیا جاتا ہے اور جس کا چرچا اور بول بالا موجودہ دور کے بعض محققین کی زبانوں پر رہا ہے' ورنہ آپ ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کا کیا معنی ہے:

لیکن اب تم ان پر حملہ کرو گے۔

باب ششم:

فتح' مقدمات اور نتائج' دعوت کا جدید مرحلہ

صلح حدیبیہ

صلح حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے چھٹے سال کے اواخر میں ماہِ ذی القعدہ میں پیش آیا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلان کیا کہ آپ مکۃ المکرمہ عمرہ کرنے کے ارادے سے جا رہے ہیں' یہ اعلان سن کر مہاجرین و انصار میں سے تقریباً چودہ (۱۴) سو صحابہ کرام' آپ ﷺ کی معیت میں عمرہ کرنے کے ارادے سے جمع ہو گئے' آپ ﷺ نے راستے میں ہی عمرے کا احرام باندھ لیا اور اپنے ساتھ قربانی کے جانور بھی لے لیے تاکہ لوگ آپ کی طرف سے جنگ سے بے خوف ہو جائیں اور لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ بیت اللہ شریف کی زیارت اور اس کی تعظیم بجالانے کی غرض سے جا رہے ہیں۔

اس سفر کے دوران آپ ﷺ جب ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو آپ نے قبیلہ خزاعہ کے بشر بن سفیان نامی شخص کو مخبری کے لیے مکۃ المکرمہ بھیجا تاکہ وہ اہل مکہ کی خبر لائے' آپ ﷺ نے اسی طرح اپنا سفر جاری رکھا جب آپ اشطاط کے کنویں پر پہنچے تو وہ مخبر آپ کو وہاں پر واپس آ کر ملا۔

اُس جاسوس نے خبر دی کہ قریش نے اپنے اردگرد کے قبائل کو جمع کر لیا ہے اور انہوں نے احابیش کو بھی جمع کیا ہے تاکہ وہ آپ سے جنگ کریں اور آپ کو بیت اللہ کی زیارت سے روکیں' آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! مشورہ دو! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ بیت اللہ کی زیارت کے لیے نکلے ہیں' آپ کسی ایک کو بھی قتل کرنے یا کسی سے بھی جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے' پس آپ اسی طرح بڑھتے جائیں' جو بھی ہمیں روکنے کی کوشش کرے گا' ہم اُس سے جنگ کریں گے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا نام لے کر چلتے جاؤ۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: جس راستے پر اہل مکہ ہمیں روکنے کے لیے موجود ہیں' اس سے ہٹ کر کسی دوسرے راستے پر کیا کوئی شخص ہماری رہنمائی کرے گا۔

قبیلہ بنو اسلم کے ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں! دوسرے راستے سے لے چلوں گا' پس وہ شخص گھاٹیوں کے درمیان سے غیر معروف ویران راستے سے قافلے کو لے کر چلا۔

نبی اکرم ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ چلتے چلتے مرار نامی گھاٹی کے مقام پر پہنچے' جو حدیبیہ کے بالکل قریب تھا۔ جب مرار نامی گھاٹی کے مقام پر پہنچے تو وہاں پر آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی' لوگ ''حل' حل'' کی آواز نکالنے لگے' اس طرح کی آواز نکال کر اونٹوں کو اٹھایا جاتا تھا لیکن وہ اونٹنی بالکل نہ اُٹھی' تو لوگ کہنے لگے کہ یہ اونٹنی (قصواء) اَڑ گئی ہے' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ اونٹنی نہ اَڑی ہے اور نہ ہی اس کی یہ عادت ہے بلکہ اسے اُس ذات نے روکا ہے جس ذات نے ہاتھی کو آگے بڑھنے سے روکا تھا۔

پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! یہ قریش جو بھی منصوبہ پیش کریں گے جس میں اللہ کی حرمات کی تعظیم کا پہلو ہوگا تو میں اسے ضرور منظور کروں گا۔

پھر آپ ﷺ نے اپنی سواری کو ہانکا تو وہ جھٹ سے اٹھی اور آپ ﷺ نے وہاں راستے سے کچھ ہٹ کر حدیبیہ کے ایک کنارے پر ایک چھوٹے سے تھوڑے پانی والے کنویں کے قریب پڑاؤ کیا' تھوڑی دیر بعد ہی لوگوں نے دیکھا کہ کنواں خالی ہو گیا ہے تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں شدید پیاس کی شکایت کی' آپ ﷺ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور فرمایا کہ اس تیر کو کنویں کے اندر ڈال دو' جونہی تیر پانی میں ڈالا' اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ تمام صحابہ سیراب ہو گئے۔[1]

---

[1] یہ روایت امام بخاری نے کتاب الشرط اور ابن اسحاق وغیرہ نے ذکر کی ہے۔ امام بخاری نے اس کے علاوہ صحیح بخاری' کتاب المغازی میں اسی طرح کی ایک اور روایت نقل کی ہے کہ جب صحابہ کرام نے پیاس کی شکایت کی تو آپ ﷺ کنویں کی منڈیر پر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابھی سب لوگ حدیبیہ کے مقام پر ہی موجود ہے کہ بدیل بن ورقاء الخزاعی اپنے ساتھ چند آدمی لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: میں کعب بن لؤی اور عامر بن لؤی کو حدیبیہ کے کنوؤں پر پڑاؤ کیے ہوئے چھوڑ کر آیا ہوں' ان کے ساتھ ''عوذ المطافیل'' [1] شیر خوار بچوں والی دودھ دینے والی اونٹنیاں بھی موجود ہیں' وہ اپنی خوراک وغیرہ کا خوب بندوبست کر کے آئے ہیں تا کہ آپ سے جنگ کریں اور آپ کو بیت اللہ کی زیارت سے روکیں' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم یہاں پر کسی سے بھی جنگ کے لیے نہیں آئے' بلکہ ہم تو صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں' مسلسل لڑائیوں سے قریش کو کافی جانی و مالی نقصان پہنچا ہے' اگر چہ وہ چاہیں تو وہ مجھ سے ایک مدتِ معینہ کے لیے صلح کا معاہدہ کر لیں' وہ میرے اور دیگر لوگوں کے درمیان رکاوٹ نہ ڈالیں' اگر مجھے غلبہ حاصل ہو جائے تو اگر وہ چاہیں تو دوسروں لوگوں کی طرح وہ بھی اسلام قبول کر لیں اور نہ چاہیں تو بھی آرام سے رہیں اور اگر وہ اس پر راضی نہیں ہیں تو مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میں اُن سے اُس وقت تک لڑوں گا حتیٰ کہ میری گردن میرے بدن سے الگ ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تشریف لائے اور وہاں بیٹھ گئے' پھر ایک برتن منگوایا' پس آپ نے کلی کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی' پھر وہ (کلی والا) پانی کنویں میں انڈیل دیا' پھر ارشاد فرمایا: اس کو تھوڑی دیر چھوڑ دو' پھر کنویں میں اس سے اتنا پانی ہو گیا کہ سب صحابہ اسی پانی سے سیراب ہو گئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب ''فتح الباری'' میں لکھتے ہیں: ان دونوں واقعات میں تطبیق یوں ہے کہ ممکن ہے یہ دونوں واقعات الگ الگ واقع ہوئے ہوں (ان دونوں واقعات سے مراد کنویں میں تیر گاڑنے والا واقعہ اور کنویں میں کلی والا پانی ڈالنے والا واقعہ ہیں) جہاں تک اُس واقعہ کا تعلق ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر اپنا ہاتھ مبارک پانی سے بھرے برتن میں ڈالا تو آپ ﷺ کی پانچوں انگلیوں سے پانی کے چشمے اُبلنے لگے' یہ واقعہ ان مذکورہ بالا دونوں واقعات سے الگ ہے اور یہ تینوں واقعات صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

[1] حدیث شریف میں ''العوذ'' کا لفظ ہے' جو ''عائذ'' کی جمع ہے' اس کے معنی دودھ دینے والی اونٹنی کے ہیں۔ حدیث میں لفظ آیا ہے: ''مطافیل'' اس سے مراد وہ اونٹنیاں ہیں جن کے ساتھ ان کے بچے ہوں' بدیل یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قریش پوری تیاری کے ساتھ نکلے' اور تہیہ کیے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے خواہ انہیں کتنے ہی دن یہاں ٹھہرنا پڑے۔

جائے یا اللہ تعالیٰ اس دین کو نافذ کر دے۔

یہ سن کر بدیل نے کہا: جو کچھ آپ نے فرمایا' میں اس کو قریشِ مکہ تک پہنچاتا ہوں' بدیل وہاں سے چلا اور قریش کو آ کر وہ ساری بات بتائی جو اُس نے آپ ﷺ سے سنی تھی۔ یہ بات سن کر عروہ بن مسعود کھڑا ہوا اور کہنے لگا: میں نبی (ﷺ) کے پاس جاتا ہوں اور بدیل بن ورقاء جو پیغام لے کر آیا ہے' اس سلسلے میں اُن سے مزید بات چیت کرتا ہوں' قریش نے کہا: جیسے تم کہتے ہو ٹھیک ہے پس تم جاؤ۔ عروہ بن مسعود وہاں سے چلا اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے اس کے ساتھ بھی وہی گفتگو فرمائی جو آپ نے اس سے قبل بدیل سے کی تھی' یہ سن کر عروہ کہنے لگا: آپ کا کیا خیال ہے اگر آپ نے لڑ کر قریش کو برباد کر دیا تو مجھے بتایئے کیا آپ سے پہلے کبھی کسی عرب نے اپنی ہی قوم کو برباد کیا ہے اور اگر قریش کا پلڑا بھاری رہا تو آپ کے ساتھ جو یہ لوگ ہیں بخدا! میں ان میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ یہ سب آپ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ عروہ بن مسعود کا یہ جملہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تڑپ کر بولے اور گالی دے کر کہا: اے عروہ! اپنی دیوی ''لات'' کی شرم گاہ کے چیتھڑے کو چوس! کیا ہم اللہ کے رسول کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ یہ سن کر عروہ اُدھر متوجہ ہوا اور پوچھنے لگا: یہ کون ہیں؟ صحابہ نے کہا: یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں' عروہ کہنے لگا: اے ابوبکر! اگر تیرا ایک وہ احسان مجھ پر نہ ہوتا جس کا بدلہ میں تجھ کو نہیں دے سکا' میں تیری اس تلخ بات کا جواب ضرور دیتا[1] پھر عروہ آپ ﷺ سے گفتگو کرنے لگا اور وہ جب بھی کوئی بات کرتا تو آپ ﷺ کی ریش مبارک کو پکڑ لیتا' حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جو زرہ میں ملبوس' تلوار لے کر حضور ﷺ کی پشت پر کھڑے تھے اور جب عروہ بات کرتے ہوئے اپنا ہاتھ آپ ﷺ کی ریش مبارک کی طرف بڑھاتا تو حضرت مغیرہ اُس کے ہاتھ پر تلوار کا دستہ مارتے اور اُسے کہتے کہ اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کی ریش مبارک سے دور رکھو۔ عروہ بن مسعود نے اپنا سر اٹھایا اور پوچھا: یہ

---

[1] حدیث شریف میں'' الید '' کا لفظ آیا ہے' جس کا معنی ہے: احسان۔ عروہ جس احسان کا قصد کر رہا ہے وہ یہ کہ ایک موقع پر عروہ پر ایک دیت عائد ہوگئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔

کون شخص ہے؟ ایک صحابی نے کہا: یہ مغیرہ بن شعبہ ہیں' عروہ نے کہا: اے دھوکے باز! میں نے کل ہی تیری غلاظت صاف کی ہے[1] (حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اسلام لانے سے قبل تیرہ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا تو دو مقتولوں کا خون بہا عروہ بن مسعود نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا' یہ اُسی طرف اشارہ تھا)۔ اس کے بعد عروہ بن مسعود صحابہ کرام کو کن انکھیوں سے دیکھنے لگا (اور پورے لشکر گاہ کو دیکھ کر وہاں سے روانہ ہوا' عروہ قریش کے پاس آ کر کہنے لگا: اے میری قوم!) اللہ کی قسم! جب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا کھنکھار تھوکتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی صحابی کی ہتھیلی پر پڑتا ہے اور وہ فرطِ عقیدت سے اس کو اپنے چہرے اور اپنی جلد پر مَل لیتا ہے اور وہ کسی بات کا اُن لوگوں کو حکم دیتے ہیں تو سب کے سب اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں' اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو اُن کے اصحاب ان کے وضو کے دھوون کو لینے کے لیے اس طرح جھپٹ پڑتے ہیں گویا ان میں لڑائی ہو جائے گی اور جب وہ کوئی گفتگو کرتے ہیں تو سب صحابہ اپنی آوازوں کو پست کر لیتے ہیں اور ادب و تعظیم کی وجہ سے کوئی شخص اُن کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔

عروہ نے واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا: اے میری قوم! اللہ کی قسم! میں نے بہت سے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں' میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں بھی گیا ہوں مگر اللہ کی قسم! میں نے کسی بادشاہ کے درباریوں کو اپنے بادشاہ کی اتنی تعظیم کرتے ہوئے نہیں دیکھا جتنی تعظیم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کرتے ہیں' لہٰذا انہوں نے جو بہترین پیش کش تمہیں کی ہے تم اسے قبول کر لو۔

پھر قریش نے سہیل بن عمرو کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تاکہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان وہ صلح کا معاہدہ تحریر کرے۔ سہیل جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر بیٹھ گیا تو کہنے لگا: آئیں! ہم اپنے اور آپ کے درمیان معاہدہ کی ایک دستاویز لکھ لیں' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کاتب طلب فرمایا' اور مسلم کی روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ کو یہ دستاویز لکھنے کے لیے طلب فرمایا۔

---

[1] عروہ کا ارادہ یہاں یہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے قبولِ اسلام سے قبل ایک موقع پر تیرہ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا تو دو آدمیوں کی دیت ان کی طرف سے عروہ نے ادا کی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: لکھو: "بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم" سہیل کہنے لگا: بخدا! ہم رحمٰن کو نہیں جانتے کہ یہ کون ہے؟ بلکہ آپ لکھیں: "باسمك اللّٰھم" یہ سن کر مسلمان کہنے لگے: بخدا! ہم "بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم" ہی لکھیں گے' آپ ﷺ نے فرمایا: لکھو: "باسمك اللّٰھم" پھر آپ ﷺ نے لکھوایا: "ھذا ما قاضی علیه محمد رسول اللّٰہ" یعنی یہ وہ شرائط ہیں جن پر محمد رسول اللہ نے صلح کا فیصلہ کیا ہے۔

سہیل نے پھر ٹوکا اور کہنے لگا: اللہ کی قسم! اگر ہم جان لیتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو نہ ہم آپ کو بیت اللہ سے روکتے اور نہ آپ کے ساتھ جنگ کرتے' لیکن آپ "محمد بن عبداللہ" لکھوائیں' آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہوں اگرچہ تم لوگ میری رسالت کو جھٹلاتے ہو! پھر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: لکھیں: محمد بن عبداللہ۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ "محمد رسول اللّٰہ" کو مٹادو' حضرت علی رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: نہیں! اللہ کی قسم! میں اس کو نہیں مٹاؤں گا' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اچھا! مجھے اس کی جگہ دکھاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ جگہ دکھائی تو آپ نے وہاں سے "رسول اللّٰہ" کا لفظ خود مٹا دیا اور محمد بن عبداللہ لکھوا دیا گیا' پھر آپ ﷺ نے سہیل سے فرمایا: یہ معاہدہ اس شرط پر ہوا کہ تم ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان سے ہٹ جاؤ تاکہ ہم اس کا طواف کرسکیں' سہیل نے کہا: اللہ کی قسم! ایسا نہ ہوگا ورنہ عرب باتیں کریں گے کہ مسلمان بزورِ بازو مکہ میں داخل ہو گئے لیکن یہ اگلے سال ہوگا' اگلے سال مسلمان آئیں اور تلواریں بھی نیام میں بند ہوں' یہ شرط لکھی گئی۔

سہیل نے کہا: ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص بھی جو آپ کے پاس جائے اگرچہ وہ آپ ہی کے دین پر ہو تو آپ اس کو واپس لوٹا دیں گے لیکن اگر آپ میں سے کوئی شخص یہاں آیا تو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے' مسلمان اس پر کہنے لگے: سبحان اللہ! ایک مسلمان کو ہم کیوں کر مشرکین کی طرف لوٹا دیں گے؟ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہو کر پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم اس شرط کو بھی لکھ لیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اگر ہم میں سے کوئی بھی اُن کے پاس چلا جاتا ہے تو اللہ اُسے دور کردے اور اگر ان میں سے کوئی شخص ہمارے پاس آجاتا ہے تو اللہ ضرور اس کے لیے کشادگی اور خلاصی کی

کوئی سبیل پیدا فرمائے گا۔ (روایات البخاری والمسلم)

ابن اسحاق' ابن سعد اور حاکم کی روایات کے مطابق ان مذکورہ بالا شروط کی بناء پر صلح کی مدت دس سال طے پائی' اس کے علاوہ ہر قبیلہ کو اختیار تھا کہ وہ جس گروپ کے ساتھ چاہے شمولیت اختیار کر لے' اس طرح قبیلہ خزاعہ نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور وہ کہنے لگے: ہم تو محمد (ﷺ) کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہیں اور قبیلہ بنو بکر نے اعلان کیا کہ ہم قریش کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہیں۔ جب صلح کے اس معاہدے کی تحریر سے فارغ ہوئے تو اس تحریر پر مسلمانوں میں چند لوگ اور مشرکین میں سے چند لوگ گواہ بنا لیے گئے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا: کیا آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں! میں نے عرض کیا: کیا آپ حق پر اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں! میں نے عرض کیا: کیا ہمارے مقتول جنت اور ہمارے دشمن کے مقتول دوزخ میں نہیں جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں! میں نے عرض کیا: پھر ہمارے دین کے معاملہ میں ہمیں یہ ذلت کیوں دی جا رہی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں اللہ کا رسول ہوں اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا' وہ میرا مددگار ہے' میں نے عرض کیا: کیا آپ ہمیں یہ نہ کہتے تھے کہ ہم عنقریب بیت اللہ میں جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں! لیکن کیا میں نے تم کو یہ خبر دی تھی کہ ہم اسی سال بیت اللہ میں داخل ہوں گے؟ میں نے جواب دیا: نہیں! پھر آپ ﷺ نے فرمایا: میں پھر کہتا ہوں کہ تم یقیناً کعبہ میں پہنچو گے اور اس کا طواف کرو گے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ باتیں سن کر پھر بھی صبر نہ آیا حتیٰ کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور وہی سوالات ان سے بھی دہرائے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے خطاب کے بیٹے! بے شک وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' وہ ہرگز اپنے رب کی نافرمانی نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کبھی بھی ان کو ضائع نہیں فرمائے گا۔

اس کے بعد تھوڑی ہی دیر گزری کہ رسول اللہ ﷺ پر سورۃ الفتح کی آیاتِ بیّنات

نازل ہوئیں' آپ ﷺ نے وہ آیاتِ بیّنات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سنائیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا یہ فتح کی خوش خبری ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل کو خوشی اور تسکین ہوئی۔ (متفق علیہ)

پھر نبی اکرم ﷺ اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو فرمایا: اٹھو! قربانی کرو اور حلق کراؤ' یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ دہرائی' لیکن تمام صحابہ کرام (دل شکستہ ہو کر) خاموش بیٹھے رہے اور کوئی بھی نہ اُٹھا' آپ ﷺ اپنی زوجہ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور لوگوں کے اس برتاؤ کا تذکرہ فرمایا تو حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ اُن سے اس عمل میں تعمیل کو پسند کرتے ہیں؟ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ باہر نکلیں اور کسی سے کوئی بات نہ کریں' خود اپنی قربانی کرلیں اور حلق کروالیں' آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا' جب صحابہ کرام نے آپ کو ایسا کرتے دیکھا تو سب اُٹھے' سب نے قربانیاں کیں اور ایک دوسرے کے بال کاٹنے لگے مگر اس قدر عجلت اور رنج وغم سے بھرے ہوئے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کرڈالیں گے۔

پھر اس کے بعد آپ ﷺ اپنے جملہ صحابہ کے ساتھ مدینۃ المنورہ واپس لوٹ آئے۔

مدینۃ المنورہ لوٹ آنے کے بعد کچھ عورتیں اپنے اپنے دین کو چھوڑتے ہوئے اسلام قبول کرکے آپ ﷺ کی بارگاہ میں مدینۃ المنورہ حاضر ہوئیں' جن میں اُمِ کلثوم بنت عقبہ بھی تھیں' اُس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیاتِ بیّنات نازل فرمائیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (الممتحنہ:۱۰)	اے ایمان والو! جب آ جائیں تمہارے پاس مؤمن عورتیں ہجرت کرکے تو ان کی جانچ پڑتال کرلو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کو پس اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مؤمن ہیں تو انہیں کفار کی طرف مت واپس کرو نہ وہ حلال ہیں کفار کے لیے اور نہ وہ (کفار) حلال ہیں مؤمنات کے لیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان عورتوں کو کفار کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ (صحیح البخاری)

بیعتِ رضوان

صلح حدیبیہ کے معاہدے کی تحریر سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس مسئلہ پر گفتگو کے لیے قریشِ مکہ کے پاس بھیجا' قریش نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کچھ مدت کے لیے اپنے ہاں روک لیا' تو ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہم جب تک قومِ قریش سے پورا پورا بدلہ نہ لے لیں اپنی جگہ سے نہیں پلٹیں گے' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو بیعت کی دعوت دی' یہ بیعت رضوان ایک (ببول) کے درخت کے نیچے ہوئی' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک پر سب صحابہ کرام سے ایک ایک کر کے بیعت لی' سب صحابہ کرام نے اس بات پر بیعت کی کہ وہ کسی صورت میں میدان سے نہیں بھاگیں گے (اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل کا بدلہ لے کر ہی جائیں گے)' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ایک دستِ مبارک پکڑا اور فرمایا: یہ (بیعت) عثمان کی طرف سے ہے۔

یہی وہ بیعت ہے جس کو تاریخِ اسلام میں ''بیعتِ رضوان'' سے جانا جاتا ہے۔

جب بیعت مکمل ہوگئی تو اب خبر یہ پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر غلط تھی۔

اسباق ونصائح

صلح حدیبیہ کی حکمت کے متعلق مختصر وضاحت

قبل اس کے کہ ہم صلح حدیبیہ کی تفصیل میں جائیں اور اس سے حاصل ہونے والے اسباق ونصائح اور احکام کی وضاحت کریں' ہم اس کی حکمت کے متعلق مختصراً بیان کرتے ہیں کہ بے شک یہ صلح' تدبیر الٰہی کا مظہر تھی' جس میں نبوت کا عمل اور اثر اس قدر نمایاں ہوا کہ جس طرح کسی دوسرے عمل میں نمایاں نہ ہوا' اس کی کامیابی وہ راز تھا جس کا تعلق علمِ الٰہی میں پوشیدہ غیب سے تھا' اسی لیے جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ مسلمان اس کے متعلق غور وفکر کر کے گھبرا گئے' اس قسم کے واقعہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اس صلح کا معاملہ اپنے مقدمات' مضمون اور نتائج کے اعتبار سے عقیدۂ اسلامی کے استحکام کی اہم بنیادوں میں سے ہے۔

پہلے ہم اس صلح میں پائی جانے والی عظیم الٰہی حکمتوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس واقعہ کے بعد نمایاں ہو کر سامنے آئیں' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی واضح نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار پائیں' پھر ہم اس کے بعد اس صلح کے واقعات سے حاصل ہونے والے شرعی احکام کا ذکر کریں گے۔

صلح حدیبیہ میں پائی جانے والی حکمتیں

صلح حدیبیہ فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی' جیسا کہ امام ابن قیم نے کہا کہ جنگ بندی کا یہ معاہدہ فتح مکہ کا باب اور کنجی ثابت ہوئی' اللہ عزوجل کی یہ عادتِ کریمہ ہے کہ وہ مستقبل میں جن اُمور کا ارادہ فرمالیتا ہے ان کی حقانیت کو واضح کرنے کے لیے ابتداء میں کچھ ایسے واقعات سرزد ہوتے ہیں جو مستقبل میں ہونے والے اُمور پر بیّن دلیل ہوتے ہیں۔

اگرچہ صلح حدیبیہ کے وقت اس کی شرائط کے پیش نظر مسلمانوں کو اس کی حقیقت پر اطلاع نہ ہوئی کیونکہ مستقبل اُن سے غائب تھا' پھر جو صورتِ حال درپیش تھی' اس کا تعلق وہ اُس غیب سے کیوں کر سمجھ سکتے تھے' جس کا ابھی انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا' لیکن تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ مسلمانوں پر اس صلح کی افادیت آشکارا ہونے لگی اور اس میں پوشیدہ خیر اور بہتری کے پہلو عیاں ہوئے (اس صلح کی رُو سے جب فریقین کے درمیان دس سالہ جنگ بندی کا معاہدہ ہو گیا) تو مسلمان اور مشرکین سمیت سب لوگ آپس میں امن و سلامتی محسوس کرنے لگے۔ اس طرح مسلمان اور کفار کا آپس میں میل جول شروع ہوا اور مسلمانوں نے کفار کو دین کی دعوت دینا شروع کی' ان کو قرآن کی آیاتِ بیّنات سناتے' جس سے کفار بے حد متاثر ہوتے اور وہ مزید مسلمانوں کے قریب ہوتے' مسلمانوں نے اُن سے علی الاعلان بغیر کسی ڈر اور خوف کے اسلام کے بارے میں بحث و مباحثہ کیا' اس طرح بے شمار کفار مسلمان ہوئے اور ایسے بے شمار لوگ بھی ظاہر ہوئے' جو پوشیدہ طور پر اسلام قبول کر چکے تھے لیکن اظہار نہیں کیا تھا' اب وہ بھی اسلام کا علی الاعلان پرچار کرنے لگے۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق سے روایت کیا ہے کہ اسلام میں صلح حدیبیہ جیسی فتح سے قبل کوئی بڑی فتح نہ تھی' پہلے تو مسلمانوں اور غیر مسلم لوگوں کے درمیان گتھم گتھا جنگ ہوتی تھی لیکن جب صلح کا معاہدہ ہو گیا اور جنگ بندی ہو گئی تو سب لوگ ایک دوسرے سے پرامن ہو

گئے' اس طرح ایک دوسرے سے میل ملاپ ہوا' بات چیت شروع ہوئی اور جس غیر مسلم نے بھی اسلام کی حقانیت کو سمجھا' وہ اسلام میں داخل ہو گیا' ان دو سالوں میں اتنے لوگ مسلمان ہوئے جتنے اس سے قبل مسلمان ہوئے یا اس سے بھی زیادہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

اسی لیے قرآن پاک نے اس صلح کو بیان کرتے ہوئے ''فتح'' کا لفظ استعمال کیا' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَالَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۝ (الفتح: ۲۷)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ کہ تم ضرور داخل ہو گے مسجدِ حرام میں جب اللہ نے چاہا امن وامان سے' منڈواتے ہوئے اپنے سروں کو یا ترشواتے ہوئے' تمہیں (کسی کا) خوف نہ ہو گا' پس وہ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے تو اس نے عطا فرمادی (تمہیں) اس سے پہلے ایسی فتح جو قریب ہے۝

صلح حدیبیہ کی مزید واضح حکمتیں

اس صلح کی ایک عظیم حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس صلح کے ذریعہ سے وحیِ نبوت اور انسانی فکری تدبیر کے درمیان فرق واضح ہو' ایک نبی مُرسل کی قوتِ فیصلہ اور ایک عبقری مفکر کی قوتِ فیصلہ میں فرق ظاہر ہو' تاکہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ جو چیز دنیوی اسباب ومظاہر سے ماوراء' الہامِ الٰہی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے' اس میں واضح فرق ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو ہر سوجھ بوجھ رکھنے والے اور عقل سے کام لینے والے کی بصیرت کے سامنے اپنی مدد ونصرت سے نوازے' شاید مندرجہ ذیل آیت کی یہی تفسیر ہے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۝ (الفتح: ۳)

اور تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی ایسی مدد فرمائے جو زبردست ہے۝

یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو ایک ایسی انوکھی' ان ہونی فتح و نصرت عطا فرمائے گا' جس کی شان یہ ہوگی کہ وہ مدہوش افکار کو بیدار کر دے گی اور غافل عقلوں کو جھنجوڑ دے گی۔

صلح حدیبیہ کی شرائط پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس میں مشرکین کو کافی سہولت دی اور ان کے حق میں کافی نرم شرائط قبول فرمائیں جو مسلمانوں کے حق میں بہت سخت تھیں (ایسی سخت شرائط صحابہ کرام کو قابلِ قبول نہ تھیں لیکن پھر بھی آپ ﷺ نے معاہدہ کر لیا' اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ نبی مرسل تھے جن پر الہام کے ذریعے سب چیزیں عیاں تھیں' باقی صحابہ محض بشری عقل و فکر کی بناء پر ان کو سمجھنے سے قاصر تھے) یہی وجہ تھی کہ آپ نے دیکھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کس حد تک گھٹن اور پریشانی کا مظاہرہ کیا' لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد ان کو اپنی اس جلد بازی کا احساس ہوا تو امام احمد کی روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس روز میں نے حضور ﷺ سے جو سخت لہجے میں گفتگو کی' اس خوف سے میں لگاتار روزے رکھتا رہا' نمازیں پڑھتا رہا' صدقہ دیتا رہا اور غلام آزاد کرتا رہا (یہاں تک کہ مجھے اپنے بارے میں خیر کی امید ہو گئی)۔

اسی طرح آپ نے دیکھا کہ جب آپ ﷺ نے معاہدۂ صلح کے بعد قربانی کرنے اور بال منڈوانے کا حکم دیا تو سب کے سب بیٹھے رہے' ان میں سے کوئی نہ اٹھا حتیٰ کہ آپ ﷺ نے یہ حکم تین مرتبہ دہرایا۔

اس میں راز یہی ہے کہ جملہ صحابہ کرام عام بشری سوجھ بوجھ کے مطابق سوچ رہے تھے اور عقلِ بشری جو صرف محسوسات کی خبر تک رسائی حاصل کر سکتی ہے' وہ اسی نہج پر اس سب معاملے کو بالکل ظاہری کیفیت میں ہی دیکھ رہے تھے جب کہ نبی اکرم ﷺ بشری اخبار و اسباب سے کئی درجے بالاتر ہو کر ایک نبی مرسل کی حیثیت سے اس معاملہ کے دور رس پہلوؤں کو دیکھ رہے تھے' کیونکہ نبی اور رسول کو الہام اور وحی کے ذریعے ہر چیز کی حقیقت پر مطلع کیا جاتا ہے اور آپ کے پیش نظر حکم خداوندی کا نفاذ ہی رہتا تھا' اس بات کی مزید وضاحت آپ ﷺ کی اس بات سے ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق کے متعجب اور ناپسندیدہ سوالات کے جواب کے طور پر ارشاد فرمائی' آپ ﷺ نے فرمایا:

انی رسول اللّٰہ ولست اعصیہ — بے شک میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں

وھو ناصری. اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہ میرا مددگار ہے۔

اسی طرح نبی ﷺ کے علوم اور آپ کی بصیرت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجا تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان کو ایک وصیت کی' فرمایا: وہاں مکہ میں موجود جو مؤمن مسلمین اور مسلمات بے کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں' ان کے پاس بھی جائیں اور انہیں یہ خوش خبری سنائیں کہ مکہ فتح ہونے والا ہے اور یہاں پر اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب فرمائے گا حتیٰ کہ یہاں پر کوئی بھی اپنے ایمان کو مشرکین کے ڈر سے نہیں چھپائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی نبوی بصیرت کے مطابق صلح حدیبیہ میں جو موقف اختیار فرمایا' عام مؤمنین کی سمجھ اور فہم میں بتقاضائے بشریت یہ بات نہیں آرہی تھی جس وجہ سے وہ کچھ ملال محسوس کر رہے تھے لیکن جلد ہی ان کی ذہنی کوفت' غم و غصہ اور ملال جاتا رہا' جب رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الفتح کی آیات ان کو سنائیں' یہ آیاتِ بیّنات صلح حدیبیہ سے فراغت کے بعد جلد ہی نازل ہوئیں' صحابہ کرام پر ہر مبہم بات واضح ہوگئی اور معاہدے کی جن شرائط کے متعلق ان کو تحفظات تھے' اب ان کو فتح و نصرت پر پورا یقین آ گیا' اور صحابہ کرام پر واضح ہوگیا کہ مشرکین صلح کی جن شرائط کی وجہ سے اپنی مضبوطی اور عزت سمجھتے تھے' وہ ذلیل و رسوا ہوں گے اور اپنی قدرت اور غلبے کو جتنا وہ ظاہر کر رہے تھے' اتنے ہی وہ مغلوب و مقہور ہوں گے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کے رسول اور مؤمنین کو فتحِ عظیم حاصل ہوگی' اس طرح عقل و فکر کی کسی تجویز کے بغیر اللہ کے رسول اور اہل ایمان عظیم فتح سے کامیاب ہوئے۔

کیا عقیدہ کے دلائل میں حضور ﷺ کی نبوت و رسالت اور آپ کے علوم و معارف پر اس سے بڑی اور واضح کوئی دلیل ہو سکتی ہے؟

اسی طرح مسلمانوں کو سخت تردّد اُس وقت ہوا جب حضور ﷺ نے سہیل بن عمرو (مشرکین کے نمائندے) کی لکھوائی ہوئی اس شرط پر موافقت کا اظہار فرمایا' اُس نے یہ شرط لکھوائی کہ قریش میں سے کوئی شخص جو اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینۃ المنورہ میں محمد (ﷺ) کے پاس جائے گا' اس کو واپس قریش کے حوالے کیا جائے گا لیکن اگر کوئی شخص محمد

(ﷺ) کی طرف سے قریش کے پاس آئے گا تو اس کو ہرگز واپس نہ کیا جائے گا۔

مسلمانوں کے غم وغصہ اور تنگی میں اُس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب اُسی وقت اس معاہدے کی تحریر سے قبل ہی سہیل بن عمرو کے مسلمان بیٹے حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ مشرکین کی قید سے بھاگ کر بیڑیاں پہنے ہوئے گرتے پڑتے وہاں پہنچ آئے' سہیل نے آپ کا دامن پکڑا اور کہنے لگا: اے محمد (ﷺ)! میرے اور آپ کے درمیان اس کے آنے سے قبل معاہدہ طے پا چکا ہے (لہٰذا ابوجندل کو میرے حوالے کر دیں)' آپ ﷺ نے فرمایا: ''صدقت'' تم نے سچ کہا' اس پر سہیل بن عمرو اپنے اس بیٹے کو پکڑ کر کھینچنے لگا اور مارتے پیٹتے ہوئے واپس لے جانے لگا تا کہ اس کو قریش کے حوالے کر دیا جائے' حضرت ابوجندل بلند آواز سے چلّا کر کہنے لگے: اے گروہِ مسلمین! کیا مجھے مشرکین کے حوالے کیا جا رہا ہے تا کہ وہ میرے دین کی وجہ سے مجھے ستائیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابوجندل! صبر کرو اور بھروسا رکھو! اللہ تعالیٰ تیرے اور دوسرے ضعیف مسلمانوں کے لیے کشادگی کی کوئی راہ پیدا فرمائے گا' ہم نے اپنے اور قوم کے درمیان صلح کا معاہدہ کر لیا ہے (ہم اپنا قول انہیں دے چکے ہیں) ہم اُن سے وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔ سب صحابہ کرام اس منظر کو دیکھتے رہ گئے اور اس سے اُن کو سخت دلی تکلیف بھی ہوئی۔

لیکن بالآخر کیا انجام ہوا؟

جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ میں صلح کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد مدینۃ المنورہ لوٹ آئے تو قریش میں سے ابوبصیر نامی ایک شخص مسلمان ہو کر مدینہ آن پہنچا' اُدھر قریش نے دو آدمیوں کو اس کے پیچھے بھیجا تا کہ اُس کو واپس لائیں' رسول اللہ ﷺ نے ابوبصیر کو بھی معاہدے کے مطابق واپس ان کے حوالے کر دیا' وہ دونوں مشرک جب ابوبصیر کو لے کر مدینہ سے نکلے اور ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو وہاں پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرے' وہاں پر ابوبصیر نے اپنے پہرہ دار ایک مشرک کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تلوار لے کر اس کو قتل کر دیا' جب دوسرے مشرک نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا' پھر ابوبصیر واپس رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹا اور عرض کی: یا نبی اللہ! اللہ کی قسم! آپ کا وعدہ پورا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذمہ پورا کر دیا' آپ نے مجھے میری قوم کے سپرد کر دیا تھ

لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اُن سے نجات عطا فرمائی' پھر حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ وہاں سے نکل پڑے اور سمندر کے کنارے سیف البحر نامی علاقے کی طرف چلے گئے' حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ بھی مکہ سے بھاگ کر حضرت ابوبصیر کے پاس چلے گئے' وہاں پر مکۃ المکرمہ سے بھاگے ہوئے مسلمانوں کی کافی تعداد جمع ہوگئی' جو شخص بھی اسلام قبول کر کے مکہ سے نکلتا وہ مدینۃ المنورہ نہ جاتا بلکہ وہ حضرت ابوبصیر کے پاس چلا جاتا (اس طرح یہ جگہ مکہ سے بھاگے ہوئے مسلمانوں کی پناہ گاہ بن گئی اور تقریباً ستر آدمی جمع ہو گئے) ان لوگوں کو جب بھی پتا چلتا کہ قریش کا کوئی قافلہ اس راستے سے گزر کر ملکِ شام تجارت کے لیے جا رہا ہے تو مسلمانوں کی یہ جماعت مشرکین کے اُس قافلے پر بلہ بول دیتی' ان کو قتل کر کے ان کا مال و اسباب سب لوٹ لیتے' بالآخر مشرکین قریش نے آپ ﷺ کو خدا تعالیٰ اور رشتہ داری کا واسطہ دیتے ہوئے خط لکھا کہ آپ ان لوگوں کو قبول کر لیں اور ان کو اپنے اصحاب میں شامل کر لیں۔ (رسول اللہ ﷺ نے انہیں پناہ دے دی) اس طرح وہ مدینہ طیبہ آ گئے۔

(البخاری)

جب فتح مکہ ہوئی تو حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ نے ہی اپنے باپ کے لیے امان طلب کی' اور پھر جنگِ یمامہ میں آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی۔

(دیکھیے: الاصابہ ج ۴ ص ۲۴)

اس طرح صحابہ کرام کا غم و غصہ جب دور ہوا اور یہ ساری باتیں دیکھ کر اُن کے ایمان میں اضافہ ہوا اور حکمتِ الٰہیہ اور نبوتِ محمد ﷺ پر ایمان مزید پختہ ہوا۔ صحیح روایت میں ہے کہ حضرت سہیل بن سعید رضی اللہ عنہ نے جنگِ صفین کے موقع پر فرمایا: اے لوگو! اپنی رائے کو غلط قرار دو' یوم ابی جندل (صلح حدیبیہ) کے موقع پر میں بھی اپنی رائے کو صحیح سمجھ رہا تھا' اس وقت اگر میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو رد کرنے کی طاقت رکھتا ہوتا تو ضرور رد کرتا۔

ہم ایک مرتبہ پھر دہراتے ہیں اور کہتے ہیں: کیا عقیدہ کے دلائل میں حضور ﷺ کی نبوت و رسالت اور آپ کے علوم و معارف پر اس سے بڑی اور واضح کوئی دلیل ہو سکتی ہے؟

صلح حدیبیہ کی مزید ایک حکمتِ جلیلہ

بے شک اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار اس طرح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ تھا کہ وہ

اپنے نبی ﷺ کے لیے فتح مکہ کو جنگ اور قتال کی بجائے رحمت و سلامتی کی فتح بنا دے۔ یہ ایسی فتح ہو کہ لوگ تیزی سے دینِ اسلام میں فوج در فوج داخل ہوں' اور مسلمانوں میں جن لوگوں نے آپ کو اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائی تھیں' وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں' آپ کے سامنے صلح کی پیش کش کریں' عاجزی و انکساری کا مظاہرہ کریں' آپ پر ایمان لائیں' اللہ کی طرف رجوع کریں اور توحید کو قبول کریں' اسی لیے صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کی تمہید بنایا تا کہ قریش اپنی خوابِ غفلت سے بیدار ہوں' اپنے ضمیر کا محاسبہ کریں اور اصحابِ رسول کے ساتھ اس صلح اور اس کے مقدمات و نتائج سے عبرت حاصل کریں تا کہ لوگوں کے ذہن خوب سوچ سمجھ لیں اور حق کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

اور پھر ایسا ہی ہوا جس کی تفصیل ان شاء اللہ عنقریب آئے گی۔

صلح حدیبیہ سے متعلق احکام

اس سے قبل صلح حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق جو الٰہی حکمتیں تھیں' ان کا ذکر ہوا' اب ہم صلح حدیبیہ سے حاصل ہونے والے دروس و احکام جو اگر چہ بہت زیادہ ہیں لیکن ان کو مختصراً بیان کرتے ہیں:

پہلا: جنگ کے علاوہ دوسرے اُمور میں غیر مسلموں سے مدد حاصل کرنا

ہم نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ نے بشر بن سفیان کو قریش کی خبریں لانے کے لیے جاسوس بنا کر بھیجا' حالانکہ بشر بن سفیان مشرک تھا اور اس کا تعلق قبیلہ خزاعہ سے تھا۔

اس سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ غیر مسلم سے مدد حاصل کرنے کے معاملے کا جہاں تک تعلق ہے' اس میں اُس غیر مسلم کی حالت اور ذہنی رجحان کو پیشِ نظر رکھا جائے گا' جس سے مدد حاصل کی جا رہی ہے۔ اگر وہ غیر مسلم ایسا ہے جس پر اطمینان و اعتماد کیا جا سکتا ہے' اور اُس سے کسی غداری اور دھوکے کا خطرہ نہیں تو پھر اُس سے مدد لینا جائز ہے ورنہ نہیں' بہر حال رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے علاوہ دیگر کئی اُمور میں غیر مسلموں سے مدد لی' مثلاً دشمن کی نقل و حرکت جاننے کے لیے جاسوس بنا کر بھیجنا یا اُن سے اسلحہ ادھار لینا وغیرہ' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلموں سے جنگ و جدل کے معاملات میں مدد لی جا سکتی ہے تو دیگر معاملات میں ان سے مدد حاصل کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہے۔

دوسرا: اسلام میں شوریٰ کا معمول

جیسا کہ ہم نے دیکھا رسول اللہ ﷺ کا عام معاملات میں باہم مشورہ کرنا جس سے شوریٰ کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے اور حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان آراء کو اپنے فیصلے میں شامل کرے' حضور ﷺ کا اُن مشوروں اور آراء پر عمل کرنا یا نہ کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شوریٰ کی نوعیت اور اس کا اصل مقصد کیا ہے جس کے لیے یہ مشروع کی گئی ہے' شریعتِ اسلامیہ میں شوریٰ مشروع ہے لازم نہیں۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کی آراء اور مشوروں کو حاصل کیا جائے' اور کسی معاملہ میں پائی جانے والی مصلحت پر بحث کی جائے' جس کے بارے بعض کو تو علم ہوتا ہے لیکن بعض کو پتا نہیں ہوتا' یا یہ کہ سب کی آراء لے کر ان کے دلوں کو تسلی دینا مقصود ہوتا ہے' اور جب حاکم اُن لوگوں کی آراء اور مشوروں میں کوئی ایسی چیز پائے جو شریعتِ اسلامیہ کے دلائل اور احکام کی روشنی میں معقول ہو تو اُس رائے کو قبول کر لیا جائے' ورنہ اس کو اختیار ہے کہ اس کے علاوہ جس رائے پر چاہے عمل کرے' بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کی کسی نص یا مسلمانوں کے اجماع کے خلاف نہ ہو۔

ہم نے اس واقعہ میں پایا کہ نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ میں اپنے صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا کہ یارسول اللہ ﷺ! بے شک آپ بیت اللہ کی زیارت کے لیے نکلے ہیں' لہٰذا اس کی طرف ہی چلتے جائیں' جس نے بھی ہمارا راستہ روکا ہم اُس سے جنگ کریں گے۔

ابتداء میں آپ ﷺ نے اس رائے پر اتفاق کرتے ہوئے اپنے صحابہ کے ساتھ مکہ کی طرف سفر جاری رکھا حتیٰ کہ ایک مقام پر پہنچ کر آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی' آپ کو معلوم ہوا کہ غیب سے اس کو روک دیا گیا ہے' اب آپ ﷺ نے اُس رائے کو ترک کر دیا جس کا مشورہ آپ کو دیا گیا تھا' اور یہ کہتے ہوئے اعلان فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! آج قریش مجھ سے جس بات کا بھی مطالبہ کریں گے جس میں اللہ کی حرمات کی تعظیم ہو گی تو میں اسے ضرور منظور کر لوں گا۔

آپ ﷺ نے اس اعلان کے ساتھ ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اُس

رائے پر عمل ترک کر دیا اور صلح کی طرف میلان کا اظہار فرمایا اور مشرکین کی ہر قسم کی شروط سے موافقت کا عندیہ دیا۔ آپ ﷺ نے اس بارے میں نہ کسی سے مشورہ طلب فرمایا اور نہ ہی معاہدے کی اُن شقوں کے متعلق لوگوں کی پسند و ناپسند اور ناگواری کی پرواہ کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شوریٰ کا حکم ان معاملات سے متعلق ہے جو وحی الٰہی کے منقطع ہو جانے کے بعد درپیش ہوں۔

اس لیے فی زمانہ کتاب و سنت اور اجماع ائمہ سے ہی قانون سازی ہوتی ہے اور یہی اس کے قائم مقام ہے، اس لیے اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مشاورت اور شوریٰ کا قیام احکام پر غور و فکر کے لیے اور رائے دینے کی حد تک ہے، ہر مشورہ اور رائے کا لازم قیام ضروری نہیں، حالات کے پیش نظر فیصلہ ممکن ہے۔

تیسرا: نبی اکرم ﷺ کے آثار و تبرکات سے توسّل اور برکت کا حصول

ہم نے بیان کیا کہ عروہ بن مسعود (نمائندۂ قریش) نے صحابہ کرام کے حرکات و سکنات کو دقتِ نظری سے دیکھنے کے بعد قریش کو واپس جا کر کہا: خدا کی قسم! محمد (ﷺ) جب (لعابِ دہن) تھوک پھینکتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی صحابی کی ہتھیلی پر پڑتا ہے، جس کو فرطِ عقیدت سے وہ اپنے چہرے اور جسم پر مَل لیتا ہے، اور جب وہ کسی کام کا انہیں حکم دیتے ہیں تو وہ سب کے سب اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو ان کے اصحاب ان کے وضو کے دھوون کو لینے کے لیے اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ ان کے درمیان لڑائی کا گمان ہونے لگتا ہے اور جب وہ کوئی گفتگو کرتے ہیں تو سب اصحاب خاموش ہو جاتے ہیں اور کوئی شخص اُن کی طرف تعظیماً نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔

عروہ بن مسعود نے جو منظر کشی کی ہے یہ ایسی زندہ و پائندہ تصویر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو رسول اللہ ﷺ سے کتنی گہری محبت تھی، ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سے حاصل ہونے والے اہم نتائج سے واقف ہو۔ پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ والہانہ محبت کے بغیر ایمان کا کوئی اعتبار نہیں اور نہ ہی ایمان مکمل ہوتا ہے، اور محبت محض معنوی اور عقلی بات نہیں، محبت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر دل پر منقش ہو جاتا ہے، تو پھر ایک محبت کرنے والا اپنے محبوب کی ہر چیز کو دل و جان سے قبول

کرتا ہے اور ہر وقت اس کے قرب کے لیے کوشاں رہتا ہے' جیسے کہ عروہ بن مسعود نے اس کی عملی تصویر صحابہ کرام کے عمل کی منظر کشی کر کے بیان کی۔

دوسرے نمبر پر یہ واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آثار اور آپ ﷺ سے متعلقہ چیزوں سے برکت حاصل کرنا جائز اور مشروع امر ہے۔ بے شمار صحیح احادیثِ طیبات سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام نے آپ ﷺ کے موئے مبارک' پسینہ' وضو کے پانی' لعابِ دہن اور اُس پانی کے پیالے کو تبرک کے طور پر استعمال کیا جس میں آپ ﷺ نے پانی پیا۔ ان میں سے بعض احادیثِ طیبات کی تفصیل ہم نے گزشتہ صفحات میں ذکر کی ہے۔

جب آپ نے جان لیا کہ کسی چیز کو تبرک سمجھنے اور اُس سے برکت حاصل کرنے سے مراد اُس چیز کے وسیلہ اور واسطے سے خیر طلب کرنا ہوتا ہے اور یہ بھی جان لیا کہ رسول اللہ ﷺ سے متعلقہ اشیاء کو وسیلہ بنانا جائز اور مستحب عمل ہے تو پھر آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات کو وسیلہ بنانا اور آپ ﷺ کی ذات کے توسل سے اللہ سے مانگنا اور طلب کرنا بدرجۂ اتم جائز اور بہترین عمل ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات اور آپ ﷺ کی باقیات سے تبرک اور توسل آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں حاصل کیا جائے یا آپ ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد حاصل کیا جائے' تبرک و توسل کے لیے ظاہری حیات کی مطلقاً کوئی قید نہیں' چاہے تبرک اور توسل آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کیا جائے یا آپ ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد کیا جائے' دونوں برابر ہیں' جیسا کہ یہ بات صحیح بخاری' باب شیب رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔

ان روشن اور بیّن دلائلِ صحیحہ کے باوجود بعض لوگ گمراہ ہو گئے' جن کے دلوں سے محبتِ رسول کی شمع بجھ گئی اور وہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات کا وسیلہ اختیار کرنے سے انکار کرنے لگے۔

اور دلیل یہ دینے لگے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی تاثیر یعنی اثر پذیر ہونے کی قوت ختم ہو گئی ہے' اس لیے آپ ﷺ کی ذات سے وسیلہ پکڑنے کا

مطلب ایسے ہی ہے جیسے اس چیز سے وسیلہ پکڑنا جس کی کوئی تاثیر ہی نہ ہو۔ (العیاذ باللہ) یہ دلیل ان کی عجیب جہالت پر دلالت کرتی ہے۔

یہ بات تو تب کی جائے کہ جب کوئی شخص یہ ثابت کر رہا ہو کہ کیا آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ ﷺ سے متعلقہ اشیاء میں کوئی ذاتی تاثیر تھی جو وفات کے بعد منقطع ہو گئی؟ لیکن ایسی بات ہرگز نہیں! کوئی بھی مسلمان اشیاء میں ذاتی تاثیر کی نسبت اللہ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی دوسری طرف نہیں کر سکتا' جو شخص اس کے برعکس عقیدہ رکھتا ہے' اس کے کفر پر تمام اہل اسلام کا اجماع ہے۔

آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات اور آپ ﷺ کے آثار و باقیات سے تبرک اور توسل سے یہ مراد نہیں کہ ان کی طرف کوئی ذاتی تاثیر منسوب کرنا ہے بلکہ اس کی اصل علت اور وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں علی الاطلاق تمام مخلوقات سے افضل و اعلیٰ ہیں اور آپ ﷺ بندوں کی طرف اللہ تعالیٰ کی رحمت بن کر تشریف لائے ہیں' اس لیے آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات اور آپ ﷺ سے متعلقہ اشیاء کو وسیلہ اور واسطہ بنا کر رب تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے' کیونکہ آپ ﷺ مخلوق کے لیے رب تعالیٰ کی رحمتِ کبریٰ ہیں۔

جیسے کہ ایک نابینا صحابی نے آپ ﷺ کی ذاتِ برکات کے وسیلہ اور توسط سے جب رب تعالیٰ کی بارگاہ میں بینائی کے حصول کے لیے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اُس نابینا کی بینائی لوٹا دی[1]

---

[1] یہ صحیح حدیث ہے جس کو ترمذی' نسائی اور بیہقی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک نابینا شخص آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا' اس وقت صحابہ کی ایک جماعت آپ ﷺ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی' اُس نابینا شخص نے اپنی بینائی کے کھو جانے کی شکایت کی' آپ ﷺ نے اس کو صبر کی تلقین فرمائی' وہ عرض گزار ہوا کہ راہنمائی کے لیے میرے ساتھ کوئی شخص نہیں جس وجہ سے مجھے ہر کام میں بینائی نہ ہونے کی وجہ سے مشقت اٹھانا پڑتی ہے' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وضو کی جگہ پر جاؤ' وضو کرو اور دو رکعات نماز پڑھو' پھر یہ دعا کرو: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسی معنی کی بنیاد پر صحابہ کرام بغیر کسی انکار کے آپ ﷺ کی ذات بابرکات اور آپ ﷺ کی باقیات کے وسیلہ اور واسطہ کو اختیار کرتے تھے' اور آپ ﷺ انہیں ایسا کرنے سے نہیں روکتے تھے' گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اہل تقویٰ اور اہل اللہ کے وسیلہ سے شفا طلب کرنا اور اہلِ بیتِ نبی کے وسیلہ سے بارش طلب کرنے کے عمل کو پسندیدہ اور مستحب قرار دیا گیا ہے۔

اس پر جمہور ائمہ وفقہاء کا اجماع ہے' جن میں امام شوکانی' ابن قدامہ حنبلی اور صنعانی وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ان سب دلائل وشواہد کے بعد یہ فرق ڈالنا کہ توسل کا تعلق آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ تھا وفات کے بعد نہیں' یہ بدنیتی پر مبنی ایسا عجیب وغریب خلطِ مبحث ہے' جس کی کوئی گنجائش نہیں۔

چوتھا: کسی بیٹھے ہوئے انسان کے پاس دوسرے انسان کے کھڑا رہنے کا حکم

جیسا کہ پیچھے صلح حدیبیہ کے واقعہ میں گزر چکا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اپنے ہاتھ میں تلوار لیے آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے تھے' اور عروہ بن مسعود (نمائندۂ قریش)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اللھم انی اتوجه بنبیك محمد نبی الرحمة' یا محمد انی توجهت بك الی ربی فی حاجتی لتقضی لی اللھم شفعه فی۔

اے اللہ! میں تیری طرف تیرے نبی حضرت محمد ﷺ نبی الرحمۃ کے وسیلہ سے متوجہ ہوتا ہوں' اے محمد ﷺ! میں آپ کے ذریعہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی اس حاجت کو پیش کرتا ہوں کہ میری حاجت پوری ہو' اے اللہ! میرے لیے آپ ﷺ کی سفارش قبول فرمالے۔

بعض روایات میں اضافہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو فرمایا: تمہیں کوئی بھی حاجت ہو تو اسی طرح دعا مانگا کرو۔

حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ہماری مجلس ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ شخص بینائی کی نعمت لے کر واپس لوٹا۔

بات کرتے کرتے جب اپنا ہاتھ آپ ﷺ کی ریش مبارک کی طرف بڑھاتا تو حضرت مغیرہ اپنی تلوار کا دستہ اس کے ہاتھ پر مارتے ہوئے کہتے: (رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور سے) اپنا ہاتھ دُور رکھو!

اس کے برعکس غزوۂ بنو قریظہ کے واقعات میں گزر چکا ہے کہ بیٹھے ہوئے شخص کے پاس کسی شخص کا کھڑے رہنا جائز نہیں کیونکہ یہ تعظیم کا ایسا طریقہ ہے جو عجمیوں کے ہاں معروف ہے اور اسلام نے اس کو ناپسند قرار دیا ہے۔ یہی وہ صورت ہے جس سے رسول اکرم ﷺ نے منع کیا اور روکا' اور فرمایا: جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے مجسمہ بنے کھڑے رہیں وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ میں اس کی خلاف ورزی کیوں کی گئی؟

جواب: صلح حدیبیہ والا واقعہ منع کے عموم سے مستثنیٰ ہے لیکن خاص حالت میں ایسا جائز ہے' یعنی ایسی حالت کہ جب مسلمان امام کے پاس دشمن کے نمائندے آئیں تو ایسی صورتِ حال میں کسی سپاہی یا فوجی کا حفاظت کی غرض سے امام اور قائد کے پاس کھڑا ہونے میں کوئی حرج نہیں' اس کا مقصد اسلام کی عزت وعظمت کا اظہار' امام کی تعظیم اور کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیشِ نظر حفاظت کی غرض سے کھڑا ہونا ہے۔ (زاد المعاد لابن القیم ج ۲ ص ۱۱۴)

لیکن عام حالات میں بغیر کسی ضرورت شرعی کے یہ چیز توحید اور عقیدۂ اسلامیہ کے تقاضے کے مخالف ہونے کے باعث جائز نہیں۔

اسی کے مشابہ ایک اور واقعہ ہے جو غزوۂ اُحد میں حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا گیا' وہاں ہم نے کہا کہ چلنے کے دوران ایسی چال ڈھال جو تکبر اور غرور پر دلالت کرتی ہو' شرعاً ممنوع ہے لیکن جنگ کے خاص حالات میں اکڑ کر چلنا جائز ہے' اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ کی دی ہوئی تلوار لے کر جنگِ اُحد کے دوران دشمن کے سامنے جب حضرت ابو دجانہ اکڑ کر چلے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسے اکڑ کر چلنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے سوائے اس موقع کے۔

پانچواں: مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان صلح کی مشروعیت

علماء اور ائمہ نے صلح حدیبیہ والے واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے مسلمانوں اور ان

کے دشمنوں کے درمیان مدتِ معلوم تک جنگ بندی کے معاہدے کو جائز قرار دیا ہے' چاہے یہ معاہدہ دشمن سے مال و دولت یا کسی اور چیز کے عوض کیا جائے یا بغیر عوض کے کیا جائے' جیسے کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ بغیر کسی عوض کے کیا گیا' لیکن اگر یہ معاہدہ کسی چیز کے عوض کیا جائے تو یہ بھی جائز ہے' اس لیے کہ جب ان کے ساتھ بلا عوض صلح جائز ہے تو عوض کے ساتھ بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگی' لیکن اگر کوئی بھی معاہدہ یا مصالحت اس شرط پر کی جائے کہ جس میں مسلمانوں پر شرط لگائی جائے کہ وہ غیر مسلموں کو کچھ مال دیں تو یہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک جائز نہیں' کیونکہ اس میں ذلت اور مسلمانوں کا نقصان ہے' اور اس لیے بھی کہ کتاب و سنت سے اس کا جواز ثابت نہیں۔

ائمہ کا اس ضمن میں کہنا یہ ہے کہ اگر ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جس میں کوئی چارۂ کار نہ ہو' وہ یہ کہ مسلمانوں کو ہلاکت یا قید کیے جانے کا خوف ہو تو اس صورت میں مال دے کر جنگ بندی کا معاہدہ کرنا صحیح ہے' جیسا کہ مسلمان قیدی کے لیے جائز ہے کہ وہ مال کے بدلے اپنے آپ کو آزاد کروا لے۔

چھٹا: صلح کے لیے مدت کا تعین

امام شافعی' امام احمد اور دیگر کئی ائمہ کرام کا یہ مؤقف ہے کہ جنگ بندی یا صلح کا معاہدہ مخصوص مدتِ معلوم تک ہونا چاہیے' اور یہ کہ یہ مدتِ معاہدہ دس سال سے زائد نہیں ہونی چاہیے' کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے قریش کے ساتھ حدیبیہ کے موقع پر دس سال کا ہی معاہدہ کیا تھا۔

ساتواں: صلح کی شرائط

جنگ کے معاہدے کی شروط اور شقوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے: صحیح' باطل۔

(۱) صحیح: صحیح شرائط میں ان شرائط کو شمار کیا جاتا ہے جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی کسی نص کے خلاف نہ ہوں' مثال کے طور پر یہ شرط رکھی جائے کہ معاہدے کی صورت میں کفار کچھ مال دیں گے یا حاجت کے وقت مسلمانوں کی معاونت کریں گے' یہ شرائط صحیح ہیں' اسی طرح یہ شرط رکھنا کہ کفار کی طرف سے جو مسلمان ہو کر آئے معاہدے کی معینہ مدت کے دوران نہ اس کو قبول کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو پناہ دی جائے گی' ائمہ کرام نے اس آخری

شرط کو مطلقاً صحیح قرار دیا ہے سوائے امام شافعی کے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس شخص کو صرف اُسی صورت میں واپس کیا جا سکتا ہے جب کفار کے درمیان اس نومسلم کے کچھ ایسے رشتہ دار ہوں جو اس کی حفاظت کر سکیں (بصورتِ دیگر مسلمان ہو کر آنے والے کو واپس نہیں کیا جائے گا) انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کے لیے اس شرط کو اسی لیے منظور فرمایا تھا جب کہ اسلام قبول کرنے والوں کے رشتہ دار مکہ میں موجود تھے۔

(۲) باطل: باطل شرائط میں ہر وہ شرط ہے جو کسی ثابت شدہ حکمِ شرعی کے مخالف ہو، مثلاً دشمن کی طرف سے آنے والی مسلمان عورتوں یا ان کے حق مہر واپس کفار کی طرف لوٹانے کی شرط، یا مسلمانوں کا اسلحہ اور مال کفار کو دینے کی شرط، یہ سب باطل شرائط ہیں، اس کے بطلان کا استدلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ عمل ہے کہ صلح حدیبیہ کے معاہدے کی مدت کے دوران جب کچھ عورتیں مسلمان ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں مدینۃ المنورہ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو واپس لوٹانے سے انکار کر دیا اور قرآنِ پاک نے بھی صراحۃً اس سے منع کیا، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں جو معاہدہ کیا تھا، اس میں یہ شرط تھی کہ اگر کوئی شخص مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ آئے گا تو اس کو واپس مکہ والوں کے حوالے کیا جائے گا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن مسلمان عورتوں کو کیوں روک لیا جو مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئی تھیں، کیا یہ معاہدے کی خلاف ورزی نہ تھی؟

جواب: اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے معاہدے میں صرف مردوں کا ذکر تھا، عورتوں کا اس میں ذکر نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کا احتمال تھا کہ اُس معاہدے کا اطلاق صرف مردوں پر ہی ہو، اس کے علاوہ ایک اور حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جتنے بھی تصرفات تھے ان کے متعلق جب تک قرآن کی تصدیق و تائید یا تردید نازل نہ ہو جاتی وہ حکم شرعی قرار نہ پاتا، اسی طرح بعض اوقات قرآن پاک خاموشی اور سکوت اختیار کرتا ہے، یہ بھی تصدیق کی علامت ہے، صلح حدیبیہ کی جملہ شقوں کی قرآن پاک نے تصدیق کی لیکن عورتوں کو واپس کفار کی طرف بھیجنے والے معاملہ میں قرآن پاک نے سخت تردید کی (جس وجہ سے مکہ سے مسلمان

ہو کر بھاگنے والی عورتوں کو آپ ﷺ نے قبول فرمایا اور واپس کفار کے حوالے نہ کیا)۔

آٹھواں: حج یا عمرہ سے روکے جانے کا حکم

حضور ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ کی طرف جا رہے تھے کہ ان کو حدیبیہ کے مقام سے آگے نہ جانے دیا گیا تو آپ ﷺ نے صلح کے معاہدے کے بعد احرام کھول دیا' قربانی کا جانور ذبح کر دیا اور حلق کروا دیا' آپ ﷺ کے اس عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ روکے جانے والے شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ احرام کھول دے' اس کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں اس کو روکا گیا ہے' وہیں وہ اپنی قربانی ذبح کر دے' حلق کروالے اور پھر احرام کھول دے' چاہے حج سے روکا گیا یا عمرہ سے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر نفلی حج یا نفلی عمرہ سے روکا گیا تھا تو اب اس کی قضاء لازمی نہیں۔ احناف نے اس سے اختلاف کیا ہے' احناف کا مؤقف ہے کہ روکے جانے والے نفلی حج یا عمرہ کے بعد اس کی قضاء واجب ہے' اس کی دلیل یہ ہے کہ جتنے بھی صحابہ کرام آپ ﷺ کے ساتھ صلح حدیبیہ والے سال نکلے تھے' یہ سب کے سب صحابہ بعد میں عمرۂ قضاء کے لیے بھی آپ ﷺ کے ساتھ نکلے سوائے اُن کے جو وفات پا گئے یا جو غزوۂ خیبر میں شہید ہو گئے۔

غزوۂ خیبر

صلح حدیبیہ کے بعد نبی اکرم ﷺ نے خیبر کی طرف قصد فرمایا' خیبر کی طرف لشکر کشی ۷ ہجری میں ماہِ محرم کے اواخر میں ہوئی' خیبر ایک بڑا شہر تھا جس میں بڑے بڑے قلعے اور زرعی رقبے پائے جاتے تھے' یہ شہر مدینہ منورہ سے شمال کی سمت ملکِ شام کی طرف سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

اس غزوہ میں آپ ﷺ کے ساتھ سوار اور پیادہ فوج کے چودہ سو جنگ جو شریک تھے' ابن ہشام لکھتے ہیں کہ جب آپ ﷺ خیبر کے قریب پہنچے تو اپنے صحابہ سے فرمایا: ٹھہر جاؤ! پھر دعا فرمائی: اے اللہ! جو آسمانوں کا رب ہے! اور آسمان جن پر سایا فگن ہیں اُن کا بھی رب ہے! اے زمینوں کے رب! اور زمینیں جنہیں اٹھائے ہوئے ہیں ان کے رب! اے شیاطین کے رب! اور ان کے رب جنہیں شیاطین نے گمراہ کر رکھا ہے! اے ہواؤں کے

رب! اور ان کے رب جنہیں ہوائیں اُڑا رہی ہیں! ہم تجھ سے اس شہر کی خیر اور اس کے باسیوں کی خیر اور اس میں جو کچھ ہے اس کی خیر طلب کرتے ہیں' ہم اس کے شر' اس کے رہنے والوں کے شر اور اس میں جو کچھ ہے اس کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔

پھر فرمایا: اللہ کے نام سے آگے بڑھو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ جب کسی قوم پر حملہ کا ارادہ فرماتے تو صبح کے طلوع ہونے سے پہلے حملہ نہ کرتے' اگر آپ اذان کی آواز سنتے تو حملہ کرنے سے رُک جاتے' اور اگر اذان کی آواز سنائی نہ دیتی تو حملہ کر دیتے' اب یہاں پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رات بسر کی (اور صبح کے وقت اذان کی آواز نہ آئی)' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش قدمی فرمائی' آگے بڑھے تو دیکھا کہ خیبر کے کسان اپنی کسیاں' کلہاڑے اور ٹوکریاں لے کر زمینوں پر کام کرنے کے لیے اپنے گھروں سے نکل رہے تھے' جب اُن کسانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو وہ چلاّ کر کہنے لگے: یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کا لشکر ہے' پھر وہ واپس بھاگ کھڑے ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ اکبر! خیبر تباہ و برباد ہو گیا کیونکہ جب ہم کسی قوم کے میدان میں اُترتے ہیں تو ان کافروں کی صبح کتنی بُری ہوتی ہے جنہیں پہلے ہی ڈرایا اور آگاہ کیا جا چکا ہے۔ (متفق علیہ)

ابن سعد کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی فوج کو ہدایات دیں اور فوج کو کئی دستوں میں جھنڈوں تلے تقسیم کر دیا (تاکہ ہر دستہ ہر ایک قلعہ پر یک بارگی حملہ کرے)۔ اب معرکوں کی ابتداء ہوئی' اہلِ خیبر اپنے قلعوں میں مورچہ بند ہو گئے اور قلعہ بند ہو کر لڑنے لگے' مسلمان یکے بعد دیگرے ایک ایک قلعہ فتح کرنے لگے حتیٰ کہ آخری دو قلعے باقی رہ گئے' جن کے نام وطیح اور السلالم تھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں قلعوں کا دس سے زائد دنوں تک محاصرہ کیے رکھا۔

امام احمد' نسائی' ابن حبان اور حاکم نے حضرت بریدہ بن خطیب سے حدیث روایت کی ہے کہ غزوۂ خیبر میں حضرت ابوبکر صدیق کو جھنڈا دیا گیا (آپ رضی اللہ عنہ نے شدید جنگ کی) لیکن فتح نہ ہوئی' آپ لوٹ آئے' دوسرے دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جھنڈا دیا گیا لیکن پھر بھی قلعہ فتح نہ ہوا' تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

کل میں جھنڈا اُس شخص کو دوں گا کہ اللہ تعالیٰ اُس کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائے گا' وہ

اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھنے والا ہے۔ حضرت بریدہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے یہ رات بڑے اضطراب میں گزاری یعنی ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے رہے کہ صبح کس شخص کو یہ شرف حاصل ہوگا' جب صبح ہوئی تو سب صحابہ کرام رسول اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے' ہر صحابی کی یہی خواہش تھی کہ آج پرچم عطا کیے جانے کا شرف اُسے ہی حاصل ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کہاں ہیں؟ عرض کی گئی: یارسول اللہ ﷺ! وہ آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا: انہیں بلائیں' حضرت علی رضی اللہ عنہ جب حاضرِ خدمت ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنا لعابِ دہن حضرت علی کی آنکھوں میں لگایا اور دعا فرمائی' حضرت علی رضی اللہ عنہ اُسی وقت صحت یاب ہو گئے گویا کہ اُن میں کوئی درد تھا ہی نہیں' پھر آپ ﷺ نے پرچم انہیں عطا فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! کیا میں اُن سے اُس وقت تک جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ ہماری طرح مسلمان نہ ہو جائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: آہستہ آہستہ اُن کے میدان میں جاؤ' ان کے سامنے پڑاؤ ڈالو' پھر انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دو' نیز انہیں بتاؤ کہ اُن پر اللہ تعالیٰ کا کون سا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اے علی! اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بدرجہا بہتر ہے' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نکلے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے ہاتھ پر فتح و نصرت فرمائی۔[1]

اُن مفتوحہ قلعوں سے جو بھی مال و اسباب ہاتھ آیا وہ مسلمانوں کو مالِ غنیمت میں حاصل ہوا جب کہ دونوں مذکورہ بالا قلعے بدستور مسلمانوں کے محاصرے میں رہے' ان قلعوں میں جو یہودی محصور تھے' جب ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب ان کو ہلاک کر دیا جائے گا تو انہوں نے صلح کا پیغام بھیجا کہ ہم ضرورت کے مطابق سامان لے کر یہاں سے نکل جاتے ہیں اور باقی اموال یہیں چھوڑ جاتے ہیں' اس شرط پر کہ ہمارے خون معاف کر دیے جائیں۔

آپ ﷺ نے ان شرائط پر اُن سے موافقت کا اظہار فرمایا' پھر انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں خیبر سے نہ نکالا جائے اور زمینیں ہمارے ہی قبضے میں رہنے دی جائیں

---

1. یہ حدیث بخاری و مسلم میں اس طرح مروی ہے' اس کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے: کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا۔۔۔۔۔۔۔الخ

کیونکہ ہم اپنی زمینوں کو بہتر جانتے ہیں اور اچھے طریقے سے ان کو آباد رکھیں گے' ہم یہاں کی پیداوار کا آدھا حصہ آپ کو دیتے رہیں گے' تو آپ ﷺ نے ان شرائط پر بھی اُن سے مصالحت فرمائی' اور ان کو فرمایا: اس شرط پر کہ اگر ہم تمہیں یہاں سے نکالنا چاہیں تو ہم تمہیں نکال دیں گے۔ (متفق علیہ)

ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ جنگ سے مطمئن ہو گئے تو زینب بنت حارثہ نے ایک بھنی ہوئی بکری کا گوشت آپ ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا۔ یہ زینب' سلام بن مشکم کی بیوی تھی۔ زینب نے پوچھ لیا تھا کہ بکری کا کون سا حصہ آپ ﷺ کو پسند ہے؟ اس کو بتایا گیا: دستی! اُس نے دستی میں زیادہ زہر ملایا' پھر پوری بکری کو زہر آلود کر دیا' پھر وہ بھنی ہوئی بکری کا گوشت لے کر آئی' جب اُس نے حضور ﷺ کے سامنے اس کو رکھا تو آپ ﷺ نے دستی اٹھائی اور اس میں سے ایک لقمہ منہ میں ڈالا اور ہلکا سا چبایا لیکن اُسے نہ نگلا' آپ ﷺ کے ساتھ بشر بن البراء رضی اللہ عنہ بھی تھے' انہوں نے بھی اُس سے اسی طرح لقمہ لیا' جس طرح آپ ﷺ نے لقمہ لیا تھا لیکن بشر رضی اللہ عنہ اُس لقمے کو نگل گئے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اُس لقمے کو باہر پھینک دیا' پھر فرمایا: یہ ہڈی مجھے خبر دے رہی ہے کہ یہ زہر آلود ہے' پھر آپ ﷺ نے اُس عورت کو بلایا تو اُس نے اپنے اس جرم کا اعتراف کر لیا' آپ ﷺ نے پوچھا: تم نے یہ کام کیوں کیا؟ وہ کہنے لگی: میری قوم پر جو آفت آن پڑی ہے وہ مخفی نہیں' میں نے سوچا کہ اگر آپ بادشاہ ہیں تو ان سے نجات حاصل ہو جائے گی' اگر نبی ہوئے تو آپ کو خبر دے دی جائے گی' تو رسول اللہ ﷺ نے اُس عورت سے درگزر فرمایا جب کہ حضرت بشر رضی اللہ عنہ اُس لقمے کی وجہ سے شہید ہو گئے۔[1]

امام زہری اور سلیمان التیمی لکھتے ہیں کہ یہ عورت مسلمان ہو گئی' پھر علماء سیرت میں اس کے بعد اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا آپ ﷺ نے حضرت بشر رضی اللہ عنہ کے قتل کے قصاص میں اس عورت کو قتل کرا دیا یا نہیں؟ ابن سعد متعدد روایات سے نقل کرتے ہیں کہ آپ

---

[1] ان الفاظ میں یہ واقعہ ابن اسحاق نے روایت کیا ہے' بخاری و مسلم کے ہاں یہ واقعہ متفق علیہ ہے۔

ﷺ نے اس عورت کو حضرت بشر رضی اللہ عنہ کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا تو انہوں نے اِس عورت کو خود قصاص میں قتل کیا' جب کہ صحیح یہ ہے جو امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اُس عورت کو فرمایا: اللہ تعالیٰ کبھی تمہیں اس پر قدرت نہ دے گا' یعنی میرے قتل کرنے پر۔

صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم اس کو قتل نہ کر دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں!

پھر رسول اللہ ﷺ نے خیبر سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت سب مسلمان مجاہدین میں تقسیم فرمایا' وہ اس طرح کہ پیادہ کو ایک حصہ اور گھوڑے کے لیے دو حصے۔ حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے اس کی وضاحت فرمائی جس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ جب آدمی کے ساتھ گھوڑا ہوتا تو پھر اس کو تین حصے دیئے جاتے' ایک حصہ اُس کا اپنا اور دو حصے گھوڑے کے لیے' لیکن اگر اس کے ساتھ گھوڑا نہ ہوتا تو پھر ایک ہی حصہ دیا جاتا۔

صفیہ بنت حیی بن اخطب جو یہودیوں کے سردار کی بیٹی تھیں' یہ بھی خیبر میں قید ہونے والی عورتوں سے تھیں (یہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھیں)' جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو سرکارِ دو عالم ﷺ نے ان کو اپنی زوجیت کا شرف بخشا اور ان کا حق مہر ان کی آزادی کی صورت میں دیا (یعنی ان کو آزاد کر دیا اور اپنی زوجیت میں قبول فرمایا)۔

(متفق علیہ)

حضرت جعفر بن ابوطالب رضی اللہ عنہ کی حبشہ سے واپسی

حضور ﷺ ابھی خیبر میں ہی تھے کہ چند رفقاء کے ساتھ حضرت جعفر بن ابوطالب رضی اللہ عنہ حبشہ سے لوٹے اور وہ خیبر میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے' ان کے ساتھ عورتوں اور مردوں کی کل تعداد سولہ تھی۔ حضرت جعفر طیار کے ساتھ یمن کے کچھ مزید لوگ بھی شامل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے مشورہ کے بعد حبشہ سے واپس آنے والے لوگوں کو بھی مالِ غنیمت سے حصہ عطا فرمایا۔

ابن ہشام فرماتے ہیں کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ غزوۂ خیبر کے روز آپ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچے تو آپ ﷺ نے ان کی آنکھوں کے درمیان بوسا دیا

اور اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا: میں نہیں جانتا کہ مجھے دونوں میں سے کس بات سے زیادہ خوشی ہوئی ہے خیبر کی فتح سے یا جعفر کی آمد سے؟ [1]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واپس مدینۃ المنورہ آنے کا ارادہ فرمایا تو انصار میں سے ایک شخص کو وہاں عامل مقرر فرمایا، کہا جاتا ہے کہ اُس شخص کا نام سواد بن غزیہ تھا جو قبیلہ بنو عدی سے تھے، پس وہ بڑی عمدہ قسم کی کھجوریں [2] لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کیا خیبر کی ساری کھجوریں اسی طرح کی ہیں؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! خدا کی قسم! ساری کھجوریں تو ایسی نہیں، ہوتا یوں ہے کہ ہم دو یا تین صاع گھٹیا کھجوروں کے بدلے ایک صاع عمدہ کھجوریں لے لیتے ہیں اور تین صاع کے بدلے دو صاع۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو! بلکہ ان سب کو درہموں سے فروخت کر دیا کرو اور اچھی کھجوریں اُن درہموں سے خرید لیا کرو۔

(اس کو بخاری نے روایت کیا ہے، دیکھئے: فتح الباری ج ۷ ص ۳۴۷)

اسباق ونصائح

ہمیں چاہیے کہ پہلے ہم اس غزوہ کی حقیقت کے متعلق غور کریں اور پھر اس غزوہ اور دیگر سابقہ غزوات کی حقیقت ونوعیت اور مزاج میں پائے جانے والے فرق کو ملاحظہ فرمائیں۔

تمام سابقہ غزوات دفاعی اسباب پر مبنی تھے۔ غزوۂ خیبر سے پہلے جتنے غزوات ہوئے اُن میں مسلمانوں نے اپنے دفاع کا فیصلہ کیا اور اپنے دشمنوں کے حملوں کو سختی سے روکا، جیسا کہ گزشتہ تمام غزوات کے اسباب میں یہ بات موجود ہے۔

لیکن صلح حدیبیہ اور واقعۂ بنوقریظہ کے بعد غزوۂ خیبر وہ پہلا غزوہ ہے جس کی نوعیت مختلف ہے، سابقہ غزوات کی بہ نسبت غزوۂ خیبر میں بنیادی اور اساسی نوعیت کا اختلاف ہے۔ اس غزوہ کی نوعیت میں پایا جانے والا بنیادی اختلاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ

---

[1] حضرت جعفر بن ابی طالب کی آمد اور اموالِ غنیمت میں ان کی شمولیت کا تذکرہ بخاری اور دیگر کتب کی روایات میں موجود ہے لیکن بخاری میں ان کے استقبال کی تفصیل موجود نہیں۔

[2] عربی روایت میں "التمر الجنیب" کا لفظ آیا ہے، جس کا معنی ہے: اچھی کھجور۔

صلح حدیبیہ کے بعد اب دعوتِ اسلامیہ نئے مرحلہ میں داخل ہو چکی ہے' یہ پہلا غزوہ ہے جس کی ابتداء رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوئی' خیبر اور اس کے گردونواح کے یہودیوں پر اچانک حملہ کر دیا گیا حالانکہ یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ و جدل کی پہل نہیں کی تھی۔

اس غزوہ کا واحد سبب یہودیوں کو اسلام کی دعوت تھی جو پہلے ہی دی جا چکی تھی لیکن اُن کے کفر وعناد کی وجہ سے' حق کو قبول نہ کرنے اور اُن کے دلوں میں پائے جانے والے بغض اور کینہ کی وجہ سے اُن پر حملہ کی پہل کی گئی' جب کہ اس سے قبل دلائل و براہین سے مدتِ طویل تک اسلام کی دعوت کا سلسلہ قائم رہا۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ جب خیبر کے علاقے میں پہنچے تو کسی ایک سے بھی جنگ کیے بغیر اور کسی ایک کو بھی اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر وہاں شہر کے باہر ایک رات بسر کی اور صبح کا انتظار کیا لیکن جب صبح کے وقت شہر سے اذان کی آواز نہ آئی تو آپ ﷺ نے اُن پر حملہ کرنے اور اُن سے جنگ کرنے کا حکم دے دیا' حضور ﷺ کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ کسی بستی پر حملہ آور ہونے سے پہلے وہاں پر رات گزارتے اور صبح کا انتظار کرتے' اگر اُس بستی سے اذان کی آواز آتی تو حملہ نہ کیا جاتا اور اگر اذان کی آواز نہ آتی تو پھر حملہ کر دیا جاتا' کیونکہ اس سے پتا چل جاتا کہ بستی والے مسلمان ہیں یا کافر' تو جب یقین ہو جاتا کہ بستی والے کافر ہیں تو اس صورت میں اُن پر حملہ کر دیا جاتا۔

کسی بستی پر حملہ آور ہونے کے اس سبب اور وجہ کی مزید وضاحت اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے جھنڈا عطا فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! کیا میں اُس وقت تک اُن سے لڑتا رہوں جب تک کہ وہ ہماری طرح (مسلمان) نہ ہو جائیں؟ اس سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے جو فرمایا وہ قابلِ غور ہے' ارشاد فرمایا: تم آہستہ آہستہ چلو حتیٰ کہ اُن کے میدان میں پہنچ کر پڑاؤ ڈالو' پھر انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دو' اور ان کو اس بات کی خبر دو کہ اللہ کا ان پر کیا حق ہے (آپ ﷺ کے اس ارشاد سے واضح طور پر پتا چل گیا کہ اس غزوہ کا اصل سبب اسلام کی دعوت دینا تھا)۔

علماء نے غزوۂ خیبر کے واقعات سے کثیر تعداد میں مختلف احکام کا استنباط کیا ہے' ہم ان کو یہاں پر مختصراً بیان کرتے ہیں۔

پہلا: جس قوم تک اسلامی دعوت پہنچ چکی ہو ان پر اچانک حملہ کرنے کا جواز

جن لوگوں اور جن اقوام تک دعوتِ اسلام پہنچ چکی ہو ان کو از سرِ نو دعوت دیے بغیر اور اپنے ارادے سے آگاہ کیے بغیر ان پر حملہ کر دینا جائز ہے۔ شوافع اور جمہور فقہاء کا یہی مذہب ہے مثلاً آپ ﷺ نے خیبر پر حملہ کی صورت میں یہی طریقہ اختیار فرمایا' لیکن جملہ فقہاء کے نزدیک یہ حملہ صرف اُسی صورت میں ہوگا جب دعوت صحیح طریقے سے پہنچ چکی ہو اور اسلام کو اچھے طریقے سے سمجھ لیا گیا ہو'اس شرط پر جملہ فقہاء کا اتفاق ہے۔

دوسرا: مجوزہ طریقے سے مالِ غنیمت کی تقسیم

مالِ غنیمت میں پانچواں حصہ یعنی خمس نکال کر باقی چار حصے مجاہدین کے درمیان اس طرح تقسیم کیے جاتے ہیں کہ پیادہ فوجی کو ایک حصہ اور سواری والے فوجی کو تین حصے دیے جاتے ہیں۔

سواری والے فوجی کو جو تین حصے دیے جاتے ہیں' اُن میں سے ایک حصہ مجاہد کا اپنا ہوتا ہے اور دو حصے گھوڑے کے ہوتے ہیں[1]

اور کُل مالِ غنیمت کا جو پانچواں حصہ یعنی خمس بچ گیا تھا اس کو آیۂ قرآنیہ کی اس نص کے مطابق تقسیم کیا جائے گا' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ. (الانفال:۴۱)	اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لیے ہے اس کا پانچواں حصہ اور رسول کے لیے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس پر

[1] امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ شہسوار کو دو حصے دیے جائیں گے' ایک حصہ اس کا اپنا اور دوسرا اس کے گھوڑے کا' غزوۂ خیبر میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کی نبی اکرم ﷺ نے جس طرح تقسیم فرمائی تھی' اس سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔

جسے ہم نے اتارا اپنے (محبوب) بندہ پر
فیصلہ کے دن جس روز آمنے سامنے ہوئے
تھے دونوں لشکر' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے O

آپ ﷺ کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد مالِ غنیمت کا یہ پانچواں حصہ یعنی خُمس مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا' شافعیہ اور حنفیہ کا یہی مؤقف ہے' اور ایک یہ بھی ہے کہ خلیفہ کو اس پانچویں حصے میں اختیار حاصل ہے کہ وہ جہاں ضرورت محسوس کرے وہاں خرچ کر سکتا ہے۔ یہ دونوں قول قریب قریب حکم رکھتے ہیں' ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

تیسرا: مجاہدین کے علاوہ میدانِ جنگ میں شریک ہونے والے دیگر افراد کو بھی مالِ غنیمت میں حصہ دار بنانے کا جواز

ایسا کرنا اس صورت میں جائز ہے جب مالِ غنیمت کے اصل حق دار مجاہدین اس کی اجازت دے دیں۔ جب حضرت جعفر بن ابوطالب اور اُن کے ساتھی حبشہ اور یمن سے واپس آئے اور خیبر کے میدان میں آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے صحابہ کے مشورے اور اجازت سے حضرت جعفر اور ان کے ساتھیوں کو بھی مالِ غنیمت سے حصہ عطا فرمایا۔

واضح رہے کہ اس معاملہ میں بخاری شریف کی روایت میں مسلمانوں سے اجازت طلب کرنے کی قید نہیں ہے' البتہ امام بیہقی نے اپنی بیان کردہ روایت میں اس بات کا اضافہ نقل کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے مسلمان مجاہدین سے بات چیت کی تو وہ راضی ہو گئے اور مشورہ کرنے کے بعد حضرت جعفر طیار اور ان کے ساتھیوں کو مالِ غنیمت میں شریک کیا' اس تقسیم کو سب مجاہدین نے قبول کیا کیونکہ عادل شخص کی طرف سے اضافہ قبول ہوتا ہے۔

امام بیہقی نے جو مشورے کی قید ذکر کی ہے اس کی قدر و قیمت اس طرح بڑھ جاتی ہے کہ اسی خیبر کے مقام پر ایک اور صحابی ابان بن سعید بھی جنگ کے بعد آن پہنچے تھے جن کو رسول اللہ ﷺ نے نجد کی طرف ایک سریہ میں بھیجا تھا' انہوں نے بھی عرض کیا: یارسول

اللہ! اس مالِ غنیمت کی تقسیم میں مجھے بھی حصہ دیں، لیکن آپ ﷺ نے خیبر کے مالِ غنیمت میں سے ان کو حصہ دار نہ بنایا۔

جب ان دونوں مذکورہ بالا روایات کو جمع کیا جائے تو ان میں تطبیق اس طرح ہوتی ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو مالِ غنیمت میں حصہ دار بنانے کی اجازت صحابہ نے دے دی لیکن ابان بن سعید کو اس مال میں حصہ دار بنانے کی اجازت نہ دی ہوگی۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۳۴۹۔۳۴۰)

یہاں پر ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں جنگی حالات کے پیشِ نظر فاتح فوج کے سپاہیوں میں کس طرح مالِ غنیمت تقسیم ہوگا؟ جب کہ آج سپاہیوں کو تنخواہیں اور الاؤنسز وغیرہ بھی دیے جاتے ہیں۔

جواب: گزشتہ روایات کی رُو سے آپ نے جانا کہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ علیہما الرحمۃ کے نزدیک غیر منقولہ اموال و جائیدادیں مجاہدین میں تقسیم نہیں کی جائیں گی، جیسا کہ روایات موجود ہیں، صرف ضرورت اور مصلحت کے تحت ایسا ہوسکتا ہے جب کہ اموالِ منقولہ کو رسول اللہ ﷺ کے طریقہ تقسیم کے مطابق ہی مجاہدین میں مجوزہ حصے کے مطابق تقسیم کیا جائے گا لیکن موجودہ دور میں جنگ کے مختلف وسائل اور طریقوں کو پیشِ نظر رکھ فوجیوں کے درجات کے مطابق تقسیم کے طریقہ کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا۔

(اِس دور کی جنگوں کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف فوجیوں کے رینکس کے مطابق مالِ غنیمت کو ان کے درمیان تقسیم کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے) اس میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ سپاہیوں کے حصے ان کے درمیان الاؤنسز اور تنخواہوں میں اضافہ کی شکل میں تقسیم کیے جائیں۔ البتہ سربراہ مملکت کے لیے کسی صورت میں جائز نہیں کہ وہ مالِ غنیمت کو صرف اپنے ہی قبضے میں لے لے اور فوجیوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔

چوتھا: مساقات کے عقد کی مشروعیت

یہ اس طرح ہے کہ زمین یا باغ کا مالک کسی دوسرے سے اس بات کا عقد کرتا ہے کہ درختوں کو پانی دینے اور ان کی دیکھ بھال کے عوض اُسے درختوں کے پھل کا حصہ دیا جائے گا، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد اس عقد کی صحت کے قائل ہیں اور دلیل کے طور پر حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُس عمل کو پیش کرتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کی اردگرد کی زمینوں کے بارے میں اختیار فرمایا' جب کہ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ اکیلے اس مذکورہ بالا عقدِ مساقاۃ کو جائز نہیں سمجھتے' آپ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اس قسم کے عقد کی حدیثِ طیبہ میں کوئی مثال نہیں ہے کیونکہ خیبر کا علاقہ بہ زورِ شمشیر فتح کیا گیا تھا اور وہاں کے باشندے اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام بن چکے تھے۔ (اس لیے ان کے ساتھ تو کوئی عقد اور معاہدہ نہیں کیا جا سکتا' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ خیبر کو جو یہ فرمایا تھا کہ ان درختوں کی دیکھ بھال کے بدلے آدھے پھل دیئے جائیں گے' یہ کوئی برابر کا معاہدہ نہیں تھا بلکہ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مرضی سے اُن پر کرم فرماتے ہوئے ان کو آدھے پھل دینے کا ارشاد فرمایا تھا) کیونکہ اہلِ خیبر اب غلام تھے اور غلاموں سے جو لیا جائے یا جو کچھ غلاموں کے لیے چھوڑ دیا جائے' یہ سب آقا ہی کی ملکیت ہوتا ہے۔

صاحبین نے امام صاحب کے مذکورہ بالا مؤقف سے اختلاف کرتے ہوئے جمہور ائمہ کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے اس قسم کے معاہدے کو صحیح قرار دیا ہے۔

اس کے بعد اگلی بات میں علماء کا اختلاف یہ ہے کہ کیا اس قسم کا عقد تمام قسم کے درختوں کے متعلق صحیح ہوگا یا صرف انگور اور کھجور کے درختوں کے بارے ہی صحیح ہوگا؟

اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ چونکہ خیبر میں عام طور پر انگور اور کھجور ہی کے درخت تھے۔

اس ضمن میں اکثر فقہاء کا یہی مؤقف ہے کہ اس قسم کا عقد تمام اقسام کے درختوں کے لیے کرنا جائز ہے' کیونکہ اس میں عموم ہے۔

مذکورہ بالا بحث تو درختوں کی سیرابی اور ان کی دیکھ بھال کے متعلق عقد کرنے کی صورت میں تھی' اس کے برعکس زمین کو بٹائی پر دینے کے عقد کو اکثر فقہاء نے ممنوع قرار دیا ہے' ان میں شافعیہ بھی شامل ہیں' وہ اس طرح ہے کہ زمین کا مالک کسی دوسرے شخص سے یہ معاملہ کرتا ہے کہ زمین میں زراعت اور کھیتی کی دیکھ بھال کے بدلے اس کھیتی سے حاصل ہونے والی پیداوار سے اس کو مخصوص حصہ دے گا۔

جمہور شوافع نے کہا ہے کہ یہ عقدِ مزارعت صحیح نہیں ہے' اس کی دلیل صحیح مسلم سے ثابت

ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مزارعت (زمین کو بٹائی پر دینے) سے منع فرمایا ہے، اور اُجرت پر کام کروانے کا حکم دیا ہے۔ شوافع کہتے ہیں کہ اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ مزارعت کا معاملہ مساقات کے تحت تابع ہو، یعنی مساقات کا معاملہ طے ہونے کے ساتھ ساتھ درختوں کے درمیان خالی زمین پر کھیتی کرنے پر بھی دونوں فریق تیار ہو گئے ہوں۔

جملہ دلائل پر غور کرنے سے راجح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مساقات اور مزارعت دونوں عقد صحیح ہیں، علماء نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے کہ ابتداء میں مزارعت کی ممانعت لوگوں کی ضرورت اور حاجت کی وجہ سے تھی، مہاجرین کے پاس زمینیں نہیں تھیں، تو نبی اکرم ﷺ نے انصار کو مہاجرین کے ساتھ ہمدردی اور مواسات کا معاملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس بات کی دلیل امام مسلم کی روایت کردہ وہ حدیثِ طیبہ ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: بعض انصاریوں کے پاس زمینیں تھیں، وہ ان زمینوں کو تہائی یا چوتھائی پیداوار کے بدلے دوسروں کو زراعت کے لیے دیتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود اس پر کھیتی باڑی کرے یا اپنے بھائی کو دے دے، اگر وہ لینے سے انکار کر دے تب وہ اسے اپنے پاس رکھے۔

پھر جب مسلمانوں کی حالت بہتر ہوئی اور ان کی ضروریات رفع ہو گئیں تو مزارعت کو جائز کر دیا گیا، اور زمین کے مالک کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں اور آپ کے بعد خلفاء راشدین کے زمانہ میں زمینوں کو مزارعت پر بھی دیا جاتا اور اُجرت پر بھی کام کرایا جاتا تھا۔

پانچواں: آنے والے شخص کو بوسا دینے اور اُس سے بغل گیر ہونے کا جواز

جب آنے والا شخص لمبے سفر سے آیا ہو یا طویل عرصے کے بعد ملا ہو تو اس کو بوسا دینے اور گلے ملنے کے بارے میں علماء میں کوئی اختلاف نہیں، اس ضمن میں علماء رسول اللہ ﷺ کے اُس عمل سے استدلال کرتے ہیں کہ جب حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ ملکِ حبشہ سے واپس تشریف لائے اور خیبر کے مقام پر ان کی ملاقات آپ ﷺ سے ہوئی تو اُس وقت آپ ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے درمیان پیشانی پر بوسا دیا اور ان کو سینے سے لگایا۔

اسی طرح ایک اور حدیثِ طیبہ ہے جس کو امام ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت میرے گھر میں تھے' حضرت زید رضی اللہ عنہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملنے کے لیے آئے تو دروازہ کھٹکھٹایا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُٹھ کر اس کی طرف گئے کہ آپ کا کپڑا گھسٹ رہا تھا' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو گلے سے لگایا اور اُن کو بوسا دیا۔

مذکورہ بالا دو احادیثِ طیبات کے علاوہ ایک حدیثِ طیبہ ہے جس سے بظاہر کچھ اشکال پیدا ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ امام ترمذی نے ہی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم میں سے کوئی شخص جب اپنے کسی دوست یا بھائی کو ملے تو کیا وہ اس کے سامنے جھک سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! وہ شخص پھر پوچھنے لگا: تو کیا اس کو سینے سے لگائے اور بوسا دے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! وہ پھر پوچھنے لگا: کیا اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں!

اس حدیثِ طیبہ سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیثِ طیبہ میں بوسا دینے اور گلے لگانے سے کیوں منع فرمایا؟

جواب: مذکورہ بالا حدیثِ طیبہ میں اُس شخص نے جو سوال پوچھا تھا' وہ اُن ملاقاتوں کے بارے میں تھا' جو عام طور پر بار بار ہوتی ہیں' اس قسم کی روزمرہ کی عام ملاقاتوں میں بار بار بوسا دینا اور بار بار گلے لگانا کوئی زیادہ پسندیدہ امر نہیں' جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جعفر اور حضرت زید سے ان کے طویل سفر کے بعد ملاقات میں جو بوسا دیا اور سینے سے لگایا' ان دونوں کیفیات میں واضح فرق ہے۔

(کہ عام روزمرہ کی بار بار ملاقاتوں میں صرف مصافحہ ہی کر لیا جائے اور طویل عرصے کے بعد کی ملاقات میں بوسا دینا اور گلے ملنا درست اور صحیح ہے)۔

چھٹا: کھانے والی اشیاء میں سود کی حرمت

کھانے والی چیزوں میں ربا الفضل (سود) حرام ہے' اس کی صورت یہ ہے کہ کھانے کی ایک ہی جنس کی دو اشیاء کو کمی بیشی کے ساتھ باہم تبدیل کرنا اس طرح کہ ایک چیز زیادہ ہو

اور دوسری تھوڑی ہو (مثلاً ایک کلو کھجور کے بدلے دو کلو کھجور دینا یہ زیادتی ' سود ہے اور حرام ہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے متعدد احادیث طیبات میں اس کو ممنوع قرار دیا ہے' اسی طرح کی ایک حدیثِ طیبہ ہے جسے امام مسلم' حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' آپ بیان کرتے ہیں: میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے سونے کے بدلے سونے' چاندی کے بدلے چاندی' کھجور کے بدلے کھجور' گندم کے بدلے گندم' جَو کے بدلے جَو اور نمک کے بدلے نمک کی خرید وفروخت کو کمی بیشی کے ساتھ منع فرمایا سوائے اس کے کہ جب ان چیزوں کی برابر مقدار میں نقد و نقد خرید وفروخت کی جائے' اور فرمایا: جس نے ان چیزوں کے باہمی تبادلے میں زیادہ دیا یا زیادہ طلب کیا تو یہ سود ہے۔

اسی موضوع کی ایک حدیثِ طیبہ بخاری میں ہے جس میں آپ ﷺ نے عمدہ کھجور کے بدلے ردّی کھجور کی زیادہ مقدار کے ساتھ خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے۔

مختلف چیزوں کے غیر مساویانہ باہمی تبادلے کے حرام ہونے کی حکمت کے متعلق طویل بحث کی یہاں جگہ نہیں' اس کی تفصیلات فقہ کی کتب میں اپنی جگہ پر موجود ہیں' لیکن یہاں پر مختصراً اس کے بارے میں کچھ ضروری باتیں بیان کی جاتی ہیں۔

- وہ شخص جو عمدہ کھجور کی تھوڑی مقدار کے بدلے ردّی کھجور کی زیادہ مقدار کا سودا کرنا چاہتا ہے یا اسی طرح دوسری اشیائے خورد میں اسی تناسب سے خرید وفروخت کرنے کا خواہاں ہے تو ایسے شخص کو رسول اللہ ﷺ نے ہدایت و رہنمائی دیتے ہوئے فرمایا (کھانے والی چیزوں کی خرید وفروخت مساوی اور برابری کے تناسب سے ہی کی جائے یا اس کے لیے دوسرا طریقہ اپنایا جائے' تو ان دونوں صورتوں میں سود نہیں ہوگا' دوسرا جائز طریقہ یہ ہے) کہ پہلے ردّی کھجوروں کو دراہم (روپوں) کے بدلے فروخت کیا جائے پھر ان روپوں سے عمدہ قسم کی کھجوریں خرید لی جائیں تو یہ طریقہ صحیح اور جائز ہے' لیکن زیادہ ردّی کھجوروں کے بدلے تھوڑی عمدہ کھجوریں بیچنا یا خریدنا سود کے زمرے میں آتا ہے' بلکہ روپوں کے بدلے ردّی کھجوریں بیچ کر عمدہ کھجوریں خرید لی جائیں' یہ درست طریقہ ہے۔

کیونکہ یہاں خرید وفروخت اصل چیز کے بدلے مقصود نہیں بلکہ اسے دوسری چیز حاصل

کرنے کا جو ذریعہ بنایا گیا ہے' یہ حرمت کا باعث ہے۔اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں رعایت نکالی کیونکہ حرام وہ کام ہوتا ہے جس کی کتاب وسنت میں قطعی طور پر نہی وارد ہوئی ہو۔

اس سے یہ بات بھی مستنبط ہوتی ہے کہ کسی حرام حکم کو کسی دوسرے جائز طریقہ اور ذریعہ سے حلال بنایا جا سکتا ہے' اور اس کا شمار حیلۂ حرام میں نہیں ہوگا' مثلاً کوئی شخص طلاق یافتہ عورت سے نکاح کرتا ہے' اس ارادے سے کہ اس کا نکاح پہلے شوہر سے جائز کر دے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ اس عقد نکاح میں ایسی کوئی شرط نہ لگائی گئی ہو۔

اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ کوئی قرض خواہ اپنے مال کی زکوٰۃ ایسے مقروض کو دے جو قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور پھر وہی دیا ہوا مال اپنے قرض کی مد میں اُس سے واپس لے لے۔

ابن قیم اس میں اختلاف کرتے ہوئے اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں' ان کی دلیل یہ ہے کہ اعمال کا اعتبار ان کے مقاصد سے ہوتا ہے' مثلاً مذکورہ بالا مثالوں کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے کوئی چیز فروخت کر کے ایسی چیز چاہی جس کے لیے بیع جائز نہیں تھی' اسی طرح جس شخص نے نکاح کیا اور اس کے ذریعے اُس نے وہ مقصد حاصل کرنا چاہا جس کے لیے نکاح مشروع نہیں ہے تو ان دونوں نے غلط کام کا ارتکاب کیا' اس لیے کہ انہوں نے حکم کو اس کے اصل مقصد سے پھیر دیا ہے اور اس سے دوسرا مقصد حاصل کرنا چاہا ہے' جس کے لیے وہ حکم مشروع نہیں۔

ابن قیم کی یہ بات قابلِ اعتبار نہیں' اس لیے کہ یہ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا حدیثِ طیبہ سے صریحاً متعارض ہے' فقہی قواعد تو نصوص سے مستنبط کیے جاتے ہیں نہ کہ انہیں نصوص سے ماوراء ہو کر وضع کیا جاتا ہے۔اس موضوع پر ابن قیم نے اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' میں جو بحث کی ہے' اس میں بھی انتہائی تناقض پایا جاتا ہے' انہوں نے بعض صورتوں کی تحریم کی مذمت میں طویل بحث کی ہے اور انہیں حرام حیلوں کا نام دیا ہے اور جن ائمہ نے ان کو صحیح قرار دیا ہے ان کی آراء کو تفصیل کے ساتھ رد کیا ہے اور انہیں وعید سنائی ہے کہ وہ یومِ قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوں گے' پھر خود ہی چند صفحات کے بعد ان صورتوں کو جائز قرار

دینے لگے ہیں اور صحیح شرعی حیلوں کی حیثیت سے انہیں پیش کرنے لگے ہیں۔[1]

پھر اس غزوہ میں دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا شمار ان عظیم خوارق میں ہوتا ہے' جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید و نصرت فرمائی' یہ دونوں واقعات صحیح احادیث سے ثابت ہیں:

پہلا واقعہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں تکلیف اور درد تھی' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا لعابِ دہن اس میں ڈالا جس سے ان کی آنکھ اُسی وقت ٹھیک ہوگئی گویا کہ ان کو کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔

دوسرا واقعہ: جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زہر آلود بکری کا بھنا ہوا گوشت کھانے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی خبر دے دی' قبل اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کو اس کے زہر آلود ہونے کی خبر دیتے' قضائے الٰہی سبقت لے گئی اور حضرت بشر بن البراء رضی اللہ عنہ اس میں سے ایک لقمہ نگل گئے جس سے ان کا وصال ہوگیا' اس کی مزید وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی سازشوں سے محفوظ و معصوم رکھا تھا' اور اپنے اس وعدہ کو پورا فرمایا' جو وعدہ اس آیت مبارکہ میں ہے:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ. اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (المائدہ:۶۷) (کے شر) سے۔

ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ اُس یہودی خاتون کے اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں راویوں میں اختلاف ہے۔ غالب گمان یہی ہے جیسا کہ امام زہری وغیرہ نے پورے

---

[1] دیکھئے: اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۹۲' مطبوعہ التجاریہ۔ ابن قیم یہاں طلاق سے بچنے کے لیے خلع کو واسطہ بنانے کے حیلے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ حیلہ شرعاً باطل ہے' لیکن پھر آگے چل کر اسی کتاب میں (ج ۴ ص ۱۱۰) اس حیلہ کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس کی دس توجیہات پیش کرتے ہیں اور اپنے نزدیک ان کو معتبر دلائل سمجھتے ہیں' ان مقامات کا سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ کرنے سے عجیب و غریب تناقض سامنے آتا ہے۔ شرعی حیلوں اور معاملات و احکام میں مقاصد کے اثرات پر تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھئے: ہماری کتاب ''ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ'' ص ۲۹۳ تا ۳۲۴۔

یقین سے بیان کیا ہے کہ اُس عورت نے اسلام قبول کر لیا تھا اس لیے آپ ﷺ نے اسے قتل نہیں کرایا تھا جیسا کہ امام مسلم نے ذکر کیا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قصاص کا تقاضا تو تھا کہ اسے قتل کرا دیا جاتا' اس لیے کہ متفق علیہ قاعدہ یہ ہے کہ اسلام' ماقبل کو ساقط کر دیتا ہے (یعنی اسلام قبول کر لینے سے وہ تمام گناہ ساقط ہو جاتے ہیں جو ماقبل اسلام کیے تھے)۔

جس قتل کے نتیجے میں قصاص لازم ہوتا ہے' وہ ایسا قتل ہے جس کا ارتکاب قاتل نے اسلام قبول کرنے کے بعد کیا ہو' جب کہ ماقبلِ اسلام قتل کا معاملہ' حرابت سے متعلق ہے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ اسلام میں داخل ہوتے ہی حرابت ختم ہو جاتی ہے۔

پھر خیبر کے یہودی نصف پیداوار کے بدلے بٹائی پر زمینوں کی کاشت کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آ گیا' آپ کی خلافت میں انہوں نے ایک انصاری صحابی کو قتل کر دیا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر حملہ کر دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے' اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کے ساتھ اس شرط پر معاملہ کیا تھا کہ ہم جب چاہیں گے انہیں یہاں سے نکال دیں گے' ان لوگوں نے عبداللہ بن عمر پر حملہ کیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ اس سے قبل وہ ایک انصاری صحابی پر بھی حملہ کر چکے ہیں' بے شک یہ اصحابِ رسول ہیں اور یہودیوں کے علاوہ ہمارا کوئی دشمن نہیں' اس لیے خیبر کی زمینوں کے جو مالک ہیں' وہ ان کا انتظام خود سنبھالیں' میں یہود کو جلاوطن کر رہا ہوں۔

اس طرح جزیرۂ عرب سے یہود کو مکمل طور پر نکال دیا گیا' اگر ان کی سرکشی' جارحیت اور غرور و تکبر نہ ہوتا تو انہیں وہیں رہنے دیا جاتا اور وہاں سے انہیں نکالا نہ جاتا' لیکن ساری زمین اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے' وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ O (الاعراف: ۱۲۸)　اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے (مخصوص) ہے O

قبائل کے خلاف سرایا اور بادشاہوں کی طرف خطوط

غزوۂ خیبر سے فراغت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جزیرۂ عرب میں پھیلے ہوئے مختلف غیر مسلم قبائل کی طرف سرایا کی مختلف مہمات کے لیے اپنے اصحاب کے دستے روانہ کیے (سرایا، سریہ کی جمع ہے، سریہ اُس جنگ کو کہتے ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہ ذاتِ خود شرکت نہ فرمائی ہو)۔

مختلف قبائل کی طرف یہ دستے بھیجنے کا مقصد اسلام کی دعوت کو اُن تک پہنچانا تھا اور اگر وہ اسلام کی دعوت کو قبول نہ کریں تو پھر ان کے خلاف جنگ کریں۔

ہجرت کے ساتویں سال تقریباً دس سرایا کی مہمات پر یہ دستے مختلف صحابہ کرام کی سرکردگی میں روانہ فرمائے۔

اس عرصہ کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف بادشاہوں اور شاہانِ عالم کی طرف خطوط بھیجے جن میں ان کو اسلام کی دعوت دی گئی اور اُن باطل ادیان کو ترک کرنے کا کہا گیا جن ادیان پر وہ کاربند تھے۔

ابنِ سعد نے ''طبقات'' میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ذوالحجہ ۶ ہجری میں حدیبیہ سے واپس مدینۃ المنورہ لوٹے تو دنیا کے مختلف بادشاہوں کی طرف سفیر بھیجے اور ان کو خطوط لکھے اور ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! بادشاہ صرف وہی خط وصول کرتے اور پڑھتے ہیں جس پر مُہر لگی ہوئی ہو، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاندی کی مہر بنوائی جس پر تین سطروں میں ''محمد رسول اللہ'' نقش تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطوط پر یہ مہر لگائی اور اُن خطوط کو لے کر ایک ہی دن چھ وفود روانہ ہوئے، ان وفود کی روانگی محرم ۷ ہجری میں عمل میں آئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر قوم کی طرف اُس صحابی کو روانہ کیا جو اُس قوم کی زبان پر پورا عبور رکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے سفیر حضرت عمر بن امیہ الضمری رضی اللہ عنہ کو نجاشی بادشاہ کی طرف روانہ فرمایا، نجاشی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامۂ مبارک لیا اور اپنی آنکھوں سے لگایا،

اور اپنے تخت سے نیچے اُتر آیا' تواضع و انکساری کرتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا' پھر اُس نے اسلام قبول کیا اور حق کی گواہی دی' اور کہا: اگر میں آپ کی خدمت میں مدینہ آنے کی استطاعت رکھتا تو میں ضرور آتا۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۳ بہ اختصار)

آپ ﷺ نے حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبی رضی اللہ عنہ کو شاہِ روم ہرقل کی طرف بھیجا' حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ یہ مکتوبِ گرامی لے کر حاکم بصریٰ کے پاس آئے' حاکمِ بصریٰ نے اسے ہرقل کے پاس پہنچا دیا' اُس نے یہ نامہ مبارک پڑھا' اس میں لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے ہرقل کی طرف ہے جو روم کا بڑا رئیس ہے' سلامتی ہو ہر اُس شخص پر جو ہدایت کا پیروکار ہے۔

امابعد! میں تمہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں' تو اسلام قبول کر لے تو سلامت رہے گا' تو اسلام قبول کر لے تو اللہ تجھے دوگنا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے دعوتِ اسلام سے روگردانی کی تو تمہاری رعایا[1] کے انکار کا گناہ بھی تیری گردن پر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب! آجاؤ! اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی بھی اللہ کے سوا کسی کو اپنا خدا نہیں بنائے گا' اگر اس دعوت کے باوجود وہ روگردانی کریں تو تم کہو: گواہ رہنا بے شک ہم مسلمان ہیں۔ (متفق علیہ)

ابن سعد اپنی کتاب ''طبقات'' میں لکھتے ہیں کہ ہرقل نے آپ ﷺ کا یہ مکتوبِ گرامی پڑھ کر تمام امراء سلطنت اور وزراء مملکت کو جمع کیا اور ان کو خطاب کیا: اے مملکتِ روم کے شہریو! کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں فلاح و کامیابی حاصل ہو؟ اور تمہارا ملک ہمیشہ قائم و دائم رہے اور تم عیسیٰ ابن مریم کے حکم پر عمل کرو؟ روم کے باشندوں نے کہا: اے بادشاہ! پھر کیا کرنا ہوگا؟ ہرقل نے کہا: تو پھر تمہیں اس عربی نبی کی اتباع کرنا ہوگی۔ یہ سنتے ہی حاضرین

[1] عربی روایت میں ''اریسین'' کا لفظ آیا ہے' ابن حجر نے لکھا ہے: یہ ''اریسی'' کی جمع ہے' جو ''اریس'' کی جانب منسوب ہے۔ اس کے لفظی معنی کاشتکار اور کسان کے ہیں' یہاں اس سے مراد ماتحت لوگ اور عوام ہیں۔

میں ایک بھگدڑ مچ گئی اور سب جنگلی گدھوں کی طرح دولتیاں جھاڑنے لگے اور باہم لڑائی جھگڑا شروع کر دیا' اس حال میں کہ انہوں نے صلیبیں اٹھائی ہوئی تھیں۔

جب ہرقل نے دیکھا کہ یہ تو اسلام قبول کرنے والے نہیں' تو وہ اُن سے مایوس ہو گیا اور اس کو اپنی جان اور اپنی بادشاہی کا خطرہ محسوس ہوا' اُس نے ان کو خاموش کیا' پھر کہا: میں نے یہ بات محض تمہیں آزمانے کے لیے کہی تھی کہ مجھے پتا چل جائے کہ تم اپنے عقیدہ میں کتنے پختہ ہو' اپنے عقیدہ اور مذہب کے ساتھ تمہاری یہ وابستگی دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔ ہرقل کی یہ بات سن کر انہوں نے ہرقل کو سجدہ کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کو کسریٰ کی طرف بھیجا تاکہ وہ اس کو اسلام کی دعوت دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لیے ایک خط بھی ارسال کیا۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں نے کسریٰ کو یہ مکتوبِ گرامی پیش کیا تو اُس کو پڑھ کر سنایا گیا' پھر اُس نے وہ نامہ مبارک لے کر چاک کر دیا' جب یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اُس کے ملک کو پارہ پارہ کرے۔

اُدھر کسریٰ نے یمن میں اپنے مقررہ کردہ گورنر باذان کو حکم نامہ لکھا کہ تم اپنے پاس سے جلد ہی دو طاقت ور آدمی اُس شخص کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجو (جس نے نبوت کا اعلان کیا ہے)' باذان نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اپنے دو طاقت ور آدمی بھیجے' اور ایک خط بھی لکھا' جب یہ دونوں قاصد مدینۃ المنورہ پہنچے اور باذان کا خط آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: آج تم جاؤ! کل مجھ سے ملاقات کرنا پھر میں تمہیں اس کے بارے اپنے ارادے سے آگاہ کروں گا۔

جب دوسرے دن وہ دونوں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: جاؤ! میری طرف سے اپنے حاکم کو یہ خبر پہنچا دو کہ میرے رب نے اُس کے رب' کسریٰ کو آج رات موت کے گھاٹ اتار دیا ہے جب رات کے سات پہر گزر چکے تھے۔

ابنِ سعد فرماتے ہیں: یہ رات منگل ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ ہجری کی تھی' اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسریٰ پر اُس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا' اُس نے کسریٰ کو قتل کر دیا' جب یہ خبر لے کر دونوں قاصد باذان کی طرف گئے تو یہ خبر بالکل صحیح نکلی' یہ دیکھ کر باذان اور یمن میں رہنے

والے اس کے بیٹوں نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

حضور ﷺ نے حضرت حارث بن عمیر الازدی رضی اللہ عنہ کو بصریٰ کے حاکم شرحبیل بن عمرو الغسانی کی طرف دعوت کا پیغام دے کر بھیجا' قیصرِ روم کی طرف سے شرحبیل کو بصریٰ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا' شرحبیل نے آپ ﷺ کے اس قاصد کو بیڑیوں میں جکڑ دیا اور ان کو قتل کر دیا۔ راوی کہتے ہیں: حضرت حارث بن عمیر الازدی رضی اللہ عنہ ہی وہ قاصد ہیں جنہیں اس دوران شہید کیا گیا' ان کے علاوہ کسی قاصد کو قتل نہیں کیا گیا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے اس کے علاوہ مختلف علاقوں اور مختلف ممالک کے بادشاہوں اور سرداروں کی طرف خطوط اور قاصد روانہ فرمائے' ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا یا اس کی تائید کی جب کہ صرف بعض نے اس پیغامِ حق کی مخالفت کی تھی۔

جنگ بندی کے اس عرصہ کے دوران مختلف جہات اور مختلف علاقوں سے متعدد افراد اور کئی وفود آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور دینِ اسلام میں داخل ہوئے' اس عرصہ میں عرب کے کئی بڑے بڑے سرداروں نے بھی اسلام قبول کیا' جن میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی

---

[1] کسریٰ کے نام جو مکتوب گرامی بھیجا گیا اس کی یہ تفصیل ''طبقات ابن سعد'' سے منقول ہے' بخاری نے اسے اختصار سے ذکر کیا ہے' اس میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ اطلاع ملی کہ کسریٰ نے آپ کے مکتوب کو چاک کر دیا ہے تو آپ نے دعائے ضرر کی کہ وہ لوگ بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں' شیخ ناصر الدین البانی نے محمد الغزالی کی کتاب ''فقہ السیرۃ'' پر اپنی تعلیقات میں ابن سعد کی روایت میں یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے دیکھا کہ باذان نے جو دو آدمی بھیجے تھے ان کی مونچھیں مونڈی ہوئیں اور گال استرے سے چھلے ہوئے تھے' آپ نے ان سے منہ پھیر لیا اور فرمایا: تمہارا بُرا ہو! تم ایسا کس کے کہنے سے کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہمارے رب (کسریٰ) نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا۔ یہ اضافہ مجھے ابن سعد کی روایت میں نہیں ملا' میری معلومات کے مطابق یہ ابن جریر کی روایت ہے۔

[2] اسے واقدی نے عمر بن الحکم سے روایت کیا ہے' ابن حجر فرماتے ہیں: اسے شاہین نے بھی محمد بن یزید کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔

شامل ہیں۔

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے ارادے سے نکلا تو مجھے راستے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ملے جو مکہ سے آرہے تھے' یہ فتح مکہ سے پہلے کی بات ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا: اے ابوسلیمان! کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا: بخدا! میں اسلام قبول کرنے کی غرض سے جارہا ہوں' کب تک یوں ہی رہیں گے؟ میں نے انہیں کہا: میں بھی اسلام قبول کرنے کے لیے نکلا ہوں' پھر ہم اکٹھے ہی بارگاہِ رسالت میں مدینہ آئے' خالد بن ولید آگے بڑھے' انہوں نے اسلام قبول کیا اور بیعت کی' پھر میں آپ ﷺ کے قریب ہوا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اسباق ونصائح

نئے مرحلے کے نشانات/آثار

رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل کی طرف جنگی مہمات کا آغاز فرمایا اور دنیا کے مختلف ممالک میں بادشاہوں کی طرف خطوط ارسال فرمائے' جن سب کا مقصد اسلام کی دعوت تھی' یہ سب کچھ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں دعوت کے گزشتہ مراحل کی بہ نسبت دعوت کے ایک نئے مرحلے کا آغاز تھا' جو گزشتہ مراحل دعوت سے بہت مختلف تھا۔ دعوت کا وہ مرحلہ جس کا دورانیہ ہجرتِ مدینہ سے لے کر صلح حدیبیہ تک تھا' اُس کو ہم نے دفاعی مرحلہ کا نام دیا۔

اس دفاعی مرحلۂ دعوت کے دورانیہ میں آپ ﷺ نے مختلف قبائل کی طرف جو دعوتی وفود بھیجے' ان کو صرف یہی ہدایات دی گئیں کہ صرف دعوت ہی کا ابلاغ کرنا ہے' اگر کوئی قبیلہ یا کوئی فرد اس دعوت کا انکار کردے تو اس کے خلاف جنگ اور قتال نہیں کرنا۔ اس دوران پُرامن انداز سے دعوت دی جاتی رہی اور کبھی کسی قبیلہ کی جانب سریہ نہ بھیجا کہ جا کر اس قبیلہ کو دعوت دیں اور اگر وہ لوگ اس کو قبول نہ کریں تو ان سے جنگ کی جائے۔

لیکن جب حدیبیہ کے مقام پر مشرکینِ قریش اور مسلمانانِ مدینہ کے درمیان صلح اور جنگ بندی کا معاہدہ طے پا گیا تو اس سے مسلمانوں کے دلوں کو کچھ اطمینان اور سکون حاصل

ہوا اور بالخصوص مسلمان قریشِ مکہ کی روز روز کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ سازیوں سے پر امن ہو گئے' اب رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ دین کو ایک نئے مرحلے میں داخل فرمایا' ایسا مرحلہ کہ شریعتِ اسلامیہ میں احکامِ دین کی تبلیغ اور نفاذ کے لیے جس مرحلہ کو بروئے کار لائے بغیر کوئی چارۂ کار نہ تھا' وہ ہے جنگ اور قتال کا مرحلہ۔ یہ جنگ اور قتال اُن لوگوں کے خلاف کرنے کا حکم آیا جن کو اسلام کی دعوت صحیح طریقے سے پہنچائی جا چکی تھی اور وہ اس کو سمجھنے اور جاننے بوجھنے کے باوجود تکبر اور غرور کا مظاہرہ کرتے ہوئے حسد اور عداوت رکھتے ہوئے وہ اُس دعوت کو قبول نہ کریں' تو ایسی صورت میں اب دعوت کے اِس نئے مرحلے میں اُن متکبروں اور سرکشوں کے خلاف جنگ کا آغاز ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے اِسی طریقۂ دعوت کو اپنا کر اپنے رب کی دعوت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا' آپ ﷺ کے قول اور عمل کی رُو سے یہی طریقۂ دعوت ہر دور میں قیامت تک کے لیے حکمِ شرعی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے' جس پر جملہ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔

اسلام کے خلاف فکری یلغار کرنے والے اِسی مرحلۂ دعوت کی صورت کو بدلنے اور لوگوں کی آنکھوں کے سامنے سے اس کی حقانیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ تاثر دیتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ میں جہاد کے متعلق جو کچھ بھی ہے اس سے مراد صرف دفاعی جنگ اور بغاوت کو روکنے کے لیے عسکری جدوجہد ہے' اور کمزور اقوام کے تحفظ اور دفاع کے لیے اب اقوامِ متحدہ کا ادارہ قائم ہو چکا ہے' لہٰذا اب دفاعی جنگ کے نظریہ کو بھی باقی رکھنے کی کوئی ضرورت اور حاجت نہیں۔

اس میں کوئی پوشیدہ راز نہیں رہا کہ اسلام کے خلاف یہ فکری یلغار کرنے والے جہاد کے نظریہ کے متعلق کس قدر دھوکے اور چالاکی کا مظاہر کرتے ہوئے جہاد کی اصل روح کو بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں' کیونکہ اس میں اصل محرک غیر مسلم مشرقی اور مغربی اقوام میں' جہاد کے متعلق پایا جانے والا شدید خوف ہے کہ اگر مسلمانوں کے نفوس میں جہاد فی سبیل اللہ کا صحیح مفہوم اُجاگر ہو گیا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دلوں میں اگر ایمان کی چنگاری بھی سُلگ اٹھی تو پھر مغربی تہذیب چاہے کتنی ہی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو' ...نوں کے اس جذبۂ جہاد کے سیلاب میں بہہ جائے گی۔

اب یورپی باشندوں کی ذہنیت' اسلام کی خالص دعوت کو سنتے ہی اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے' اگر اس کے ساتھ ساتھ قربانی اور جہاد بھی شامل ہو جائے تو پھر اس کی قوت و طاقت کے کیا کہنے!

دعوت کے اس مرحلہ کی مشروعیت کی حکمت

اب آپ شاید یہ سوال کریں گے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ ایک مشرک یا ملحد کو اسلام کی طرف ضرور ہی کھینچ کر لایا جائے؟ اور پھر بیسویں (اکیسویں) صدی میں اس قسم کے شرعی نقطۂ نظر کو کیسے سمجھایا جائے؟

جواب: اس کا جواب دینے سے پہلے میں یہ سوال کرتا ہوں کہ بتائیں کہ کسی بھی ملک کے ایک فرد کو اُس مملکت کے نظام اور قانون کی پیروی اور پاسداری پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے؟ حالانکہ وہ شخص حقیقی آزادی کا مالک ہے اور فطری طور پر وہ مملکت کے ہر فرد کے ساتھ حقیقی مساوات رکھتا ہے؟

بے شک انسان کو اس زمین پر اس لیے پیدا کیا گیا تاکہ یہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کی ریاست کو قائم کرے' انسان کے وجود اور اس کی تخلیق کی حکمت یہی ہے اور مندرجہ ذیل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں خلافت کا یہی معنی مقصود ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (البقرہ:۳۰)

اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے: میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔

اس مملکت اور حکومت کا فلسفہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی عبودیت اور بندگی پر قائم ہے' اور اس مملکت کا نظام اس بات کے تسلیم کر لینے پر قائم ہے کہ حاکمیت صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کی ہے' کیونکہ وہ اکیلا ہی انسانوں کا مالک ہے' وہی اکیلا کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے اور وہی اکیلا آسمانوں اور زمینوں کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

یہ بات کیسے ذہن میں آسکتی ہے کہ کوئی ریاست جس کا نظام اللہ تعالیٰ کے بندے چلا رہے ہوں' اس مملکت کی رعایا پر یہ بات تو لازم ہو کہ جو نظام' اصول اور قوانین وہ خود وضع

کریں اس کی پوری پابندی کریں لیکن ان سب کے خالق و مالک کو یہ حق نہ ہو کہ وہ انہیں احکام وقوانین کا پابند کر سکے کہ یہ تمام بندے اس خالق حقیقی کے اقتدار کی ماتحتی قبول کریں اور ہر عقیدہ و دین سے منہ موڑ کر اس کے دین کو اختیار کریں؟

انسان چونکہ اللہ تعالیٰ کا زمین میں خلیفہ ہے اور زمین پر اُس کے احکام کے نافذ کرنے کی ذمہ داری اس کو دی گئی ہے' اس لیے اس انسان کو انسان ہی کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور احکام کا پابند بنایا جا سکتا ہے' جب وہ اس دین میں داخل ہو جائے' اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کے قیام کرنے کے لیے اپنی جان و مال قربان کر دینے پر اللہ تعالیٰ سے بیعت کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد کے لیے انسان کو تخلیق فرمایا ہے۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ بیسویں صدی (یا اکیسویں صدی) میں کچھ ایسے ''عقل والے'' بھی ہیں جو اس کو سمجھنا اور اس پر مطمئن ہونا ہی نہیں چاہتے' اس لیے کہ ایسے لوگوں کا پایا جانا طبعی اور فطری امر ہے' جب تک کہ لوگوں کے درمیان ایسے گروہ رہیں گے جو اسلام کے خلاف فکری یلغار کا سلسلہ جاری رکھیں گے' تا کہ اسلامی شعور کو دنیا میں مسلسل بے ہوش کرنے والے اور سُلا دینے والے لگاتے رہیں' ایسے لوگوں کو انسانی آزادی سے اتنی ہمدردی نہیں ہوتی جتنا وہ اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے نزدیک آزادی کی کیا قدر و قیمت ہے جو خود اپنے ساتھ بھی جھوٹ بولتے ہیں اور اپنی قوموں کے سامنے بھی جھوٹ بولتے ہیں' جب وہ لوگوں کے سامنے اسلام کی جھوٹی اور قابلِ نفرت تصویریں پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے متعلق ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ یہ گویا اب بھی اپنے اونٹوں اور چوپایوں کے ساتھ دیہاتوں میں زندگی گزار رہے ہیں' وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی سمجھ حاصل کرنے کی ان کی سوچ اور کوشش کو روک سکیں اور بحث و تحقیق کے محرکات کو حقیری تارِ عنکبوت کے ذریعے قید میں لا سکیں' تا کہ اس طرح ظلم و جبر کی حکمرانی اپنی انتہائی غلیظ شکل میں قائم رہ سکے۔

یہاں یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ پُرامن دعوت' حکمت' بحث و مباحثہ اور عمدہ نصیحت کے ساتھ ہر جگہ اور ہر میدان میں پیش کرنا یہ پہلا ضروری امر ہے' جب مسلمان اس دعوت کو اس کی حقیقی صورت میں نافذ کر لیں گے تو آپ کے یقین میں اضافہ ہو گا کہ اسلام دینِ

فطرت ہے، اور مسلمان خواہ کسی قوم سے ان کا تعلق ہو، اس دین میں اپنی اُس گم شدہ متاع کو پالیں گے، اور اس سے صرف وہی لوگ پیچھے ہٹیں گے جن کے دلوں میں بغض اور کینہ ہو گا، یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ اپنے دلوں میں اسلام اور اس کے داعیوں کے خلاف دشمنی چھپائے ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ پابندی جس کا ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے، یہ ملحدین، مشرکین، بت پرستوں اور ان جیسے دیگر لوگوں کے ساتھ خاص ہے جب کہ اہل کتاب کو تو صرف اسلامی معاشرے کے نظام کو تسلیم کرنے کا ہی کہا جائے گا، ان پر اس بات کا اعتماد کرتے ہوئے کہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزارنا ان کو راہِ صواب کی جانب رہنمائی کرے گا اور انہیں عقیدہ کی درستگی اور پختگی پر اُبھارے گا۔

بادشاہوں اور رئیسوں کی طرف بھیجے جانے والے مکاتیب نبوی کے اس قصہ سے بہت سے احکام اور نتائج حاصل ہوتے ہیں جنہیں ہم اختصار کے ساتھ مندرجہ ذیل سطور میں بیان کرتے ہیں:

اوّل: رسول اللہ ﷺ جو دعوت لے کر مبعوث ہوئے، یہ دعوت ساری انسانیت کے لیے تھی، کسی خاص قوم کے لیے نہیں تھی، آپ کا پیغام پوری انسانیت کے لیے عام تھا، وہ کسی نسلی، قومی یا مخصوص جماعتی نوعیت کا نہیں تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ اس دعوت کو روئے زمین کے تمام حکمرانوں اور بادشاہوں تک پہنچانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: نبی اکرم ﷺ نے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور دیگر سخت گیر حکمرانوں کو خطوط بھیجے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی۔

دوم: ہرقل اور اس کے پیروکار، جن کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر ہیں، انہوں نے دعوت کے سلسلے میں جو مؤقف اختیار کیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب اپنے غرور و تکبر کی وجہ سے حق کو قبول کرنے سے کس قدر دُور اور باطل کے اندر کس حد تک گھس چکے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک دین، رسوم و تقالید اور تعصب میں بدل چکا ہے، وہ اسے حق و باطل کی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے، جس مقدار میں وہ اس کو اپنائے ہوئے تھے کہ وہ ان کی روایات کا ایک جزء ہے اور ان کے

تعصب اور تشخص کا ایک مظہر ہے' لیکن اس کے بعد چاہے وہ حق ہو یا باطل' اس کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔ ابتداء میں ہرقل کا مؤقف ایک غور وفکر کرنے والے اُمور کے حقائق تک پہنچنے والے شخص کی صورت میں ظاہر ہوا' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو اس طرح اپنی رعیت اور اپنے حاشیہ نشینوں کے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا اور ان کی نبض ٹٹول رہا تھا تا کہ وہ اپنی حکومت اور اقتدار بچاتے ہوئے جو کرنا چاہتا ہے' اس کے بارے میں مطمئن ہو جائے۔

سوم: رسول اللہ ﷺ کا انگوٹھی بنوانے کا عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انگوٹھی پہننا جائز ہے' آپ ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی' اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگوٹھی پر اس کے پہننے والے کا نام نقش کروانا بھی جائز ہے' بہت سے علماء نے اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ چاندی کی انگوٹھی اُس انگلی میں پہننا جس میں آپ ﷺ پہنتے تھے مستحب ہے اور وہ انگلی ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی ''خنصر'' ہے۔

چہارم: رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ دعوتِ اسلامی کو زمین کے کونے کونے میں پھیلانے کے لیے مناسب ذرائع اور وسائل اختیار کریں' ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ یہ ہے کہ جن اقوام تک وہ اسلام کی دعوت پہنچانا چاہتے ہیں اور اسلام کے احکام و مبادی سے انہیں روشناس کرانا چاہتے ہیں' ان اقوام کی زبانیں سیکھیں۔ ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ نے ایک ہی دن' چھ صحابہ کو مختلف سلاطین کی طرف اپنے مکاتیب دے کر روانہ کیا' ان میں سے ہر صحابی اس قوم کی زبان سے اچھی طرح واقف تھا جس قوم کی طرف اس کو بھیجا گیا تھا۔

پنجم: مسلمانوں کی ذاتی اصلاح کے سلسلے میں حضور ﷺ کا یہ عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ پہلے اپنے درمیان دعوت کا فریضہ انجام دیں اور اپنی اصلاح کریں حتیٰ کہ جب اس ڈگر پر کافی فاصلہ طے کریں اور اسلامی نظام کو اپنی زندگی اور اپنے معاملات میں نافذ کر لیں تو پھر وہ وقت آئے گا جب اس دوسرے فریضہ کو انجام دیتے ہوئے دوسروں کو اسلام کی دعوت دیں' نبی اکرم ﷺ متعدد صحابہ کرام کو ان سلاطین اور رؤسا کی طرف اس وقت سے بہت پہلے بھیج سکتے تھے' لیکن

اس صورت میں اس فریضہ کی انجام دہی نہ ہوتی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس بات کو جانیں کہ مسلمانوں کی ذاتی اصلاح دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے کا ایک اہم جزء ہے' لوگ اخلاق و کردار میں صالح نمونہ کی جستجو میں رہتے ہیں تا کہ اس کے نقش قدم پر چلیں' اور اس کی اتباع کریں۔ اگر آج مسلمان اپنے اسلام پر فخر کرتے ہوئے اس کے اصول ومبادی اور احکام کو اپنا معاشروں میں نافذ کریں تو اس کی نورانی کرنوں سے افریقہ کے بیابانوں اور یورپ کے دور دراز کے علاقے منور اور روشن ہو جائیں گے۔

یہ مکاتیب اور رسائل ۷ ہجری کے دوران ارسال کیے گئے جیسے کہ ہم نے ذکر کیا' یعنی فتح مکہ سے قبل یہ مکاتیب گرامی ارسال کیے گئے' عموی علماء سیرت کا اس بات پر اتفاق ہے لیکن امام بخاری کا موقف اس سے مختلف ہے' انہوں نے اپنی صحیح میں مکاتیب نبوی کا ذکر غزوۂ تبوک کے بعد کیا ہے' اس سے پتا چلتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک یہ مکاتیب ۹ ہجری میں بھیجے گئے۔

امام ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان مذکورہ بالا دونوں اقوال میں تطبیق اس طرح کی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ نے قیصر کو دو مرتبہ مکتوب بھیجا اور دوسری مرتبہ مکتوب بھیجنے کی صراحت مسند امام احمد سے ہوتی ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے اُس نجاشی کو بھی مکتوب بھیجا جو اسلام لے آیا اور آپ نے اس کی وفات پر نمازِ جنازہ بھی پڑھائی' پھر اس کے بعد اس کے جانشین دوسرے نجاشی کو بھی مکتوب بھیجا جو کافر تھا۔

عمرۃ القضاء

رسول اللہ ﷺ غزوۂ خیبر اور مختلف سرایا سے فراغت کے بعد ماہِ ذی القعدہ ۷ ہجری کو عمرۂ قضاء کے ارادے سے مکہ روانہ ہوئے' یہی وہ مہینہ تھا جس میں ایک سال قبل مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو عمرہ کرنے سے روکا تھا لیکن اب کی بار آپ ﷺ نے عمرۂ قضاء کیا۔

ابن سعد اپنی کتاب ''طبقات'' میں لکھتے ہیں کہ اس دفعہ آپ ﷺ کی معیت میں دو ہزار صحابہ نے عمرہ ادا کیا' ان میں صلح حدیبیہ میں شرکت کرنے والے جملہ صحابہ بھی شامل تھے سوائے اُن کے جو وفات پا گئے یا غزوۂ خیبر میں شہید ہوئے۔ ان کے علاوہ صلح حدیبیہ میں

شرکت کرنے والوں میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہا۔ (طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۶۷)

ابنِ اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے آپس میں یہ باتیں کیں کہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے صحابہ تنگ دستی' مشقت اور مصیبت کا شکار رہے ہیں۔ ابن اسحاق مزید لکھتے ہیں کہ مشرکین دارِ ندوہ کے پاس جمع ہو کر کھڑے ہو گئے تا کہ وہ آپ ﷺ کو اور آپ کے صحابہ کو دیکھیں' پھر جب آپ ﷺ مسجدِ حرام میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے ''اضطباع'' کیا یعنی احرام کی چادر کو دائیں کندھے کی بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر رکھا اور دایاں بازو باہر نکالا' پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ اُس بندے پر رحم فرمائے جو آج ان لوگوں کو اپنی طاقت دکھائے' پھر آپ نے رکن کو استلام کیا اور آپ ﷺ تیزی سے چلے' صحابہ کرام بھی آپ کے ساتھ تیزی سے چل پڑے۔ آپ ﷺ تین چکروں میں اسی طرح (کندھے اُٹھا کر' سینہ پھلا کر اور تیز تیز قدم اُٹھا کر) چلے اور سب صحابہ کرام بھی آپ ﷺ کی معیت میں اسی طرح چلے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ خیال کرتے تھے کہ رَمَل (طواف کے پہلے تین چکروں میں اکڑ اکڑ کر چلنا) آئندہ کے لیے اُن پر لازم نہیں کیونکہ رمل کا حکم آپ ﷺ نے صرف اس لیے دیا تھا کہ مشرکین باتیں کرنے لگے تھے (کہ یثرب کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو بیمار اور لاغر کر دیا ہے) لیکن جب آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں رمل کیا تو یہ سنت بن گئی۔[1]

آپ ﷺ نے اسی موقع پر حضرت میمونہ بنت حارث سے نکاح فرمایا' ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے احرام کی حالت میں ہی یہ عقدِ نکاح کیا' اور ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے احرام کھولنے کے بعد نکاح فرمایا۔ حضرت میمونہ کا نکاح آپ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب نے کروایا' جو حضرت میمونہ کی بہن حضرت اُمِ فضل کے شوہر تھے۔

(عیون الاثر ج ۲ ص ۱۴۸)

جب مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ کو ٹھہرے ہوئے تین دن گزر گئے (اور یہی وہ مدت تھی جتنے دن ٹھہرنے کی قریش نے اجازت دی تھی) تو قریش نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷۰' یہ مضمون قریب قریب الفاظ میں بخاری و مسلم میں موجود ہے۔

طرف ایک وفد بھیجا اور کہا کہ آپ اپنے آقا سے کہیں کہ تین دن کی معینہ مدت ختم ہوگئی ہے لہٰذا اب آپ چلے جائیں' پس آپ ﷺ پھر وہاں سے نکلے اور واپسی کا سفر شروع فرمایا۔

(رواہ البخاری ج ۵ ص ۸۵)

مدینہ منورہ کی طرف سفر کے دوران تنعیم کے قریب مقام ''سَرِف'' پر حضور ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شبِ زفاف گزاری' پھر ماہِ ذی الحجہ میں آپ ﷺ مدینۃ المنورہ واپس پہنچے۔

اسباق ونصائح

اس عمرہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس وعدے کی تصدیق وتعبیر ہے جو وعدہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ یہ سب مکہ میں داخل ہوں گے اور بیت اللہ کا طواف کریں گے۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ کس طرح صلح حدیبیہ کے دوران جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ بیت اللہ کی زیارت اور اس کا طواف کریں گے؟ تو حضور ﷺ نے جواب دیا: ہاں! کیوں نہیں! کیا میں نے تمہیں یہ کہا تھا کہ اسی سال مکہ میں داخل ہوں گے؟ حضرت عمر فاروق نے عرض کیا: نہیں! یارسول اللہ! تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک تم ضرور بیت اللہ میں داخل ہوگے اور بیت اللہ کا طواف کروگے۔

اب ایک سال کے بعد یہ عمرۂ قضاء آپ ﷺ کے اُسی وعدے کی عملی تصویر اور تکمیل تھی' اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصدیق اپنے کلامِ مقدس میں یوں فرمائی:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَالَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۝ (الفتح:۲۷)	یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ کہ تم ضرور داخل ہوگے مسجد حرام میں جب اللہ نے چاہا امن وامان سے' منڈواتے ہوئے اپنے سروں کو یا ترشواتے ہوئے تمہیں (کسی کا) خوف نہ ہوگا' پس وہ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے تو

اس نے عطا فرمادی (تمہیں) اس سے پہلے
ایسی فتح جو قریب ہے O

پھر یہی وہ عمرہ ہے جو اُس فتحِ عظیم کی تمہید ثابت ہوا' جو فتح و نصرت بعد میں مسلمانوں کو ملی' آپ ﷺ کی معیت میں جو مہاجرین و انصار کا یہ جمِ غفیر عمرہ کے لیے آیا اور انہوں نے جس چستی اور نشاط سے طواف' سعی اور مناسکِ عمرہ ادا کیے' اس ولولے اور جذبے کو دیکھ کر مشرکینِ مکہ حیران و ششدر رہ گئے اور مسلمانوں کا رعب ان کے دلوں میں بیٹھ گیا' کیونکہ مشرکینِ مکہ تو یہ تصور کر رہے تھے کہ مسلمان یثرب کی طرف ہجرت کرنے کے بعد لاغر اور کمزور ہو چکے ہوں گے کیونکہ یثرب کا بخار اور اس کی ناساز آب و ہوا نے ضرور مہاجرین پر اپنا اثر جمایا ہوگا لیکن اب صحابہ کرام کی چستی اور نشاط کو دیکھ کر وہ رعب زدہ ہو گئے۔

امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مشرکین نے جب مسلمانوں کو طواف کے دوران رمل کرتے ہوئے اور چاک و چوبند سعی کرتے ہوئے دیکھا تو وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے: یہ ہیں وہ مسلمان جن کے بارے میں تم خیال کر رہے تھے کہ بخار نے ان کو ناتواں و کمزور کر دیا ہے؟ یہ تو فلاں فلاں سے بھی زیادہ طاقت ور ہیں۔
(مسلم ج ۵ ص ۶۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عمرہ جس شکل میں مکمل ہوا' اس نے مشرکین کے نفوس پر گہرے اثرات چھوڑے اور اس عمرہ نے فتح مکہ کی پُرامن بنیاد ڈالی' عنقریب اس کی وضاحت ہوگی' پھر عمرۂ قضاء سے ہمیں مندرجہ ذیل احکام و نتائج حاصل ہوتے ہیں:

اوّل: اضطباع اور رمل کا استحباب۔

اسی عمرہ میں آپ ﷺ نے اضطباع اور رمل فرمایا۔

اضطباع: اس سے مراد ہے احرام کی ایک چادر دائیں کندھے کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے کے اوپر ڈالنا' طواف کے دوران یوں ہی احرام باندھا جاتا ہے' آپ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے' یہ مستحب عمل ہے۔

رَمَل: اس سے مراد ہے: طواف کے پہلے تین چکروں میں کندھے اُٹھا کر' سینہ پھیلا کر' تیز تیز قدم اٹھا کر چلنا' ایسا اُس طواف میں کیا جائے گا جس کے بعد سعی کرنا ہو کیونکہ آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا۔ اضطباع اور رمل دونوں مستحب عمل ہیں۔

لیکن مذکورہ بالا دونوں عمل عورتوں کے لیے نہیں' یہ صرف مردوں کے لیے ہیں۔

دوم: بعض فقہاء کے نزدیک حج یا عمرہ کے احرام باندھنے کے دوران عقدِ نکاح جائز ہے' ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احرام باندھے ہوئے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے عقدِ نکاح فرمایا۔

لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک حالتِ احرام میں مطلقاً نہ نکاح جائز ہے اور نہ ہی وکالتِ نکاح جائز ہے۔ (مغنی المحتاج ج ۲ ص ۲۱۸)

احناف کے نزدیک حالتِ احرام میں عقدِ نکاح مطلقاً حرام نہیں کیونکہ احناف نکاح سے مراد جماع لیتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان المحرم لاینکح ولا ینکح. بے شک محرم (احرام باندھنے والا) نہ نکاح کرے اور نہ ہی اس کا نکاح کیا جائے۔

احناف اس حدیثِ طیبہ میں نکاح سے مراد جماع لیتے ہیں۔ (رواہ مسلم)

یہ عمرہ ملا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار عمرے کیے اور ایک حج کیا۔ امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار عمرے ادا کیے' تمام عمرے ذی القعدہ میں ادا کیے سوائے آخری عمرہ کے جو حجۃ الوداع کے ساتھ کیا۔

ایک عمرہ حدیبیہ کی طرف سے آ کر کیا جو (صلح) حدیبیہ کے زمانے میں ذوالقعدہ میں کیا' دوسرا اس کے بعد والے سال ذوالقعدہ میں کیا' تیسرا عمرہ جعرانہ کی طرف سے آ کر کیا' جب آپ نے غزوۂ حنین کا مالِ غنیمت تقسیم فرمایا' یہ بھی ذوالقعدہ میں کیا اور چوتھا عمرہ آپ نے آخری حج کے ساتھ کیا۔ (مسلم ج ۵ ص ۶۰)

غزوۂ موتہ

یہ غزوہ جمادی الاولیٰ ۸ ہجری میں واقع ہوا' شام کی سرحد پر ایک بستی کا نام موتہ ہے' آج کل اس بستی کا نام "کرک" ہے۔

اس غزوہ کا سبب جیسا کہ پہلے بھی ہم نے ذکر کیا کہ حضرت حارث بن عمیر الازدی رضی اللہ عنہ کا قتل تھا' حضور ﷺ نے ان کو والی بصریٰ کی طرف قاصد بنا کر بھیجا تو اُس نے آپ کو قتل کر دیا' حضور ﷺ نے جتنے بھی بادشاہوں کی طرف قاصد بھیجے اُن میں سے صرف حضرت حارث بن عمیر الازدی کو ہی شہید کیا گیا' اس پر لوگوں نے ملکِ شام کی طرف بدلہ لینے کی غرض سے نکلنے کا ارادہ کیا' اور جلد ہی موتہ کی طرف نکلنے کے لیے تین ہزار مجاہدین کا لشکر جمع ہو گیا۔

حالانکہ حضور ﷺ اس لڑائی میں بذاتِ خود شریک نہ ہوئے لیکن اس کے باوجود اس جنگ کو غزوہ کا نام دیا جاتا ہے' کیونکہ جس لڑائی میں آپ ﷺ بذاتِ خود شریک نہ ہوئے ہوں اس کو سریہ کہتے ہیں لیکن عام علماء سیرت اس جنگ کی اہمیت اور اس میں صحابہ کی کثرت سے شرکت کی بناء پر اس کو غزوہ کا ہی نام دیتے ہیں۔

موتہ کے مجاہدین کو رسول اللہ ﷺ نے روانہ کرتے ہوئے فرمایا:

لشکر کا امیر زید بن حارثہ ہے' پس اگر یہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابو طالب ہوں گے اگر یہ بھی شہید ہو جائیں تو امیر عبداللہ بن رواحہ ہوں گے اور اگر یہ بھی شہید ہو جائیں تو ان میں سے جس شخص کو لوگ پسند کریں اس کو اپنا امیر چن لیں۔[1]

حضور ﷺ نے مجاہدین کو نصیحت فرمائی کہ تم سب سے پہلے وہاں جا کر اُن کو اسلام کی دعوت دینا' اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں تو ٹھیک بصورتِ دیگر ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا اور اُن سے جنگ کرنا۔

حضرت ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ان مجاہدین اور ان کے امراء کو مدینہ منورہ سے نکلتے وقت حضور ﷺ اور آپ کے اصحاب نے الوداع کیا' اس اثناء میں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ رونے لگے' صحابہ کرام نے اُن سے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم! مجھے نہ دنیا سے محبت ہے اور نہ ہی تمہارا عشق ہے لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے' جس میں جہنم کا ذکر ہے:

---

[1] صحیح بخاری' مسند احمد' طبقات ابن سعد۔ صحیح بخاری میں روایت کا آخری حصہ: اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر جس کو چاہیں اس کو امیر لشکر بنالیں' موجود نہیں ہے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّاO (مریم:۷۱)

اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا یہ آپ کے رب پر لازم ہے (اور اس کا) فیصلہ ہو چکا ہےO

اب میں نہیں جانتا کہ جہنم پر سے گزر ہونے کے بعد کیسے لوٹوں گا۔ لشکر روانہ ہو چکا تو مسلمانوں نے اس کے لیے دعا کی اور کہا: اللہ تعالیٰ کی معیت تمہیں حاصل رہے، وہ تمہاری حفاظت فرمائے اور تمہیں صحیح سلامت ہماری طرف لوٹائے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن رواحہ نے یہ اشعار پڑھے:

لکنني اسال الرحمٰن مغفرة وضربة ذات فرع تقذف الزبدا

(ترجمہ:) لیکن میں ربِ رحمٰن سے مغفرت کا سوال کرتا ہوں اور ایسی ضرب کا سوال کرتا ہوں جو وسیع ہو اور جھاگ پھینک رہی ہو۔

او طعنة بيدي حرّان مجهزة بحربة تنفذ الاحشاء والكبدا

(ترجمہ:) یا ایسے نیزے کے وار کا سوال کرتا ہوں جو خون کے پیاسے کافر کے دونوں ہاتھوں سے لگایا گیا ہو جو نیزے پر پورا زور لگائے انتڑیوں اور جگر کو پار کر دے۔

حتى يقال اذا مرّوا على جدثي ارشده الله من غاز وقد رشدا

(ترجمہ:) یہاں تک کہ اس وقت یہ بات کہی جائے جب میری قبر کے پاس سے لوگ گزریں، اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح راستہ کی راہنمائی کی اور وہ ہدایت یافتہ ہو گیا۔

جب دشمن کو پتا چلا کہ لشکر اسلام مدینہ سے کوچ کر چکا ہے تو وہ سب جمع ہونے لگے ہرقل نے ملکِ روم سے ایک لاکھ کا لشکر جمع کیا اور شرحبیل بن عمرو نے مزید ایک لاکھ جوانوں کا لشکر لخم، جذام، قین اور بہراء کے قبائل سے جمع کیا، جو سب رومیوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔

مسلمانوں نے جب رومیوں کی جنگی تیاری کا سنا تو ملکِ شام کے علاقے معان میں اترے، دو دن یہاں ٹھہرے اور جنگی حکمتِ عملی کے بارے غور و فکر کرتے رہے۔

بعض صحابہ کرام نے مشورہ دیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو خط لکھتے ہیں اور آپ کو دشمنوں کی تعداد کے بارے میں خبر دیتے ہیں، لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے

اس موقع پر مجاہدین کو حوصلہ دلایا اور انہیں کہا: اے قوم! اللہ تعالیٰ کی قسم! جس کو تم ناپسند کرتے ہو اسی کے لیے ہی تو تم نکلے ہو' تم تو شہادت کے طلب گار ہو' ہم لوگوں سے تعداد' قوت اور کثرت کی بنیاد پر جنگ نہیں کرتے بلکہ ہم تو اس دین کے لیے لوگوں سے جنگ کرتے ہیں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عزت و تکریم بخشی ہے' آگے بڑھو! اور دو اچھائیوں میں سے ایک تو نصیب ہو گی' یا فتح ہو گی یا شہادت!

مسلمانوں کا دشمن سے آمنا سامنا کرک کے علاقے سے کچھ پیچھے ہی ہوا' دشمن کی تعداد' اسلحہ اور نیزے اس قدر زیادہ تھے کہ اس سے قبل مسلمانوں نے ایسا کبھی نہ دیکھا تھا' سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عطا کردہ جھنڈا اٹھایا اور جنگ شروع کی' سب مسلمان بھی آپ کی معیت میں جنگ کرتے رہے حتیٰ کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو نیزے لگنے سے جسم چھلنی ہو گیا اور وہ شہید ہو گئے' پھر حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ نے جھنڈا اٹھا ما اور خوب جنگ ہوئی' آپ دشمن پر عذاب بن کر ٹوٹ پڑے' جب خوب گھمسان کا رن پڑا تو آپ اپنے گھوڑے سے نیچے اترے اور گھوڑے کی کونچیں کاٹ ڈالیں' پھر آگے بڑھ کر دشمن سے پیادہ جنگ کرنے لگے اور زبان سے یہ رجز پڑھ رہے تھے:

یا جبذا الجنۃ واقترابھا　　　طیبۃ وباردًا شرابھا

(ترجمہ:) جنت اور اس کا قرب کتنا اچھا ہے' اس کا مشروب پاکیزہ اور ٹھنڈا ہے۔

والروم روم قددنا عذابھا　　　کافرۃ بعیدۃ انسابھا

(ترجمہ:) یہ رومی وہ رومی ہیں جن کا عذاب قریب آ چکا ہے' یہ کافر ہیں اور ان سب کا نسب ہم سے بہت دور ہے۔

علیّ اذ لاقیتُھا ضربھا

(ترجمہ:) مجھ پر لازم ہے کہ ان پر ضرب لگاؤں اگر میں ان سے جنگ کروں۔

آپ رضی اللہ عنہ اسی طرح جنگ کرتے رہے حتیٰ کہ آپ شہید ہو گئے' دشمن نے آپ رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا اور آپ کے جسم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا' آپ رضی اللہ عنہ کے جسم پر پچاس زخم تھے لیکن پیٹھ پر کوئی بھی زخم نہیں تھا۔ (رواہ البخاری)

ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا اٹھایا اور آگے

بڑھے، آپ رضی اللہ عنہ یہ رجز پڑھ رہے تھے:

اقسمت یانفس لتنزلنه　　لتنزلن او لتكرهنه

(ترجمہ:) میں نے قسم اٹھائی تھی اے نفس! کہ تو ضرور میدانِ جنگ میں اترے گا تو خوشی سے اُترے گا یا تجھے جنگ کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

ان اجلب الناس وشدوا الرنة　　مالي اراك تكرهين الجنة

(ترجمہ:) اگر لوگ واویلا کرتے اور شدت سے روتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ میں تجھے دیکھتا ہوں کہ تو جنت میں جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

قد طال ما قد كنت مطمئنة　　هل انت الا نطفة في شنة

(ترجمہ:) بہت طویل عرصہ گزر چکا ہے تو اس پر تو مطمئن تھا، تو تو صرف ایک نطفہ ہے جو کسی پرانے مشکیزے میں پڑا ہو۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اسی طرح جنگ کرتے رہے حتیٰ کہ شہید ہو گئے، ان کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے پر اتفاق کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا اٹھایا اور کفار کے خلاف خوب جنگ کی، بالآخر دشمن کو شکست ہوئی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو جمع کیا اور واپس مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید، حضرت جعفر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ کی شہادت کی خبر مدینہ آنے سے پہلے ہی لوگوں کو دے دی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پہلے جھنڈا زید نے اٹھایا، پس وہ شہید ہو گئے، پھر جھنڈا جعفر نے سنبھال لیا تو وہ بھی شہید ہو گئے، پھر ابن رواحہ نے جھنڈا لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے (یہ بات کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چشمانِ مبارکہ اشک بار تھیں)، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہاں تک کہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے یہ جھنڈا سنبھال لیا حتیٰ کہ اس کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے کافروں پر فتح عطا فرمائی۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ یہ حدیثِ طیبہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

مسلمانوں کی مدد و تائید فرمائی اور بالآخر فتح ہوئی۔ ایسی بات نہیں جیسا کہ بعض سیرت نگاروں نے لکھا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی اور وہ متفرق ہو گئے' اور اس کے بعد وہ مدینہ لوٹ آئے' جن سیرت نگاروں نے یہ بات لکھی ہے شاید ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں نے رومیوں اور ان کے اتحادیوں کی شکست کے بعد ان کا پیچھا نہیں کیا اور دشمن کو صرف ان کی پڑاؤ والی جگہوں سے نکالنے پر ہی اکتفاء کیا اور مزید جانی نقصان سے بچنے کے پیش نظر محاذِ جنگ سے ہٹ گئے اور وہیں سے پلٹ کر واپس مدینہ منورہ لوٹ آئے' اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے زیرک شخص کی تدبیر تھی۔

امام ابن حجر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ بن عقبہ کی کتاب "المغازی" جو کہ سب سے زیادہ صحیح ہے' اس میں آپ کا یہ قول صراحۃً موجود ہے: پھر جھنڈا عبداللہ بن رواحہ نے اٹھایا' پس وہ شہید ہو گئے' پھر مسلمانوں نے بالاتفاق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اپنا امیر چن لیا' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کیا اور مسلمانوں کو فتح مرحمت فرمائی۔

امام عماد بن کثیر کہتے ہیں: ان دونوں اقوال کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ حضرت خالد نے حکمتِ عملی سے تمام مسلمانوں کو جمع کیا ہو' رات وہیں گزاری ہو' پھر صبح کو انہوں نے جنگی چال تبدیل کر دی ہو اور میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ بنا دیا ہو تاکہ دشمن کو وہم گزرے کہ مسلمانوں کو پیچھے سے تازہ دم فوج کی کمک پہنچ آئی ہے' پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دشمن پر حملہ کر دیا ہو' جس سے وہ کفار شکست کھا کر بھاگ نکلے ہوں' پھر حضرت خالد نے ان کا پیچھا نہ کیا ہو بلکہ مدینہ واپس لوٹنے کو ہی بڑی غنیمت سمجھا ہو۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۳۶۲-۳۶۱)

واپس آتے ہوئے جب مسلمانوں کا یہ لشکر مدینہ منورہ کے قریب پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا' بچے بھی دوڑتے ہوئے اُن کو ملے' آپ ﷺ نے فرمایا: بچے لے لو اور ان کو اپنی سواریوں پر سوار کر لو اور جعفر کا بیٹا مجھے دے دو' چنانچہ عبداللہ بن جعفر کو لایا گیا اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا گیا' آپ ﷺ نے اُسے پکڑ کر سواری پر اپنے آگے بیٹھا لیا۔

لوگوں نے اونچی آواز میں چلانا شروع کر دیا: اے بھگوڑو! تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے سے بھاگے ہو' اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: یہ بھگوڑے نہیں بلکہ ان شاء اللہ یہ پلٹ کر

حملہ کرنے والے ہیں۔

اسباق ونصائح

اس غزوہ میں سب سے زیادہ اہم اور خوف ناک بات یہ تھی کہ مسلمان مجاہدین اور ان کی تعداد اور اہلِ روم ومشرکینِ عرب کی فوج کی تعداد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مشرکینِ عرب اور رومی فوجوں کی تعداد تقریباً دولاکھ تھی' جب کہ مسلمان مجاہدین کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی' اس بات کو ابن اسحاق' ابنِ سعد اور عام کتبِ سیرت کے مصنفین نے روایت کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشرکینِ عرب اور رومی فوجوں کی تعداد مسلمانوں کی فوج سے پچاس گنا سے بھی زیادہ تھی۔

دونوں فوجوں کی تعداد کی اس نسبت پر غور کریں اور جیشِ اسلامی کی قلت اور لشکرِ کفار کی کثرت کا تصور کریں تو یوں لگتا ہے جیسے ایک بحرِ بیکراں کے سامنے ایک چھوٹی سی آب جُو ہو اور اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ دشمنانِ اسلام نے اس غزوہ میں اپنی تعداد کی کثرت' اسلحہ کی تیاری' اپنی شان وشوکت اور رعب ودبدبہ کے اظہار کا کتنا زیادہ اہتمام کیا جب کہ ان کے مقابلے میں مسلمان تعداد میں کمی اور ساز وسامان میں قلت کا شکار تھے۔

اس سب کچھ کے باوجود' تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ سریہ تھا' یعنی رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود اس میں شریک نہیں تھے' لیکن پھر بھی صحابہ علیہم الرضوان' مسلسل آگے بڑھتے رہے اور پسپا نہ ہوئے۔ صحابہ کرام نے اپنے سامنے اس لشکرِ جرار کو کوئی اہمیت نہ دی حالانکہ دشمن اتنی بڑی تعداد میں تھا کہ اگر انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتا تو ان کے درمیان مجاہدینِ اسلام کا مٹھی بھر لشکر یوں لگتا تھا جیسے چٹیل میدان میں چھوٹی سی گٹھلی ہو' لیکن صحابہ کرام جذبۂ جہاد سے سرشار پے درپے کامیابی حاصل کر رہے تھے۔

پھر اس سب کے بعد مقامِ تعجب یہ ہے کہ مسلمان مجاہدین لشکرِ کفار کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے سامنے پوری جرأت اور بہادری سے ثابت قدم اور قائم تھے' حالانکہ مسلمانوں کے تین سپہ سالار یکے بعد دیگرے شہید ہوئے' لیکن پھر بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش تک نہ آئی' مسلمان ذوق وشوق اور جذبۂ ایمان سے شہادت کے دروازے پر دستک دیتے رہے' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اُس کثیر لشکر کے دلوں میں ان کا رعب

ڈال دیا' حالانکہ اس کا کوئی ظاہری سبب بھی نہ تھا' کیونکہ بہ ظاہر مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن جب مشرکین کے دلوں میں رعب طاری ہو گیا تو وہ پیٹھ پھیر کر میدان سے بھاگنے لگے' اس موقع پر بے حد و بے حساب کفار مارے گئے۔

ہر قسم کی حیرت اور تعجب اُس وقت زائل اور ختم ہو جاتا ہے' جب ہم ایمان باللہ کی طاقت' اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا کی قوت' اور اس کے وعدے پر یقین کی عملی تصویر کو مسلمانوں کی فتح و نصرت کی صورت میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

بلکہ مسلمانوں کی بہ نسبت حیران کن بات یہ ہے کہ یہ تعداد' ساز و سامان اور اسلحہ کی کثرت کی بنیاد پر جہاد نہیں کرتے بلکہ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حق کے راستے میں ان کی مدد و نصرت' تائید اور جنت و نعیم کا مژدہ سنایا ہے' جیسا کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مسلمان تعداد' قوت اور کثرت کی بنیاد پر جہاد نہیں کرتے بلکہ یہ تو اس دینِ اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کرتے ہیں' جس دین کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت و تکریم سے نوازا ہے۔

پھر یہ غزوہ اپنے اندر بے شمار دروس اور واضح نشانیاں رکھتا ہے' جنہیں ہم نیچے ذکر کرتے ہیں:

اوّل: حضور ﷺ نے لشکرِ اسلام کو نامزد امراء کی شہادت کے بعد امیر مقرر کرنے کے متعلق جو نصیحت فرمائی' یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خلیفۃ المسلمین یا رئیس المسلمین کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی امارت (امیر بنانے) کو کسی شرط سے مشروط کر دے یا وہ خلیفہ بالترتیب مسلمانوں کے متعدد امیر مقرر کر دے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت زید' پھر حضرت جعفر اور پھر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کو بالترتیب امیر مقرر فرمایا۔

علماء فرماتے ہیں: صحیح بات یہ ہے کہ جب خلیفہ اس طرح کا حکم دے دے تو ایک ہی وقت میں تمام امراء کی ولایت منعقد ہو جاتی ہے' لیکن یہ ولایت بالترتیب ہی نافذ ہو گی۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۳۶۱)

دوم: حضور ﷺ کی یہ نصیحت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جب مسلمانوں کا امیر غائب ہو جائے یا خلیفہ نے ان کو اپنا امیر مقرر کرنے کا اختیار تفویض کر دیا ہو تو ان دونوں

صورتوں میں مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ اجتہاد کر کے اپنا امیر مقرر کریں۔

امام طحاوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: یہ وہ اصول ہے جس سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا امیر جب غائب ہو جائے تو اس کے واپس آ جانے تک قائم مقام امیر مقرر کر لینا مسلمانوں پر لازم ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نصیحت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی مسلمانوں کا اجتہاد کرنا جائز و مشروع ہے۔

سوم: غزوۂ موتہ کے ان واقعات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی پے در پے شہادت کی خبر جب اپنے صحابہ کو سنائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چشمانِ مقدسہ سے آنسو بہہ نکلے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور اس لشکر اسلام کے درمیان سینکڑوں میل کی مسافت تھی! (لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عین اُسی وقت مدینۃ المنورہ میں معلوم ہو گیا کہ یہ تینوں سپہ سالار یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے ہیں)۔

یہ واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے زمین کو سمیٹ دیا تھا، جس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینۃ المنورہ میں بیٹھ کر شام کی سرحدوں پر جہاد کرنے والے مسلمانوں کے احوال کا عینی مشاہدہ فرما رہے تھے، اس کے علاوہ صحابہ کرام سے جو روایات مروی ہیں، ان سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے بے شمار معجزات اور خوارق اپنے حبیبِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرما کر ان کو عزت و تکریم سے نوازا۔

یہی حدیثِ طیبہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے کتنی محبت اور اُن پر کس قدر شفقت فرماتے، یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اپنے اصحاب میں کھڑے ہو کر اُن شہداء کا ذکر فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آبدیدہ ہو گئے، اور آپ کو یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُن شہداء کا ذکر کر کے آبدیدہ ہو جانا قضائے الٰہی پر راضی برضا رہنے کے منافی نہ تھا، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

بے شک آنکھ روتی ہے اور دل غم زدہ ہوتا ہے۔

یہ طبعی رقت و نرمی اور فطری رحمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائی ہے۔

چہارم: یہ حدیثِ طیبہ جس میں آپ ﷺ نے ان تین صحابہ کرام کی شہادت کی خبر دی' اسی حدیث طیبہ میں آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خاص فضیلت و درجے کا اعلان بھی فرمایا۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حتیٰ کہ جھنڈا لیا اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہوئے' کیونکہ ابھی آپ کو اسلام قبول کیے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا' یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ''سیف اللہ'' کا لقب عطا فرمایا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس غزوہ میں سخت آزمائش میں مبتلا ہوئے اور خوب دادِ شجاعت دی' امام بخاری نے آپ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت کیا ہے' آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: غزوۂ موتہ کے دن میرے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں اور آخر میں میرے ہاتھ میں ایک یمنی چوڑی تلوار باقی رہ گئی۔

امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں نے اس غزوہ میں بے شمار مشرکین کو قتل کیا۔

جب لشکرِ اسلام مدینۃ المنورہ واپس لوٹا تو بعض لوگوں نے مجاہدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے بھگوڑو! تم اللہ کے راستے سے بھاگے ہو' یہ جملہ استعمال کرنے کا سبب اور اس طرح مخاطب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ لشکرِ اسلام نے دوسرے غزوات کی طرح اس غزوہ میں مسلمانوں کی فتح اور کفار کی شکست کے بعد ان کا پیچھا نہ کیا' میدان سے دشمن کے بھاگ جانے کے بعد ان کا پیچھا کیے بغیر سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر واپس چلے آئے' حالانکہ گزشتہ غزوات میں ایسا نہیں کرتے تھے' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسی پر اکتفاء کیا اور مدینۃ المنورہ واپسی کا ارادہ کیا۔ مسلمانوں کی حفاظت اور رومیوں کے دلوں پر طاری رعب اور ہیبت کو باقی رکھنے کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہ پرحکمت جنگی تدبیر اختیار فرمائی' اسی وجہ سے آپ ﷺ نے لوگوں کی اس بات کا جواب ان الفاظ میں ارشاد فرمایا:

یہ بھگوڑے نہیں! بلکہ ان شاء اللہ یہ پلٹ کر حملہ کرنے والے ہیں۔

فتح مکہ

فتح مکہ ماہِ رمضان المبارک ۸ ہجری میں ہوئی۔

سبب: (صلح حدیبیہ کے وقت قبیلہ بنوبکر نے قریش سے باہمی امداد کا معاہدہ کیا اور قبیلہ بنوخزاعہ نے رسول اللہ ﷺ سے امدادِ باہمی کا معاہدہ کرلیا' یہ دونوں قبیلے مکہ کے قریب ہی آباد تھے لیکن ان دونوں قبائل میں عرصہ دراز سے باہمی عداوت و دشمنی چلی آ رہی تھی) اب یہ ہوا کہ قبیلہ بنوبکر کے کچھ لوگوں نے قریش کے اشراف سے قبیلہ بنوخزاعہ کے خلاف جنگ کے لیے کچھ آدمی اور اسلحہ مانگا تو قریش نے بنوخزاعہ کے خلاف جنگ کے لیے اپنے آدمی اور اسلحہ فراہم کردیا۔ قریش کے آدمیوں کا ایک گروہ اپنا بھیس بدل کر چہروں پر نقاب ڈال کر نکل کھڑا ہوا۔ "وتیر" نامی جگہ پر سے یہ لوگ بنوخزاعہ پر حملہ آور ہوئے' بنوخزاعہ رات کے وقت اپنے گھروں میں بے خوف وخطر اطمینان سے سوئے پڑے تھے کہ اُن پر شب خون مارا گیا' ان حملہ آوروں میں قریش کے بڑے بڑے سردار بھی شامل تھے جن میں صفوان بن امیہ' حویطب بن عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص پیش پیش تھے۔

ان حملہ آوروں نے بنوخزاعہ کے بیس آدمیوں کو بے دردی سے قتل کردیا' اس حادثہ کے بعد قبیلہ بنوخزاعہ کے سردار عمرو بن سالم الخزاعی اپنے قبیلہ کے چالیس آدمیوں کا وفد لے کر مدینۃ المنورہ کی طرف عازمِ سفر ہوا تا کہ اس حادثہ فاجعہ کی خبر بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں پہنچائے۔ جب آپ ﷺ کے سامنے ان مظالم کی روئیداد پیش کی گئی جو قریش اور بنوبکر نے اُن پر ڈھائے تو آپ ﷺ غصہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی ردائے مبارک سنبھالتے ہوئے ارشاد فرمایا: اگر میں بنی کعب کی امداد نہ کروں تو میری مدد نہ کی جائے' میں اُن کا ہر اس چیز سے دفاع کروں گا جس سے میں اپنی ذات کا دفاع کرتا ہوں۔

اور پھر فرمایا: بادل کا یہ ٹکڑا بنوکعب کو مدد ملنے کی خوش خبری سنا رہا ہے۔[1]

---

[1] ابن سعد نے اسے "طبقات" میں روایت کیا ہے' اسے ابن اسحاق نے بھی روایت کیا ہے' ابن حجر فرماتے ہیں: اس روایت کو بزاز' طبرانی اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے۔

قریش سے جو یہ واقعہ سرزد ہوا' اس پر وہ نادم ہوئے اور لعنت ملامت کرنے لگے' پھر انہوں نے ابوسفیان بن حرب کو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بھیجا تاکہ معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کی جائے اور اس کی مدت کا تعین کر لیا جائے' چنانچہ ابوسفیان مدینۃ المنورہ میں آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس حادثہ کے متعلق گفتگو کی اور معاہدہ کی تجدید کی درخواست کی لیکن آپ ﷺ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا' پھر وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور اُن سے بات کی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سفارش کریں' تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں کچھ نہیں کر سکتا' پھر وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اُن سے اس کے متعلق بات کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تمہاری سفارش کروں؟ اللہ کی قسم! اگر تم لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے مجھے چیونٹیاں مل جائیں تو میں ان کے ذریعے تم سے جنگ کروں گا۔

پھر ابوسفیان مایوس اور ناکام ہو کر واپس مکہ لوٹا اور اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

حضور ﷺ نے اس کے بعد انتہائی رازداری اور خاموشی سے جنگ کی تیاری شروع کی اور دعا کی:

اللھم خذ علی ابصار قریش فلا یرونی الا بغتة.	اے اللہ! قریش کی آنکھوں پر پردے ڈال دے! وہ مجھے نہ دیکھیں مگر اچانک حملہ کے وقت۔[1]

نبی مکرم ﷺ نے مکہ پر حملہ کرنے کی تیاری مکمل کر لی تو حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کی طرف ایک خط لکھا اور انہیں مسلمانوں کی طرف سے ممکنہ حملے کے بارے خبردار کر دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے مجھے' حضرت زبیر اور حضرت مقداد کو بھیجا کہ روضۂ خاخ کے مقام پر جاؤ' وہاں تمہیں ایک عورت ملے گی جس کے پاس ایک خط ہے' اُس سے وہ خط لے آؤ۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ ہم روانہ ہو گئے اور ہمارے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے

[1] اس روایت کو ابن اسحاق اور ابن سعد نے قریب قریب الفاظ میں روایت کیا ہے۔

یہاں تک کہ ہم روضۂ خاخ کے مقام پر پہنچے تو ٹھیک اُسی جگہ پر ایک کجاوہ نشین عورت کو دیکھا' ہم نے اُسے کہا کہ خط نکال دو! اُس نے کہا: میرے پاس کوئی خط نہیں' ہم نے کہا: خط نکال دو! ورنہ ہم ضرور تمہاری جامہ تلاشی لیں گے' حضرت علی کا بیان ہے کہ پھر اُس نے اپنے بالوں کی مینڈھیوں میں سے ایک خط نکال کے دے دیا' پھر ہم اُس خط کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے' یہ خط حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے بعض مشرکینِ مکہ کی جانب لکھا تھا اور اس میں انہوں نے مشرکینِ مکہ کو رسول اللہ ﷺ کے جنگی ارادوں سے باخبر کیا تھا' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے حاطب! یہ کیا ہے؟ حاطب نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے معاملے میں جلدی نہ فرمایئے! میں قریش میں رہنے کی وجہ سے اُن کا حلیف تھا' لیکن نسبی قریشی نہیں ہوں' آپ کی معیت میں جتنے بھی مہاجرین ہیں ان میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار مکہ میں موجود ہے جو ان کے چھوڑے ہوئے اہل وعیال اور اموال کی حفاظت کرتا ہے چونکہ میرا وہاں پر کوئی رشتہ دار نہیں اس لیے میں نے چاہا کہ اُن لوگوں پر کوئی احسان کر دوں تا کہ اس احسان کے بدلے وہ میرے اہل وعیال کا خیال رکھیں' نہ میں نے اپنے دین کو چھوڑا ہے اور نہ ہی میں اسلام لانے کے بعد کفر پر راضی ہوا ہوں' یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''انه قد صدقکم'' حاطب نے تمہیں سچی بات بتادی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں' تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک یہ بدری صحابی ہے' اے عمر! تمہیں کیا معلوم! شاید اللہ تعالیٰ نے اصحابِ بدر کے اعمال پر مطلع ہو کر ان کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ. اب جو چاہو کرو میں نے تمہیں بخش دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اُس وقت یہ آیات نازل فرمائیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ

اے ایمان والو! نہ بناؤ میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو (اپنے) جگری دوست' تم تو اظہارِ محبت کرتے ہو اُن سے حالانکہ وہ

الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُوْلَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ O (الممتحنۃ:۱)

انکار کرتے ہیں (اس دین) حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے' انہوں نے نکالا ہے رسول (مکرم) کو اور تمہیں بھی (مکہ سے) محض اس لیے کہ تم ایمان لائے ہو اللہ پر جو تمہارا پروردگار ہے' اگر تم جہاد کرنے نکلے ہو میری راہ میں اور میری رضاجوئی کے لیے (تو انہیں دوست مت بناؤ) تم بڑی راز داری سے ان کی طرف محبت کا پیغام بھیجتے ہو حالانکہ میں جانتا ہوں جو تم نے چھپا رکھا ہے اور جو تم نے ظاہر کیا اور جو ایسا کرے تم میں سے تو وہ بھٹک گیا راہِ راست سے O

(متفق علیہ)

رسول اللہ ﷺ نے مدینۃ المنورہ میں کلثوم بن حصین رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا اور دس رمضان المبارک بروز بدھ بعد نمازِ عصر مدینہ سے روانہ ہوئے' آپ ﷺ نے اردگرد کے عرب قبائل اسلم' غفار' مزینہ اور جہینہ وغیرہ کو بھی پیغام بھیج دیا' یہ سب قبائل مکہ اور مدینہ کے درمیان مقامِ ظہران میں آپ ﷺ سے آ ملے' اور مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی' ابھی تک قریش کو کوئی خبر نہیں پہنچی تھی' لیکن ابوسفیان کے مدینہ سے ناکام واپس لوٹ جانے کی وجہ سے اہلِ مکہ اس بات کی توقع کر رہے تھے کہ حملہ ممکن ہے' پس قریش نے ابوسفیان' حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء کو بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی خبر لائیں' پس یہ چلتے چلتے مرّ الظہر ان کے مقام تک پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کثرت سے آگ جلائی ہوئی تھی۔ یہ تینوں آپس میں اس آگ کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے' اسی دوران انہیں آپ ﷺ کے محافظ دستے نے دیکھ کر گرفتار کر لیا اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کر دیا' تو اُس وقت وہاں ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا[1] (من روایۃ البخاری)

[1] صحیح بخاری کی اس روایت میں ابوسفیان کے دونوں ساتھیوں کے اسلام (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابن اسحاق' حضرت عباس سے روایت کرتے ہوئے ابوسفیان کے ایمان لانے کی تفصیل بیان کرتے ہیں' حضرت عباس فرماتے ہیں: جب صبح ہوئی تو میں ابوسفیان کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا' جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کو دیکھا تو فرمایا: اے ابوسفیان! تیرا خانہ خراب ہو! کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم اس حقیقت کو تسلیم کرلو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟ ابوسفیان نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! آپ کتنے حلیم اور کتنے کریم ہیں اور آپ کی شان عفوودرگزر کتنی عظیم ہے' اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو اُس نے ہمیں کچھ تو فائدہ پہنچایا ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا: اے ابوسفیان! تجھ پر افسوس! کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو جان لیتا اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں!

ابوسفیان نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کتنے حلیم ہیں! آپ کتنے کریم ہیں! آپ کتنے صلہ رحمی کرنے والے ہیں! اللہ کی قسم! اس کے بارے میں میرے ذہن میں اب بھی ایک کھٹکا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: تیرا خانہ خراب! اسلام قبول کر اور گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں' قبل اس کے کہ تیری گردن اُڑادی جائے! اس پر ابوسفیان نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اسلام قبول کرلیا۔

حضرت عباس بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ابوسفیان فخر کو پسند کرتا ہے' لہٰذا اس کے لیے باعثِ فخر کسی چیز کا اعلان فرمادیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گیا اس کے لیے امان ہے' جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیا اس کے لیے امان ہے اور جو مسجد میں داخل ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) قبول کرنے کے بارے میں اشارہ نہیں ملتا حالانکہ جو روایات علماء سیرت نے نقل کی ہیں جن میں حضرت موسیٰ بن عقبہ سرفہرست ہیں وہ روایت یہ ہے کہ بدیل اور حکیم دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی اسلام قبول کرلیا جب کہ ابوسفیان نے صبح تک تاخیر کی' اسی وجہ سے بخاری کی روایت میں صرف ابوسفیان کے اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے اور دیگر دونوں ساتھیوں کے بارے میں ذکر موجود نہیں۔

گیا' اُس کے لیے امان ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ کی طرف جانے کا ارادہ فرمایا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے عباس! ابوسفیان کو وادی کی ایسی تنگ جگہ پر روک لینا جہاں سے اللہ کے لشکر اس کے سامنے سے گزریں تو یہ اُنہیں دیکھ لے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نکلا یہاں تک کہ میں نے وادی کی اُس گھاٹی پر اُسے روک لیا جہاں رسول اللہ ﷺ نے رُکنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا' قبائل اپنے جھنڈوں کے ساتھ گزرنے لگے' جب بھی کوئی قبیلہ گزرتا تو حضرت ابوسفیان پوچھتے: اے عباس! یہ کون ہیں؟ تو میں کہتا: یہ بنوسلیم ہیں' تو حضرت ابوسفیان کہتے: مجھے بنوسلیم سے کیا غرض! اسی طرح قبائل گزرتے گئے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ایک مسلح لشکر کے جلو میں گزرے جو صرف مہاجرین اور انصار ہی پر مشتمل تھا' ان میں سے ہر ایک لوہے (زرہوں اور آہنی خودوں) میں غرق تھا' صرف ان کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں' ابوسفیان نے پوچھا: سبحان اللہ! اے عباس! یہ کون ہیں؟ میں نے جواب دیا: یہ رسول اللہ ﷺ ہیں جو مہاجرین اور انصار کے درمیان موجود ہیں تو ابوسفیان نے کہا: ان میں سے کسی کو آج سے پہلے یہ طاقت اور شان وعظمت حاصل نہیں تھی۔

اے ابو الفضل! اللہ کی قسم! آج صبح تو تیرے بھتیجے کی بادشاہت بہت عظیم ہو گئی' حضرت عباس نے فرمایا: اے ابوسفیان! یہ نبوت ہے' اس پر ابوسفیان نے کہا: ہاں! نبوت کہہ لو![1]

پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو کہا: اپنی قوم کو نجات کی فکر دو! تو ابوسفیان تیزی سے آگے بڑھے اور رسول اللہ ﷺ کے وہاں پہنچنے سے پہلے مکہ میں داخل ہوئے اور بلند آواز سے یہ اعلان کرنے لگے: اے جماعت قریش! یہ حضرت محمد (ﷺ) ہیں! یہ ایسے لشکرِ جرار کے ساتھ آئے ہیں جس کا مقابلہ کرنے کی تم میں قوت و طاقت نہیں' پس جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گیا وہ امن میں ہے' یہ سن کر اس کی بیوی ہند بنت عتبہ اس کی طرف اُٹھی اور اس کی مونچھیں پکڑ لیں اور چیخ کر کہنے لگی: اس گھی کے بے فائدہ مٹکے کو قتل کر

[1] اسے روایت کیا ہے ابن سعد' ابن اسحاق اور ابن جریر نے' اسی طرح امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔

دو! یہ قوم کا کتنا بُرا پیشوا ہے! تو ابوسفیان نے لوگوں سے کہا: اس عورت کی بات تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے ورنہ تم تباہ ہو جاؤ گے' کیونکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسا لشکر جرار لے کر آئے ہیں جس کا مقابلہ کرنے کی تم میں طاقت نہیں' پس جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گیا وہ امن میں ہے' قوم کے لوگوں نے کہا: اللہ تجھے ہلاک کرے! تیرے گھر ہم میں سے کتنے لوگ سما سکیں گے؟ تو ابوسفیان نے کہا: جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا وہ بھی امن میں ہے اور جو مسجد حرام میں داخل ہو گیا وہ بھی امن میں ہے' تو لوگ یہ سن کر منتشر ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں اور مسجد کی طرف چلے گئے۔ (ابن اسحاق)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ جب ابوسفیان وادی کی گھاٹی پر کھڑا ہو کر لشکر اسلام کو دیکھ رہا تھا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو للکارتے ہوئے کہا:

الیوم یوم الملحمة ' الیوم تستحل الکعبة.	آج قتل و غارت کا دن ہے' آج کعبہ میں خون ریزی جائز ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات پسند نہ آئی' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بل الیوم یوم الرحمة ' الیوم یعظم اللہ الکعبة.	بلکہ آج کا دن رحمت کا دن ہے' آج کے دن اللہ تعالیٰ کعبہ کی عظمت کو بڑھا دے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فوجی دستوں کے امراء کو حکم دیا: وہ کسی سے جنگ نہیں کریں گے مگر جو ان سے جنگ کرے۔ عام معافی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھ آدمیوں اور چار عورتوں کے قتل کی اجازت دی کہ وہ جہاں بھی ہوں ان کو قتل کر دیا جائے' ان کے نام یہ ہیں: عکرمہ بن ابوجہل' ہبار بن الاسود' عبداللہ بن سعد بن ابی سرح' مقیس بن صبابۃ اللیثی' حویرث بن نقید اور عبداللہ بن ھلال' عورتوں میں ہند بنت عتبہ' سارہ مولاۃ عمرو بن ہشام اور فرتنی و قرینہ یہ دونوں گانے والی لونڈیاں تھیں' جو ہمیشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو میں گاتی تھیں۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکۃ المکرمہ میں اوپر والی جانب 'کداء'' کی طرف سے داخل

---

[1] طبقات ابن سعد' سیرت ابن اسحاق' ابن حجر فرماتے ہیں: میں نے مختلف روایتوں سے ان چھ مردوں اور چار عورتوں کے نام جمع کیے ہیں۔

ہوئے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے دستہ کے ساتھ مکہ کی نچلی جانب ''کدی'' کی طرف سے مکہ میں داخل ہوں' آپ ﷺ نے مختلف قبائل کو مکہ میں جہاں سے داخل ہونے کا حکم دیا تھا' سب آپ کے حکم کے مطابق ہی مکہ میں داخل ہوئے' لشکر کے کسی دستے کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ ہوئی سوائے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب مکہ میں داخل ہوئے تو مشرکین کے ایک گروہ نے آپ سے مزاحمت کی' ان میں عکرمہ بن ابوجہل اور صفوان بن امیہ تھا' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اُن سے جنگ کی تو قریش کے چوبیس آدمی مارے گئے اور ہذیل کے چار آدمی ہلاک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دور سے تلواروں کی چمک دیکھی تو اس کو ناپسند فرمایا' آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یہ خالد بن ولید ہیں جن سے مشرکین نے جنگ میں پہل کی ہے تو انہوں نے مجبوراً جوابی کارروائی کی ہے' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''قضاء اللہ خیر'' جو اللہ کا فیصلہ ہے وہی بہتر ہے[1]

ابن اسحاق نے عبداللہ بن ابوبکر سے اور حاکم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ذی طویٰ کے مقام پر پہنچے تو آپ اپنی سواری پر ہی وہاں ٹھہر گئے' آپ یمنی چادر کا عمامہ پہنے ہوئے تھے' رسول اللہ ﷺ نے تواضع و انکساری کی غرض سے اپنا سر جھکایا ہوا تھا' یہ صورت اُس وقت تھی جب آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح و نصرت سے نوازا ہے حتیٰ کہ آپ کی ریش مبارک کے بال کجاوے کے اگلے اُبھار والے حصے کو چھو رہے تھے۔

امام بخاری نے معاویہ بن قرہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ اونٹنی پر سوار ہیں اور خوش الحانی سے سورۃ الفتح کی تلاوت فرمارہے ہیں۔ معاویہ بن قرہ فرماتے ہیں: اگر مجھے اپنے اردگرد لوگوں کے جمع ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بھی اسی خوش الحانی سے پڑھنے لگتا جیسے

---

[1] اس روایت کو ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے' ابن حجر نے بھی موسیٰ بن عقبہ سے قریب قریب الفاظ میں روایت کیا ہے' سیرت ابن ہشام میں ہے کہ اس موقع پر مشرکین کے تیرہ یا چودہ آدمی مارے گئے' اس حدیث کو امام بخاری نے اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے۔

آپ نے تلاوت فرمائی تھی۔

رسول اللہ ﷺ فتح و نصرت کے ساتھ بیت اللہ شریف کی طرف رخ کرتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت کعبہ کے ردگرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے' آپ ﷺ اپنے ہاتھ مبارک میں پکڑی ہوئی چھڑی سے ایک کے بعد دوسرے بت کو مارتے جاتے اور فرماتے:

جاء الحق وزهق الباطل جاء الحق وما يبدئ الباطل وما يعيد.

حق آ گیا ہے اور باطل مٹ گیا' حق آ گیا اور باطل نہ اب نئے سرے سے کھڑا ہوگا اور نہ لوٹ کر آئے گا۔

(متفق علیہ)

بیت اللہ کے اندر بھی بہت سے بت موجود تھے تو آپ نے ان جھوٹے معبودوں کی وجہ سے بیت اللہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا' آپ ﷺ نے ان کے نکالنے کا حکم فرمایا تو انہیں نکال دیا گیا' وہاں حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کی تصویریں بھی تھیں جن کے ہاتھوں میں پانسے کے تیر بنا رکھے تھے' ان تصویروں کو بھی نکال دیا گیا' پس نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کافروں کو ہلاک کرے! حالانکہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دونوں نے ہرگز پانسے کے تیر نہیں پھینکے۔

پھر آپ ﷺ بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے اور اس کے کونوں میں تکبیر کہی' پھر باہر نکل آئے لیکن اس میں نماز نہ پڑھی[1] (رواہ البخاری)

رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کے کلید بردار حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو چابی لانے کا حکم دیا' پس وہ چابی لے کر آئے' بیت اللہ کا دروازہ کھول دیا گیا' پھر آپ ﷺ کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہوئے' پھر جب آپ باہر نکل آئے تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا اور چابی ان کو واپس دے دی' اور ان کو فرمایا: یہ چابی ہمیشہ کے لیے تم ہی رکھو' یہ میں تمہیں نہیں دے رہا (یعنی بیت اللہ کی دربانی) لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ توفیق بخشی

[1] مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو وہاں نماز بھی پڑھی' عنقریب اس کی تحقیق ان شاء اللہ تبصرے میں ذکر کریں گے۔

ہے اور یہ چابی تم سے وہی چھینے گا جو ظالم ہوگا۔ آپ ﷺ نے اپنے اس قول سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا. (النساء:۵۸)

بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو آپ ﷺ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر نماز کے لیے اذان دی' لوگ دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے' تمام لوگ اس طرف آ گئے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کے دروازے کے دونوں کواڑوں کو تھام لیا اور تمام لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے' سب یہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے گا' پس آپ ﷺ نے خطاب فرمایا: اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! وہ اکیلا ہے! اس کا کوئی شریک نہیں! اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا' اپنے بندے کی مدد کی اور کفار کے تمام لشکروں کو تنہا شکست دی' خبردار! تمام مفاخر' خون بہا اور وہ مال جس کا دورِ جاہلیت میں دعویٰ کیا جاتا تھا' وہ میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہیں مگر بیت اللہ شریف کی خدمت اور حاجیوں کو پانی پلانا باقی ہے' اے جماعتِ قریش! اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور اپنے آباء پر فخر کرنے کو دور کر دیا' تمام لوگ حضرت آدم کی اولاد ہیں اور حضرت آدم مٹی سے پیدا کیے گئے' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنا دیا ہے تمہیں مختلف قومیں اور مختلف خاندان تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو' تم میں سے زیادہ معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

---

[1] اس روایت کو طبرانی نے مرسل' زہری سے اور ابن ابی شیبہ اور ابن اسحاق نے روایت کیا ہے۔ مزید دیکھئے: فتح الباری ج ۸ ص ۱۴۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے گروہ قریش! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ سب نے کہا: بھلائی! آپ کریم بھائی اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اذهبوا فانتم الطلقاء. جاؤ! تم آزاد ہو[1]

امام بخاری اور امام مسلم نے ابوشریح العدوی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

بے شک مکہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ نے حرمت کا درجہ دیا ہے' اور اس کو کسی آدمی نے حرمت نہیں دی' پس جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو اُس کے لیے حلال نہیں کہ اس حرم کے اندر خون بہائے یا یہاں سے کوئی درخت کاٹے' اگر کوئی شخص رسول اللہ کے قتال کو حجت بنائے تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسول کو ایسا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی' جب کہ تمہیں تو اجازت نہیں دی' اور اپنے رسول کو بھی تھوڑی سی دیر کے لیے اجازت دی تھی' پھر اس حرم کی حرمت حسب سابق لوٹ آئی تھی جو آج تک قائم ہے' پس سب حاضرین کو چاہیے کہ یہ بات اُن لوگوں تک پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ (متفق علیہ)

پھر مکہ میں سب لوگ جمع ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی کہ یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت وفرماں برداری کریں گے' جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو پھر عورتوں سے بیعت لی' قریش کی کچھ عورتیں جمع ہوئیں' قریش کی ان عورتوں میں ہند بنت عتبہ بھی تھی' جو نقاب اوڑھے بھیس بدل کر وہاں موجود تھی' اس خوف کے مارے کہ جو حرکت اُس نے غزوۂ احد میں حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے جسدِ اطہر کی بے حرمتی کر کے کی تھی۔ جب یہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کرنے کے لیے قریب ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ان امور پر میری بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گی!

تو ہند بولی: اللہ کی قسم! یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا لیکن ہمیں یہ منظور ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چوری مت کرنا! ہند بولی: بخدا! میں (اپنے شوہر) ابوسفیان

[1] اسی طرح کی روایت ابن سعد نے بھی اپنی کتاب ''طبقات'' میں نقل کی ہے۔

کے مال سے تھوڑا تھوڑا لے لیا کرتی تھی' میں نہیں جانتی کہ یہ میرے لیے حلال تھا یا نہیں؟ ابوسفیان بولا جو اُس وقت وہیں موجود تھا: جو تو نے اس سے پہلے مال لیا ہے وہ تجھے حلال ہے' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم ہند بنت عتبہ ہو؟ تو وہ بولی: ہاں! میں ہند بنت عتبہ ہوں اور جو کچھ ہو چکا آپ مجھے معاف فرما دیں' اللہ تعالیٰ آپ سے درگزر فرمائے گا' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اور تم زنا نہیں کرو گی! ہند بولی: کیا آزاد عورت بھی زنا کر سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اور تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی! ہند بولی: ہم نے اپنے چھوٹے بچوں کو پال کر بڑا کیا اور جب بڑے ہوئے تو آپ نے بدر میں ان کو مار دیا' اب آپ جانیں اور وہ جانیں' یہ بات سن کر وہاں موجود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اتنی زور سے ہنسے کہ لوٹ پوٹ ہو گئے' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کسی پر جھوٹا بہتان نہیں لگاؤ گی! تو ہند بولی: بخدا! کسی پر بہتان لگانا بہت بُری بات ہے اور بعض مواقع پر چشم پوشی زیادہ بہتر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نیکی کے کام میں میری نافرمانی نہیں کرو گی' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ان عورتوں سے بیعت لو۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر اُن عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت و بخشش کی دعا کی' پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُن عورتوں سے بیعت لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں سے (بیعت لیتے تو) نہ مصافحہ کرتے اور نہ ہی کسی عورت کو مَس کرتے اور نہ ہی کوئی عورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مَس کرتی' سوائے اُن عورتوں کے جن کو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلال قرار دیا۔ (رواہ ابن اسحاق وابن جریر)

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں سے کلام کے ذریعے بیعت لیتے اور اس آیت کے مطابق بیعت لیتے:

اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰهِ شَیْئًا. کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔ (الممتحنہ:۱۲)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ مبارک کسی عورت کے ہاتھ کو مَس نہ کرتا سوائے اُن عورتوں کے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں تھیں یا آپ کی ملکیت تھیں۔

امام مسلم نے بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

(البخاری ج ۸ ص ۱۳۵' مسلم ج ۶ ص ۲۹)

فتح مکہ کے روز حضرت ام ھانیء' جو حضرت ابوطالب کی بیٹی تھیں' انہوں نے ایک مشرک شخص کو پناہ دی جس کو حضرت علی قتل کرنا چاہتے تھے۔ حضرت اُم ھانیء فرماتی ہیں: میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی' میں نے آپ کو پایا کہ آپ غسل فرما رہے ہیں اور آپ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کو پردہ کیے ہوئے تھیں۔ حضرت ام ھانیء فرماتی ہیں: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: یہ کون عورت ہے؟ میں نے کہا: اُم ھانیء' بنت ابوطالب! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اُمِ ھانیء! خوش آمدید! پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسل سے فارغ ہوئے تو ایک کپڑا لپیٹ کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور آٹھ رکعات نماز (چاشت) پڑھی' پھر آپ متوجہ ہوئے تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرا ماں جایا علی چاہتا ہے کہ وہ اُس شخص کو قتل کر دے جس کو میں نے پناہ دے رکھی ہے' فلاں شخص ابن ہبیرہ کو' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے اُمِ ھانیء! جس کو تم نے پناہ دی ہم نے بھی اُس کو پناہ دی۔ (متفق علیہ)

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن لوگوں کے قتل کرنے کی اجازت دی تھی' اُن میں سے بعض تو مسلمان ہو گئے اور بعض دوسرے مارے گئے' اُن میں سے جو قتل ہوئے' ان کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن خطل' مقیس بن حبابہ اور دو ہجو گانے والی لونڈیوں میں سے ایک قتل ہو گئی اور دوسری نے اسلام قبول کر لیا' عبداللہ بن سعد بن ابی سرح (کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ اُنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد ارتداد کا راستہ اختیار کر لیا ہے لیکن پھر انہوں نے اسلام کا اعلان کیا) ان کے بارے میں آپ نے سفارش قبول کر لی' وہ اسلام قبول کر کے اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ اسی طرح عکرمہ' ہبار اور ہند بنت عتبہ بھی مسلمان ہو گئے۔

ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ فضالہ بن عمیر لیثی[1] نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (معاذ اللہ طواف کعبہ کرتے ہوئے قتل کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا' طواف کے دوران جب فضالہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تو فضالہ ہے؟ اُس نے کہا: ہاں! یارسول اللہ!

[1] اس واقعہ کو ابن ہشام نے اپنی "سیرت" میں اور ابن قیم نے "زاد المعاد" میں ذکر کیا ہے۔

میں فضالہ ہوں' آپ ﷺ نے فرمایا: تم دل میں کیا سوچ رہے تھے؟ وہ کہنے لگا: کچھ نہیں! میں تو اللہ کا ذکر کر رہا تھا' آپ ﷺ مسکرائے اور پھر فرمایا: ''استغفر اللّٰہ'' پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اُس کے سینے پر رکھا تو اس کے دل کو سکون ملا' فضالہ کہا کرتے تھے: اللہ کی قسم! آپ ﷺ نے میرے سینے سے ابھی اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا تھا کہ آپ کی ذات سے بڑھ کر کوئی چیز میرے نزدیک محبوب نہ تھی۔

فضالہ واپس گھر جاتے ہوئے جب ایک عورت کے پاس سے گزرے جس کی طرف فضالہ مائل تھے اور اُس سے راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے تھے تو اُس عورت نے فضالہ کو کہا: آؤ! باتیں کریں' تو فضالہ نے یہ شعر گنگنانا شروع کر دیئے:

قالت هلم الى الحديث فقلت لهالا　　　يـالـى عـلـيـك الـلّٰـه والاسـلام

(ترجمہ:) اُس نے مجھ سے کہا: آؤ! باتیں کریں' تو میں نے اُس سے کہا: نہیں! اللہ تعالیٰ اور اسلام تجھ سے باتیں کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔

لـو مـا رايـت مـحـمـدًا وقـبـيـلـة　　　بـالـفـتـح يـوم تـكـسّـر الاصـنـام

(ترجمہ:) اگر تو حضرت محمد ﷺ اور اُن کے قبیلے کو دیکھ لیتی جب فتح مکہ کے روز بت ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

لـرايـت ديـن الـلّٰـه اضـحٰـى بـيّـنـا　　　والـشـرك يـغـشـى وجـهـه الاظـلام

(ترجمہ:) تو دیکھتی کہ (اللہ کا) دین تو روشن اور واضح ہو گیا اور شرک کے چہرے پر تاریکی چھا گئی۔ (سیرت ابن ہشام)

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ فتح کے بعد مکہ مکرمہ میں انیس دن مقیم رہے اور اس دورانِ نمازِ قصر ہی ادا فرماتے رہے' یعنی چار رکعتوں والی فرض نماز کو دو رکعت پڑھتے رہے۔

اسباق و نصائح

فتح عظیم کے ان واقعات میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراحل میں اپنے حبیب کریم ﷺ اور ان کے اصحاب کو عزت و تکریم سے نوازا' اس سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سابقہ مراحلِ دعوت کی کیا اہمیت تھی اور ان مراحلِ دعوت میں جو اسرار و رموز اور حکمت

الٰہیہ پوشیدہ تھی وہ آج آپ کی آنکھوں کے سامنے مجسم شکل میں ہے۔

اب' جب وہ عظیم کامیابی فتح مکہ کی صورت میں روزِ روشن کی طرح سب کے سامنے عیاں ہے۔ اب ہم اور آپ اس بات کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں کہ آج سے تقریباً آٹھ سال قبل مسلمانوں نے جو ہجرت کی' اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے اہل و عیال' رشتہ دار' مال و دولت' جائیداد اور وطن چھوڑنے کی صورت میں جو قربانیاں پیش کیں' اُن میں سے کوئی بھی قربانی رائیگاں نہ گئی' جب دینِ اسلام باقی ہے' لیکن اگر دین اسلام باقی نہ رہے تو دنیا کی یہ ساری چیزیں اور دنیوی سارے تعلقات مل کر بھی انسان کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔

اب' اگر آپ اس فتحِ عظیم کے مراحل پر غور کریں تو آپ اس بات کا ادراک کر سکتے ہیں کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد' شہادت اور پر خلوص جدوجہد کی کیا قدر و قیمت تھی' اس سے قبل مسلمانوں نے جو کچھ بھی قربان کیا' اُن میں سے کوئی چیز بھی رائیگاں نہ گئی' کسی مسلمان کا بہایا ہوا ایک قطرۂ خون بھی بے فائدہ نہ گیا اور آج فتحِ عظیم کے اس مرحلے پر پہنچنے تک مسلمانوں نے جو قربانیاں دیں اور مصائب و آلام اور مشکلات کی جن آندھیوں کا سامنا کیا' اُن سب تکالیف کا مداوا' اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و نصرت سے نواز کر کیا' اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے متعلق یہی سنت ہے کہ فتح و نصرت کا حصول صحیح عقیدے اور اسلام پر پوری طرح عمل کیے بغیر ممکن نہیں' اور دینِ اسلام پر پوری طرح اعتبار' اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور بندگی کے بغیر ممکن نہیں اور صحیح حقِ بندگی' اُس کے راستے میں اپنا مال و دولت' اپنی جان قربان کیے بغیر' اُس کی بارگاہ میں پر خلوص حاضری دیئے بغیر اور اُس کے راستے میں جہاد کیے بغیر ممکن نہیں۔

اب' جب آپ نے اس فتحِ عظیم کی تفصیل کو پڑھا تو اب آپ صلح حدیبیہ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتے ہیں اور صلح حدیبیہ کے وہ نکات جن پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر کثیر صحابہ نے اپنی تشویش کا اظہار کیا' اس کے متعلق اب ہم سب کی تشفی ہو جاتی ہے کہ اس میں بھی اسرارِ الٰہیہ پوشیدہ تھے اور ہم سب اب نہایت اطمینان سے اُس کلمہ پر توقف کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کے لیے مطلقاً ارشاد فرمایا تھا اور وہ فتح عظیم کا کلمہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا O (الفتح: ۲۷) اس نے عطا فرما دی (تمہیں) اس سے پہلے ایسی فتح جو قریب ہے O

جب یہ حقیقت کھل کر سب کے سامنے آ گئی ہے تو اس کے علاوہ مزید بے شمار حقائق نبویہ ہیں جو آپ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ میں ہمیں نظر آتے ہیں جو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو عطا فرمائے۔

کیا آپ کو وہ دن یاد ہے جس میں رسول اللہ ﷺ اپنے وطن مکۃ المکرمہ سے نکلے' آپ ﷺ نے وادیوں اور گھاٹوں سے خفیہ طور پر گزرتے ہوئے یثرب کی طرف ہجرت فرمائی' آپ ﷺ کی ہجرت سے قبل اور بعد صحابہ کرام نے بھی نہایت کسمپرسی اور محتاجی کی حالت میں چھپتے ہوئے ہجرت کی' اُس وقت اُن صحابہ کرام کی تعداد قلیل تھی' ان صحابہ کرام نے اپنے اہل وعیال' مال واسباب اور وطن کو کس لیے چھوڑا؟ صرف اور صرف اپنے دین کی حفاظت کی خاطر چھوڑا' لیکن اب! جب یہ لوگ واپس اپنے وطن' اپنے اہل وعیال اور رشتہ داروں کی طرف لوٹے ہیں تو ان کی قلیل تعداد کثرت میں بدل چکی ہے' ان کی کمزوری' قوت و طاقت میں بدل چکی ہے' اور کل جن لوگوں نے ان کو اپنے وطن سے نکالا تھا' آج وہ دہشت زدہ' مجبور و عاجز ہو کر ان کا استقبال کر رہے ہیں' اب اس فتح عظیم کے بعد اہلِ مکہ جوق در جوق دینِ اسلام میں داخل ہونے لگے' وہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ جن کو ایک وقت یہاں مکہ کی گلیوں اور وادیوں میں تپتی ہوئی زمین پر مشرکین کے ہاتھوں سخت سزائیں دی جاتی تھیں' آج فتح کے دن وہ کعبۃ اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر یہ صدائے دل نواز بلند کر رہے ہیں: اللہ اکبر! اللہ اکبر! یہی وہ آواز تھی جو حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو کل عذاب کے کوڑوں کے نیچے ثابت قدم رہنے کی ہمت و طاقت دیتی' وہ کمزور آواز جو کبھی عذاب کے کوڑوں کے نیچے ''احد' احد احد'' پکارتی تھی' لیکن آج کعبۃ اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر ''لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ'' بہ آوازِ بلند پکار رہی ہے لیکن اب ہر کوئی اس کے سامنے ڈرا ہوا خاموش اور سر جھکائے کھڑا ہے۔

خبردار! یہی وہ حقیقتِ واحدہ ہے جس کا کوئی ثانی نہیں' اور یہ حقیقتِ مطلقہ دینِ اسلام ہے' وہ انسان کتنا احمق اور جاہل ہے جو اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستے میں جدوجہد'

کوشش اور تگ ودو کرتا ہے' بے شک وہ اُس وقت حقیقت کے برعکس چل رہا ہوتا ہے' وہ ایک سراب کے پیچھے چل رہا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اس فتحِ عظیم کے غیر معمولی واقعات اپنے اندر بے شمار احکام اور متعدد ہدایات سمیٹے ہوئے ہیں' جن پر غور وفکر کرنا اور تبصرہ کرنا ناگزیر ہے' اس لیے ہم ان کو بالترتیب ذکر کرتے ہیں۔

اوّل: صلح کا معاہدہ اور اس کے توڑنے کے متعلق احکام

(۱) فتح مکہ کا ایک سبب ہماری راہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جن قبائل یا جماعتوں نے صلح کا باہمی معاہدہ کیا ہوا ہو تو دشمن کا اُن قبائل یا جماعتوں سے جنگ کرنا جو مسلمانوں کے حواری ہوں' یہ مسلمانوں کے ساتھ ہی جنگ کرنے کے مترادف ہے' تو اس طرح دشمن کا مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا وہ معاہدہ ختم ہو جائے گا اور وہ حربی ہو جائیں گے۔ اس مسئلہ پر جمہور علماء کا اتفاق ہے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو طریقہ اہل مکہ کے ساتھ اپنایا' اس سے ہمیں یہ راہنمائی ملتی ہے کہ بے شک مسلمانوں کے قائد اور امیر کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اچانک اُس قوم پر حملہ کر دے جنہوں نے صلح کا معاہدہ توڑنے کی خیانت کی ہو۔

مسلمانوں کے قائد پر یہ بات لازم نہیں ہے کہ وہ اس صورت میں دشمن کو حملے کی پیشگی اطلاع کرے' جیسا کہ آپ نے گزشتہ واقعات میں ملاحظہ کیا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ کی طرف نکلنے کے لیے تمام لوگوں کو جمع کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی:

اللهم خذ علٰى ابصار قريش فلا يروني الا بغتة.

اے اللہ! قریش کی آنکھوں پر پردہ ڈال دے وہ مجھے نہ دیکھیں مگر اچانک (جب اُن پر حملہ ہو جائے)۔

اس مسئلہ پر بھی جملہ علماء کا اتفاق ہے۔

لیکن جب دشمن کی طرف سے معاہدہ توڑنے کی خیانت نہ کی جائے' البتہ دلائل وشواہد اور علامات سے صلح کا معاہدہ توڑنے کا صرف خوف ہو تو اس صورت میں امام المسلمین کے لیے جائز نہیں کہ وہ معاہدہ توڑ کر اچانک حملہ کر دے بلکہ پہلے اس خوف اور خدشہ کے متعلق

اور معاہدہ توڑنے کے متعلق ان کو آگاہ کیا جائے' اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق کہ

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ○ (الانفال:۵۸)

اور اگر آپ اندیشہ کریں کسی قوم سے خیانت کا تو پھینک دو ان کی طرف (ان کا معاہدہ) واضح طور پر بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا خیانت کرنے والوں کو ○

یعنی معاہدہ آگے پھینک دینے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں بتا دیا جائے کہ اب تم سے ہمارا معاہدہ باقی نہیں رہا۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل میں اس امر کی بھی دلیل ہے کہ کسی جماعت یا قبیلہ کے بعض افراد کا معاہدہ توڑنا' پورے قبیلے یا جماعت کے معاہدہ توڑنے کے مترادف ہوگا جب تک کہ اُس قبیلہ کے دوسرے افراد حقیقی اور قطعی طور پر بعض معاہدہ توڑنے والے افراد کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔

پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دیکھا کہ قریش کے بعض افراد نے صلح کا معاہدہ توڑنے کی خیانت کرتے ہوئے مسلمانوں کے حلیف قبائل پر شب خون مارا ہے اور اس سانحہ پر قریش کے عام لوگ بھی خاموش ہیں اور انہوں نے اس کی کوئی مذمت نہیں کی' اس چیز کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کی دلیل قرار دیا کہ یہ سب لوگ اس پر رضامندی کا اظہار کر رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے قریشِ مکہ پر حملہ کرنے کا ارادہ فرمالیا' کیونکہ اس سانحہ پر سب اہلِ مکہ کی خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ سب معاہدہ توڑنے کی خیانت میں شریک ہو گئے ہیں کیونکہ جب مکہ کے بڑے بڑے سردار اور زعماء اس معاہدے کو توڑنے کی خیانت پر رضامند ہو گئے تو پھر عام لوگ بھی تبعاً اس میں شامل ہو گئے' اس لیے صلح کا معاہدہ توڑنے میں قریش نے پہل کی' جس کی بناء پر اب ان کی سرکوبی ضروری ہو چکی تھی۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنو قریظہ کے تمام جنگ جوؤں کو قتل کروا دیا' یہ پوچھے بغیر کہ کس نے معاہدہ توڑا ہے یا کس نے نہیں توڑا؟ کیونکہ جب ان کے بعض افراد نے لڑائی میں پہل کی تو دوسرے بعض ان کی اس حرکت پر رضامند رہے تو خود بخود سب کی طرف سے معاہدہ ٹوٹ گیا' اسی طرح قبیلۂ بنو نضیر کے افراد نے جب معاہدہ توڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

سب کو ہی مدینہ بدر کر دیا حالانکہ ان کے بعض افراد ہی معاہدہ توڑنے کی خیانت میں شامل تھے۔

دوم: حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ سے متعلقہ اُمور

(۱) اس واقعہ میں ہم حضور ﷺ کی نبوت کے ایک اور مظہر (اور معجزہ) کو ملاحظہ کرتے ہیں کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی مدد و تائید وحی کے ذریعے فرمائی' جب آپ ﷺ نے اپنے بعض اصحاب کو فرمایا:

اذھبوا حتی تاتوا روضۃ خاخ فان بھا ظعینۃ معھا کتاب فخذوہ منھا.

تم جاؤ! حتیٰ کہ جب تم روضہ خاخ کے مقام پر پہنچو گے تو وہاں تمہیں ایک کجاوہ نشین عورت ملے گی جس کے پاس ایک خط ہے' پس وہ خط تم اُس سے لے آؤ۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو کس نے اس خط کے متعلق خبر دی اور حاطب بن بلتعہ اور اُس عورت کے درمیان طے شدہ خفیہ معاملہ سے کس نے آپ ﷺ کو مطلع کیا؟

بے شک یہ اطلاع بذریعہ وحی ہوئی کیونکہ یہ نبوت کا ایک مظہر ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو بروقت خبر دینے کی صورت میں اپنی تائید سے بہرہ ور فرمایا اور پھر اُس فتحِ عظیم سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ کریم ﷺ اور مسلمانوں کو سرفراز فرمایا' جس کو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا تھا اور جس کا وعدہ فرما رکھا تھا۔

(۲) کیا کسی ملزم کو جرم کا اعتراف کرانے کے لیے مختلف طریقوں سے سزا دینا جائز ہے؟

بعض ائمہ نے اس کے جواز کا کہا ہے' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اُس قول سے استدلال کرتے ہوئے جو آپ رضی اللہ عنہ نے اُس خط والی عورت کو فرمایا کہ تم خط نکال دو ورنہ ہم تمہاری جامہ تلاشی لیں گے۔

تو بعض ائمہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس بات سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام المسلمین اور اُس کے نائب کے لیے جائز ہے کہ وہ جرم ثابت کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرے جو وہ مناسب خیال کرتا ہو۔

اسی طرح اس مؤقف پر استدلال کرتے ہوئے اُس واقعہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب یہود نے غزوۂ خیبر میں حیی بن اخطب کے اموال کو غائب کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے چچا سے پوچھا: حیی کے اُس چرمی تھیلا کا کیا ہوا جسے وہ بنو نضیر سے لایا تھا؟ اس نے جواب دیا: جنگوں اور دیگر اخراجات میں کام آ گیا' آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی تو اسے لائے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور وہ مال بھی بہت زیادہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُسے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا' انہوں نے اس سے تادیبی کارروائی کی تو اس نے بتایا کہ میں نے حیی کو فلاں ویران جگہ پھرتے ہوئے دیکھا تھا' صحابہ کرام نے اُسی جگہ جا کر تلاش کیا تو وہ مال برآمد ہو گیا۔

ہمارے دور کے بعض محققین اس قسم کی مذکورہ بالا رائے کو حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں' جب کہ حق بات جس پر ائمہ اربعہ' جمہور محققین اور علماء کا اتفاق ہے یہ ہے کہ بے شک جس ملزم کا جرم کسی شرعی محکم دلیل سے ثابت نہ ہو' اس کو مختلف طریقوں سے تکلیف دینا تا کہ وہ جرم کا اعتراف کر لے یہ جائز نہیں' ملزم پر جب تک ثبوت و شواہد سے جرم ثابت نہ ہو تو وہ بَری ہے۔

لہٰذا جہاں تک اُس کجاوہ نشین عورت کا تعلق ہے جس کو حاطب نے خط دے کر مکہ بھیجا تھا اور اُس عورت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دھمکی دینے کا تعلق ہے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ ملزم کو تکلیف دی جائے۔ اس کے مندرجہ ذیل دو اسباب ہیں:

اوّل: وہ خط لے جانے والی عورت محض ملزمہ نہیں تھی بلکہ وہ حقیقتاً مجرمہ تھی' جس پر دنیا کے تمام لوگوں سے سچے انسان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی خبر دلالت کرتی ہے اور یہ خبر اُس عورت کے اعتراف اور اقرار سے زیادہ قوی اور مضبوط ہے' پھر اس پر اس شخص کے معاملہ کو کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے جس پر بعض غیر معصوم انسانوں کی جانب سے محض شکوک وشبہات کی بناء پر الزامات لگائے گئے ہوں جو کچھ اس خط والی عورت کے معاملہ میں کہا گیا ہے' وہی حیی بن اخطب کے چچا کے بارے میں بھی کہا جائے گا اور اسی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔

دوم: اُس عورت کے کپڑے اُتروا کر جامہ تلاشی لینا اس کو تادیب یا قید کی طرح نہیں قرار دیا جا سکتا' ان دونوں میں تو بہت بڑا واضح فرق ہے' کیونکہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ لامحالہ خط اُسی

عورت کے پاس ہے اور جامہ تلاشی لیے بغیر خط حاصل کرنا ممکن نہیں تو پھر ایسا کرنا جائز اور یقینی امر تھا' بلکہ واجب تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی بجا آوری ضروری تھی' یعنی خط ضرور لے کر جانا تھا۔

اور جہاں تک حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا حیی بن اخطب کے چچا کو جسمانی تکلیف دینے کا تعلق ہے تو اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی: حیی بن اخطب کا معاملہ حقیقتِ حال پر مبنی تھا' تہمت اور الزام تک محدود نہ تھا۔

دوسری: پھر یہ معاملہ جہاد سے متعلق تھا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگ سے متعلق تھا۔

تو اس وجہ سے مسلمانوں کے اس علیحدہ علیحدہ تعامل کو ایک دوسرے پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے؟

پس بعض نے جو یہ گمان کیا کہ (ملزم کو جسمانی اذیت دینے کا) یہ مؤقف امام مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی فقہ میں ذکر کیا ہے تو یہ زعمِ باطل ہے اور امام مالک کے واضح مؤقف کے خلاف ہے جو انہوں نے اپنے مذہب میں بیان کیا ہے۔

''مدونہ'' میں آیا ہے اور یہ حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ سے سحنون نے روایت کیا ہے کہ اُن سے پوچھا گیا: آپ کی کیا رائے ہے کہ کوئی شخص ڈرائے دھمکائے جانے' قید میں ڈالے جانے' وعید سنائے جانے یا مارے پیٹے جانے کے بعد' اگر کسی موجبِ حد جرم کا اقرار کر لیتا ہے تو کیا اُس پر حد قائم کی جائے گی یا نہیں؟ تو حضرت امام مالک نے فرمایا: جس شخص نے دھمکی یا ڈراوے کے بعد اقرار کیا' اس کا دعویٰ بے بنیاد ہے' اور جو اس کو مارا پیٹا گیا یا ڈرایا گیا یا حبسِ بے جا میں رکھا گیا' یہ سب میرے خیال میں دھمکی کے زمرے میں ہیں اور میرا خیال ہے اس صورت میں حد جاری نہیں ہو گی۔

پھر سحنون نے پوچھا کہ اگر اُس کو مارا پیٹا گیا اور دھمکایا گیا تو اُس نے مقتول کو یا مسروقہ مال کو برآمد کروا دیا تو پھر اس صورت میں جو کچھ اُس سے برآمد ہوا ہے' اس کی بناء پر کیا اُس پر حد لگائی جائے گی یا کہ نہیں؟ تو حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اُس پر حد قائم نہیں کی جائے گی سوائے اس کے کہ وہ بغیر کسی خوف و خطر کے اُس جرم کا اقرار کر لے۔

(المدونۃ ج ۱۶ ص ۹۳)

(۳) حضور ﷺ کا حضرت حاطب بن بلتعہ سے اُس خط کے متعلق پوچھنا اور ان کا جواب دینا اور اسی موقع پر جیسا کہ اسی کے سبب سے کلامِ الٰہی کا بھی نازل ہونا واضح کرتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ کٹھن حالات میں ہونے کے باوجود بھی وہ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ کوئی تعلق قائم کریں یا دوستی نبھائیں' یا یہ کہ کوئی مسلمان' دشمنانِ اسلام کی طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھائے۔

حاطب بن بلتعہ کا معاملہ اس سے جدا ہے کیونکہ انہوں نے قریش میں ایک عرصہ گزارا تھا' بس اس وجہ سے انہوں نے ایسا کیا ورنہ انہوں نے ان کے دفاع کی غرض سے یا ان کو اس حملے سے بچانے کی غرض سے ایسا نہیں کیا تھا' وہ تو محض اُن پر احسان کرنا چاہتے تھے تاکہ قریش اس احسان کی وجہ سے اُن کے اہل وعیال اور قرابت داروں کا خیال رکھیں' جو مکہ میں رہ رہے تھے' انہوں نے یہ عذر بھی پیش کیا کہ ان کی قریش کے ساتھ نسلی نسبت نہیں بلکہ وہ ایک وقت میں ان کے حلیف رہے ہیں' جب کہ ان کا اصل مقصد اپنے اہل وعیال کا تحفظ تھا جو مکہ میں تھے۔

اس کے بعد جو آیاتِ قرآنیہ نازل ہوئیں اُن میں اللہ تعالیٰ نے صراحتہً اس بات کا حکم دیا کہ مسلمان صرف اور صرف اللہ وحدہٗ کے لیے ہی کسی سے دوستی اور تعلق رکھیں' اس کے علاوہ ہر تعلق اور ہر طرح کی دوستی ختم کر دیں اور مسلمان دوسرے ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور دوستی صرف اس بنیاد پر ہی رکھیں جو دینِ حنیف کے اصول وقواعد کے مطابق ہو' ورنہ یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی جانیں' اپنے اموال اور اپنی خواہشات اور تمناؤں کو قربان کر رہے ہیں؟ (اس لیے اِن قربانیوں کے ساتھ ساتھ اخلاص اور حسنِ نیت کا ہونا از حد ضروری اور لازمی ہے)۔

موجودہ دور میں اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والوں کا یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے' آج کل لوگ کثرت کے ساتھ نماز کے لیے مساجد کا رُخ بھی کرتے ہیں' کثرت کے ساتھ اذکار و اَوراد بھی کرتے ہیں' ان کے ہاتھوں میں ٹکاٹک تسبیح بھی چلتی ہے' لیکن اس کے باوجود دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور دوستی کا معیار خاندان' قبیلہ اور رشتہ داری تک ہی محدود

ہے یا مال و دنیا کی مصلحت ہے، یا شہوات اور خواہشات کی تکمیل ہے، وہ بالکل اس بات کو اہمیت نہیں دیتے کہ ہم اس طرح کی مادی بنیاد پر تعلقات قائم کر کے حق کے بدلے باطل کو خرید رہے ہیں یا یہ کہ وہ دنیوی حقیر خواہشات سے دین پر پردہ ڈال رہے ہیں!

یہی لوگ منافق کہلاتے ہیں اور انہی کی وجہ سے آج مسلمان قوم پسماندگی، انتشار اور کمزوری کا شکار ہے اور ہر طرف سے مسلمانوں اور دین اسلام کے خلاف حملے ہو رہے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہر مرتبہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بنائی جانے والی مختلف سازشوں میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

سوم: ابوسفیان کا معاملہ اور ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا موقف

فتح مکہ کے دن ابوسفیان کا معاملہ عجیب تھا کہ یہ وہ پہلا شخص تھا جو اپنی قوم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کی وعید سنا کر ڈرا رہا تھا، اور یہ وہ شخص تھا جو اس روز جوق در جوق اسلام قبول کرنے والوں میں بھی سرِ فہرست تھا، حالانکہ ابوسفیان وہ شخص تھا کہ اس سے قبل رسول اللہ ﷺ کے لڑائی کے لیے مکہ سے نکلنے والے ہر لشکر کی سربراہی کرتا اور اسی کی نگرانی میں ہی اسلام کے خلاف تمام جنگیں ہوئیں اور اسی کے ہی اُکسانے پر مشرکین مکہ نکلتے رہے۔ شاید اب حکمتِ الٰہیہ یہ چاہتی تھی کہ مکۃ المکرمہ بغیر کسی لڑائی اور جنگ کے فتح ہو، اور یہ کہ یہاں کے باسی بغیر کسی مزاحمت اور لڑائی کے جوق در جوق دینِ اسلام میں داخل ہوں اور آپ ﷺ کی اطاعت قبول کریں۔

حالانکہ یہاں کے باسیوں نے ہی آپ ﷺ اور صحابہ کرام کو طرح طرح کی تکالیف دیں، یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا اور پھر مدینہ جا کر بھی حملہ آور ہوتے رہے۔

پس اب وہی ابوسفیان جو اس سے قبل اسلام کے خلاف سرکشی میں پیش پیش رہتے، آج اسلام قبول کرنے میں بھی پیش پیش ہیں اور ایسا اُس ملاقات کے بعد ممکن ہوا جو ابوسفیان اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان "مرّ الظہران" کے مقام پر ہوئی، اس کا سبب یہ تھا کہ ابوسفیان جب مکۃ المکرمہ واپس لوٹیں تو اہلِ مکہ کو لڑائی کا خوف دلائیں اور مکہ کی فضاء امن و سلامتی کے لیے سازگار بنائیں اور ان کے ذہنوں سے جنگ و جدل کا خیال نکال باہر کریں، جس کے نتیجے میں جاہلیت اور شرک کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے اور توحید و اسلام کا نور

ہر طرف روشن ہو جائے۔ اس چیز کا تمہیدی مظہر یہ تھا کہ ابوسفیان نے جب اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ نے بھی اس امن وسلامتی کو قائم رکھنے کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان فرمادیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کے لیے امان ہے۔ آپ ﷺ نے ان کی تالیف قلب اور اسلام پر ثابت قدمی کے لیے ان کے گھر کو دارالامان کا درجہ عطا فرمایا۔

کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ اسلام کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے اعتقادی اور عملی ارکان کو قبول کرنا اور ان کی پیروی کرنا' اور اس کام کے بعد ضروری ہے کہ ایک مسلمان کے دل میں ایمان مضبوط اور راسخ ہو اور یہ چیز مبادیاتِ اسلام اور ارکانِ اسلام پر پختگی کے ساتھ عمل سے آتی ہے' اس لیے جائز طریقوں سے مسلمانوں کی تالیفِ قلوب اور دل جوئی کرنے سے اُن میں ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے' جس سے ان کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ یہ حکمت بعض صحابہ کرام کے اذہان سے محو ہو گئی' جب بعض انصاری صحابہ نے آپ ﷺ کا یہ فرمان سنا: جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گیا' وہ امان میں ہے۔

آپ ﷺ کا یہ فرمان سن کر بعض انصاری صحابہ یہ گمان کرنے لگے کہ شاید آپ ﷺ نے اپنے قبیلہ اور اپنے اہلِ وطن کی طرف میلان اور اُن پر شفقت کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا ہے جس سے آپ ﷺ اُن کے ساتھ مصالحت یا اُن کے ساتھ عفوو درگزر کا مظاہرہ فرما رہے ہیں!

اس ضمن میں امام مسلم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے ابوسفیان کے گھر کو دارالامان قرار دیا تو کچھ انصار آپس میں کہنے لگے کہ حضور ﷺ اپنے وطن کی طرف مائل ہو گئے ہیں اور اُن پر قرابت داروں کی محبت غالب آ گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ پھر آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی' جب آپ پر وحی آتی تھی تو ہمیں پتا چل جاتا تھا اور وحی اترنے کے دوران کوئی شخص آپ کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا حتیٰ کہ وحی منقطع ہو جائے' جب وحی منقطع ہو گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے جماعتِ انصار! انہوں نے کہا: ''لبیك یا رسول اللہ'' آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے کہا تھا کہ اس شخص کے دل میں اپنے وطن کی طرف رغبت پیدا ہو گئی ہے' انہوں نے

عرض کیا: ایسا ہی تھا' آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہیں! میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں' میں نے اللہ کی طرف اور تمہاری طرف ہجرت کی ہے' میری زندگی اور موت تمہارے ساتھ ہے۔ انصار زار و قطار روتے ہوئے آپ ﷺ کی طرف بڑھے اور عرض کرنے لگے: بخدا! ہم نے جو کچھ کہا وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں کہا تھا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا' یہ ہے وہ اسلام اور ایمان کے درمیان فرق' اس سے وہ اشکال ختم ہو جاتا ہے جو حضرت ابوسفیان کے اسلام کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ سے ابوسفیان کی ملاقات ''مر الظہران'' میں ہوئی اور ابوسفیان کو اسلام کی دعوت پیش کی گئی تو آپ ﷺ نے اُس کو فرمایا: کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم جان لو کہ بے شک میں اللہ کا رسول ہوں! تو اُس نے جواب دیا: اللہ کی قسم! ابھی میرے دل میں کچھ شک باقی ہے' تو اس پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فوراً ان کو فرمایا: تیرا ستیاناس! اسلام قبول کر اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں! اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اس سے قبل کہ تیری گردن اُڑا دی جائے' اُس وقت ابوسفیان نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔

اشکال: یہاں پر اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس اسلام کی کیا قدر و قیمت ہے جو دھمکی کے بعد قبول کیا جائے؟ کیونکہ ابوسفیان تھوڑی دیر قبل یہ کہہ رہے تھے کہ میرے دل میں نبوت کے متعلق کچھ شکوک ہیں؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں جب کسی کافر یا مشرک کو اس طرح اسلام کی دعوت دی جاتی ہے تو اُس وقت وقتی طور پر اُس سے مطلوب یہی ہوتا ہے کہ یہ ظاہری طور پر اپنے عمل اور اپنی زبان سے اسلام کا مطیع و فرماں بردار ہو جائے' وہ اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو جائے اور اس کے رسول کی نبوت اور جو کچھ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں' وہ اس کا اعتراف کر لے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں بھی ایمان مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی فرق ہے اسلام اور ایمان میں کہ ظاہری اطاعت کو اسلام کہتے ہیں اور دل میں اس کی پختگی کو ایمان کہتے ہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسی لیے اپنی کتابِ کریم میں ارشاد فرمایا:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے

تُؤْمِنُوْا وَلٰـكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ. (الحجرات: ۱۴)

آ ئے' آپ فرمایئے: تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کرلی ہے اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اسی لیے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اگر جنگ کے دوران کوئی کافر اسلام قبول کرلے تو اس کے اس اسلام قبول کرنے کو قتل ہونے کے خوف یا مالِ غنیمت کے لالچ یا جھوٹے دکھاوے پر محمول کرے خواہ اس پر کتنے ہی قرائن دلالت کررہے ہوں' اس لیے کہ مطلوب دلوں کے راز معلوم کرنا نہیں بلکہ مطلوب تو ظاہر کی اصلاح کرنا ہوتا ہے' اسی لیے جب ایک سریہ میں ایک مشرک نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو ایک صحابی نے پھر بھی اس کو قتل کردیا یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس نے موت کے خوف سے ایسا کیا ہے' تو اس موقع پر یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی:

يٰٓـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۝ (النساء: ۹۴)

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر پر نکلو (جہاد کے لیے) تو خوب تحقیق کرلو اور نہ کہو اسے جو بھیجتا ہے تم پر سلام کہ تم مؤمن نہیں ہو تم تلاش کرتے ہو سامان دنیوی زندگی کا' پس اللہ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں (وہ تمہیں غنی کردے گا) ایسے ہی (کافر) تم بھی تھے اس سے پہلے' پھر احسان فرمایا اللہ نے تم پر تو خوب تحقیق کرلیا کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے جو کچھ تم کرتے ہو خبردار ہے۝

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اس آیت مبارکہ میں کیسے یہ بات یاد دلائی کہ جب تم مسلمان ہوئے تھے تو اُس وقت تم بھی اسلام میں اتنے راسخ اور پختہ نہیں تھے جتنے آج ہو' پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان اور فضل فرمایا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہارے دلوں میں

اسلام مضبوط ہوا اور احکامِ اسلام پر عمل کرتے کرتے تم آمیزشوں اور پلیدیوں سے پاک ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی بھی حکمت ابوسفیان کے متعلق یہی تھی کہ جب ابوسفیان نے اسلام کا اعلان کیا تو آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ابوسفیان کو تنگ وادی کے ٹیلے پر کھڑا کیا جائے تا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں کو گزرتے ہوئے دیکھے اور ملاحظہ کرے کہ اسلام کتنا طاقت ور ہو چکا ہے' اور اُن مسلمانوں کی حالت کتنی تبدیل ہو چکی ہے جنہوں نے مکہ سے اس حال میں ہجرت کی کہ وہ کمزور تھے' محتاج تھے اور ان کی تعداد بہت کم تھی' اور اب ان کی طاقت اور تعداد کتنی زیادہ ہو چکی ہے! تا کہ اس عبرتِ بالغہ سے ابوسفیان کا عقیدہ اور دین مزید مضبوط اور مستحکم ہو۔

جب ابوسفیان کو اس ٹیلے پر کھڑا کیا گیا جو لشکروں کی گزرگاہ تھی تو ابوسفیان ایک کے بعد دوسرے دستے کو دیکھ رہے تھے تو اُن پر ان کی دہشت اور ان کا خوف طاری ہو رہا تھا' اسی اثناء میں وہ حضرت عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی دورِ جاہلیت کی فکر کے مطابق کہنے لگے: اے عباس! تیرے بھتیجے کی بادشاہت آج صبح کتنی عظیم ہو گئی ہے! حضرت عباس نے اُن کو ان کی سابقہ غفلت سے جگایا اور فرمایا: اے ابوسفیان! بے شک یہ نبوت ہے۔

تم کس بادشاہت کی بات کرتے ہو؟ یہ بادشاہت' جاہ و جلال اور مال و دولت تو آپ ﷺ نے اُسی دن اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالا تھا جس دن مکہ میں تم نے آپ ﷺ کو یہ سب کچھ پیش کیا تھا' اور آپ ﷺ مکہ میں تمہاری سختیوں اور ایذاؤں کو برداشت کرتے رہے اور تم نے اسی پر اکتفاء نہ کیا' پھر اس کے بعد کیا تم نے آپ ﷺ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیا؟ کیا اس کا سبب اس کے علاوہ کچھ اور تھا کہ انہوں نے نبوت کے بدلے تمہاری طرف سے پیش کردہ سرداری' مال و دولت اور جاہ و جلال کو لینے سے انکار کر دیا' یہ تمہیں ایمان و اسلام کی دعوت دیتے رہے' یہ سب کچھ کیا تھا؟

بے شک یہ نبوت ہے!

حکمتِ الٰہیہ بھی چاہتی تھی کہ یہ کلمہ حضرت عباس کی زبان سے نکلے اور سب کو معلوم ہو جائے کہ آپ ﷺ کی ساری جدوجہد اسی نبوت کے پیغام کو پھیلانے کے لیے ہی تھی' اور

اس کے علاوہ اگر کسی کو دیگر شکوک و شبہات ہیں تو قیامت کے دن تک کے لیے یہ کلمہ اس کے لیے جواب کے طور پر باقی رہے' کیونکہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت بادشاہت' سرداری کے حصول یا عصبیت و قومیت کے احیاء کے لیے نہ تھی بلکہ دینِ حق کی سربلندی کے لیے تھی' حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلا ہوا یہ کلمہ آپ ﷺ کی اول تا آخر ساری حیاتِ طیبہ کا جامع عنوان ہے' اس لیے کہ آپ ﷺ کی ساری عمر اور اس کا ایک ایک مرحلہ اس حقیقت پر دلیل ناطق ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ تھا نہ کہ زمین میں اپنی بادشاہت اور سرداری قائم کرنا۔

چہارم: حضور ﷺ کے مکۃ المکرمہ میں داخل ہونے کی کیفیت

(۱) امام بخاری نے جو روایت حضرت عبداللہ بن المغفل رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ حضور ﷺ جب مکہ کے قریب پہنچے تو اُس وقت آپ ﷺ سورۃ الفتح کی تلاوت خوش الحانی کے ساتھ فرمارہے تھے' روایت میں ''ترجیع'' کا لفظ آیا ہے' جس کا معنی ہے: قراءت میں ترنم۔ آپ ﷺ کا خوش الحانی اور ترنم سے قرآن پاک کی تلاوت کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوتے وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حالتِ شہود میں مستغرق تھے' آپ ﷺ اس فتح و نصرت اور عظیم کامیابی کے نشے میں سرشار نہیں تھے اور نہ ہی آپ کے خیالات پر غرور و تکبر طاری تھا بلکہ آپ نے بارگاہِ الٰہی میں مکمل عاجزی و انکساری اختیار کر رکھی تھی اور اس کی مدد و تائید پر شکر گزاری کا اظہار کر رہے تھے۔

اس مفہوم کی تصویر مزید اس روایت سے واضح ہوتی ہے جو ابن اسحاق سے مروی ہے کہ بے شک حضور ﷺ جب مقامِ ذی طویٰ پر پہنچے تو آپ ﷺ نے اُس فتح و نصرت کو ملاحظہ فرمایا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عزت و تکریم عطا فرمائی تو آپ ﷺ نے اپنا سرِ انور ازراہِ تواضع اتنا جھکا لیا کہ ڈاڑھی مبارک کے بال کجاوے کی لکڑی کو چھونے لگے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے اپنے رب کے حکم پر کاربند رہنے کا ثمرہ دیکھا اور اپنی قوم سے مصائب و آلام جھیلنے کے بعد اب جب فتح و نصرت کی صورت میں ثابت قدمی کا نتیجہ دیکھا تو آپ ﷺ نے اس حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل عبودیت

کا اظہار کیا کہ اُس خالق و مالک نے کس طرح عزت تکریم سے واپس اپنے وطن مکۃ المکرمہ لوٹایا ہے جہاں سے لوگوں نے نکال دیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا جاتا اور اس کے سامنے عبودیت تامہ کا اظہار کیا جاتا۔

ضروری ہے کہ تمام مسلمانوں کی حالت بھی ہمیشہ ایسی ہی ہو کہ خوش حالی و بدحالی آسانی اور سختی، کمزوری اور قوت ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کے لیے مکمل اظہارِ بندگی ہی کیا جائے، مسلمانوں کو یہ زیب نہیں کہ جب کوئی مصیبت اور کرب کی کیفیت ہو تب تو وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی وانکساری اور اپنی محتاجی کا اظہار کریں حتیٰ کہ وہ کرب اور ضرر ختم ہو جائے، اور جب تکالیف دور ہو جائیں تو وہ خوشی سے سرشار ہو جائیں بلکہ اس خوشی کے نشے میں وہ ہر چیز سے غافل ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام وفرامین سے اس طرح دور ہو جائیں کہ ان کا احساس بھی نہ ہو اور ایسا محسوس ہو کہ پریشانی کے ایام میں انہوں نے کوئی فریاد کی ہی نہیں۔

(۲) امام بخاری نے جو روایت نقل کی ہے، اس سے ہمیں اس بات کی راہنمائی بھی ملتی ہے کہ تلاوتِ قرآنِ پاک، ترنم (طرز لگا کر) یا تغنی یعنی خوش الحانی سے کرنا جائز ہے، یہی وہ معنی ہے جس کی تعبیر حضرت عبداللہ بن مغفل نے اپنی روایت میں لفظِ ''ترجیع'' سے کی ہے، یہی صحیح اور درست ہے، اس پر شافعیہ اور حنفیہ کے عام علماء اور مالکیہ کے اکثر علماء کا اتفاق ہے۔

لیکن وہ علماء جو کثیر صحابہ اور تابعین سے کچھ ایسی روایات نقل کرتے ہیں جن میں تطریب اور تغنی سے تلاوتِ قرآن پاک کرنے کو منع کیا گیا ہے تو اس تطریب اور تغنی سے مراد یہ ہے کہ ایسی طرز لگا کر قرآنِ پاک تلاوت کرنا جس سے حروف کی صحیح ادائیگی اور مخارج کی سلامتی باقی نہ رہے، لہٰذا ایسی طرز میں تلاوتِ قرآنِ پاک کرنا بالاتفاق جائز نہیں (کیونکہ مخارجِ حروف کی عدمِ صحت کی وجہ سے معانی بدل جاتے ہیں)۔

(۳) حضور ﷺ نے ایک حکمت سے معمور تدبیر یہ فرمائی کہ صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ سب مکۃ المکرمہ میں مختلف راستوں سے داخل ہوں، یہ بات اس لیے ارشاد فرمائی کہ جب صحابہ کرام کے دستے مکہ کے مختلف راستوں سے داخل ہوں گے تو اہلِ مکہ اگر لڑنا بھی چاہیں تو لڑ نہیں سکیں گے، کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ مکہ کے ہر راستے سے مسلمان داخل ہو رہے

ہیں تو جلدی میں نہ وہ اپنی تعداد پوری کر سکیں گے اور نہ ہی مقابلہ کی ہمت کریں گے' اس طرح مزاحمت کے اسباب کمزور پڑ جائیں گے اور وہ اس پر آمادہ نہ ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا اس لیے کیا تا کہ محترم شہر کی امن و سلامتی محفوظ رہے اور یہاں پر خون خرابہ نہ ہو' اس وجہ سے آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ کسی سے قتال نہیں کریں گے سوائے اُس کے جو لڑائی میں پہل کرے' اور آپ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا' اس کے لیے بھی امان ہے۔

پنجم: حرمِ مکہ کے خاص احکام

(۱) حرمِ مکہ میں قتال کی حرمت

ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کے ساتھ بھی قتال اور لڑائی سے منع فرمایا سوائے اُس کے جو لڑائی میں پہل کرے یا جن چھ افراد کے قتل کا آپ ﷺ نے حکم جاری فرما دیا کہ یہ چھ افراد جہاں بھی ملیں ان کو قتل کر دیا جائے' یہ سب اس حکم سے مستثنیٰ تھے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ایک موقع پر جب آپ ﷺ نے چمکتی ہوئی تلواریں دیکھیں تو اس کو ناپسند فرمایا لیکن جب صحابہ نے بتایا کہ یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہیں جن کے ساتھ لڑائی میں پہل کی گئی ہے' جس وجہ سے وہ جنگ کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''قضاء اللّٰہ خیر'' اللہ کا فیصلہ بہتر ہے۔ اس کے علاوہ مکہ میں قتال اور لڑائی کا کوئی بھی واقعہ پیش نہ آیا۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

بے شک مکہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ نے حرمت کا درجہ دیا ہے اور اس کو انسانوں نے حرمت نہیں دی' پس جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے' اُس کے لیے حلال نہیں کہ وہ یہاں خون بہائے یا یہاں سے کوئی درخت کاٹے' اگر کوئی شخص رسول اللہ کے قتال کو حجت بنائے تو اُس سے کہہ دو کہ اللہ نے اپنے رسول کو ایسا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی جب کہ تمہیں تو اجازت نہیں دی' اور اپنے رسول کو بھی تھوڑی سی دیر کے لیے اجازت دی تھی' پھر اس کی حرمت حسب سابق لوٹ آئی تھی' جو کل تک قائم تھی۔

عام علماء نے اس خطبہ سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ مکہ میں اور اس کے متصل جو حرم ہے اس میں قتال (جنگ) جائز نہیں' کیونکہ فتح مکہ کے روز آپ ﷺ نے اپنے خطبے میں صراحت کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

پھر علماء نے اس بارے میں بھی بحث کی ہے کہ آپ ﷺ کے وہ احکامات جن میں مشرکین' باغیوں اور جن پر قصاص ہو' ان سب کو حرمِ مکہ میں بھی قتل کرنے کا جو حکم دیا ہے' اس حکم میں اور گزشتہ حکم جس میں مطلقاً حرمِ مکہ میں قتال سے منع کیا گیا ہے' ان دونوں میں کیا مطابقت ہوگی اور ان دونوں میں موافقت کا راستہ کیسے نکلے گا؟

علماء کرام نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ جہاں تک مشرکین اور ملحدین کا تعلق ہے ان کے ساتھ تو قتال اور جنگ کرنے میں کوئی ممانعت نہیں کیونکہ شریعتِ مطہرہ میں یہ بات ثابت ہے کہ مکۃ المکرمہ میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر کسی دین سے تعلق رکھنے والے شخص کو رہائش اختیار کرنا ممنوع ہے۔ اس پر ائمہ کا اتفاق ہے بلکہ علماء شافعیہ اور دیگر کثیر مجتہدین کے نزدیک غیر مسلموں کا مکۃ المکرمہ میں محض داخلہ بھی ممنوع ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق:

إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا. (التوبہ:۲۸)	مشرکین تو بڑے ناپاک ہیں' سو وہ قریب نہ ہونے پائیں مسجدِ حرام سے اس سال کے بعد۔

اس آیتِ مبارکہ کی رُو سے اہلِ مکہ پر لازم ہے کہ وہ غیر مسلموں کے یہاں داخل ہونے اور پہنچنے سے پہلے اُن سے قتال کریں اور اُن کو روکیں۔ اس بات کا حکم اس لیے دیا گیا کہ مکہ مکرمہ کو مشرکین اور کافرین کے دَنَس (ناپاکی) اور پلیدی سے محفوظ رکھا جائے۔ یہ دینِ اسلام کے اعجاز کا مظہر ہے' اس وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے سچ کر دکھایا جو نبی اکرم ﷺ کی زبانِ اقدس پر جاری ہوا اور کتابِ مبین میں مذکور ہے۔

جہاں تک باغیوں کا حکم ہے تو باغی وہ ہوتے ہیں جو امامِ صالح کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیں۔ جمہور فقہاء کا اس بارے میں مذہب یہ ہے کہ باغیوں کے ساتھ اُس وقت تک جنگ جاری رہے گی جب تک کہ جنگ کے علاوہ کسی طریقہ سے ان کی بغاوت روکنا

ممکن نہ ہو' کیونکہ باغیوں کے ساتھ جنگ کرنا اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ایک حق ہے جس کو کسی صورت بھی ضائع نہیں ہونے دیا جائے گا' تو لہٰذا حرمِ مکہ میں بدرجۂ اولیٰ اس حق کی حفاظت کرتے ہوئے باغیوں کے ساتھ قتال اور جنگ جائز ہے تاکہ یہ حقِ الٰہی ضائع نہ ہو۔ امام نووی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: باغیوں کے متعلق جمہور فقہاء کا جو مؤقف نقل کیا گیا ہے' یہ درست ہے اور امام شافعی نے ''اختلاف الحدیث'' میں اس کو روایت کیا ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ وہ احادیثِ طیبات جن کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حرمِ مکہ میں مطلقاً قتال ممنوع ہے حتیٰ کہ باغیوں سے بھی' تو اس کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ وہ قتال جس کی تحریم مقصود ہے اس سے مراد یہ ہے کہ حرمِ مکہ میں باغیوں پر جنگ مسلط نہیں کی جائے گی یا یہ کہ منجنیق وغیرہ سے جنگ کرنا جس کے عمومی اثرات ہوں' جنگ صرف اُس صورت میں ہے جب اس کے بغیر اصلاحِ حال ممکن نہ ہو' لیکن اس کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں جہاں باغی شہر بند ہو جائیں وہاں ہر صورت اور ہر شکل میں کافروں اور باغیوں سے جنگ کی جائے گی۔

جب کہ بعض فقہاء کا یہ موقف ہے کہ حرمِ مکہ میں باغیوں سے قتال کرنا جائز نہیں بلکہ ہر طرح سے اُن کو گھیر کر یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ یہاں سے یا تو نکلنے پر مجبور ہو جائیں یا اطاعت قبول کر لیں گے۔ (شرح مسلم للنووی ج۹ ص ۱۲۵۔ ۱۲۴)

حدود کو قائم کرنا: جہاں تک حدود کو قائم کرنے کا تعلق ہے تو اس ضمن میں امام مالک اور امام شافعی کا مؤقف ہے کہ حرمِ مکی میں بھی حدود کو قائم کیا جائے گا۔ امام بخاری کی روایت کردہ اس حدیث کے مطابق کہ جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک حرم کسی سرکش' قتل کر کے بھاگنے والے اور کسی غاصب کو پناہ نہیں دیتا[1]

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مؤقف یہ ہے اور یہی امام احمد کی ایک روایت ہے کہ ایسا شخص جب تک حرم میں ہے امن میں ہے' لیکن اس کو تنگ اور مجبور کیا جائے گا تاکہ یہ یہاں سے

[1] نہایہ میں ہے کہ ''الخربة'' کے اصل معنی عیب کے ہیں اور یہاں مراد ہے وہ شخص جو کوئی ایسی چیز لے کر فرار ہو جسے وہ صرف اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہو حالانکہ شریعت میں اس کی اجازت نہ ہو۔

نکلے اور جب یہ حدود کو توڑنے والا شخص یہاں سے نکلے گا تو اُس وقت اُس پر حد لگائی جائے یا اُس سے قصاص لیا جائے۔ ان فقہاء کی دلیل' حضور ﷺ کے خطبہ کا عموم ہے جو آپ ﷺ نے فتح مکہ کے روز ارشاد فرمایا۔

امام زرکشی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہاں خصوصیت کی وجہ حرم مکی ہے کہ کفار اور باغی اگر مکہ کے بغیر کسی دوسرے شہر میں پناہ لیں تو مصلحت کے مطابق اُن سے ہر طرح سے اور ہر مشکل میں ہر طرح کے اسلحہ سے جنگ کی جائے گی لیکن اگر یہ حرمِ مکی میں کہیں پناہ لے لیں تو ان سے قتال جائز نہیں' حرمِ مکہ کے امن والی جگہ ہونے کی وجہ سے۔

(طرح التغریب ج ۵ ص ۸۶' اعلام الساجد فی احکام المساجد للزرکشی ص ۱۶۲)

میری رائے یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ یہ حرم صرف مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ اور امن کی جگہ ہے' جب واقعتاً صورتِ حال یہ ہے تو پھر حدود قائم کرنے اور بغاوت کو کچلنے کے علاوہ کسی سبب سے یہاں جنگ اور قتال کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ حدود اور بغاوت کا حکم آپ پہلے جان چکے ہیں۔

(۲) حرم مکہ میں شکار کرنے کی حرمت

حرمِ مکہ میں شکار کی ممانعت بالاجماع ثابت ہے' حضور ﷺ کی اس متفق علیہ حدیثِ طیبہ کے مطابق کہ جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لایعضد شوکۃ ولا ینفر صیدہ.	نہ اس کا کانٹا توڑا جائے اور نہ اس کا شکار بھگایا جائے۔

اس حدیثِ طیبہ کی رُو سے جب شکار کو بھگانا حرام ہے تو اس کو جان سے مارنا بدرجہ اولیٰ حرام ہوا' اگر حرمِ مکہ میں شکار ہاتھ میں آ گیا تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے اور اگر وہ شکار ہاتھ میں ہلاک ہوگیا تو اُس شخص پر احرام باندھنے والے شخص کی طرح دم لازم آئے گا' جب کہ پانچ اقسام کے جانوروں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے' آپ ﷺ نے ان کو عمومِ منع سے استثنیٰ قرار دیا ہے اور ان کو فواسق کہا ہے' مثلاً کوا' چیل' بچھو' چوہا اور پاگل کتا۔ علماء کرام نے اس استثنیٰ پر قیاس کرتے ہوئے اُن دوسرے حیوانات کو بھی ان میں شامل کیا ہے جن میں ایذاء اور تکلیف کی صفت پائی جاتی ہے' مثلاً سانپ اور ایذاء دینے والے درندے وغیرہ۔

(۳) حرم مکہ سے کوئی پودا کاٹنے کی حرمت

حرمِ مکہ سے کسی قسم کی جڑی بوٹی یا کوئی پودا یا درخت کاٹنا بھی حرام ہے' اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی سابقہ حدیثِ طیبہ ہے جس میں ارشاد ہے: ''لا یعضد شوکۃ'' اس کا کانٹا نہ توڑا جائے۔

یہ مسئلہ اس طرح ہے کہ ہر جڑی بوٹی جو اللہ تعالیٰ نے یہاں خود بخود اُگائی اس کا کاٹنا حرام ہے' جب تک کہ وہ سرسبز ہو' سوائے اُس پودے کے جس کو کسی آدمی نے وہاں لگایا ہو' کیونکہ جو پودا لوگوں نے وہاں لگایا ہو اس کا کاٹنا حرام نہیں' جس طرح اس میں جانوروں کو ذبح کرنا' خشک پودوں یا درختوں کا کاٹنا اور مویشی چرانا حرام نہیں' لیکن امام زرکشی نے اس مذکورہ بالا حکم میں کچھ اختلاف کرتے ہوئے حضرت امام ابوحنیفہ اور امام احمد سے روایت کیا ہے کہ حرم میں مویشی چرانا بھی جائز نہیں بلکہ منع ہے۔ (اعلام الساجد للزرکشی ص ۱۵۷)

جمہور ائمہ نے اس مذکورہ حکم کی بناء پر اُن جڑی بوٹیوں کا استثنیٰ کیا ہے جو ایذاء رسیدہ اور زہریلی ہوں' اس ضمن میں انہوں نے فواسق جانوروں والے حکم پر قیاس کیا ہے۔

(دیکھئے: مؤلف کی کتاب' ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص ۲۰۰)

(۴) حرم مکی میں احرام پہن کر داخل ہونے کا وجوب

اس بارے میں حکم یہ ہے کہ جو شخص بھی مکہ جانے کا قصد کرے یا امام نووی کے نزدیک حرمِ مکہ میں کسی کام کے لیے بھی جانے کا ارادہ کرے تو اُس پر لازم ہے کہ وہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر داخل ہو' یہ واجب ہے لیکن امام نووی کے نزدیک اس حکم سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو تاجر ہوں یا مزدور کہ جن کا پیشہ ان کو بار بار مکہ میں داخل اور خارج ہونے پر مجبور کرے' ایسے پیشہ ور لوگوں کے لیے احرام باندھ کر داخل ہونا ضروری نہیں۔

اب علماء کرام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا احرام باندھ کر حرم مکہ میں داخل ہونا واجب ہے یا مستحب ہے؟ ائمہ ثلاثہ سے جو مشہور ہے اور جس پر فتویٰ دیا گیا ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک جو حکم ہے اور جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ یہی ہے کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت احرام باندھ کر ہی داخل ہونا واجب ہے' جب کہ جمہور فقہاء شافعیہ کے نزدیک یہ مستحب ہے۔

سبب الاختلاف: اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب فتح کے روز مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے احرام نہیں باندھا ہوا تھا' اس کی دلیل وہ حدیث طیبہ ہے جس کو امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ جب فتح کے روز مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر مبارک پر کالا عمامہ شریف تھا اور آپ ﷺ بغیر احرام کے تھے۔

پس جو ائمہ احرام باندھنے کو مستحب کہتے ہیں' وہ مذکورہ بالا حدیث طیبہ سے دلیل پکڑتے ہیں' جب کہ دوسرے ائمہ جو مکہ میں داخل ہوتے وقت احرام باندھنے کو واجب کہتے ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ بے شک نبی اکرم ﷺ فتح مکہ کے روز اس حال میں مکہ میں داخل ہوئے تھے کہ اس بات کا خدشہ تھا کہ کفارِ مکہ غدر کرتے ہوئے جنگ کریں گے' اس لیے آپ ﷺ بھی جنگ میں پہل کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے تیار ہو کر مکہ میں داخل ہوئے تھے اور یہ ایسے حالات ہیں جو عمومی حالات سے مستثنیٰ ہیں' کیونکہ عمومی حالات میں احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہونا واجب ہے۔

(۵) غیر مسلمین کا مکہ میں رہائش اختیار کرنا حرام ہے

اس بات کی وضاحت ہم نے پہلے حکم کی تشریح کے دوران کر دی ہے (کہ غیر مسلمین کا مکہ میں رہائش اختیار کرنا تو در کنار ان کا داخلہ بھی ممنوع ہے)۔

ششم: فتح مکہ کے روز کعبہ شریف کے قریب آپ ﷺ کے معمولات

(۱) کعبہ شریف کے اندر نماز کی ادائیگی

ہم نے اس سے قبل یہ روایت نقل کی ہے جو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے بیت اللہ میں داخل ہونے سے قبل وہاں سے بتوں کو نکلوایا اور حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کی ان تصاویر کو بھی نکلوایا کہ جن تصاویر میں ان بزرگوں کے ہاتھوں میں پانسے کے تیر پکڑائے ہوئے تھے' پھر آپ ﷺ بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے اور اس کے کونوں میں تکبیر کہی لیکن نماز ادا نہ فرمائی۔

امام مسلم نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے اور آپ کے ساتھ حضرت اسامہ' حضرت بلال اور حضرت عثمان بن طلحہ الحجبی رضی اللہ عنہم بھی تھے اور دروازہ بند کر لیا' پھر وہاں کچھ دیر ٹھہرے۔ حضرت عبداللہ

بن عمر فرماتے ہیں: جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نکلے تو میں نے اُن سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے اندر کیا کیا تھا؟ تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کعبہ کے دو ستون دائیں رکھتے ہوئے' ایک ستون بائیں رکھتے ہوئے اور تین ستون پیچھے رکھتے ہوئے کھڑے ہوئے اور نماز ادا کی' خانہ کعبہ اُس وقت چھ ستونوں پر تھا۔ امام بخاری نے بھی حضرت ابن عمر سے یہ روایت تقریباً انہی الفاظ میں نقل کی ہے۔ علماء کرام اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ان دونوں احادیث طیبات میں کوئی تعارض نہیں ہے' اس لیے کہ جو حدیث حضرت ابن عباس نے روایت کی ہے' اُس میں کعبہ کے اندر نماز کا ذکر نہیں لیکن حضرت ابن عباس' آپ ﷺ کے ساتھ کعبہ کے اندر موجود نہیں تھے۔ اسی طرح جس حدیث میں نماز پڑھنے کی نفی ہے' ابن حجر کے قول کے مطابق وہ حدیث کبھی حضرت اسامہ سے روایت کی جاتی ہے اور کبھی ان کے بھائی الفضل سے' جب کہ حضرت الفضل بھی اُس روز آپ ﷺ کے ساتھ کعبۃ اللہ کے اندر موجود نہ تھے' جب کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو اس حدیثِ طیبہ میں آپ ﷺ کا کعبہ مشرفہ کے اندر نماز پڑھنا بیان کرتے ہیں' وہ اُس دن آپ ﷺ کے ساتھ کعبہ کے اندر موجود تھے' اس وجہ سے چاہیے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ حدیث جو انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' اس کو مقدم رکھا جائے۔ اس حدیث کے مقدم ہونے کی دو وجوہات ہیں:

پہلا سبب: پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیثِ طیبہ اثباتِ نماز کو ثابت کرتی ہے' لہٰذا اس میں زیادہ معلومات ہیں' اس لیے قانون یہ ہے کہ اثبات ثابت کرنے والی حدیث کو نفی کرنے والی حدیث پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔

دوسرا سبب: دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ والی روایت میں کعبہ کے اندر نماز کے اثبات کے ساتھ ساتھ اس کا مشاہدہ بھی پایا گیا ہے۔

کیونکہ حضرت بلال اُس روز بذاتِ خود آپ ﷺ کے ساتھ کعبہ کے اندر موجود تھے' لہٰذا یہ روایت زیادہ قابل قبول ہے جب کہ حضرت ابن عباس والی جو روایت ہے اس کو آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ صرف نقل کی گئی ہے' اس میں مشاہدہ نہیں پایا جاتا' اور نقل کرنے میں بھی وجہ یہ ہے کہ کبھی یہ روایت حضرت اسامہ سے نقل کی جاتی ہے اور کبھی ان کے بھائی حضرت

الفضل کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے' جب کہ حضرت الفضل وہاں پر بذاتِ خود موجود بھی نہیں تھے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ علماء حدیث نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ والی روایت کو اپنانے پر اجماع کیا ہے' کیونکہ یہ مثبت ہے یعنی کعبہ کے اندر نماز کی ادائیگی کو ثابت کرتی ہے اور اس میں معلومات بھی زیادہ ہیں' اس لیے اس کو ترجیح دینا ضروری ہے۔

(فتح الباری ج ۳ ص ۴۰۴' شرح مسلم للنووی ج ۹ ص ۸۲)

اس مذکورہ بالا تحقیق کی بناء پر امام شافعی' امام ابوحنیفہ' امام احمد اور جمہور علماء نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ کعبۃ اللہ کے اندر نماز ادا کرنا صحیح ہے' جب نمازی کسی ایک دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے' نفلی اور فرضی دونوں نمازیں ادا کرنا صحیح ہے جب کہ امام مالک نے تھوڑا اختلاف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کعبۃ اللہ کے اندر نفل نماز تو صحیح ہے لیکن فرض اور سنن مؤکدہ ادا کرنا صحیح نہیں۔ (النووی علی المسلم وطرح التغریب للحافظ العراقی ج ۵ ص ۱۷۵)

(۲) تصویر اور تصویر کشی کا حکم

ہم نے اس سے قبل جو بخاری شریف کی حدیث نقل کی' اس میں یہ بات موجود ہے کہ آپ ﷺ کعبۃ اللہ کے اندر اُس وقت تک داخل نہ ہوئے جب تک کہ وہاں پڑے ہوئے بتوں اور تصاویر کو نکلوا نہ دیا۔

ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب جو اُس وقت بطحاء میں تھے' کو حکم دیا کہ وہ جا کر کعبۃ اللہ سے تمام تصویروں کو مٹائیں' پس آپ ﷺ اُس وقت تک کعبہ کے اندر داخل نہ ہوئے جب تک کہ تمام تصویریں مٹا نہ دی گئیں۔

امام بخاری نے کتاب الحج میں حضرت اسامہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر کو دیکھا تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور اس تصویر کو مٹایا۔

مجموعی طور پر یہ احادیثِ طیبات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے دیواروں پر نقش کی ہوئی تصاویر کو بھی ایسے ہی صاف کروا دیا جس طرح کعبہ کے اندر صورتوں

کی شکل میں کھڑے مجسموں اور بتوں کو نکلوایا۔ اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ ان بتوں اور تصاویر کو نکلوانے کے بعد کعبۃ اللہ میں داخل ہوئے تو وہاں ابھی ان تصاویر کے کچھ آثار باقی تھے' جس پر آپ ﷺ نے دوبارہ پانی منگوا کر اچھی طرح سے اُن تصاویر کے باقی ماندہ نشانات کو بھی صاف کروایا۔

اس عمل سے تصویر کے بارے میں اسلام کا حکم واضح ہو گیا کہ تصویر چاہے مجسم مورتی ہو یا منقوش ہو یعنی ہاتھ سے نقش کی ہو' دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ یہاں پر ہم حضرت امام نووی علیہ الرحمۃ کی وضاحت بھی نقل کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی شرح صحیح مسلم میں کی ہے' امام نووی فرماتے ہیں:

ہمارے ائمہ اور دیگر علماء اسلام کہتے ہیں کہ کسی جان دار کی تصویر بنانا شدید حرمت کے ساتھ حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے' کیونکہ اس کے بارے احادیثِ طیبات میں شدید وعید آئی ہے۔

جان دار کی تصویر خواہ ایسی چیز سے بنائی گئی ہو جس کا احترام نہیں کیا جاتا یا ایسی چیز سے بنائی گئی ہو جس کا احترام کیا جاتا ہے' اس کو بنانا اور نقش کرنا ہر طرح سے حرام ہے' کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے مشابہ مخلوق کی شکل و صورت منقش کرنے کے مترادف ہے' اسی طرح جان دار کی تصویر چاہے کپڑے پر ہو' چاہے چٹائی پر ہو یا فرش پر یا درہم و دینار پر ہو یا سکے پر ہو یا برتن پر ہو یا دیوار وغیرہ پر ہو' ان سب کا حکم برابر ہے۔

جب کہ درختوں کی تصاویر (مظاہر فطرت کی تصاویر) اور اونٹوں کے کجاوں کی تصاویر بنانا یہ حرام نہیں ہے۔

یہ حکم تو نفسِ تصویر کا ہے' اسی طرح مصور نے کوئی تصویر بنائی جس میں جان دار کی تصویر بھی ہو اور اس تصویر کو لٹکا دیا جائے' یا کپڑوں پر بنی ہو یا عمامہ وغیرہ پر بنی ہو' جس میں اس تصویر کی توہین کا پہلو نہ ہو تو یہ حرام ہے' اور اگر وہ تصویر ایسی چٹائی پر ہو جس پر پاؤں رکھ کر چلا جاتا ہو یا بستر کی چادر یا گاؤ تکیہ پر بنی ہو' جس سے اُس تصویر کی توہین کا پہلو نکلتا ہو تو یہ حرام نہیں' لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایسی تصاویر کی وجہ سے رحمت کے فرشتوں کا نزول بند تو نہیں ہو جاتا؟

اس بارے میں ہم آگے چل کر بحث کریں گے (ان شاء اللہ)' تصویر کے اس مذکورہ بالا حکم میں ہر طرح کی تصاویر شامل ہیں' جن کا سایا ہو یا نہ ہو یعنی وہ مجسم ہوں یا نہ ہوں وغیرہ سب ممنوع ہیں۔

ہمارے اصحاب کے مذہب کی یہ تلخیص ہے جو ہم نے اوپر ذکر کر دی۔ صحابہ کرام' تابعین اور جمہور علماء نے بھی ایسا ہی بیان فرمایا ہے' اور امام نووی' امام مالک اور امام اعظم ابوحنیفہ وغیرہ کا بھی یہی مؤقف ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ صرف اُس تصویر کی ممانعت ہے جس کا سایا ہو یعنی جو مجسم ہو اور جس کا سایا نہ ہو یعنی جو مجسم نہ ہو اُس کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں' یہ رائے باطل ہے۔ کیونکہ جب آپ ﷺ' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لائے اور وہاں ایک پردے پر تصاویر دیکھیں تو آپ ﷺ نے اُس کو ناپسند فرمایا۔[1]

معلوم ہوا کہ اس میں کسی کو شک نہیں کہ وہ تصاویر جن کا سایا نہ ہو' وہ بھی مذموم ہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لگائے ہوئے پردے پر بنی ہوئی تصاویر کا سایا نہیں تھا' اسی طرح اس کے علاوہ باقی ایسی احادیث طیبات ہیں جن میں مطلقاً تصاویر کو ممنوع و مذموم قرار دیا گیا ہے۔

پھر امام نووی فرماتے ہیں کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جن تصاویر کا سایا ہو' ان کا رکھنا سخت ممنوع ہے اور ان کو بدلنا واجب ہے۔ قاضی فرماتے ہیں: لیکن جو کھلونے گڑیوں وغیرہ کی صورت میں بچیوں کے کھیلنے کے لیے ہوں' ان میں رخصت ہے۔

(النووی بر صحیح مسلم ج ۱۴ ص ۸۱)

میں کہتا ہوں کہ آج کل جو لوگ کیمرے کے ذریعے تصاویر بناتے ہیں' ان کا کیا حکم

---

[1] امام نووی یہاں وہ حدیث مراد لیتے ہیں جسے امام مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا' وہ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے' میں نے ایسا باریک پردہ دروازے پر لٹکا رکھا تھا کہ جس میں تصاویر تھیں' انہیں دیکھ کر آپ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا' آپ نے وہ پردہ لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا: قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب پانے والے وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

ہے؟ کیا یہ انہی تصاویر کے حکم میں ہیں جن کو ہاتھ کی مہارت سے نقش اور مرتسم کیا جاتا ہے یا ان کا کوئی دوسرا حکم ہے؟

امام نووی نے اس ضمن میں تصویر کی علت کے متعلق جو کچھ ذکر کیا تو اس علت کے پیش نظر فوٹوگرافی کی تصویر کے متعلق ایک رائے یہ سامنے آئی ہے کہ فوٹوگرافی والی تصویر' ہاتھ سے بنائی گئی تصویر کی مانند نہیں ہوتی کیونکہ فوٹوگرافی کا عمل کسی طور بھی ہاتھ کی صنعت اور ہاتھ کی مہارت کے برابر نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ کیمرے کی فوٹوگرافی میں تصویر اپنی مرضی سے ہاتھ سے منقش نہیں کی جاتی کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ اشیاء کی مشابہت کی کوشش ہو' بلکہ یہ عمل بٹن کی بالکل تھوڑی سی تحریک سے کیمرے میں وقوع پذیر ہوتا ہے' یہ عمل کیمرے کے اندر اصل چیز کے سائے اور عکس کے رک جانے سے اور پھر کیمیائی مادے کے ذریعے کاغذ پر اُتارنے سے ہوتا ہے' اور ایسا بالکل تھوڑی سی حرکت سے ایک چھوٹا بچہ بھی کرسکتا ہے۔

لیکن حق یہی ہے کہ ان مختلف انواع واقسام کی تصاویر میں کوئی فرق نہیں بلکہ یہ سب ایک ہی حکم میں ہیں۔ حدیث طیبہ کے مطلق الفاظ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تصاویر کی مختلف اقسام کے درمیان ازروئے تکلف فرق نہیں کرنا چاہیے' اس معاملہ میں احتیاط کے پیش نظر۔ یہ تو تصویر بنانے سے متعلق بات تھی لیکن تصویر کا رکھنا خواہ وہ فوٹوگرافی والی ہو یا ہاتھ سے بنائی گئی ہو' دونوں کا حکم برابر ہی ہے (اس کے حکمِ شرعی کے متعلق مزید تحقیق کی ضرورت ہے)۔

لیکن جہاں تک تعلق ہے تصویر کی نوعیت کا تو تصویر بنانے اور اُسے رکھنے کے حکم پر اس کا ضرور اثر ہوگا' اگر جس چیز کی تصویر بنائی ہے وہ چیز محرمات میں سے ہے مثلاً عورتوں کی تصویر یا اس جیسی کوئی دوسری چیز تو یہ یقیناً حرام ہوگی' اور اگر کوئی ایسی چیز ہو جس کی تصویر بنانا مصلحت کا تقاضا ہو تو بعض اوقات اس سلسلے میں رخصت ہے۔ واللہ اعلم

پھر بعض لوگ آج کے اس دور میں اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر سازی اور مجسمہ سازی حرام اور ممنوع ہیں' حالانکہ یہ دونوں چیزیں آج کے اس جدید دور میں تمام متمدن اقوام کے نزدیک عظیم فنی لوازمات میں شمار ہوتی ہیں۔

ان لوگوں کے تعجب کا راز یہ ہے کہ یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اسلام آج کے دور کی اس

مغربی تہذیب سے متفق ہے' اور صرف ان بعض جزئی مظاہر میں وہ اس سے مختلف ہے' اس تناقض کی وجہ سے وہ تعجب کرتے ہیں جب کہ اسلام اگر ان فنی مظاہر کو تسلیم نہیں کرتا اور انہیں حرام قرار دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام تہذیب کے لیے ایک مستقل بالذات اصول رکھتا ہے جو مغربی تہذیب کے اصولوں سے موافقت نہیں رکھتا کیونکہ مغربی تہذیب وہ ہے کہ جو ہم تک خالص عقلی بحث و تمحیص کے ذریعے نہیں پہنچتی بلکہ اندھی تقلید کی صورت میں ہم پر مسلط کردی گئی ہے۔

یہ لوگ فن کے نام پر اسلام کے خلاف دلیل قائم کرتے ہیں حالانکہ اسلام میں فن کا ایک علیحدہ مفہوم ہے' جو اس مضمون سے مختلف ہے جسے ہم نے عقیدے سے غیر متعلق ایک دوسرے فلسفے سے اخذ کیا ہے۔

(۳) بیت اللہ کی دربانی اور کلید برداری

ہم نے اس سے قبل جو روایت نقل کی کہ جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت اللہ کی چابی حضرت عثمان بن طلحہ کو واپس لوٹا دی اور فرمایا:

خذوھا خالدۃ مخلدۃ. اس کو ہمیشہ کے لیے تم ہی رکھ لو۔

اس حکم سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد بنوعبدالدار اور بنوشیبہ تھے۔

پھر فرمایا:

لاینزعھا منکم الا ظالم. یہ چابی تم سے کوئی ظالم ہی ہتھیائے گا۔

عام علماء کا یہ مؤقف ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان سے قیامت تک بھی خانہ کعبہ کی دربانی اور کلید برداری کا عہدہ چھینے اور یہ منصب چھین کر کسی اور کے حوالے کر دے۔

امام نووی نے قاضی عیاض سے نقل کیا ہے' وہ فرماتے ہیں: یہ منصب اور حق انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عطا کیا گیا' اس لیے یہ ہمیشہ ان کے پاس اور ان کی نسلوں کے پاس ہی رہے گا' نہ ان سے چھین کر کسی اور کو دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو ان کے ساتھ اس حق ولایت میں شریک کیا جا سکتا ہے' جب تک کہ اس خاندان کے افراد موجود ہیں

اور وہ اس کام کے اہل ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ولایت اور یہ حق آپ ﷺ کی وصیت اور حکم کے مطابق آج بھی انہی کے پاس ہے۔

(۴) بت شکنی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی فتح ونصرت اور اپنے نبی ﷺ کی تائید کا یہ دلکش منظر تھا کہ آپ ﷺ مشرکین کے اُن خداؤں کو جو مجسموں' مورتیوں اور تصاویر کی صورت میں کعبۃ اللہ کے اردگرد بکھرے ہوئے تھے' ان کو اپنے عصا مبارک سے ٹھوکر مارتے جاتے اور ساتھ ساتھ یہ فرما رہے تھے:

جاء الحق وزھق الباطل' جاء الحق وما یبدئ الباطل وما یعید۔ حق آ گیا ہے اور باطل مٹ گیا' حق آ گیا ہے اور باطل نہ اب نئے سرے سے کھڑا ہوگا اور نہ ہی لوٹ کر آئے گا۔

ابن اسحاق وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ تمام بت جن کی بنیادیں مضبوط کی ہوئی تھیں تا کہ وہ ان مضبوط بنیادوں پر سیدھے قائم ودائم کھڑے رہیں اور محض کسی چھڑی کے اشارے سے وہ گرنے والے نہیں تھے لیکن سب نے وہاں دیکھا کہ وہ مضبوط بنیادوں پر کھڑے بت کیسے آپ ﷺ کے عصا مبارک کے اشارے سے گرتے گئے' آپ ﷺ جب کسی بت کی طرف اشارہ فرماتے تو وہ منہ کے بل اوندھا گر جاتا اور کوئی بت پشت (گدی) کی طرف گر پڑتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آج اللہ تعالیٰ نے قریش کے اس جرءت اور غرور کو ذلت و خواری میں بدل دیا اور آج حق واضح ہو گیا اور باطل ہر طرح سے مٹ گیا' اور اہل مکہ کو آپ کے لائے ہوئے دین کا تابع اور آپ کی بلند کی ہوئی آوازِ حق کا مطیع بنا دیا۔

ہفتم: فتح مکہ کے روز آپ ﷺ کے خطبہ کے اہم نکات

اب جب کہ مکہ فتح ہو چکا ہے اور یہ وہی مکہ ہے جہاں سے آٹھ سال قبل آپ ﷺ نے اور صحابہ کرام نے ہجرت فرمائی اور آج یہ مکہ آپ ﷺ کے سامنے مطیع ہے اور آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان لے آیا ہے' اور یہ اہلِ مکہ وہی ہیں جنہوں نے آپ ﷺ پر اور مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے اور ان کو طرح طرح کی تکالیف اور اذیتیں دیں'

آج یہ سب اہلِ مکہ ہتھیار ڈالے مطیع و فرماں بردار سر جھکائے ہوئے آپ ﷺ کے اردگرد کھڑے ہیں' آج اس فتحِ عظیم کے موقع پر آپ ﷺ ان کو کیا فرمائیں گے؟

آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ آپ ﷺ سب سے پہلے اپنے رب کی حمد و ثناء بیان کریں' جس رب نے آپ کی مدد و نصرت فرمائی اور اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا' اسی لیے آپ ﷺ نے اپنا خطبہ اس قول سے شروع کیا:

لا اله الا الله وحدهٗ لاشريك له صدق وعده' ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده.

اللہ وحدہٗ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں' اُس نے اپنا وعدہ سچا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور یک بارگی تمام لشکروں کو شکست دی۔

پھر اس کے بعد آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ آپ ﷺ قریش' دیگر قبائل اور تمام لوگوں کے سامنے جدید معاشرے اور اس کے شعار کے قیام کا اعلان فرمائیں' وہ شعار جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنا دیا ہے تمہیں مختلف قومیں اور مختلف خاندان تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو' تم میں سے زیادہ معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

اس طرح جاہلیت کے وہ پرانے باقی ماندہ آثار مسلمانوں کے قدموں تلے دفن ہو گئے' جاہلیت کے اُن آثار میں آباء و اجداد پر تفاخر' قومیت' عصبیت' قبائلی مباہات اور رنگ' زبان' نسل کے تفرقات سب شامل تھے' جو آنِ واحد میں قدموں تلے روند ڈالے گئے اور اعلان ہوا کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔

قریش کی سرداری اور فخر و مباہات جو جاہلیت کے زمانے سے تھا' وہ سب سمیٹ دیا گیا

اور ان کی پرانی تمام عادات و تقالید بھی اسی کے ساتھ ہی لپیٹ دی گئیں' اب یہ سب کچھ ماضی کے دریچوں میں دفن ہو چکا اور اب قریش کے لیے ضروری تھا کہ جاہلیت کے باقی ماندہ آثار کی پلیدی کو بھی دھوڈالیں اور قافلۂ اسلام کے ساتھ ہمرکاب ہو جائیں' کیونکہ اب اس قافلۂ اسلام کو ایوانِ کسریٰ اور بلادِ روم میں داخل ہونا تھا۔

مکۃ المکرمہ آج کے بعد سے اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارا بن رہا تھا' جس تہذیب و تمدن کا لباس پوری دنیا کو پہنایا جانا تھا' جس میں سعادتِ انسانی اور فلاح شامل ہیں۔ اس طرح فتح مکہ کی اس گھڑی میں جاہلیت کے باقی ماندہ آثار قدموں تلے دفن کر دیے گئے اور قریش نے رسول اللہ ﷺ کے دستِ حق پر اسلام کی بیعت کر لی۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے' اور یہ کہ کوئی عظمت نہیں ہے سوائے اسلام کا لبادہ اوڑھنے کے' اور یہ کہ کوئی مباہات نہیں سوائے اسلام کے نظام پر مضبوطی کے ساتھ عمل کرنے کے' اس حقیقت کو تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دنیا کی زمامِ اقتدار عطا فرمائی اور پوری دنیا کو ان کے سامنے مطیع کر دیا۔

لیکن افسوس! کتنی عجیب بات ہے کہ آج تقریباً چودہ سو سال گزر جانے کے بعد مسلمان پھر وہی دورِ جاہلیت کی رسوم و عادات کے گڑے ہوئے متعفن مردے کو اکھاڑ رہے ہیں (جس وجہ سے آج امتِ مسلمہ کمزور اور بکھری چلی جا رہی ہے)۔

ہشتم: عورتوں کی بیعت اور اس سے متعلق احکام

اس سے ہم مندرجہ ذیل احکام مستنبط کرتے ہیں:

اوّل: عام اسلامی ذمہ داریوں میں عورت اور مرد کی شرکت

مکمل انسانی مساوات کی بنیاد پر جملہ ذمہ داریوں میں عورت اور مرد دونوں برابر کے شریک ہیں' اسی لیے خلیفہ یا حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان عورتوں سے تمام مشروع وممکنہ وسائل بروئے کار لا کر اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے کام کرنے کا عہد لے' جس طرح وہ مردوں سے عہد لیتا ہے' اس سلسلے میں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق اور تفاوت نہیں ہے۔

اس لیے مسلمان عورت پر لازم ہے کہ وہ بھی مردوں کی طرح اپنے دین کے مسائل و

احکام جانے اور یہ کہ عورت بھی علوم وفنون اور شعور وآگہی کے اسلحہ سے لیس ہونے کے لیے تمام جائز اور ممکنہ وسائل اختیار کرے' دشمنانِ اسلام اس کے خلاف جو سازشیں کرتے ہیں' ان کے اسالیب اور کمین گاہوں سے واقفیت حاصل کرے تاکہ اپنی ذات کے بارے میں اس نے جو عہد کیا ہے اسے پورا کر سکے' اور بیعت کا جو قلادہ اس نے اپنی گردن میں ڈالا ہے' اس کا پورا حق ادا کر سکے۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ عورت ان ذمہ داریوں میں سے بعض پوری طرح انجام نہیں دے سکتی' یہ اس صورت میں ہے کہ اگر وہ اپنے دین کے حقائق سے پوری طرح آگاہ نہ ہو اور اس کے اردگرد جو بیرونی سازشیں ہو رہی ہیں' اُن سے بے خبر ہو۔

دوم: بیعت کے وقت اجنبی عورتوں سے مصافحے کی ممانعت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس طرح عورتوں سے بیعت لی' اس کیفیت کے متعلق ہم نے اس سے قبل ذکر کیا۔ آپ نے مردوں کے طریقہ کے برعکس ان کے ہاتھ کو چھوئے بغیر کلام کے ذریعے بیعت لی جب کہ مردوں سے آپ نے ہاتھ پر بیعت لی۔ اس عمل سے ہمیں یہ راہنمائی ملتی ہے کہ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اجنبی عورت کی جلد کو مَس کرے۔ اس مسئلہ میں علماء اسلام کے ہاں کوئی اختلاف مجھے نہیں معلوم' البتہ انتہائی ضرورت کے پیشِ نظر عورت کے جسم کو چھوا جا سکتا ہے مثلاً علاج کی غرض سے' فصد لگوانے کے لیے' ڈاڑھ نکلوانے کے لیے وغیرہ۔

لیکن آج کل جو عورتوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کا رواج چل نکلا ہے اور بعض لوگ اس کو عرف عام کی ضرورت سمجھتے ہیں' ایسا خیال بالکل غلط اور من گھڑت ہے۔ عرف عام ایسے احکام کے تغیر وتبدل کا کوئی حق نہیں رکھتا جو کتاب وسنت سے ثابت ہوں' اس سے صرف وہی حکم بدل سکتا ہے جو کسی عرف عام پر مبنی ہو' وہ اس طرح کہ اگر عرف بدل جائے تو اس کی وجہ سے اس کے حکم میں بھی تبدیلی آ جائے گی' گویا وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مشروط حکم ہے جو ایک مخصوص حالت کا متقاضی ہوتا ہے' اس کا اس موجودہ موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔

سوم: اجنبی عورت کی آواز سننے کا حکم

احادیثِ بیعت جو ہم نے اس سے قبل ذکر کیں' وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ

اجنبی عورت کی آواز ضرورت اور حاجت کے وقت سننی جائز ہے کیونکہ عورت کی آواز کا پردہ نہیں۔ یہ جمہور فقہاء کا مذہب ہے' جن میں فقہاء شافعیہ بھی شامل ہیں۔

بعض فقہاء احناف کا مؤقف یہ ہے کہ اجنبی عورت کی آواز کا بھی پردہ ہے لیکن اس ضمن میں عورتوں کی بیعت کی صحیح احادیث اور اس کے علاوہ کثیر دیگر احادیث اس صورت میں ان کے خلاف جاتی ہیں۔

نہم: کیا مکہ طاقت سے فتح ہوا یا صلح سے؟

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے' امام شافعی' امام احمد اور دیگر ائمہ کا یہ مؤقف ہے کہ آپ ﷺ مکہ میں صلح کے بعد داخل ہوئے اور اس صلح میں قریش کا نمائندہ ابوسفیان تھا' اور اس صلح میں اس شرط پر اتفاق ہوا تھا کہ بے شک جو شخص اپنا دروازہ بند کر لے گا وہ بھی امان میں ہے' جو اسلام لے آئے گا وہ بھی امان میں ہے اور جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ بھی امان میں رہے گے سوائے اُن چھ افراد کے جن کو قتل کرنے کا حکم دیا جا چکا تھا۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک کا یہ مؤقف ہے کہ آپ ﷺ نے مکۃ المکرمہ بہ زورِ بازو' طاقت کے ذریعے فتح کیا' اس پر یہ ائمہ استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان مکہ میں اسلحہ اٹھائے ہوئے سامانِ حرب سے لیس مختلف راستوں سے داخل ہوئے' یہ طریقہ ثابت کرتا ہے کہ یہ بزورِ شمشیر فتح ہوا۔

بہرکیف اس بارے کسی کا کوئی بھی مؤقف ہو' سب اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ نے یہاں سے کچھ بھی مالِ غنیمت نہ لیا اور نہ ہی اس میں کسی کو غلام یا لونڈی بنایا گیا' پس جو ائمہ یہ کہتے ہیں کہ مکۃ المکرمہ صلح سے فتح ہوا تو اس کا سبب بھی واضح ہے' اور جو ائمہ کہتے ہیں کہ مکہ بزورِ شمشیر فتح ہوا' وہ کہتے ہیں کہ ایک اور چیز جو مکہ کو دوسرے شہروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ نے اس کی کسی چیز کو تقسیم کرنے سے منع فرمایا' کیونکہ یہ مناسک ادا کرنے کی جگہ' حق تعالیٰ کی عبادت کرنے کی جگہ اور ربِ تعالیٰ کا حرم ہے گویا کہ اس کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام عالمین کے لیے وقف ہے' اس لیے کئی فقہاء جن میں حضرت امام ابوحنیفہ بھی شامل ہیں' نے مکہ کی زمینوں کی خرید و فروخت اور یہاں کے مکانات کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (الاحکام السلطانیہ ص ۱۶۴' زاد المعاد لابن القیم ج ۲ ص ۱۷۴)

مکۃ المکرّمہ کی اس فتح عظیم کے ان واقعات سے جو چند احکام اور دروس حاصل ہوئے' ہم نے اُن کا خلاصہ اپنی استطاعت و قدرت کے مطابق پیش کر دیا ہے' اتنی تفصیل ہی کافی ہے۔ واللہ اعلم!

غزوۂ حنین

غزوۂ حنین ماہِ شوال ۸ ہجری میں واقع ہوا۔

سبب

اس کا سبب یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مکۃ المکرّمہ کی فتحِ عظیم عطا فرمائی اور قریش اپنی بغاوت اور دشمنی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطیع ہوئے تو اسلام کی اس عظیم کامیابی کو دیکھ کر قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف کے اکثر سردار آپس میں جمع ہوئے اور مسلمانوں کی اس فتحِ عظیم پر اُن کے سینے جلنے لگے اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاری کا پروگرام بنایا' اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک بہت بڑے لشکر کو جمع کیا۔ سب نے متفقہ طور پر قبیلہ ھوازن کے سردار مالک بن عوف کو اس لشکر کا امیر چن لیا' اس نے حکم دیا کہ سب لوگ اپنے اموال' اپنی عورتیں اور بچے بھی ساتھ لے کر نکلیں' یہ لشکر اس انوکھی تدبیر کے ساتھ نکلا حتیٰ کہ جب مکہ اور طائف کے درمیان ''اوطاس'' کے مقام پر پہنچا تو یہاں پر پڑاؤ کرنے کا کہا گیا' اس لشکر میں سب جنگ جوؤں کو اپنے اموال' اپنی عورتیں اور بچے لانے کا جو حکم دیا گیا' اُس کا مقصد یہ تھا کہ ہر لڑنے والا جب اپنے پیچھے اپنے مال' اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو پائے گا تو وہ اُن کا دفاع کرتے ہوئے پوری طاقت سے لڑے گا اور راہِ فرار اختیار نہ کرے گا۔ انہوں نے دوسرے قبائل کو بھی ساتھ ملا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر حملہ کرنے کے مضبوط منصوبہ پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔

اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب اس لشکر کی پیش قدمی کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چھ شوال کو ان کی سرکوبی کے لیے نکلے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ اُس وقت بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر تھا' جس میں سے دس ہزار اہلِ مدینہ تھے اور دو ہزار اہلِ مکہ تھے۔

(طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۳۰۰' سیرت ابن ہشام)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد الاسلمی کو اس لشکر کی مخبری کے لیے بھیجا، ان کو حکم دیا کہ اُن مشرکین میں داخل ہو جائیں اُن میں ٹھہرے رہیں یہاں تک کہ پوری خبر حاصل کر لیں، پھر واپس آ کر حالات سے آگاہ کریں، حضرت عبداللہ چلے گئے حتیٰ کہ اُن میں داخل ہو گئے، ان کے لشکر میں گھوم پھر کر ان کی سرگرمیوں کا بغور جائزہ لیا اور پھر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اُن کی خبر دی۔

جب آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا گیا کہ صفوان بن امیہ کے پاس کافی زرہیں اور اسلحہ ہے، صفوان اُس وقت ابھی مشرک تھا، پس آپ ﷺ نے صفوان کو بُلا بھیجا اور اُس سے زرہیں اور اسلحہ طلب فرمایا، صفوان نے پوچھا: ''اغصبًا یامحمد؟'' اے محمد (ﷺ)! کیا یہ غصب ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

بل عاریۃ، وھی مضمونۃ حتی نو دیھا الیک.

بلکہ یہ اُدھار ہوگا اور اس کی ضمانت ہوگی حتیٰ کہ ہم یہ تمہارے حوالے کر دیں گے۔

پس صفوان نے سو زرہیں اور ساتھ ہی اس کی ضرورت کے مطابق اسلحہ بھی مہیا کر دیا[1]

جب مالک بن عوف، ہوازن کے سردار اور لشکر کے سپہ سالار کو آپ ﷺ کی پیش قدمی کی خبر ہوئی تو اُس نے اپنے جنگ جوؤں کو وادیٔ حنین کے اردگرد بکھر کر مورچہ بند ہونے کا حکم دیا، اور ان سب کو یہ نصیحت کی کہ تم سب یک بارگی محمد ﷺ اور ان کے اصحاب پر حملہ کر دینا۔

مسلمان جب وادیٔ حنین میں پہنچے تو اُس وقت ابھی صبح کا اندھیرا تھا، مسلمان ابھی نشیب کی طرف اُترنا شروع ہی ہوئے تھے کہ تنگ وادیوں، گھاٹیوں اور گوشوں میں چھپے ہوئے دشمن کے دستوں نے نمودار ہو کر یک بارگی مسلمانوں پر ایسا حملہ کیا کہ مسلمانوں کے گھوڑے بدک گئے اور مسلمان تیزی سے پیچھے پلٹے، اس حال میں کہ کوئی دوسرے کو مڑ کر دیکھ

[1] اس روایت کو ابن اسحاق نے صحیح سند سے نقل کیا ہے اور انہی کی سند سے ابن جریر اور ابن سید الناس نے بھی روایت کی ہے۔

بھی نہ رہا تھا اور کسی کو دوسرے کی خبر نہ تھی' رسول اللہ ﷺ دائیں جانب ہو گئے اور لوگوں سے فرمانے لگے:

الیّ یا عباد اللّٰہ' انا النبی لاکذب' انا ابن عبد المطلب۔

اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ! میں نبی ہوں' یہ جھوٹ نہیں! میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں!

امام مسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں غزوۂ حنین کے دن آپ ﷺ کی معیت میں تھا' میں اور ابوسفیان بن الحارث بن عبد المطلب' حضور ﷺ کے ساتھ چمٹے رہے اور آپ ﷺ سے جدا نہ ہوئے' آپ ﷺ اُس روز اپنے سفید خچر پر سوار تھے' جب مسلمانوں پر مشرکین کا اچانک حملہ ہوا اور مسلمان واپس مڑ گئے تو آپ ﷺ سفید خچر پر سوار مسلسل کفار کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔ حضرت عباس فرماتے ہیں: میں نے خچر کی لگام پکڑی ہوئی تھی تاکہ وہ تیزی سے آگے نہ جائے اور حضرت ابوسفیان' رسول اللہ ﷺ کی رکاب تھامے ہوئے تھے' تو آپ ﷺ نے فرمایا:

ناد اصحاب السمرۃ[1] اے عباس! ببول کے درخت کے نیچے بیعت کرنے والے اصحاب کو بلاؤ۔

میں چونکہ بلند آواز والا شخص تھا تو میں نے بلند آواز سے کہا: ''یا اصحاب السمرۃ'' اے ببول کے درخت (کے نیچے بیعت کرنے) والو! (کہاں ہو!)' حضرت عباس نے کہا: اللہ کی قسم! میری آواز سنتے ہی وہ اس طرح پلٹے جیسے کہ گائے اپنے بچوں کی طرف پلٹتی ہے' وہ یالبیک! یالبیک! کہتے ہوئے دوڑے آئے اور انہوں نے کافروں سے لڑنا شروع کر دیا' پھر حضرت عباس نے انصار کو بلایا: ''یا للانصار'' اے انصار! جب آپ ﷺ نے جھانک کر ان کی لڑائی کو دیکھا تو فرمانے لگے:

الآن حمی الوطیس۔ اب لڑائی کا تنور گرم ہوا ہے۔

پھر آپ ﷺ نے زمین سے کنکریاں اٹھائیں اور کفار کے چہروں کی طرف پھینکیں

---

[1] اس سے مراد وہ درخت ہے جس کے نیچے حدیبیہ میں بیعتِ رضوان ہوئی تھی۔

اور فرمایا:

انهزموا ورب محمد.[1] رب محمد کی قسم! یہ ہار گئے۔

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دلوں میں رعب طاری کر دیا اور وہ شکست کھا گئے اور بدحواسی میں اپنی پیٹھیں پھیر کر بھاگنے لگے، کسی کو دوسرے کی خبر نہ تھی، مسلمان ان کا پیچھا کرنے لگے، بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا اور بہت کو قیدی بنا لیا، جب مسلمان جمع ہوئے تو ہر ایک مسلمان کچھ نہ کچھ لے کر آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، حتیٰ کہ آپ ﷺ کے سامنے قیدیوں کی کثیر تعداد زنجیروں میں جکڑی ہوئی جمع ہو گئی، اس غزوہ میں آپ ﷺ نے اعلان فرمایا:

من قتل قتيلًا له عليه بيّنة فله سلبه. جس نے کسی کافر کو قتل کیا اور اس پر اس کے پاس کوئی دلیل بھی ہو تو اُس کافر کا سامان اُس مسلمان کو ملے گا۔

(متفق علیہ)

ابن اسحاق وغیرہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ نے غزوۂ حنین کے روز بیس آدمیوں کا سامان لیا جن کو آپ نے قتل کیا تھا۔

ابن اسحاق اور ابن سعد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے پلٹ کر ملاحظہ فرمایا تو آپ نے اُم سلیم بنت ملحان کو دیکھا، یہ اپنے خاوند حضرت ابوطلحہ کے ساتھ تھیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اُم سلیم ہو! وہ عرض کرنے لگیں: ہاں! یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! ان لوگوں کو بھی قتل کیجئے جو آپ کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں جس طرح آپ ان لوگوں کو کرتے ہیں جو آپ سے جنگ کرتے ہیں۔

حضرت اُم سلیم کے پاس ایک خنجر بھی تھا، ابوطلحہ نے ان سے کہا: اے اُم سلیم! تمہارے پاس یہ خنجر کیسا ہے؟ انہوں نے کہا: یہ خنجر ہے، میں نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آئے گا تو میں اس کے ساتھ اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔

---

[1] امام مسلم نے اسے روایت کیا ہے، اسی طرح اختصار کے ساتھ امام بخاری نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ تمام کتب سیرت میں تفصیل سے اس کو روایت کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ ایک عورت کی لاش پر سے گزرے' جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوئی تھی' لوگ اُس لاش کے پاس جمع تھے تو آپ ﷺ نے پوچھا: "ماھذا" یہ کیا ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ ایک عورت ہے جسے خالد بن ولید نے قتل کیا ہے' تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھ شامل ایک صحابی کو فرمایا:

ادرك خالدًا فقل له ان رسول اللّٰه ینهاك ان تقتل ولیدًا او امراة او عسیفًا.

خالد سے ملو' اس سے کہو کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں بچے' عورت اور مزدور کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔[1]

کفار کے لشکر کا سپہ سالار مالک بن عوف اپنی قوم کے چند سرکردہ افراد کے ساتھ میدانِ کارزار سے دُم دبا کر بھاگا' حتیٰ کہ طائف جا پہنچا اور یہ سب وہاں قلعے میں چھپ گئے اور اپنے پیچھے کثیر مالِ غنیمت چھوڑ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے سارا مالِ غنیمت "جعرانہ" کے مقام پر جمع کرنے کا حکم دیا اور حضرت مسعود بن عمرو الغفاری کو اُس کے اوپر محافظ مقرر فرمایا اور آپ ﷺ نے خود اپنے جملہ صحابہ کی معیت میں طائف کی طرف سفر شروع فرمایا' وہاں پہنچ کر آپ ﷺ نے شہر طائف کا محاصرہ کر لیا' قبیلۂ ثقیف کے لوگ اپنے قلعوں سے مسلمانوں پر تیر پھینکنے لگے جس سے مسلمانوں کے کچھ لوگ شہید ہو گئے' آپ ﷺ نے تقریباً دس دن طائف کا محاصرہ جاری رکھا' ایک قول یہ بھی ہے: یہ محاصرہ بیس دن تک جاری رہا' پھر آپ ﷺ نے وہاں سے کوچ کرنے کا اور محاصرہ ختم کرنے کا ارادہ فرمایا' حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ میں اعلان فرمایا:

انا قافلون ان شاء اللّٰه.

ہم ان شاء اللہ لوٹ جائیں گے۔

تو بعض صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم لوٹ جائیں گے اور اس شہر کو فتح نہیں کریں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم ان سے لڑائی کرنا چاہتے ہو تو کل صبح ان سے جنگ کرنا' پس جب صحابہ نے اگلی صبح حملہ کیا تو بعض زخمی ہو گئے' تو آپ ﷺ نے ان صحابہ سے فرمایا: ہم

---

[1] ابوداؤد' ابن ماجہ' اسی مفہوم کی ایک حدیث طیبہ بخاری و مسلم نے بھی روایت کی ہے' حدیث میں لفظ "عسیف" آیا ہے' جس کے معنی ہیں: مزدور یا غلام۔

کل صبح واپس چلے جائیں گے' صحابہ اس سے خوش ہوئے' یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا۔ (متفق علیہ)

جب آپ ﷺ نے طائف سے واپسی کی تیاری فرمائی تو اپنے صحابہ سے فرمایا: سب کہو: ہم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے! توبہ کرنے والے اور اپنے رب کی عبادت اور حمد وثناء کرنے والے ہیں۔

بعض صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! قبیلہ ثقیف کے لیے دعاء ضرر کیجئے تو آپ ﷺ نے ان کے لیے یہ دعا مانگی:

اللهم اهد ثقيفا وات بهم. اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس پہنچا دے [1]

آپ ﷺ کی یہ دعا قبول ہوئی اور اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے ثقیف کو ہدایت عطا فرمائی تو ان کا ایک وفد مدینۃ المنورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔

مالِ غنیمت کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کے تقسیم کرنے کی کیفیت

طائف سے محاصرہ اُٹھا کر حضور ﷺ جب واپس ''جعرانہ'' کے مقام پر تشریف لائے تو یہاں پر اموالِ غنیمت کا بہت بڑا ذخیرہ اور بہت سے قیدی جمع تھے۔ یہ سب کچھ غزوۂ حنین میں ہوازن سے حاصل ہوا تھا' آپ ﷺ نے طائف سے لوٹنے کے بعد یہاں پر قیدیوں کے رشتہ داروں کے آنے کا تقریبا دس دن انتظار کیا' پھر آپ ﷺ نے قیدیوں کو تقسیم فرما دیا' اس کے بعد قبیلۂ ہوازن کا ایک وفد مسلمان ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ ہمارے اموال اور قیدی واپس لوٹا دیں' تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: جو تم چاہتے ہو میرے پاس ہے لیکن مجھے سچی بات ہی پسند ہے' لہٰذا سن لو کہ مال اور قیدی دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لو حالانکہ میں نے اس کو تمہارے لیے مؤخر رکھا ہے' یعنی میں نے قیدیوں اور اموالِ غنیمت کو تقسیم کرنے میں اس لیے تاخیر کی کہ تم اسلام قبول

[1] طبقات ابن سعد' سنن ترمذی' اس روایت کو ابن سعد نے عاصم کلابی سے' انہوں نے الاشہب سے' انہوں نے الحسن کی سند سے روایت کیا ہے۔

کر کے آؤ گے' تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے ہمیں اپنے اموال اور احساب (عورتوں اور بچوں) کے درمیان اختیار دیا ہے' ہمیں اپنا حسب زیادہ عزیز ہے۔

آپ ﷺ یہ سن کر مسلمانوں کے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے' اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی جس کا وہ اہل ہے' پھر فرمایا: امابعد! اے مسلمانو! یہ تمہارے بھائی تائب ہو کر آ گئے ہیں' اور میری رائے یہ ہے کہ میں ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں' پس تم میں سے جو پسند کرتا ہے کہ خوش دلی سے اسے منظور کر لے تو وہ اپنے حصے کے قیدیوں کو واپس کر دے اور تم میں سے جو یہ چاہے کہ ان قیدیوں کے بدلے کچھ لے کر ان کو واپس کرے تو میں اُس سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ مجھے جو مالِ غنیمت عطا فرمائے گا' میں اُس سے ایک حصہ اُسے دوں گا۔[1]

یہ سن کر سب لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! ہم سب نے خوشی خوشی سب قیدیوں کو واپس کر دیا' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس طرح پتا نہیں چلتا کہ تم میں سے کس نے اجازت دی اور کس نے اجازت نہیں دی' لہٰذا تم لوٹ جاؤ اور اپنے اپنے قبیلے کے سرکردہ لوگوں کے ذریعے مجھے اس کی خبر دو' پس تمام لوگ لوٹ گئے اور ان کے سرداروں نے ان لوگوں کی مرضی معلوم کی' پھر ان سرداروں نے آ کر آپ ﷺ کو خبر دی کہ یہ سب اس پر بخوشی راضی ہیں[2] اور اُن سب نے اجازت دے دی ہے' پھر آپ ﷺ نے ھوازن کے تمام قیدی ان کو واپس لوٹا دیئے۔

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ھوازن کے اس وفد سے مالک بن عوف کے بارے میں پوچھا کہ وہ کدھر ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ ثقیف کے ساتھ طائف میں ہے تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: تم لوگ مالک بن عوف کو خبر کر دو کہ اگر وہ مسلمان ہو کر میرے پاس آ جائے تو میں اس کے اہل وعیال اور سارا مال واپس لوٹا دوں گا

---

1. یعنی ان کے حصے میں جو قیدی آئے ہیں انہیں چھوڑ دیں' اس کا معاوضہ انہیں بعد میں دے دیا جائے گا۔
2. بخاری نے اس روایت کو طبری' بیہقی اور ابن سید الناس نے ابن اسحاق کے واسطے سے مزید تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اور اس کے علاوہ ایک سو اونٹ زائد دوں گا۔ مالک بن عوف کو جب یہ خبر ملی تو وہ مسلمان ہو کر آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا' جعرانہ اور مکہ کے درمیان ان کی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی' تو آپ ﷺ نے ان کے اہل وعیال اور مال لوٹا دیئے اور حسب وعدہ ایک سو اونٹ زائد عطا فرمائے۔ مالک بن عوف نے اسلام قبول کر لیا اور ان کے اسلام میں بہتری آئی۔

حضور ﷺ نے مکہ کے نومسلموں کو مختص فرما کر تالیفِ قلوب کے طور پر زیادہ مال غنیمت اور عطیات عطا فرمائے تا کہ ان کے دلوں میں اسلام کی محبت جاگزیں ہو جائے' اس پر بعض انصار نے اپنے دلوں میں اس بات کو محسوس کیا اور کہنے لگے: اللہ اپنے رسول کو معاف فرمائے! انہوں نے قریش کو تو زائد مال مرحمت فرمایا ہمیں نظر انداز کر دیا' حالانکہ ہماری تلواروں سے ابھی تک خون ٹپک رہا ہے۔ (بخاری ومسلم)

جب یہ بات آپ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے سب انصار کو ایک خاص جگہ پر بلا بھیجا' وہاں اُن کے علاوہ کسی کو نہیں بلایا' پھر آپ ﷺ ان کے درمیان کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق حمد وثناء کی' پھر فرمایا: اے گروہِ انصار! یہ کیا بات ہے جو تمہاری طرف سے مجھے پہنچی ہے؟ کیا میں اُس وقت تمہارے پاس نہ آیا تھا جب تم گمراہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں میرے ذریعے ہدایت عطا فرمائی' تم متفرق تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہیں اتحاد والفت عطا فرمائی' تم تنگ دست تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہیں غنی کر دیا' حضور ﷺ جب بھی کوئی بات فرماتے تو انصار یہ کہتے جاتے:- کیوں نہیں! اللہ اور اس کے رسول کا ہم پر بہت بڑا احسان اور فضل ہے' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے گروہِ انصار! تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ انصار نے کہا: یارسول اللہ! ہم اس کا کیا جواب دیں؟ اللہ اور اس کے رسول کا فضل واحسان سب سے بڑھ کر ہے' آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر تم چاہتے تو یہ کہتے' تم سچے ہوتے تو تمہاری تصدیق کی جاتی' یہ کہ یارسول اللہ! آپ ہمارے پاس آئے' آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلایا تو ہم نے آپ کی تصدیق کی' سب نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تو ہم نے آپ کی مدد کی' لوگوں نے آپ کو چھوڑ دیا تو ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا' آپ بے سروسامان تھے تو ہم نے آپ کے ساتھ غم گساری اور ہمدردی کی۔

یہ سن کر سب انصار پکار اُٹھے: نہیں! بلکہ اللہ اور اس کے رسول کا احسان (اور فضل) ہم پر بڑھ کر ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بعد ان کو فرمایا:

اے گروہِ انصار! کیا تم دنیا کی اس حقیر شادابی کے لیے[1] اپنے دلوں میں ناراضگی رکھتے ہوئے ہو' جس کے ساتھ میں نے چند لوگوں کی تالیفِ قلوب کا ارادہ کیا تاکہ یہ پکے مسلمان ہو جائیں اور میں نے تمہارے اسلام کی پختگی پر بھروسا کیا' اے گروہِ انصار! کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر اپنے پڑاؤ میں جاؤ؟ اللہ کی قسم! تم لوگ جس چیز کو لے کر اپنے گھر جاؤ گے وہ اس مال و دولت سے بہت بڑھ کر ہے' قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار میں سے ہی ہوتا اور اگر تمام لوگ کسی ایک راستہ پر چلیں اور انصار دوسری راہ پر چلیں تو میں انصار کے راستہ پر چلوں گا' بے شک تم اس خودغرضی کا اثر میرے بعد پاؤ گے' اس وقت صبر کرنا حتیٰ کہ پھر تم مجھے حوض (کوثر) پر ملو گے' اے اللہ! انصار پر' انصار کی اولاد پر اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما!

یہ سن کر سب انصار بے اختیار رونے لگے حتیٰ کی ان کی ڈاڑھیاں ان کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں اور عرض کرنے لگے: ہم اللہ اور اس کے رسول کی تقسیم اور ان کی طرف سے دیئے گئے حصہ پر راضی ہیں۔[2]

بعض عرب دیہاتی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پیچھے چلنے لگے اور مزید عطا کا سوال کرنے لگے' حتیٰ کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک ببول کے درخت کی طرف جانے پر مجبور کر دیا' جس درخت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اٹک گئی' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے لوگو! مجھے میری چادر دے دو! اللہ کی قسم! اگر مکہ معظمہ کے نشیبی علاقے تہامہ میں پائے جانے والے درختوں کے برابر بھی میرے پاس اونٹ ہوتے تو وہ بھی میں تم پر تقسیم کر

---

1. حدیث شریف میں لفظ "لعاعة" آیا ہے' جس کا معنی ہے: وہ ہریالی اور شادابی جو آنکھوں کو اچھی لگے' اس سے دنیا کو تشبیہ دی گئی ہے۔
2. اسے بخاری' مسلم' ابن اسحاق اور ابن سعد نے تقریباً ملتے جلتے الفاظ میں روایت کیا ہے۔

دیتا' پھر تم میرے بارے میں کذب' بخل اور جُبن کا گمان نہ کرتے۔ (بخاری) اے لوگو! اللہ کی قسم! تمہارے مالِ فئی میں سے میرے لیے صرف خمس ہے اور یہ خمس (پانچواں حصہ) بھی تمہاری طرف ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔[1]

پھر ایک اعرابی آگے بڑھا اور اُس نے آپ ﷺ کی چادر کو پکڑ کر سختی کے ساتھ کھینچا' اُس وقت آپ ﷺ کے اوپر سخت کنارے والی موٹی نجرانی چادر تھی حتیٰ کہ اُس کے دبانے سے چادر کے کنارے کا اثر آپ ﷺ کی گردن مبارک پر ظاہر ہو گیا اور وہ اعرابی آپ ﷺ کو کہنے لگا: اللہ کا جو مال آپ کے پاس ہے اس میں سے مجھے دینے کا حکم جاری کریں' پس آپ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور مسکرا دیے' پھر اُس اعرابی کو مال عطا کرنے کا حکم دیا۔ (متفق علیہ)

ابن اسحاق کہتے ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ جعرانہ سے عمرہ کی نیت سے احرام باندھ کر مکہ تشریف لے گئے اور عمرہ سے فراغت کے بعد آپ ﷺ نے مکہ میں حضرت عقاب بن اُسید کو اپنا نائب مقرر فرمایا اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔

اسباق ونصائح

غزوۂ حنین سے بھی غزوۂ بدر کی طرح عقیدۂ اسلامیہ اور اسباب ومسببات کے قانون کے حوالے سے اہم درسِ عبرت ملتا ہے بلکہ غزوۂ بدر سے حاصل ہونے والے دروس کا یہ تکملہ ہے۔

جب غزوۂ بدر ہوا تو اس سے مسلمانوں کو یہ سبق حاصل ہوا کہ اگر صبر اور ثابت قدمی سے ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے تو دشمن کی کثیر فوج کے مقابلے میں مسلمانوں کی قلیل فوج بھی کافی ہے۔

اور غزوۂ حنین سے یہ سبق حاصل ہوا کہ اگر مسلمانوں کی کثیر فوج بھی ہو اور وہ صبر اور ثابت قدمی سے ڈٹ کر مقابلہ نہ کرے تو یہ کثرت بھی کافی نہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر سے حاصل ہونے والی عبرت اور سبق کا اپنی کتاب میں ذکر فرمایا' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے غزوۂ حنین کے واقعہ سے بھی حاصل ہونے والی عبرت اور درس کا اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔

---

[1] روایت میں یہ اضافہ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے نقل کیا ہے۔

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد' باقی تمام موقعوں کی تعداد سے اگر چہ کم تھی لیکن ان کی تعداد کی کمی اور قلت ان کے لیے نقصان دِہ ثابت نہ ہوئی' اس وجہ سے کہ ان کے اسلام میں صدق تھا' ان کا ایمان مضبوط تھا اور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ان کی مکمل وفاداری تھی۔

جب کہ غزوۂ حنین کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد دوسرے تمام موقعوں سے زیادہ تھی۔ لیکن یہ محض تعداد کی کثرت ان کے لیے فائدہ مند ثابت نہ ہوئی' اس وجہ سے کہ کثرت کے ان جتھوں میں موجود کافی لوگوں کے دلوں میں ابھی ایمان کی مضبوطی متمکن نہیں ہوئی تھی' اور نہ ہی اسلام کا مفہوم ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اُترا تھا' یہ کثرت کے جتھے جسموں اور شکلوں کے ہی گروہ تھے اور دُنیوی مال کے حصول کا خیال بھی ان کے دلوں میں مچل رہا تھا' پھر ایسی صورت میں محض جسموں اور شکلوں کے اثر سے کیسے فتح ونصرت کا حصول ممکن تھا' یہی وجہ تھی کہ جب دشمن کے چھپے ہوئے تیراندازوں نے اپنی کمین گاہوں سے یک بارگی مسلمانوں کے اس لشکرِ جرار پر ہلّہ بول دیا تو یہ ثابت قدم نہ رہ سکے اور سب گھاٹیوں اور وادیوں میں بھاگ گئے۔

لیکن زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ جب مہاجرین وانصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آوازوں کو سنا تو یہ تیزی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف واپس لوٹ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اردگرد جمع ہو گئے اور پھر یہ قلیل تعداد میں مسلمان پوری ہمت سے جنگ میں کود پڑے اور جنگ کا تنور خوب بھڑکا' اُس وقت مسلمانوں کی تعداد دوسو سے زائد نہ تھی' لیکن ان دوسو مسلمانوں کی ثابت قدمی اور دلیری سے مسلمانوں پر فتح ونصرت لوٹ آئی اور ان کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے دشمنانِ اسلام کو ہتک آمیز شکست سے دوچار کیا' لیکن جب تعداد بارہ ہزار تھی تو ثابت قدمی اور صبر کا مظاہرہ نہ کرنے کی وجہ سے وہ اپنی اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ کچھ نہ کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اس تبلیغ وعظ ونصیحت کا اپنی کتابِ مبین میں یوں ذکر فرمایا:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ	اور حنین کے روز بھی جب کہ گھمنڈ
كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا	میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے
وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ	پس نہ فائدہ دیا تمہیں (اس کثرت نے

ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبہ: ۲۵-۲۷)

کچھ بھی اور تنگ ہو گئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے' پھر تم مڑ گئے پیٹھ پھیرتے ہوئے ۝ پھر نازل فرمائی اللہ نے اپنی (خاص) تسکین اپنے رسول پر اور اہلِ ایمان پر اور اتارے وہ لشکر جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے کافروں کی ۝ پھر رحمت سے توجہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ اس کے بعد جس پر چاہے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۝

اب ہم اس غزوہ سے حاصل ہونے والے اسباق و احکام کا جائزہ لیتے ہیں:

اوّل: دشمن کے احوال و اخبار سے باخبر رہنے کے لیے جاسوسوں کو بھیجنا

جیسا کہ اس کے متعلق ہم نے ذکر کیا' یہ عمل جائز ہے بلکہ ضرورت اور حاجت کے وقت یہ واجب ہے' رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ حنین میں ایسا ہی کیا' آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ابوحدرد الاسلمی کو دشمن کی جاسوسی کے لیے بھیجا تاکہ یہ دشمن کی صفوں میں گھس کر ان کی تیاری اور ان کی تعداد وغیرہ کے متعلق مسلمانوں کو آگاہ کریں۔ اس مسئلہ میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف ہے۔

دوم: ضرورت کے پیشِ نظر مسلمانوں کے حاکم کے لیے جائز ہے کہ۔۔۔ وہ مشرکین سے اسلحہ وغیرہ اُدھار لے لے

فوج زیادہ ہو اور اسلحہ کم ہو تو یہ جائز ہے کہ مسلمان کسی غیر مسلم فوج سے اسلحہ ادھار لیں' اور یہ ادھار بغیر رقم کے بھی ہو سکتا ہے اور اسلحہ کرایہ پر بھی لیا جا سکتا ہے' کیونکہ غزوۂ حنین میں رسول اللہ ﷺ نے ایسا عمل اختیار فرمایا تھا' جب آپ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے اسلحہ ادھار لیا حالانکہ صفوان اُس وقت مشرک تھا۔

یہ مسئلہ بھی عمومی طور پر جنگ کے دوران کفار سے مدد طلب کرنے کے حکم کے تحت آتا ہے' ہم نے اس مسئلہ کو اس سے قبل غزوۂ اُحد کے متعلقات میں ذکر کیا تھا' اب ہم آپ کے

لیے واضح کردیتے ہیں کہ کفار سے مدد طلب کرنے کی دو اقسام ہو سکتی ہیں:

پہلی قسم: جنگ میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے کفار کی افرادی قوت سے مدد حاصل کرنا

اس کے متعلق غزوۂ اُحد کے واقعات میں حدیثِ طیبہ گزر چکی ہے، ہم نے اُس مقام پر یہ ذکر کیا تھا کہ ضرورت اور حاجت کے وقت کفار کی افرادی قوت حاصل کرنا جائز ہے بشرطیکہ مسلمانوں کو ان کی امانت و دیانت اور صداقت پر پورا یقین ہو کہ وہ فوجی مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی بددیانتی نہیں کریں گے۔

دوسری قسم: جنگ میں ضرورت کے وقت کفار کی اشیاء مثلاً اسلحہ وغیرہ۔۔۔ سے مدد حاصل کرنا

اس مسئلہ میں بھی کوئی اختلاف نہیں، یہ بالکل جائز ہے بشرطیکہ اس سے مسلمانوں کی عظمت و کرامت کو کوئی خطرہ نہ ہو یعنی یہ عمل اس بات کا سبب نہ بنے کہ اس طرح مسلمان اغیار کے زیرِ تسلط یا زیرِ بار آجائیں یا یہ کہ مسلمانوں کو اس وجہ سے اپنے بعض دینی فرائض سے سبک دوش نہ ہونا پڑے۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے اسلحہ اُدھار لیا تھا تو اُس وقت صفوان مغلوبیت اور ضعف کی کیفیت میں تھا اور آپ ﷺ کو مضبوط پوزیشن حاصل تھی۔ (زاد المعاد ج ۲ ص ۱۹۰، مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۲۱)

سوم: جنگ میں حضور ﷺ کی جرأت و بہادری

آپ اس جرأت و بہادری کی ایک نادر اور بے مثل صورت دیکھ سکتے ہیں کہ جب مسلمان فوج پر اچانک تیروں اور تلواروں سے حملہ ہو جاتا ہے تو مسلمانوں کا یہ لشکر پیٹھ پھیر کر بھاگنا شروع کر دیتا ہے تو اُس وقت کمین گاہوں میں چھپے ہوئے دشمن کی طرف سے برستے ہوئے تیروں اور تلواروں میں آپ ﷺ تن تنہا جرأت و بہادری کا پہاڑ بنے کھڑے ہیں اور ان سخت حالات میں بھی جب آپ ﷺ نے کامل ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا تو اس بات کا گہرا اثر اُن بھاگنے والے مسلمانوں کے دلوں میں ہوا اور وہ آپ ﷺ کی اس جرأت کے منظر کو دیکھتے ہوئے واپس لوٹے، جس سے اُن میں شجاعت اور قوتِ عزیمت پیدا

ہو گئی۔

امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں غزوۂ حنین کے واقعات ذکر کرنے کے بعد لکھا: سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کی کامل شجاعت اور پوری بہادری کا یہ موقع تھا، لشکر بھاگ کھڑا ہوا ہے اور اس وقت آپ ﷺ کسی تیز رفتار سواری پر سوار نہیں، جو بھاگنے دوڑنے میں کام آئے بلکہ خچر پر سوار ہیں اور مسلسل مشرکوں کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اپنے آپ کو چھپاتے بھی نہیں ہیں بلکہ اپنا نام اپنی زبان سے پکار پکار کر بتلا رہے ہیں کہ نہ پہچاننے والا بھی پہچان لے، خیال کیجیے! کہ آپ ﷺ کا توکل ذاتِ واحد پر کس قدر ہے، اللہ کی ذات پر کتنا کامل یقین ہے اور اس بات کا کتنا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ امرِ رسالت کو ضرور مکمل فرمائے گا اور آپ کے دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کر کے ہی رہے گا۔ ''فصلوات اللّٰہ وسلامہٗ علیہ الی یوم الدین'' آپ پر ہمیشہ درود و سلام ہو قیامت کے دن تک، اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔
(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۵)

چہارم: عورتوں کا مردوں کے شانہ بشانہ جہاد کے لیے نکلنا

عورتوں کا جنگ کے دوران زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے اور پیاسوں کو پانی پلانے کے لیے نکلنا تو متعدد غزوات کی صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن عورتوں کا جنگ اور قتال کے لیے نکلنا یہ سنت سے ثابت نہیں، اگرچہ امام بخاری نے کتاب الجہاد کے ذکر میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ رکھا ہے: عورتوں کا جنگ میں شرکت کرنا اور مردوں کے شانہ بشانہ جنگ کرنے کا بیان، لیکن اس باب کے تحت جو احادیث نقل کی گئی ہیں، اُن میں یہ بات صراحۃً موجود نہیں ہے کہ جنگ میں عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لیا ہو۔ ابن حجر فرماتے ہیں: میں نے اس موضوع کے تحت وارد ہونے والی احادیث میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جس میں واضح طور پر اس بات کا ذکر موجود ہو کہ کسی موقع پر عورتوں نے بھی قتال میں حصہ لیا ہو۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۵۱)

فقہاء کرام نے اپنی کتابوں میں جو عورتوں کو قتال کے لیے نکلنے کا حکم ذکر کیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جب دشمن مسلمانوں کے کسی شہر پر حملہ کر دے تو اُس وقت تمام مسلمانوں کو بشمول عورتوں کے دشمن کے مقابلے میں نکلنا واجب ہے۔ فقہاء کی اس عبارت پر غور کریں

تو پتا چلتا ہے کہ یہ حکم دفاع کی صورت میں ہے کہ عورتوں سے اگر امید ہو کہ وہ لڑائی کر کے دفاع کر سکیں گی تو اس صورت میں جائز ہے بصورتِ دیگر جائز نہیں۔ (مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۱۹)

حضرت اُمِ سلیم کے پاس جو خنجر تھا وہ بھی صرف دفاع اور حفاظت کے لیے تھا جیسے کہ انہوں نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی۔

اسی طرح کی ایک حدیثِ طیبہ امام بخاری وغیرہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ جس میں حضرت عائشہ صدیق رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

جهاد كن الحج. اے عورتو! تمہارا جہاد حج ہے۔

کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جس جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی اس سے مراد قتال اور لڑائی میں مشارکت تھی' جب کہ جنگ میں عورتوں کا مرہم پٹی' پانی پلانے اور دیگر ایسے اُمورِ خدمت کے لیے جانا جائز ہے' اگر اس کی پوری شرائط پائی جائیں۔ بہرکیف عورتوں کا مردوں کے ساتھ جنگ کے میدان میں خدمت کے لیے بھی جانا مشروط ہے' اس شرط کے ساتھ کہ عورتیں مکمل پردے میں ہوں اور پوری طرح محفوظ ہوں اور یہ کہ عورتوں کا نکلنا حاجتِ حقیقیہ کے لیے ہو' پس اگر ان کے نکلنے کی کوئی حقیقی حاجت نہ ہو یا عورتوں کا حرام کاموں میں ملوث ہونے کا خدشہ ہو تو ان حالات میں عورتوں کا نکلنا حرام ہے یہ کسی صورت بھی جائز نہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ احکامِ اسلامیہ جو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں ان کو صحیح طریقے سے جانا جائے اور ان پر پوری طرح عمل کیا جائے' یہ نہ ہو کہ دلی خواہش کے لیے کسی شرعی حکم کو تو مان لیا جائے اور کسی کا انکار کر دیا جائے' اسی صورتِ حال کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی لاریب کتاب میں یوں فرمایا:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ	تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا (تم خود ہی کہو:) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے' سوائے اس کے کہ رُسوا رہے دنیا کی

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَO (البقرہ:۸۵) زندگی میں اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں' اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہوO

آج کل کچھ لوگ حقیر دنیوی مقاصد کے لیے اللہ تعالیٰ کے دینِ متین کے ساتھ قبیح مکر کرتے ہوئے ایسے فتاویٰ شرعیہ جاری کرتے ہیں جن میں دین کی حدود و قیود اور شروط و تکملات کو سرے سے نظر انداز کر کے وہ مطلوبہ صورتوں کے عین مطابق اور دنیوی حکمرانوں کی خواہشات کے عین مطابق گھڑتے ہیں' پھر وہ ان فتاویٰ کو مداہنت اور نفاق کے طبق میں رکھ کر ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

پنجم: جہاد میں عورتوں' بچوں' مزدوروں اور غلاموں کو قتل کرنے کی حرمت

اس مسئلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حدیث طیبہ دلالت کرتی ہے' جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عورت کی لاش دیکھی' جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسی وقت ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

اس مسئلہ پر جملہ ائمہ کرام کا اتفاق ہے۔

مذکورہ بالا متفقہ مسئلہ سے یہ بات مستثنیٰ ہے کہ جب عورتیں دشمن کے ساتھ شانہ بشانہ لڑائی میں شریک ہوں تو اس صورت میں جو عورتیں آگے بڑھ کر حملہ کر رہی ہوں' ان کو قتل کرنا جائز ہے جب کہ دشمن کی وہ عورتیں جو پیٹھ پھیر کر بھاگ رہی ہوں' ان کو قتل کرنا جائز نہیں۔

جس طرح یہ صورتِ حال مستثنیٰ ہے کہ جب کفار عورتوں اور بچوں کو ڈھال بنا رہے ہوں اور اس ڈھال کو ختم کیے بغیر دشمن تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو اس صورت میں بھی اُن ڈھال بنے ہوئے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا جائز ہے' لیکن پھر بھی یہ امام کی ذمہ داری ہے کہ وہ مصلحت کے تقاضا کے مطابق عمل کرے۔ (الاحکام السلطانیہ ص ۴' مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۲۳)

ششم: مقتول کے سامان کا حکم

بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ حنین میں یہ اعلان فرمایا کہ جس شخص کے ہاتھوں جو کافر مارا گیا' اُس مقتول کا سامان قتل کرنے والے کا ہے۔

ابن سید الناس فرماتے ہیں: آپ ﷺ کا یہ حکم ہمیشہ کے لیے قائم ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی متفق علیہ ہے لیکن ائمہ کے درمیان اس دائمی حکم کے ثابت ہونے کی نوعیت میں اختلاف ہے کہ آیا یہ امامت کے احکام میں سے ہے یا فتویٰ میں سے ہے؟

یعنی کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم کی تبلیغ کے طور پر کیا کہ جس کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں جیسے کہ نماز' روزہ وغیرہ کے اٹل احکام ہیں یا یہ کہ آپ ﷺ نے یہ اعلان مسلمانوں کا امیر اور قائد ہونے کی حیثیت سے کیا' جسے اختیار ہوتا ہے کہ جس چیز میں مسلمانوں کی خیر اور مصلحت دیکھے اس کا حکم دے دے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ کا مذہب ہے کہ یہ حکم فتویٰ اور تبلیغ کی اساس پر محکم طریقے سے قائم و دائم ہے' لہٰذا اس حکم کی بنیاد پر ہر زمانے میں جب بھی میدانِ جنگ میں کسی مسلمان کے ہاتھ سے جو کافر مارا گیا اُس مقتول کا سامان اُسی مسلمان کے لیے ہی ہوگا' اس میں امام یا قائد کی اجازت لینے کی ضرورت وحاجت نہیں۔

جب کہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک علیہ الرحمہ کا مذہب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ حکم امامت اور مصلحت کی بناء پر حکمِ قضائی تھا' جس وجہ سے ہر زمانے میں مقتول کے سامان کا فیصلہ حاکم اور امیر کے حکم کے مطابق ہوگا' اگر امام نے اجازت دے دی تو قتل کرنے والے کو دے دیا جائے گا اور اگر اُس نے اجازت نہ دی تو سارا سامان مالِ غنیمت میں جمع کر دیا جائے گا' جس کے اوپر مالِ غنیمت کا حکم جاری ہوگا۔

(الاحکام السلطانیہ ص ۱۳۹' الاحکام للقرافی ص ۳۸)

ہفتم: جہاد کا مقصد کفار کے ساتھ بغض وعناد نہیں

اس مسئلہ پر وہ حدیث طیبہ دلالت کرتی ہے کہ جب طائف سے واپسی پر بعض صحابہ کرام نے آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ ثقیف کے لیے دعائے ضرر کیجئے' تو آپ ﷺ نے اس کی بجائے یہ دعا مانگی:

اللھم اھد ثقیفا وات بھم. اے اللہ! ثقیف کو ہدایت عطا فرما! اور ان کو میرے پاس لے آ۔

اس کا مطلب ہے کہ جہاد تو ایک جدوجہد اور کوشش ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن

المنکر کے لیے کی جاتی ہے' یہ ایک ذمہ داری ہے جو بعض نافرمان لوگوں کے لیے بعض فرماں بردار لوگوں پر عائد ہوتی ہے' تاکہ وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو جہنم کے دائمی اور ابدی عذاب سے بچانے کی تگ ودو کریں۔

بہرکیف مسلمانوں کی طرف سے دوسروں کے لیے ہدایت اور اصلاح کی ہی دعا ہونی چاہیے' کیونکہ جہاد کی مشروعیت کی یہی حکمت اور تقاضا ہے۔

ہشتم: فوج کب مالِ غنیمت کی مالک بنے گی؟

اس ضمن میں ہم نے ذکر کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ھوازن کے وفد کو جب وہ مسلمان ہو کر آئے تو ارشاد فرمایا: میں نے تمہارے لیے غنائم کی تقسیم میں تاخیر کی ہے' یعنی تمہارے اسلام قبول کر کے آنے کی اُمید پر میں نے مالِ غنیمت کی تقسیم موخر کی۔

آپ ﷺ کی یہ بات دلالت کرتی ہے کہ فوج یا لشکر کے سپاہی مالِ غنیمت کے اُس وقت مالک بنتے ہیں جب امام یا حاکم ان کو مالِ غنیمت تقسیم کر کے دے دے۔ حاکم کی طرف سے تقسیم کیے جانے سے قبل فوج کے سپاہی اُس مال کے مالک نہیں بنیں گے' اسی طرح یہ حدیث طیبہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ امام اور حاکم کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مالِ غنیمت کی تقسیم سے قبل مسلمان ہو کر آنے والے لوگوں کے اموال ان کو واپس کر دے جس طرح کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر کیا' ھوازن کے تقسیم شدہ مال کے متعلق آپ ﷺ کے عمل سے ایک مسئلہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ جو اموالِ غنیمت سپاہیوں میں تقسیم کیے جا چکے ہوں اُن اموال کے متعلق امام یا قائد کو واپس لینے کا اب اختیار حاصل نہیں' ہاں! وہ سپاہی بغیر جبر واکراہ کے خوش دلی کے ساتھ اگر وہ ملا ہوا مالِ غنیمت واپس دے دیں تو یہ جائز ہے۔

اس مسئلہ میں حضور ﷺ کی دقتِ نظری پر ذرا غور کریں کہ اُس مال کے مالکوں سے اجازت طلب کرنے میں آپ ﷺ نے نہایت احتیاط سے کام لیا' آپ ﷺ نے جب صحابہ سے پوچھا کہ کیا تم یہ مالِ غنیمت ھوازن کے اس وفد کو واپس دینا پسند کرو گے؟ تو آپ ﷺ نے اُن کی طرف سے اجتماعی طور پر بلند آواز سے کہے ہوئے اس قول پر اکتفاء نہ فرمایا کہ یارسول اللہ! ہم اس پر بہ خوشی راضی ہیں' بلکہ آپ ﷺ نے اصرار فرمایا کہ ہر شخص کی رضامندی کی تصدیق وتوثیق اُس سے سن کر ہونی چاہیے' لہٰذا ہر قبیلہ کے سرکردہ مشہور افراد

میرے پاس آ کر اپنے قبیلے کے ہر ہر شخص کی رضامندی کے بارے میں آگاہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل سے مراد یہ ہے کہ کسی حاکم کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی طاقت و سلطانی کے بل بوتے پر لوگوں کو اپنے حقوق اور اپنی ملکیتی اشیاء سے دست بردار ہونے پر زور ڈالے' بلکہ حاکم تو کجا یہ شارع کو بھی روا نہیں کہ وہ اپنی اہلیت کی بناء پر ایسا کرے اگرچہ وہ رسول ہی کیوں نہ ہو' یہ ہے وہ حقیقی عدل' دلکش مساوات اور انصاف!

ان عظیم الٰہی قدروں کی موجودگی میں ان تمام بے بنیاد دعووں کو زمین میں دفن ہو جانا چاہیے' جو اچھے الفاظ اور خوب صورت نعروں کے ذریعے بلند کیے جاتے ہیں۔

نہم: تالیفِ قلوب کے حوالے سے اسلامی حکمت عملی

آپ نے ملاحظہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تالیفِ قلوب کے لیے مکہ کے اُن افراد کو مختص فرمایا جو نومسلم تھے اور ان کے دلوں میں اسلام کی الفت اور ایمان کی پختگی پیدا کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان افراد کو دوسرے سپاہیوں سے زیادہ مالِ غنیمت عطا فرمایا' اور اس تقسیم میں سپاہیوں کے درمیان مساوات والے قاعدے کو بھی نہ اپنایا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ عمل ان دلائل میں سے ہے جن سے ائمہ اور فقہاء استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام اور حاکم کے لیے جائز ہے کہ وہ مالِ غنیمت کی تقسیم میں تالیفِ قلوب کی مصلحت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے دوسرے سپاہیوں سے کچھ زیادہ حصہ ان نومسلم افراد کو دے' بلکہ اگر اس کام کی شدید ضرورت و حاجت ہو تو یہ واجب ہے' اور مالِ غنیمت سے تالیفِ قلوب کے لیے مال دینے میں بھی کوئی ممانعت اور حرج نہیں۔

کیونکہ مالِ زکوٰۃ میں بھی ایسے افراد کے لیے تالیفِ قلوب کے نام سے ایک حصہ شامل ہے' مالِ زکوٰۃ کا یہ حصہ حاکم کے زیرِ نگرانی جمع ہوتا ہے' اس میں سے مصلحتِ اسلامیہ کے پیشِ نظر کچھ افراد کو تالیفِ قلوب کے لیے ضرورت کے مطابق مال دینا جائز ہے۔

دہم: انصار کی فضیلت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان کے ساتھ اظہارِ محبت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا' جو فرمایا:

ان الشیطان لیجری من ابن آدم مجری الدم.	بے شک شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح چلتا ہے۔

بے شک شیطان نے چاہا کہ وہ انصار کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کی تقسیمِ غنائم کی حکمت کے متعلق تنقید پیدا کرے اور یہ کہ انصار کے دلوں میں یہ تصور ڈالے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی قوم کی محبت اور اپنے اہلِ وطن کی چاہت میں گرفتار ہو کر اپنے پہلو میں کھڑے انصار کو بھول گئے۔ (معاذ اللہ) جب آپ ﷺ کو انصار پر شیطان کے اس حملے کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے کیا فرمایا؟

آپ ﷺ نے انصار کے دلوں میں پیدا ہونے والے ان وسوسوں کے جواب میں جو خطاب فرمایا اس سے رقت ونرمی' ذوقِ رفیع اور انصار کے ساتھ آپ ﷺ کی شدید محبت کے احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں اس بات کے اشارے بھی موجود ہیں کہ آپ ﷺ کو ان کی اس بات پر سخت تکلیف پہنچی کہ جو لوگ آپ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں' ان کے دل میں آپ کے بارے میں یہ شکایت پیدا ہوئی ہے کہ انہیں آپ نے تقسیمِ غنائم کے وقت بھلا دیا ہے اور ان سے منہ موڑ لیا ہے۔

آپ ﷺ کے اس خطاب پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے اس خطاب میں اپنے دل کے لطیف جذبات اور احساسات کا اظہار فرمایا ہے۔ جب یہ رقتِ قلبی اور لطیف جذبات و احساسات انصار کی سماعت کو چھوئے تو وہ جھومنے لگے' ان کے وساوس اور ہواجس دور ہو گئے اور وہ بلند آواز سے رونے لگے' اپنے نبی کریم ﷺ کی چاہت پر خوش ہوتے ہوئے اور اپنی قسمت اور نصیب کی بلندی پر نازاں ہوتے ہوئے۔

اُس مال' اُن مویشیوں اور اُن غنائم کی ان کے نزدیک کیا حیثیت تھی' جب انصار اپنے حبیب رسول ﷺ کو اپنے ساتھ لے کر اپنے وطن کو لوٹیں گے تاکہ آپ ﷺ کی حیات و ممات سب کچھ اُن کے ساتھ ساتھ ہو۔ آپ ﷺ کی طرف سے محبت اور مودت کے اظہار کے لیے اب مزید اس سے بڑھ کر کس دلیل کی ضرورت تھی؟ یعنی آپ ﷺ نے اپنا وطن' اپنی جنم بھومی اور اپنے قبیلہ والوں کو چھوڑ کر اپنی زندگی کے بقیہ ایام انصار کے درمیان گزارنے کا فیصلہ کیا۔

پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے میزان میں مال' محبت اور قدر افزائی کی دلیل کیسے تھی؟ کہ جب آپ ﷺ نے قریش کو کثیر اموال و غنائم سے نوازا لیکن آپ ﷺ نے اپنی

ذات کے لیے کیا کچھ مختص فرمایا؟ اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت میں سے جو ''خمس'' پانچواں حصہ اپنے اور اپنے رسول کے لیے مقرر فرمایا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو وہ ''خمس'' بھی سارا خود ہی نہیں رکھ لیتے بلکہ وہ بھی آپ نے اپنے اردگرد اعرابیوں میں تقسیم فرما دیا۔

آپ غور کریں کہ جب مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد کچھ اعرابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زائد مال کا مطالبہ کرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے لوگو! اللہ کی قسم! تمہارے مالِ فئی میں سے میرا حصہ ''خمس'' پانچواں ہے اور یہ خمس بھی تمہیں پر ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔

صلی اللّٰہ علیك یا سیدی یا	اے میرے آقا! اے اللہ کے رسول!
رسول اللّٰہ وعلی اصحابك البررۃ	اللہ کی طرف سے درود وسلام ہو آپ پر اور
من الانصار والمھاجرین۔	اس کی رحمتیں ہوں آپ کے پاکیزہ اور نیک صفت انصار اور مہاجرین صحابہ پر۔

اللہ ہمیں آپ کے لوائے محمود کے نیچے جمع فرمائے اور قیامت کے دن ہمیں اُن لوگوں میں شامل فرمائے جو حوضِ کوثر پر آپ سے ملاقات کریں گے۔

غزوۂ تبوک

غزوۂ تبوک کا سبب: ابن سعد اور دیگر علماءِ سیرت کے مطابق اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ نبطی سوداگر جو شام اور مدینہ کے درمیان تجارت کرتے تھے' ان کے ذریعے مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ اہلِ رُوم نے مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا ہے اور اس لشکر میں لخم جذام وغیرہ اور دیگر عرب عیسائی قبائل بھی شامل کر لیے ہیں' جو روم کی سلطنت کے زیرِ اثر آتے تھے اور اس لشکر کے دستے بلقاء کے مقام تک پہنچ چکے ہیں۔ یہ اطلاع ملنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب لوگوں کو اس غزوہ کے لیے نکلنے کی تلقین فرمائی۔

طبرانی نے حضرت ابن حصین سے حدیث روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رومیوں کی فوج چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ (دیکھئے: طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۸' فتح الباری ج ۸ ص ۸۷)

غزوۂ تبوک ماہِ رجب ۹ ہجری میں پیش آیا' اُس وقت گرمی کا موسم تھا اور گرمی اپنے عروج پر تھی' لوگ تنگ دستی کا شکار تھے اور عین اُسی وقت مدینہ منورہ میں کھجور کے درختوں کے

پھل بھی پکے ہوئے تھے (لوگ اپنے درختوں کے سائے اور پکے ہوئے پھلوں میں رہنا چاہتے تھے) لیکن رسول اللہ ﷺ نے (غزوۂ تبوک کا) اعلان فرمایا اور اس کے بارے میں سب کچھ واضح طور پر بتادیا کہ کس طرف سفر کرنا ہے حالانکہ دوسرے غزوات میں آپ ﷺ حفاظت کے پیشِ نظر سب کچھ پہلے ہی نہیں بتاتے تھے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ کسی غزوہ پر جاتے وقت جب تک اُس کا وقت نہ ہوتا صاف نشان دہی نہ فرماتے کہ کس طرف نکلنا ہے۔

اس غزوہ کے وقت گرمی شدید' سفر دراز' راستے میں غیر آباد جنگل اور بہت بڑی تعداد میں دشمن موجود تھے' اس لیے آپ ﷺ نے صاف صاف بتادیا تاکہ وہ سامانِ حرب وغیرہ اچھی طرح تیار کرلیں۔ (متفق علیہ)

اس لیے اس غزوہ میں کوچ کرنا نفوس پر بھاری تھا کیونکہ اس میں ہر جگہ امتحان وابتلاء کا سامنا تھا' اس موقع پر منافقین جو بظاہر ہر جگہ اپنے آپ کو صادق الایمان مسلمان کہتے' ان کی منافقت کا پردہ بھی چاک ہوگیا' دوسری طرف مؤمنین صادقین کا ایمان بھی ظاہر ہوگیا' بعض منافقین ایک دوسرے کو کہنے لگے:

لاتنفروا فی الحر۔ گرمی میں نہ نکلو۔

ایک منافق شخص آیا (جس کا نام جدّ بن قیس تھا) اور آپ ﷺ سے عرض کرنے لگا: مجھے اجازت دیجئے! مجھے آزمائش میں نہ ڈالئے' اللہ کی قسم! میری قوم خوب جانتی ہے کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی شخص عورتوں کا رسیا نہیں' مجھے ڈر ہے کہ اگر میں بنواصفر کی عورتوں کو دیکھ لوں گا تو میں صبر نہ کرسکوں گا' رسول اللہ ﷺ نے اُس سے اعراض فرمایا اور اس کے ارادے کے مطابق اس کو اجازت دے دی۔[1]

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول نے مدینہ کے مضافات میں اپنے دوستوں اور حلیفوں کے ساتھ پڑاؤ کیا' جب نبی اکرم ﷺ لشکر کو لے کر وہاں سے روانہ ہوئے تو عبداللہ بن ابی پیچھے سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس آگیا۔

[1] اس روایت کو ابن اسحاق اور ابن مردویہ نے ضحاک عن ابن عباس کی سند سے اور عبدالرزاق نے معمر عن قتادہ کی سند سے روایت کیا ہے' دیکھئے: الاصابہ ج ۱ ص ۲۳۰۔

اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں ذکر فرمایا:

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ○ (التوبہ:۸۱)

خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر اللہ کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد اور ناگوار تھا انہیں کہ جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہِ خدا میں اور (دوسروں کو بھی) کہتے: مت نکلو! اس سخت گرمی میں فرمایئے: دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے' کاش! وہ کچھ سمجھتے○

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ○ (التوبہ:۴۹)

اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: اجازت دیجئے مجھے (کہ گھر میں ٹھہرا رہوں) اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے' خبردار! فتنہ میں تو وہ گر چکے اور بے شک جہنم گھیرے ہوئے ہے کافروں کو○

تمام مؤمنین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق تیاری کرنے لگے اور ہر طرف سے اکٹھے ہونے لگے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اغنیاء کو زادِ راہ اور سواریوں کا انتظام کرنے پر برانگیختہ کیا تو لوگوں نے اپنا مال پیش کیا' حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تین سو اونٹ[1] بمعہ کجاووں کے مہیا کیے' اس کے علاوہ ایک ہزار دینار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں ڈال دیئے' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا: عثمان اس کے بعد جو کچھ بھی کرے اس کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔[2]

---

1. طبرانی' ترمذی' حاکم' احمد نے عبدالرحمان بن خباب سے روایت کیا ہے' اور "الاحلاس" جمع ہے "حلس" کی' اس کا معنی ہے: وہ ٹاٹ یا دری جو اونٹ کی پیٹھ کے اوپر بچھا کر اوپر کجاوہ رکھا جاتا ہے۔
2. اس حدیث کو امام ترمذی نے اپنی سنن میں اور امام احمد نے اپنی مسند میں عبدالرحمان بن سمرہ سے روایت کیا ہے۔

اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا سارا مال لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے مال کا آدھا حصہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔

امام ترمذی نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا ہے' حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا' اور اُس وقت میرے پاس مال کی فراوانی تھی' میں نے دل میں کہا: اگر آج میں ابوبکر صدیق سے سبقت لے گیا تو میں اُن سے ہمیشہ کے لیے سبقت لے جاؤں گا' حضرت عمر فرماتے ہیں: پس میں اپنے گھر کا آدھا مال لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہوا' آپ ﷺ نے پوچھا: ''ما ابقیت لاھلك'' اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ میں نے عرض کیا: آدھا مال آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور آدھا مال گھر والوں کے لیے چھوڑ آیا ہوں' حضرت ابوبکر صدیق اپنا سارا مال لے کر آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یا ابا بکر ما ابقیت لاھلك'' اے ابوبکر! اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ تو انہوں نے کہا: ''ابقیت لھم اللہ ورسولہ'' میں ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں' یہ سن کر میں نے کہا: میں کبھی بھی ابوبکر صدیق سے سبقت نہیں لے سکتا۔[1]

(رواہ الترمذی والحاکم وابوداؤد)

اگر یہ حدیث صحیح ہے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقع پر ہی پیش آیا۔ علماء کی ایک جماعت کا یہی خیال ہے۔

---

[1] اس روایت کو ترمذی' حاکم اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے' اس کی سند میں ایک راوی ہشام بن سعد ہے' اس نے اس روایت کو زید بن اسلم سے روایت کیا ہے' ہشام کو امام احمد اور کسائی نے ضعیف قرار دیا ہے' حافظ ابن حجر نے اس کا شمار پانچویں درجے میں کیا ہے اور اس کے بارے میں کہا ہے: وہ سچا ہے لیکن بعض روایتوں میں اسے وہم ہو گیا ہے۔ ذہبی نے اس کے بارے میں ابوداؤد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ معتبر ہے' اگر زید بن اسلم سے روایت کرے جیسا کہ اس حدیث میں ہے' اسی طرح انہوں نے حاکم سے روایت کیا ہے کہ امام مسلم نے بطورِ شواہد اس سے تخریج کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کو ''بکاؤن'' (گریہ زاری کرنے والے) کہا جاتا تھا' انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمیں جہاد میں شرکت کے لیے سواریاں عطا فرمائیں ہم تنگ دست ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں فرمایا: میں ایسے وسائل نہیں پاتا کہ تمہیں سواریاں دوں۔ یہ لوگ واپس ہوئے تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور یہ اس بات پر غمگین تھے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے مال نہیں رکھتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکمل تیاری کے بعد تقریباً تیس ہزار مسلمان مجاہدین کا لشکر لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے[1]

اس موقع پر کچھ مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ روانہ نہ ہو سکے جب کہ ان کے مخلص مسلمان ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا' ان میں کعب بن مالک' مرارہ بن الربیع' ھلال بن امیہ اور ابوخیثمہ بھی تھے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ سچے مسلمان تھے' ان کے اسلام کے بارے میں کوئی تہمت نہیں لگائی جاسکتی' ان میں سے حضرت ابوخیثمہ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تبوک میں جا ملے۔

طبرانی' ابن اسحاق اور واقدی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مدینہ سے روانہ ہو جانے کے چند دن بعد جب حضرت ابوخیثمہ ایک گرم دن اپنے گھر والوں کے پاس آئے تو آپ نے اپنی دونوں بیویوں کو اپنے باغ میں چھپروں کے نیچے پایا' ہر ایک نے اپنے چھپر میں چھڑکاؤ کر رکھا تھا' دونوں نے آپ کے لیے ٹھنڈا پانی رکھا ہوا تھا اور کھانا بھی تیار کر رکھا تھا' جب آپ داخل ہوئے تو چھپر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے' اپنی دونوں بیویوں کو دیکھا اور جو کچھ انہوں نے تیار کر رکھا تھا اس کو ملاحظہ کیا تو کہنے لگے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو دھوپ' گرم ہوا اور تپش میں ہوں اور ابوخیثمہ ٹھنڈے سائے' تازہ کھانے' خوب صورت بیوی اور اپنے باغ میں مقیم ہو؟ اللہ کی قسم! یہ کوئی انصاف نہیں! پھر کہا: اللہ کی قسم! میں تم میں سے کسی کے چھپر میں داخل نہیں ہوں گا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نہ جا ملوں۔ دونوں بیویوں نے ان کے لیے زادِ راہ تیار کیا' پھر وہ اپنا اونٹ لائے اور سفر پر روانہ ہو گئے' رسول

[1] اس روایت کو ابن سعد' ابن اسحاق اور دیگر اصحاب سیر نے نقل کیا ہے۔

اللہ ﷺ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے یہاں تک کہ انہوں نے آپ ﷺ کو پالیا' جب کہ آپ ﷺ ابھی تبوک میں پہنچے ہی تھے۔ جب حضرت ابوخیثمہ مسلمانوں کے قریب پہنچے تو انہوں نے کہا کہ یہ راستے پر ایک سوار چلا آ رہا ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کرے ابوخیثمہ ہو! وہ قریب ہوئے تو صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! اللہ کی قسم! یہ ابوخیثمہ ہی ہیں' جب ابوخیثمہ نے اپنا اونٹ بٹھایا' حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: "اولی لك يا ابا خيثمة" اے ابوخیثمہ! تو ہلاکت کے قریب ہو گیا تھا' پھر ابوخیثمہ نے سارا واقعہ آپ ﷺ کو سنایا تو آپ ﷺ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

مسلمانوں نے اس غزوہ کے دوران سخت مشقتوں اور جسمانی تکالیف کا سامنا کیا۔

امام احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ تنگ دستی اور عُسرت کا یہ حال تھا کہ سواریاں نہ ہونے کی وجہ سے ایک ایک اونٹ پر پے در پے دو دو' تین تین آدمی سوار ہوتے تھے' اور جب لوگوں کو راستے میں شدید پیاس لگتی تو اونٹ ذبح کر کے اس کی اوجھ نکال کر اُس کا پانی پیتے[1]

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ غزوۂ تبوک میں لوگوں کو سخت بھوک لگی ہوئی تھی' قحط کا زمانہ تھا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم پانی لانے والے اونٹوں کو ذبح کر کے کھالیں اور چربی کا تیل بنالیں؟ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی' اتنے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آ گئے اور عرض کی: یارسول اللہ! اگر آپ نے ایسے ہی اجازت دی تو سواریاں کم ہو جائیں گی' البتہ آپ لوگوں کو اپنا بچا ہوا کھانا لانے کا کہیں اور اس پر برکت کی دعا فرمایئے' اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ برکت عطا فرمائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک چمڑے کا دسترخوان منگوایا' اس کو بچھا دیا گیا' پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو اپنا بچا ہوا کھانا لانے کو کہا' پس کوئی شخص اپنی ہتھیلی میں جوار' کوئی کھجوریں اور کوئی روٹی کے ٹکڑے لیے چلا آ رہا تھا' چمڑے کے دسترخوان کے اوپر یہ سب چیزیں تھوڑی مقدار میں جمع ہو گئیں' پھر آپ ﷺ نے اس پر برکت کی دعا فرمائی' پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا کہ سب اپنے اپنے برتنوں میں کھانا

[1] اس روایت کو ابن سعد نے بھی اپنی طبقات میں نقل کیا ہے' ج ۳ ص ۲۲۰۔

بھرلیں' چنانچہ تمام لوگوں نے اپنے اپنے برتن کھانے سے بھر لیے یہاں تک کہ لشکر کے تمام برتن بھر گئے اور سب نے مل کر کھانا کھایا اور سیر ہو گئے' کھانا پھر بھی بچ گیا' رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور جو شخص بھی اس کلمہ پر یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا وہ شخص جنتی ہوگا[1] (رواہ احمد فی مسندہ' ورواہ مسلم)

حضور ﷺ جب تیس ہزار کے اس لشکر جرار کو ساتھ لے کر تبوک کے مقام پر پہنچے اور وہاں پڑاؤ کیا تو وہاں پر نہ کوئی لشکر تھا اور نہ کوئی فوج تھی' کیونکہ جب رومی فوجوں کو مسلمانوں کے اس تیس ہزار کے لشکر کی آمد کی خبر ملی تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے اور ان کی ساری فوجیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔

آپ ﷺ تبوک میں کئی دن ٹھہرے رہے' پھر ''ایلہ'' کا حاکم ''یوحنا'' آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اس نے جزیہ دینے کی شرط پر آپ ﷺ سے صلح کر لی' پھر اسی طرح ''جرباء'' اور ''اذرح'' کے عیسائی بھی حاضرِ خدمت ہوئے اور جزیہ دینے پر رضامندی ظاہر کی' آپ ﷺ نے ایک دستاویز بھی لکھوا کر ان کو عطا فرمائی۔

تبوک کے سفر کے دوران جب رسول اللہ ﷺ مقامِ حجر کے پاس سے گزرے' جہاں قومِ ثمود کی تباہ شدہ بستیاں تھیں تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: ان ظالموں کے گھروں میں داخل نہ ہونا جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیے' کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آ جائے جو ان پر آیا تھا' بلکہ یہاں سے (خوفِ خدا کے باعث) روتے ہوئے گزرنا' پھر آپ ﷺ نے اپنا سرِ انور ڈھک لیا اور تیزی کے ساتھ اس بستی سے گزر گئے' حتیٰ کہ وادی پیچھے رہ گئی۔ (متفق علیہ)

رسول اللہ ﷺ تبوک میں تقریباً بیس دن گزارنے کے بعد واپس مدینہ منورہ کی جانب عازمِ سفر ہوئے اور جب مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب

---

[1] امام احمد نے اس کو اپنی مسند میں روایت کیا ہے' حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: اس حدیث کو امام مسلم نے ابوکریب عن ابی معاویہ عن الاعمش کی سند سے روایت کیا ہے۔

سے فرمایا: یہ "مدینہ" طیبہ ہے اور یہ اُحد پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ (متفق علیہ)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: مدینہ طیبہ میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب تم دور دراز کا سفر طے کر رہے تھے اور وادیوں کو عبور کر رہے تھے تو اس وقت بھی وہ تمہارے ساتھ تھے' لوگ عرض گزار ہوئے کہ یارسول اللہ! وہ تو مدینہ منورہ میں ہی تھے' پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ واقعی وہ مدینہ طیبہ میں رہے لیکن انہیں عذر نے روکے رکھا۔ (متفق علیہ)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مدینہ منورہ میں ماہِ رمضان ۹ ہجری کو پہنچے اور تقریباً دو ماہ کا یہ عرصہ آپ مدینہ سے باہر رہے۔

غزوۂ تبوک میں شرکت سے پیچھے رہ جانے والوں کا معاملہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غزوۂ تبوک سے واپسی پر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے مسجد نبوی میں تشریف لے گئے اور وہاں دو رکعت نماز ادا کی' پھر لوگوں کے درمیان تشریف فرما ہوئے تو پیچھے رہ جانے والے حاضر ہو کر اپنے عذر بیان کرنے لگے اور اس پر قسمیں کھانے لگے' ایسے تقریباً اسی (۸۰) افراد تھے' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے عذر قبول فرما لیے اور ان کے لیے بخشش کی دعا فرمائی' لیکن کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کی توبہ کی قبولیت اللہ تعالیٰ کے حکم کے نازل ہونے پر چھوڑ دی۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں جو ایک طویل حدیث میں ہے' جسے امام بخاری' امام مسلم نے روایت کیا ہے' وہ اپنے بارے میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے پاس کوئی معقول عذر نہیں تھا کہ میں اس غزوہ سے پیچھے کیوں رہ گیا؟ اور اللہ کی قسم! جب میں آپ سے پیچھے رہ گیا تو قوت اور دولت میں دوسرے مجھ سے بڑھ کر نہ تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس غزوہ کی تیاری کر لی اور مسلمانوں نے بھی تیاری مکمل کر لی' میں روزانہ یہی کہتا رہتا کہ میں بھی ان کے ساتھ تیاری کر لوں گا' دن گزرتے رہے اور میں نے کچھ بھی نہ کیا' پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں فوراً تیاری کرنے پر بھی قادر ہوں' اسی سوچ بچار میں دن گزرتے گئے اور لوگوں نے سرتوڑ کوشش کر کے اپنا اپنا سامان تیار کر لیا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک صبح کو روانہ ہو گئے اور اہلِ اسلام آپ کے ہمراہ تھے جب

کہ میں نے ذرا بھی تیاری نہیں کی تھی' پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں جلد تیاری کر کے ان سے جاملوں گا لیکن میرا برابر یہی حال رہا یہاں تک کہ مجاہدین تیزی سے مسافت طے کرتے ہوئے بہت دور جا نکلے اور میں نے ارادہ کیا کہ میں روانہ ہو کر اُن سے جاملوں گا' کاش! میں نے ایسا کیا ہوتا' لیکن یہ بات میری تقدیر میں نہ تھی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں (گھر سے) باہر نکلتا تو مجھے اس بات سے رنج ہوتا کہ مجھے وہ لوگ ملتے جو منافق کہلاتے تھے یا معذور افراد ملتے تھے' پھر مجھے جب یہ خبر پہنچی کہ قافلہ واپس آرہا ہے تو میرے غم میں اضافہ ہونے لگا' جھوٹے خیالات دل میں آنے لگے کہ میں اپنے نہ نکلنے کی یہ وجہ بیان کروں گا جس کے باعث کل آپ کا غصہ جاتا رہے اور اس بارے میں اپنے اہل وعیال میں سے سمجھ دار لوگوں سے مشورہ بھی کیا لیکن جب یہ کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ کے قریب آ پہنچے ہیں تو جھوٹے سہارے سب میرے دماغ سے نکل گئے اور میں نے سچ بولنے کا عزم کر لیا' پس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا تو آپ نے تبسم فرمایا اور تبسم کے اندر غصے کی آمیزش تھی' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ادھر آؤ! پس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آ کر بیٹھ گیا' پھر آپ نے مجھ سے فرمایا: تم کیوں پیچھے رہے؟ کیا تم نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی؟ میں عرض گزار ہوا: کیوں نہیں! اللہ کی قسم! اگر میں کسی دنیادار کے سامنے بیٹھا ہوتا تو یقیناً میں ایسے عذر بیان کرتا کہ اُس کا غصہ دور ہو جاتا' کیونکہ قدرت نے یہ چیز مجھے عطا فرمائی تھی لیکن اللہ کی قسم! میں یہ جانتا تھا کہ آج اگر جھوٹ بول کر انہیں راضی کر بھی لوں تو اللہ تعالیٰ کل انہیں مجھ سے ناراض کر دے گا اور اگر میں سچ سچ بات عرض کر دوں گا تو خواہ آج ناراض بھی ہو جائیں لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا حالانکہ بخدا! میرے پاس کوئی معقول عذر بھی نہیں اور اللہ کی قسم! جب میں آپ سے پیچھے رہ گیا تو قوت اور دولت میں دوسرے مجھ سے بڑھ کر نہ تھے' پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے چونکہ سچ بات کہہ دی ہے لہٰذا کھڑے ہو جاؤ! یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ فرما دے' میں اٹھ کر چلا گیا تو بنوسلمہ کے کچھ آدمی بھی میرے پیچھے آئے اور کہنے لگے کہ تم کوئی عذر بتا دیتے تو تمہاری مغفرت ہو جاتی' وہ برابر مجھے یہی سمجھاتے تھے' پھر میں نے اُن سے پوچھا کہ میری طرح کسی اور نے بھی اپنی غلطی کا

اعتراف کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں! دو اور افراد نے بھی آپ کی طرح سچی بات کہہ دی ہے' اور اُن سے بھی وہی کہا گیا ہے جو تم سے کہا گیا' میں نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: وہ مرارہ بن ربیع اور ھلال بن امیہ ہیں۔ انہوں نے دو ایسے نیک حضرات کے نام لیے جو دونوں غزوۂ بدر میں شرکت فرما چکے تھے مجھے ان کی اقتداء اچھی لگی۔

رسول اللہ ﷺ نے پیچھے رہ جانے والے ہم تینوں کے ساتھ کلام کرنے سے صحابہ کرام کو منع فرما دیا' لوگ ہم سے اجتناب کرنے لگے اور ایسے بدل گئے جیسے ہمیں پہچانتے ہی نہیں گویا زمین ہی میرے لیے بدل گئی' ہم پچاس روز تک اسی حالت میں رہے' میرے دونوں دوسرے ساتھی تو وہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے اور روتے رہتے لیکن میں کچھ سخت جان تھا' لہٰذا ہمت سے کام لیتا رہا' چنانچہ میں باہر نکلتا' مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتا اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا رہا' اگرچہ میرے ساتھ کوئی کلام نہیں کرتا تھا۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو سلام عرض کرتا' جب آپ نماز کے بعد اپنی مجلس میں جلوہ افروز ہوتے' پھر میں اپنے دل میں کہتا کہ دیکھوں کہ آپ ﷺ کیا سلام کا جواب دینے کے لیے اپنے مبارک ہونٹوں کو حرکت دیتے ہیں یا نہیں؟ پھر میں آپ کے نزدیک نماز پڑھنے لگتا اور آنکھیں چرا کر چہرۂ والضحیٰ کی زیارت کرتا' جب میں نماز میں مصروف ہوتا تو آپ میری جانب دیکھنے لگتے اور جب میں آپ کی جانب متوجہ ہوتا تو اعراض فرما لیا کرتے تھے' اسی حال میں کئی دن گزر گئے۔

ایک روز میں مدینہ طیبہ کے بازار سے گزر رہا تھا کہ شام کا رہنے والا ایک تاجر ملا' جو مدینہ طیبہ میں اناج بیچنے کے لیے آیا تھا لوگوں سے کہنے لگا کہ مجھے کعب بن مالک کا پتا کون بتائے گا؟ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا یہاں تک کہ وہ میرے پاس آیا تو اس نے مجھے ایک خط دیا جو شاہِ غسان کا تھا' اس میں تحریر تھا: امابعد! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے راہنما نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذلت اور ضیاع سے بچایا ہے' پس اگر آپ ہمارے پاس آ جائیں تو ہم آپ کو آرام سے رکھیں گے۔ جب میں نے اسے پڑھ لیا تو یہ میرے واسطے دوسری مصیبت کھڑی ہو گئی' میں نے اس خط کو تنور میں ڈال کر جلا دیا' اب پچاس میں چالیس روز گزر چکے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا بذریعہ قاصد یہ حکم ملا کہ اپنی

بیوی سے بھی علیحدہ ہو جاؤ' میں نے پوچھا کہ کیا طلاق دے دوں یا کچھ اور مقصد ہے؟ جواب ملا کہ طلاق نہ دو بلکہ کنارہ کش رہو اور نزدیک نہ جاؤ! اور میرے دونوں ساتھیوں کو بھی یہی حکم بھیجا' پس میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ اور اس وقت تک وہاں رہو جب تک کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں فرما دیتا۔

حضرت کعب فرماتے ہیں: پس اس کے بعد مزید دس روز میں اسی حالت میں رہا یہاں تک کہ صحابہ کرام کو ہم سے بات چیت سے منع کیے ہوئے پورے پچاس روز مکمل ہو گئے' جب پچاسویں روز صبح کے وقت میں نے نمازِ فجر پڑھ لی اور اپنے ایک گھر کی چھت پر اسی غم کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا' جس حالتِ غم کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا زندہ رہنا مجھ پر گراں گزر رہا تھا اور زمین مجھ پر تنگ ہو چکی تھی' اُس وقت میں نے سلع پہاڑ کے اوپر کھڑے ہو کر ایک پکارنے والے کی بلند آواز سے پکار سنی: اے کعب بن مالک! تمہیں بشارت ہو! جب میں نے یہ سنا تو میں سجدے میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ اب خوشی کا وقت آ گیا ہے' کیونکہ نمازِ فجر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ہماری توبہ کے متعلق بتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمالی ہے' پس لوگ ہمیں خوش خبری سنانے لگے' اور میرے دونوں ساتھیوں کو بھی بشارت دینے لگے' جب وہ شخص میرے پاس آیا جس کی میں نے آواز سنی تھی جو مجھے بشارت سنا رہا تھا' تو میں نے بشارت سنانے والے شخص کو اپنے زیب تن دونوں کپڑے اتار کر دے دیئے' بخدا! میرے پاس اُس روز ان کے سوا کوئی کپڑے نہ تھے' میں نے دو کپڑے اُدھار لے کر پہنے اور میں رسول اللہ ﷺ کی جانب چل پڑا' پس راستے میں مجھے فوج در فوج لوگ ملے جو توبہ قبول ہونے پر مجھے مبارک باد دیتے تھے' آخر کار میں مسجد نبوی میں داخل ہوا' رسول اللہ ﷺ وہاں جلوہ افروز تھے اور صحابہ کرام آپ ﷺ کے اردگرد موجود تھے' مجھے دیکھتے ہی طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہو کر میری جانب لپکے یہاں تک کہ انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی' اللہ کی قسم! مہاجرین میں سے کوئی آدمی ان کے سوا مجھ سے ملنے کے لیے نہیں اٹھا اور میں حضرت طلحہ کا یہ احسان بھلا نہیں سکتا۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ جب میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس حال میں کہ خوشی سے آپ کا چہرۂ مبارک جگمگا رہا تھا: آج کا دن تمہیں مبارک ہو کہ جب

سے تمہاری ماں نے تمہیں جنا' اُس وقت سے ایسا خیر وخوبی والا دن تم پر نہیں گزرا ہوگا۔

حضرت کعب فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا یہ معافی آپ کی جانب سے ہوئی یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

پھر جب میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا تو عرض گزار ہوا کہ یارسول اللہ! کیا میں قبولیتِ توبہ کی خوشی میں اپنا سارا مال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لیے خیرات کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنا کچھ مال روک لو! یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

پھر میں نے عرض کی: یارسول اللہ! مجھے اللہ تعالیٰ نے سچ کی وجہ سے نجات عطا فرمائی اور میری توبہ کی یہ نشانی ہے کہ اپنی بقیہ زندگی میں سچ کے سوا کوئی بات نہیں کروں گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر یہ وحی نازل فرمائی:

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌO وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُO يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَO

(التوبہ: ۱۱۹۔۱۱۸)

یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر' نیز مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے پیروی کی تھی نبی کی مشکل گھڑی میں اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ٹیڑھے ہو جائیں دل ایک گروہ کے ان میں سے' پھر رحمت سے توجہ فرمائی ان پر بے شک وہ ان سے بہت شفقت کرنے والا رحم فرمانے والا ہےO اور ان تینوں پر بھی (نظرِ رحمت فرمائی) جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ تعالیٰ سے مگر اسی کی ذات تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بہ کرم ہوا تاکہ وہ بھی رجوع کریں' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی بہت توبہ قبول

فرمانے والا (اور) ہمیشہ رحم کرنے والا ہےO

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے

ساتھ ہو جاؤO

اسباق ونصائح

اوّل: غزوۂ تبوک پر کچھ وضاحت

جزیرۂ عرب میں جب دینِ اسلام کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں اور لوگوں کے دلوں پر جب اس کی سطوت اور دھاک بیٹھنے لگی تو روم کے عیسائی بھی اس سے اپنے تئیں خوف و اضطراب محسوس کرنے لگے۔

رومی سلطنت کے باشندے سچے دل سے عیسائی مذہب پر ایمان نہ لائے تھے بلکہ ان کے ایمان لانے اور ان کے اتحاد کا مقصد اس علاقے میں چھوٹے قبائل پر اپنی سرداری قائم کرنا اور اردگرد کے علاقے میں لوٹ مار کرنے کی غرض سے ان کے تعاون کے حصول کے لیے تھا' یہی وجہ تھی کہ وہ اس میں اپنی من مانیاں کرتے نظر آتے ہیں' اس میں خوب ہیر پھیر کیا' اسی وجہ سے عیسائی مذہب کی سچی تعلیمات میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں' ان کی ہدایت باطل میں بدل گئی اور بت پرستی ان کے مذہب میں در آئی۔

دینِ اسلام: یہ وہ دین ہے کہ جس کی طرف دعوت اور جس کی تبلیغ جمیع انبیاء اور رُسل اپنے اپنے ادوار میں کرتے رہے ہیں' یہ دین اس لیے آیا تاکہ تمام لوگ غیر اللہ کی بندگی سے چھٹکارا پا کر ایک خدا کی عبادت کا قلادہ اپنے گلوں میں ڈال لیں' اور کسی غیر کے حکم' سلطنت اور اقتدار سے رہائی پا کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی سلطانی اور حکم کے تابع ہو جائیں۔

نصرانیت میں داخل ہونے والے یہ لوگ عیسائی مذہب کے بارے میں سب حقائق سے آگاہ ہو چکے تھے اور رسالت کے اس آخری پیغام سے بھی بخوبی واقف تھے' اور اب وہ اسلام کے پھیلتے ہوئے پیغام کو اپنے جھوٹے دبدبے' بغاوت اور اپنی سرکشی کے لیے خطرہ محسوس کرتے تھے۔

کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ دین اسلام جس نے جزیرۂ عرب میں استحکام حاصل کر لیا اب اس کو رومیوں کے ظلم و ستم اور لوٹ مار کو بھی ختم کرنے کی طرف بڑھنا تھا۔ یہ

بات اُن سرکشوں اور ظالموں کیلیے نہایت قلق اور پریشانی کا باعث تھی کیونکہ اُن جنگ جو قبائل نے عیسائی مذہب بھی صرف ظاہری دکھاوے کے طور پر اختیار کر رکھا تھا تاکہ اس وجہ سے سلطنتِ روم ان کی پشت پناہی کرتی رہے اور کمزور لوگوں پر اپنا اقتدار قائم رکھیں۔ مکہ کی فتحِ عظیم اور جزیرۂ عرب میں اسلام کے غلبے اور استحکام کی خبریں جب ان قبائل تک پہنچیں تو یہ خوف زدہ ہو گئے اور وہ شام اور حجاز کے درمیان ایک جگہ پر اردگرد کے ہم مشرب تمام قبائل کو جمع کرنے لگے' ان کے درمیان یہ منصوبہ طے پایا کہ یہ دینِ اسلام جو تیزی سے جزیرۂ عرب میں مستحکم ہو رہا ہے' ہمیں اس کو ہر طرح سے ختم کرنا ہوگا اور اس کی ترقی کو ہر صورت روکنا ہوگا کیونکہ اس کی اشاعت سے ان کے اقتدار کا خاتمہ یقینی تھا۔ رومیوں کے نزدیک تو اس اتنے بڑے وسیع پیمانے پر کیے ہوئے اہتمام کا مقصد یہ تھا کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان اس بھرپور تصادم کی وجہ سے مسلمانوں کی کمر ٹوٹ جائے گی اور دینِ اسلام کی ترویج یکسر ختم ہو جائے گی' لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا کچھ اور ہی تھا' حکمتِ الٰہی یہ چاہتی تھی کہ مسلمانوں کا رومیوں سے اتنا بڑا تصادم نہ ہو کہ جس کے نتیجے میں ان کا جانی نقصان ہو۔

بلکہ صرف راستے کی صعوبتوں' تکلیفوں اور جسمانی مشکلات ہی مسلمانوں کی طرف سے جہاد شمار ہوں' مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے اُس سخت گرم موسم میں تنگ دستی کے عالم میں تبوک کا دور دراز کا جانے اور آنے کا سفر طے کیا' جو قدم قدم پر مشکلات اور امتحانات سے بھرپور تھا مسلمانوں نے اس عجیب و غریب سفر میں بھوک' پیاس' جسمانی تھکاوٹ' تکالیف اور مشکلات کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی فرماں برداری میں برداشت کیا۔

اللہ تعالیٰ نے جس جہاد کا حکم دیا ہے' وہ کون سا جہاد ہے؟ کیا وہ جہاد اسی چیز کا نام نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی شریعت کے نفاذ کے راستے میں اپنی بھرپور جدوجہد صرف کرنا اور مال و جان کا نذرانہ پیش کرنا؟

یہی وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے تقاضا فرماتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا' معاذ اللہ! اس کے ذریعے اس کا مقصد کافروں کی سازشوں کا توڑ کرنے یا منکرین کے دلوں میں ہدایت اور ایمان داخل کرنے کے لیے ان کی

مدد حاصل کرنا نہیں تھا۔

مسلمانوں کے اس کم ساز و سامان والے تنگ دست لشکر نے اس مشقت طلب غزوہ میں اپنا مال اور اپنی بھرپور کوشش صرف کی‘ انہوں نے اپنی راحت و آرام کو قربان کیا‘ دور دراز کے اس سفر کی کٹھن مشکلات کو برداشت کیا اور یہ ان کے صدقِ ایمان کی اور دینِ اسلام کے ساتھ محبت کی دلیل تھی‘ تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی فتح و نصرت کو یقینی بنا دیا‘ اور دشمن کے ساتھ لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی‘ اللہ تعالیٰ خود ہی مسلمانوں کی طرف سے دشمنانِ اسلام کے لیے کافی ہوا‘ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے دشمنانِ اسلام کے دلوں میں پہلے ہی اتنا رعب طاری کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے تبوک کے مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی خوف زدہ اور رعب زدہ ہو کر بھاگ گئے اور منتشر ہو گئے۔ اس طرح جب مسلمانوں نے اپنے رسول ﷺ کے ساتھ مل کر اپنے رب کی رضا کے لیے تکالیف برداشت کیں تو رومیوں نے بہت جلد اللہ کے حکم کی اطاعت کر لی اور جزیہ دینے پر تیار ہو گئے اور اس کی شروط و قیود کو تسلیم کر لیا۔

دوم: دروس و احکام

اس غزوہ سے ہمیں کثیر دروس و احکام حاصل ہوتے ہیں‘ جنہیں ہم بالترتیب بیان کرتے ہیں:

(۱) جہاد بالمال کی اہمیت

دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد کا مفہوم صرف ان کے خلاف لڑائی کے لیے ہی نکلنے تک محدود نہیں بلکہ یہ واحد صورت بھی کفایت نہیں کرتی‘ کیونکہ جہاد میں افرادی قوت کے ساتھ ساتھ مالی معاونت بھی اشد ضروری ہے‘ پس جہاں جہاد کا معاملہ لڑائی اور اسلحہ پر موقوف ہو یعنی جس موقع پر جہاد کے لیے اسلحہ اور ساز و سامان کی ضرورت ہو تو وہاں جہاد بالمال کی اہمیت بڑھ جاتی ہے‘ تو ایسی صورتِ حال میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ موقع کی مناسبت سے جہاد کے لیے جس قدر مال کی ضرورت ہو تو مال پیش کریں‘ ساز و سامان کی ضرورت ہو تو یہ مہیا کریں‘ ہر مسلمان پر اپنی مال داری اور غناء کی بناء پر اس کو پورا کرنا لازم ہے۔

فقہاء نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ حکومت کو جب جہاد کے لیے اخراجات پورے کرنے میں دقت ہو تو حکومت کے لیے جائز ہے کہ وہ لوگوں پر حاجت اور ضرورت کے

مطابق اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ادائیگی لازم قرار دے دے' اس کے علاوہ فقہاء کا اس شرط پر بھی اتفاق ہے کہ حکومت اپنا مال غیر ضروری کاموں یا ناجائز اُمور میں خرچ نہ کرتی ہو' اس لیے کہ فوج کی ضرورتوں اور جنگ کے لیے حکومت کے اموال کے بجائے لوگوں کے اموال خرچ کرنا مناسب نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کیسے آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے' تین سو اونٹ کجاووں اور دیگر ساز وسامان کے ہمراہ اور اس کے علاوہ ذو سو اوقیہ چاندی آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی' جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ما ضرّ عثمان ما فعل بعد اليوم. آج کے بعد عثمان جو کام بھی کرے اس کو کوئی نقصان اور خسارہ نہیں۔

اس حدیثِ طیبہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے' بلکہ آپ ﷺ نے حضرت عثمان کے حق میں جو یہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں' ان کلمات میں اُن لوگوں کے لیے زجر و توبیخ اور تادیب ہے جو لوگ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف زبان درازی کرتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ کے ایامِ خلافت کی سیاست پر تنقید کرتے ہیں' اور آپ رضی اللہ عنہ کی سیاست کی کمزوری اور ضعف کی وجوہات لکھتے ہوئے طویل صفحے بھر دیتے ہیں' ایسے لوگ یقیناً اُن مستشرقین کی تحریک کا حصہ ہیں' جنہوں نے ایک متعین اور معروف مقصد تک رسائی کے لیے تاریخِ اسلامی میں جھوٹی تنقید اور جھوٹ کے ذریعے دراندازی کی ناکام کوششیں کی ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے آپ کو عالی مرتبت سمجھتے ہوئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ذات اور آپ رضی اللہ عنہ کے طریقِ سیاست پر زبان درازی کی ہے' اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مستشرقین کو اپنی مختلف بیماریوں کو تلاش کرنا چاہیے اور ان بیماریوں کا علاج حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مناقب میں اور آپ رضی اللہ عنہ کے کارناموں اور سیرت سے راہنمائی حاصل کرنے کی صورت میں کرنا چاہیے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ کیسا ہی ہو لیکن جب حضرت عثمان کے

بارے میں حضور ﷺ کے اس فرمان کو دیکھیں کہ جس میں فرمایا:

آج کے بعد عثمان جو کوئی عمل کرے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس فرمانِ رسالت کے بعد پھر بھی کوئی شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیاست اور آپ کی ذات پر کسی قسم کی تنقید کرے تو اس نے ان کا کیا ادب ملحوظ رکھا؟

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ والی حدیث پر کچھ ایسے کلمات کی زیادتی جس سے ایک بدعت محرمہ کو گھڑ لیا گیا

ہم نے پیچھے وہ حدیث طیبہ ذکر کی جس کو امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنا سارا مال حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق سے پوچھا: "ما ابقیت لاهلك" اے ابوبکر! اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ تو اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "ابقیت لهم الله و رسوله" میں گھر والوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔

بعض حضرات نے اس حدیث طیبہ پر کچھ کلمات کی من گھڑت زیادتی کرتے ہوئے اس کے بعد یہ بیان کیا کہ پھر نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کو فرمایا: اے ابوبکر! بے شک اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو گیا' کیا تم بھی اُس سے راضی ہو؟ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق خوشی اور وجد میں جھومنے لگے اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے اور ساتھ ساتھ کہنے لگے: میں کیسے اللہ تعالیٰ سے راضی نہیں ہوں؟

پھر کچھ حضرات نے اس حدیث کے ان زائد کلمات سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ذکر کے حلقوں میں رقص کرنا اور ذکر کے دوران گولائی میں گھومنا جائز ہے جیسے کہ صوفیاء کا ایک سلسلہ جس کو "مولویہ" کہا جاتا ہے' ان کا یہ طریقہ ہے اور اسی طرح صوفیاء کے کئی دیگر سلاسل میں بھی یہ طریقہ جائز سمجھا جاتا ہے۔

یہ حضرات ذکر کے حلقوں میں رقص کرنے کی دلیل جس حدیث طیبہ سے پکڑتے ہیں' حدیث کے وہ کلمات ہی من گھڑت ہیں کیونکہ یہ بات کسی صحیح یا ضعیف حدیث سے ثابت نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سامنے رقص کیا ہو' اس ضمن میں جو

وارد ہوا' ہم نے ترمذی' حاکم اور ابوداؤد کی روایت کردہ نص حدیث کو ذکر کر دیا' اس میں بھی ضعف کے کچھ احتمالات موجود ہیں' لہٰذا تخریج الحدیث میں اس کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

پس مدلول کے بارے میں ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ دلیل سے ثابت نہیں بلکہ اس کے بارے یہ کہنا زیادہ اچھا ہے کہ اس کی حرمت پر دلیل موجود ہے' اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

جمہور فقہاء کا یہ مذہب ہے کہ ایسا رقص جس میں جسم کو موڑا جائے یہ حرام ہے اور سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر رقص' جسم کو موڑے اور الٹ پلٹ کیے بغیر بھی ہو تو یہ مکروہ ہے' پس اللہ تعالیٰ کے ذکر میں رقص جس کیفیت میں بھی ہو اس کا شامل کرنا ایسے ہی ہے کہ کسی عبادت مشروعہ میں کسی حرام یا مکروہ چیز کی ملاوٹ کر دی جائے اور اس کو بغیر دلیل کے عبادت میں اس ملاوٹ کو بھی تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھا جائے' یا اس کا طریقہ یہ ہو کہ عبادت کے دوران ایسا عمل صرف تھوڑی سی اتنی مقدار میں کیا جائے کہ جو حرمت اور کراہت سے خارج ہو' یہ ممنوع نہیں۔

میں اس بحث میں مزید اضافہ کرتے ہوئے اس بات کو بھی شامل کرتا ہوں کہ آج کل ''ذاکرین'' کا جو حال ہے کہ یہ اس حال میں ذکر کرتے ہیں کہ جس میں منہ سے ذکر کے الفاظ نہیں نکلتے بلکہ صرف گلے سے مختلف آوازیں نکلتی ہیں' گلے سے نکلنے والی یہ موٹی آوازیں ایسی متعین سروں اور طرزوں کی صورت میں ڈھالی جاتی ہیں جو گانے بجانے والوں کی سروں اور طرزوں کی طرح ہوتی ہیں' جس سے دلوں میں مزید طرب اور لطف و سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے' اس کے جواز کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ کے ذکر کی یہ صورت' کیسے اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عمل کے مطابق ہو سکتی ہے؟ یہ عمل کیسے عبادت ہو سکتا ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عبادت تو وہ ہوتی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں مشروع قرار دیا ہو یا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہو اور اس میں نہ کمی کی جائے اور نہ زیادتی کی جائے۔

آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ بالا جو کچھ ہم نے اس ضمن میں کہا' اس پر ہر زمانے

کے علماء شریعتِ اسلامیہ کا اجماع رہا ہے' علماء کے اس اجماع سے وہی لوگ اختلاف کرتے رہے ہیں جنہوں نے دین میں کچھ ایسی بدعاتِ سیئات کو رواج دیا جن کی اللہ تعالیٰ نے قطعاً اجازت نہیں دی اور ایسے لوگ بہت کم ہیں' انہوں نے کتنی ہی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھا اور کتنی ہی غلط رسومات کو اپنایا' یہ کہتے ہوئے کہ یہ وجد ہے یا تواجد ہے یا یہ کہتے ہوئے کہ اس طریقے سے فرائض کے مکلف ہونے سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ سب اپنی طرف سے بنائی گئیں باتیں ہیں' جن کی قرآن و سنت میں کوئی اصل نہیں۔

اس ضمن میں ہم مسلمانوں کے ایک امام جو دینداری' علم' تقویٰ اور تصوف میں جلیل القدر ائمہ مسلمین میں شمار ہوتے ہیں' جن کا نام العز بن عبدالسلام ہے' ان کا مؤقف آپ کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں آپ فرماتے ہیں: پس رقص اور تالی بجانا' ہلکے پن اور کم عقلی کی دلیل ہے اور یہ ایسی حرکت ہے جو عورتوں کی غیر مہذب حرکات کے مشابہ ہے' اور ایسی حرکات وہی کرتا ہے جو بے وقوف اور خودساختہ حرکات کرنے والا جھوٹا ہو۔ اگر وجد میں ہی ایسا ہوتا ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جس کی وجد کے دوران عقل ماؤف ہو گئی ہو اور اس کے دل کی کیفیت اس کے اختیار میں نہ رہی ہو' وہ کیسے کسی طرز یا سُر کے مطابق رقص کر سکتا ہے؟

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم.	سب سے بہتر لوگ میرے زمانے کے ہیں' پھر اس کے بعد جو لوگ آئیں گے' پھر اس کے بعد جو لوگ آئیں گے۔

ان سب زمانوں میں سے کسی مقتدی شخص نے ایسے افعال کو نہیں اپنایا۔

(قواعد الاحکام فی مصالح الانام ج ۲ ص ۱۸۶)

امام ابن حجر نے بھی اسی طرح کا مؤقف اختیار کرتے ہوئے اپنی کتاب "کف الرعاع" میں لکھا ہے' اور امام ابن عابدین نے اپنی شہرۂ آفاق فقہ کی کتاب "فتاویٰ شامی" جو احناف کے نزدیک معتبر ہے' میں یہ مؤقف اختیار کرتے ہوئے انہوں نے مغلوب کر دینے والے زبردست فطری وجد کے درمیان اور خودساختہ مصنوعی وجد کے درمیان فرق واضح کیا

ہے۔

جب کہ امام قرطبی نے اس بدعت سے بچنے اور اس کی حرمت بیان کرنے کے لیے تفصیل سے بحث کی ہے' اگر آپ امام قرطبی کا موقف تفصیل کے ساتھ جاننا چاہیں تو ان کی تفسیر میں سے مندرجہ ذیل دو آیات کے تحت مطالعہ کیجیے:

(۱) ''اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ''۔ (آل عمران: ۱۹۱)

(۲) ''وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا O''۔ (الاسراء: ۳۷)

اس مختصر بحث میں اگر مجھے طوالت کا ڈر نہ ہوتا تو میں اس حوالے سے اس مذکورہ بالا موقف کے مطابق کثیر ائمہ کی نصوص و روایات کو نقل کرتا تا کہ آپ اچھی طرح جان لیتے کہ اس مسئلہ پر سلف و خلف سے تعلق رکھنے والے جملہ ائمہ کا اتفاق ہے اور اس مسئلہ میں ان کے درمیان کسی نے اختلاف و نزاع نہیں کیا۔[1]

[1] بعض لوگوں کو تعجب ہوگا کہ میں اکثر آراء میں وہابیہ کی مخالفت کرتا ہوں' لیکن اس کے باوجود میں اس مسئلہ میں ان کی طرف داری کر رہا ہوں' اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تعجب مسلمانوں کی حالت کے بارے میں غلط تصور کا نتیجہ ہے' اسلام کی یہ تعلیمات نہیں ہیں کہ ہم کسی علمی بحث کو اپنے ذہن میں پہلے سے ہی قائم رائے کے مطابق ڈھالیں' کسی بے جا جانب داری یا تعصب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے' کیونکہ بعض لوگ اپنے معروف مذہب یا رائے کی طرف داری کرتے ہوئے بعض مسائل بیان کرتے ہیں اور وہ ان کو اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں۔
کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی علمی بحث کی تحقیق کرتے ہوئے اپنی ذاتی متعصبانہ رائے کو پیش نظر رکھے اور کتاب و سنت کو چھوڑ دے بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس اور فکر پر کتاب و سنت کے علاوہ کسی چیز کو اثر انداز نہ ہونے دے' اور جب اس نہج پر تحقیق کے نتیجے میں جو کچھ سامنے آئے' اس کو صحیح سمجھتے ہوئے اختیار کر لینا چاہیے خواہ کوئی اس کو ناپسند کرے یا کسی پر وہ ناگوار گزرے۔
اس کتاب میں جب میں نے متعدد مسائل پر بحث کی تو اس میں بعض لوگوں کی میری طرف سے مخالفت ہوئی' لیکن اللہ شاہد ہے کہ یہ کام میں نے محض اُن لوگوں کی مخالفت کی چاہت میں نہیں کیا بلکہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول پر سختی سے عمل کی چاہت میں ایسا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہم نے جو مذکورہ بالا عمومی موقف ذکر کیا اس میں سے ذکر کرنے والوں کی ایک حالت مستثنیٰ ہے جس کو حقیقی طور پر وجد کہتے ہیں یعنی ذکر کے دوران یہ کیفیت خودبخود طاری ہو جاتی ہے کہ جس میں انسان اپنے شعور اور حواس پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ ذکر کے دوران طاری ہونے والی اس کیفیت میں انسان مکلف نہیں رہتا یعنی یہ مغلوبی کی کیفیت ہے جس پر حرمت وکراہت کا کوئی حکم لاگو نہیں ہوتا۔

یہی کیفیت علامہ عز بن عبدالسلام پر بھی ایک دفعہ طاری ہوئی کہ وہ ذکر کے دوران اچھلنے لگے تو چونکہ اس کیفیت میں اختیار اور ارادہ شامل نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے قصد اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہوا۔ شاید میں کسی حکم یا کسی مسئلہ کا نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی کروں لیکن کتاب وسنت پر التزام اس خطا سے بچالیتا ہے۔

اب اس مسئلہ میں جو میں بحث کر رہا ہوں اس میں بھی بعض لوگوں کے ساتھ میری موافقت ہوئی ہے جب کہ مسلمان کثیر عوام اور صوفیاء سے میرا اختلاف ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ میں بھی میری خواہش نہیں تھی کہ میں خواہ مخواہ ان کی مخالفت کروں یا ان پر تنقید کروں بلکہ اس میں میری خاص رغبت اور چاہت یہ تھی کہ میں کتاب وسنت کے مطابق صحیح تحقیق کروں باوجود اس کے کہ میں ان بزرگوں کی قدر کرتا ہوں اور ان کی نیت کی درستگی پر بھی مجھے یقین ہے لیکن مخلص ان کی قدر اور ان کی نیت کی درستگی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ نصوص وقواعد سے تجاوز کیا جائے۔ اگر مسلمان اس میزان اور معیار کے راستے پر چل کر اس حق کی تلاش کریں جس کی اتباع لازمی ہے تو ان کے مختلف گروہوں کے درمیان رائے اور اجتہاد کا اختلاف تو ہوگا لیکن ان کے درمیان جھگڑے اور آویزشیں نہیں ہوں گی لیکن یہ تعصب اور غلو ہی ہے جس نے مسلمانوں کو ان پستیوں میں دھکیل دیا ہے آج جن میں ہم ان کو دیکھ رہے ہیں۔

صوفیاء اپنے بارے میں کی جانے والی دوسروں کی مخالفت کو انتہا پسندی اور غلو خیال کرتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے بارے میں نہیں سوچا کہ وہ خود کس حد تک غلو اور بدعت کا شکار ہیں جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں کیا یہی وہ حق ہے جو ہونا چاہیے؟ بے شک کسی معاملے میں بھی غلو کے نتیجے میں دوسرا غلو پیدا ہوتا ہے جو شخص اللہ کے دین اور اس کے رسول کے طریقہ کی حمایت و حفاظت چاہتا ہے اسے ہر قسم کے غلو اختراع اور بدعت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے ایک دوسرے کے خلاف غلو اختیار کرنے سے بچنے کا یہی بہتر علاج ہے۔

رادہ سے ایسا کیونکر کرتے جب کہ خود انہوں نے اسے بے عقلی قرار دیا ہے اور اس کی مخالفت کی ہے۔ (دیکھئے: کتاب کف الرعاع ص ۴۸ 'بر حاشیہ الزواجر ابن حجر)

(۳) منافقین کی فطرت اور اسلام کے لیے ان کے خطرناک عزائم

غزوۂ تبوک کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں جتنی اہمیت کے ساتھ ذکر فرمایا ایسا کسی دوسرے غزوہ کے بارے میں ذکر نہیں کیا گیا' سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ نے اس غزوہ کے متعلق تفصیلاً ذکر فرمایا' اس کے بارے میں متعدد آیات بلکہ بہت سے صفحات ہیں۔

ان آیاتِ بیّنات میں سے زیادہ تر آیات میں اللہ تعالیٰ نے جان کی قربانی اور جہاد بالمال کی اہمیت کا ذکر فرمایا ہے' یہی وہ اہم دلیل ہے جو مسلمانوں کے صدقِ اسلام پر دلالت کرتی ہے اور یہ اہم فرق ہے جو مؤمنوں اور منافقوں کے درمیان عملاً نظر آتا ہے' اس لیے مسلمان جو حقیقی مسلمان ہیں' ان پر لازم ہے کہ وہ راحت و آرام کو ترک کر دیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جو سختی اور تکلیف آئے اسے کم تر اور صحیح سمجھیں' جب کہ منافقین اللہ تعالیٰ کے راستے میں مصائب و آلام کا سامنا کرنے کی بجائے عذر گھڑتے ہیں اور سستی و کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

غزوۂ تبوک کے واقعہ کے حوالے سے یہ سبق ملتا ہے کہ منافقین کا مسلمانوں کے بارے میں طرزِ عمل ہر دور میں خطرناک ہی ہے' کیونکہ منافقین اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کبھی بھی مخلص نہیں ہو سکتے' اور ہر زمانے کے مسلمانوں پر منافقوں کے نفاق کی خطرناکی ظاہر کر دی ہے' اور واضح کر دیا کہ دینِ اسلام ایک دعویٰ ہے جس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد اور مصائب و آلام کو جھیل کر کی جاتی ہے' یہاں تک کہ صادق اور کاذب میں فرق واضح ہو جائے اور مؤمنین کا ایمان' منافقین کی منافقت کے مقابلے میں روزِ روشن کی طرح عیاں اور واضح ہو۔ غزوۂ تبوک ہمارے سامنے اس قرآنی درس کا روشن نمونہ اور بنیاد ہے کہ جس کے ذریعے مسلمانوں کو آزمایا گیا تو اُس امتحان میں کامیابی مسلمانوں کو ہی حاصل ہوئی اور ان کا ایمان نکھر کر سامنے آ گیا اور منافقین کی منافقت بھی واضح ہو گئی' منافقین کی اسلام دشمنی کھل کر سامنے آ گئی اور ان کو مسلمانوں سے چھانٹ کر بالکل الگ کر دیا' اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے پے در پے ایسی آیات نازل ہوئیں جن میں منافقین کے دجل و فریب اور

خفیہ منصوبوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا تاکہ مسلمان ان منافقین سے ہر زمانے اور ہر جگہ الگ رہیں اور خبردار رہیں، اور ان کے شر سے بچتے رہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ○ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ○ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخَالِفِيْنَ○ (التوبہ: ۸۱-۸۳)

خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر اللہ کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد اور ناگوار تھا انہیں کہ جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہِ خدا میں اور (دوسروں کو بھی) کہتے: مت نکلو اس سخت گرمی میں فرمائیے: دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے کاش! وہ کچھ سمجھتے○ تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ یہ سزا ہے جو وہ کمایا کرتے تھے○ (اے حبیب!) پھر اگر لے جائے آپ کو اللہ تعالیٰ ان کے کسی گروہ کے پاس پھر وہ اجازت طلب کریں آپ سے جہاد پر نکلنے کی تو آپ فرمائیے: نہیں نکلو گے تم میرے ہمراہ کبھی اور ہرگز جنگ نہیں کرو گے میری معیت میں کسی دشمن سے، تم نے تو (خود) پسند کیا تھا (گھر) بیٹھ رہنا پہلی مرتبہ تو اب بیٹھے رہو پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ○

ان مذکورہ بالا آیاتِ بیّنات سے پہلے والی آیات اور ان کے بعد والی آیات کا اگر مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان تمام آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی منافقت سے خوب پردہ اٹھایا ہے اور ساتھ ساتھ مؤمنوں کو ان کے شر سے بچنے کی تلقین بھی فرمائی ہے، ایسا اس وجہ سے کیا گیا کہ مسلمانوں کو زیادہ تر تکالیف اور ہزیمتیں منافقین کی وجہ

سے ہی اٹھانا پڑتی ہیں' منافقین کی صورت میں آستین کے سانپ ہیں' مسلمانوں کے دشمنوں کو منافقین کے درّوں سے ہی دراندازی کا موقع ملتا ہے' مسلمان اپنے کسی ظاہری دشمن سے اتنا دھوکا نہیں کھاتا جتنا منافقین دھوکہ دیتے ہیں' مسلمانوں کی جماعت میں کمزوری' تفرقہ اور تباہی منافقین کی وجہ سے ہی پیدا کی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ○ (التوبہ:۴۷)

اگر نکلتے تمہارے (لشکر) میں تو نہ زیادہ کرتے تم میں بجز فساد کے اور دوڑ دھوپ کر کے تمہارے درمیان فتنہ پردازی کرتے اور تم میں ان کے جاسوس (اب بھی) موجود ہیں' اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو○

منافقین کی خطرناکی کا سبب یہ ہے کہ یہ اسلام کے خلاف محاذ آرائی' اسلام کا ہی نام لے کر کرتے ہیں' اور اسلام کے نام کا ہی ہتھیار استعمال کر کے دھوکا دیتے ہیں' یہ منافقین اصلاح اور لچک کے نام پر اور شرعی احکام کی روح پر سختی کے ساتھ عمل کے نام پر اسلامی شرعی احکام کی دھجیاں بکھیرتے ہیں' اور ایسے ایسے فتاویٰ جاری کرتے ہیں' جو ان کی اسلام دشمنی کے گہرے منصوبے کی عکاسی کرتے ہیں' اس طرح اسلام میں تفرقہ ڈالنے کی خفیہ سازش کر کے یہ اپنے شیطانی قائدین کو خوش کرنے اور ان کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا اس ساری بحث سے مسلمانوں کو جو سبق حاصل ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے خارجی دشمن سے ایک مرتبہ بچیں اور منافقین جیسے خفیہ دشمن سے ہزار مرتبہ بچنے اور خبردار رہنے کی کوشش کریں' اور یہ کہ ہر دشمن کے ساتھ جنگ کرنے سے قبل اس مارِ آستین کا سر کچلیں' تاکہ منافقت کا خاتمہ ہو۔

(۴) جزیہ اور اہلِ کتاب

غزوۂ تبوک کے اس واقعہ میں اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کے جواز کی دلیل موجود ہے' اہلِ کتاب جزیہ دے کر اپنی جانیں اور اپنے اموال محفوظ کر لیتے ہیں' غزوۂ تبوک کے

واقعات میں آپ نے دیکھا کہ رومی فوجیں' حضور ﷺ کی تبوک آمد سے قبل ہی تتر بتر ہو گئیں' آپ ﷺ نے مجاہدین کے ہمراہ مقامِ تبوک پر پڑاؤ کیا' تو کچھ دنوں کے بعد عرب کے عیسائی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جزیہ دینے پر صلح کر لی' تو آپ ﷺ نے ان کے لیے ایک دستاویز تحریر فرمادی۔

جزیہ ایک مالی ٹیکس ہے جو اہلِ کتاب کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو مسلمانوں کے ہاں زکوٰۃ کی ہے' ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جزیہ محض وقتی طور پر قضاء کی بنیاد پر لاگو کیا جاتا ہے جب کہ زکوٰۃ کی مشروعیت کی بنیاد مذہب اور قضاء دونوں پر ہے۔

جزیہ دے کر اسلامی حکومت کو تسلیم کرنے والے بھی اسلامی معاشرے میں قضائی حکم کے تحت داخل ہوتے ہیں' اگرچہ وہ اسلام قبول نہیں کرتے (لیکن اسلامی حکومت ان کے حقوق کا ہر طرح سے تحفظ کرتی ہے) اسی لیے ان جزیہ دینے والوں پر یہ ضابطۂ اخلاق لاگو ہوتا ہے کہ وہ کھلے عام دینِ اسلام کے احکام میں سے کسی چیز کی عملاً یا قولاً مخالفت نہیں کریں گے سوائے اس چیز کے کہ جو ان کے دعویٰ کے مطابق اس کے برخلاف ان کے مذہب میں جائز سمجھی جاتی ہو' مثلاً شراب نوشی وغیرہ۔ جزیہ دینے کے اعتبار سے اہلِ کتاب کے درمیان اور کفار و مشرکین کے درمیان اس وجہ سے نمایاں فرق ہے کہ اہلِ کتاب اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بظاہر اسلامی معاشرے میں مسلمانوں کی مانند رہ سکتے ہیں' اس میں کوئی واضح فرق نہیں کیونکہ اہلِ کتاب کے اکثر احکام اور دینِ اسلام کے اکثر احکام باہمی مماثلت رکھتے ہیں لیکن اہلِ کفر و شرک اور ملاحدۃ کے طور اطوار اور کردار میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی قدر مشترک نہیں' کیونکہ الحاد اور بت پرستی کی فکر کا اسلامی احکام و نظام سے دُور کا بھی کوئی تعلق ممکن نہیں' اس لیے کہ اسلام اور شرک کے درمیان گہری بنیادوں پر اختلاف اور تناکر پایا جاتا ہے' اور کسی صورت ہم آہنگی کا امکان نہیں۔

(۵) غزوۂ تبوک کے سفر کے دوران جب حضور ﷺ قومِ ثمود کی بستیوں پر سے گزرے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو قومِ ثمود کی بستیوں اور تباہ شدہ گھروں میں داخل ہونے سے منع فرمایا کیونکہ ان بستی والوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے باعث تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس ہدایتِ نبوی سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کوئی بھی مسلمان جب ان قوموں کے علاقوں میں جائے تو

ان تباہ شدہ بستیوں کی حالت کو دیکھ کر ان کے انجام میں غور و فکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور جملہ مسلمانوں کے لیے خیر و عافیت اور رحمت کی دعا کرے' کیونکہ یہ وہ جگہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے غیض و غضب کا مظہر ہیں' ان بستیوں کے کھنڈرات پر اُس غضب کے آثار رقم ہیں' اور یہ عبرت کا نشان زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تا قیامت باقی رہے گا' بے شک اللہ تعالیٰ نے ان آثار کو زمین میں اب تک باقی رکھا ہوا ہے تا کہ ان سے اہل عقل و بصیرت' عبرت حاصل کریں' جس طرح قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر اس بات کا ذکر فرمایا اور اہلِ عقل و دانش کو اس میں غور و فکر کرنے اور عبرت پکڑنے کی دعوت دی' تو پھر یہ کتنی بڑی غلطی ہو گی کہ انسان ان عبرت کے مقامات پر سے سُستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقیقت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے گزر جائے' اور ان پرانی بستیوں اور عمارتوں کے ظاہری نقش و نگار' شکل و صورت اور منظر کو دیکھنے پر ہی اکتفاء کرے اور اس سے عبرت حاصل نہ کرے۔

زمین میں عبرت کی ایسی بے شمار جگہیں ہیں' جن کی تباہی و بربادی زبانِ حال سے ہر انسان کو یہ پیغام سنا رہی ہوتی ہے:

اعتبروا یا اولی الابصار. اے آنکھیں رکھنے والو! عبرت حاصل کرو۔

لیکن انسان اُن کی اس آہ و فغاں پر کان دھرے بغیر ان کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے اور اپنے دل میں ڈالے جانے والے شیطانی خیالات پر ہی عمل کرتے ہوئے ان عمارات اور بستیوں کو ہر دیکھنے والا انسان' صرف ان کے فنِ تعمیر' نقش و نگار اور تاریخی و اثری قدر و قیمت پر دھیان دیتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والا سبق اور درس پلے نہیں باندھتا!

(۶) یہاں پر یہ بات بھی ہمارے لیے اہم ہے کہ ہم اس میں غور کریں کہ رسول اللہ ﷺ کا منافقین کے معاملات نمٹانے اور اپنے مخلص' مؤمن صحابہ کے معاملات نمٹانے کی تدبیر میں کیوں فرق تھا؟

جیسا کہ پیچھے گزر چکا کہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے کثیر منافقین جب حضور

ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے خودساختہ مختلف عذر بیان کیے تو آپ ﷺ نے سب کی ظاہری معذرتوں کو قبول فرمایا اور ان کے دلوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا' لیکن وہ چند مخلص مؤمنین جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے جب یہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے نہ کوئی من گھڑت عذر پیش کیا اور نہ ہی کوئی جھوٹ بولا بلکہ اس غزوہ میں شرکت نہ کرنے کی صحیح صحیح بات عرض کر دی اور پھر ان مخلص' مؤمن صحابہ نے بھی عفو و درگزر اور معافی کی درخواست کی لیکن ان کو معاف نہ کیا گیا بلکہ سزا دی گئی' اور آپ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان پر کتنی سخت سزا لاگو کی گئی!

اس کی کیا وجہ تھی؟ آپ ﷺ نے منافقین کے ساتھ نرمی اور معافی کا رویہ اور سچے مخلص مسلمانوں کے ساتھ سزا اور سختی کا رویہ کیوں اختیار فرمایا؟

جواب: اس موقع پر ان مخلص مؤمنین کے ساتھ جو شدت اور سختی اختیار کی گئی' یہ ان کے شرف اور ان کی عزت افزائی کا مظہر تھا' منافقین اس شرف اور عزت کے قابل نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کی توبہ اور ان کی معافی کے متعلق آیات نازل فرما کر ان کی عزت افزائی فرمائی' لیکن منافقین کیسے اس عزت کے قابل ہو سکتے تھے؟

منافقین کے بارے میں تو یہ طے ہو چکا تھا کہ یہ جس حال میں بھی رہیں' یہ کافر ہی ہیں اور دنیا کی کوئی چیز ان کو قیامت کے روز جہنم کے نچلے گھڑے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی' کیونکہ یہ اللہ عزوجل کا فیصلہ ہے کہ ہم ان کی ظاہری حالت کی بناء پر ان کو چھوڑ دیں اور دنیوی احکام کا انطباق ان کے ظاہر کے مطابق ہی کریں' تو جب ہم ان کے ساتھ ظاہری احکام اور معاملات روا رکھتے ہیں جس طرح کہ وہ ہمارے سامنے اپنے احوال اور عقائد کا ظاہر پیش کرتے ہیں تو ان عذروں کے باطن اور ان کے اقوال کی حقیقت جاننے کی کوشش کیوں کی جائے اور ان کی جھوٹی باتوں پر انہیں دنیا میں کیوں سزا دی جائے؟

ابن قیم لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے جرائم کی سزاؤں میں اسی طرح عمل فرماتا ہے' وہ اپنے اُس مؤمن بندے کی تھوڑی سی لغزش اور غلطی پر تادیب فرماتا ہے جس سے وہ محبت فرماتا ہے اور اپنے ہاں جس کو عزت عطا فرماتا ہے' تاکہ آئندہ وہ بندۂ مؤمن ہر لحہ خبردار اور چوکنا رہے اور کوئی لغزش نہ کرے' اس کے برعکس جو بندہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے

دھتکار دیا جائے اور راندۂ درگاہِ خدا ہو جائے تو اُس کے اور اس کے گناہوں کے درمیان ہر رکاوٹ کو ہٹا دیا جاتا ہے' جس وجہ سے وہ جب بھی کوئی گناہ کرتا ہے' وہ سزا کی بجائے اس کے لیے نعمت بن جاتا ہے۔ (زاد المعاد ج ۳ ص ۲۰)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث جو ہم نے نقل کی' اس میں کئی اہم اسباق اور ہدایات ہیں' جن کو ہم نیچے بیان کرتے ہیں:

اوّل: دینی سبب کی بناء پر قطع تعلقی کی مشروعیت

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دینی سبب کی بناء پر کسی شخص سے ترکِ تعلق جائز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک طویل مدت تک کے لیے مسلمانوں کو حضرت کعب اور ان کے دو ساتھیوں سے بات چیت کرنے سے روک دیا تھا۔ ابن قیم کہتے ہیں: اس واقعہ میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو شخص قطع تعلقی کا مستحق ہو' اُس کے سلام کا جواب دینا بھی واجب نہیں۔

(زاد المعاد ج ۳ ص ۲۰)

جیسا کہ حضرت کعب اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میں باہر نکلتا اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شامل ہوتا۔ آپ نماز کے بعد مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو میں آپ ﷺ کو سلام کرتا اور پھر میں دل میں کہتا کہ کیا آپ ﷺ نے میرے سلام کے جواب میں ہونٹوں کو حرکت دی ہے یا نہیں؟

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اُس حال میں ان کے سلام کا جواب دینا واجب ہوتا تو آپ ﷺ ضرور جواب دیتے' جسے حضرت کعب سن سکتے۔

دوم: حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی دوسری آزمائش

اس بات کا بھی ذکر ضروری ہے تاکہ ہم سب جان سکیں کہ ایک سچے مسلمان کا ایمان اپنے رب تعالیٰ پر کیسا ہونا چاہیے۔ آپ نے پڑھا کہ اس قطع تعلقی کے دوران غسان کے بادشاہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی طرف ایک خط بھیجا جس میں اس نے حضرت کعب کو لکھا کہ آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیں جنہوں نے آپ سے قطع تعلقی کی ہے اور آپ کو ایذاء دے رہے ہیں' آپ ہمارے پاس تشریف لے آئیں' ہم آپ کی عزت و تکریم کریں گے اور

اپنے وطن میں آپ کو پرسکون رہائش دیں گے۔

یہ خط پڑھ کر حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے کرب و اضطراب میں مزید شدت پیدا ہوئی' لیکن اس آزمائش اور امتحان سے آپ رضی اللہ عنہ کے اپنے رب پر ایمان میں اضافہ ہوا' اخلاص اور اس کے ساتھ بھرپور محبت کا مزید اظہار ہوا۔

ایسے نازک حالات میں کتنے ہی قدم ڈگمگائے اور آج تک ڈگمگا رہے ہیں' یہ پھسلن جو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے سامنے بنائی گئی تھی' یہ امتحان اور آزمائش کے لیے تھی لیکن آپ رضی اللہ عنہ بغیر پھسلے' بغیر ڈگمگائے' بغیر کسی ضعف کے اس کے اوپر سے اپنے اسلام پر مضبوط گرفت رکھے ہوئے کامیابی کے ساتھ گزر گئے اور اس خوش نما جال سے بالکل متاثر نہیں ہوئے اور اس میں نہیں گرے۔

سوم: اللہ تعالیٰ کے لیے سجدۂ شکر بجالانا' جائز ہے

اس پر حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا عمل دلالت کرتا ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہ کو آپ کی توبہ کی قبولیت کی خبر دی گئی تو آپ اُسی وقت شکر کے سجدے میں گر پڑے۔

ابن قیم کہتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی سجدۂ شکر کیا جب مسیلمہ کذاب کے قتل کی خبر آئی' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی سجدۂ شکر کیا جب پستانوں والے شخص کو خوارج کے مقتولین میں مرے ہوئے پایا' رسول اللہ ﷺ نے بھی سجدہ فرمایا جب جبریلِ امین نے آپ کو یہ خوش خبری دی کہ بے شک جو شخص آپ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا' اللہ تعالیٰ اُس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ (زاد المعاد ج ۳ ص ۲۲)

چہارم: نذر ماننے کی صورت میں پورے مال کا صدقہ لازم نہیں

امام زفر کے علاوہ جملہ فقہاءِ احناف کا یہ مؤقف ہے کہ جب کوئی شخص اپنے پورے مال کو مساکین پر صدقہ کرنے کی نذر مان لے تو اس پر صرف ان اموال کا صدقہ لازم ہوگا جن کی زکوٰۃ عائد ہوتی ہے' سارے مال کا صدقہ کرنا لازم نہیں۔ احناف کے پاس اس مؤقف پر متعدد دلائل موجود ہیں' ان دلائل میں سے شاید ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب حضرت کعب نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! میری توبہ قبول ہوئی ہے تو کیا میں اس خوشی میں اپنا سارا مال اللہ اور اس کے رسول کے لیے صدقہ کردوں تو اس کا جواب دیتے ہوئے آپ ﷺ

نے فرمایا:

امسك عليك بعض المال. اپنے مال سے کچھ حصہ روکے رکھو۔

وہ فقہاء جن کا مؤقف یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اپنے پورے مال کو صدقہ کرنے کی نذر مان لی تو اس پر پورا مال ہی صدقہ کرنا لازم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی اس بات میں واضح طور پر نذر کا لفظ نہیں بولا گیا تھا' بلکہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں صرف مشورہ طلب کیا تھا' جس پر آپ ﷺ نے ان کو فرمایا کہ بعض مال کو صدقہ کرنا ان کے لیے صحیح ہے۔ (دیکھئے: المبسوط للسرخسی ج ۱۲ ص ۹۳' زاد المعاد لابن القیم ج ۳ ص ۲۳' اور مؤلف کی کتاب: ضوابط المصلحہ ص ۲۴۴)

یہ آخری مؤقف شاید حضرت کعب کی بات اور آپ ﷺ کے جواب کو سمجھنے کے سیاق میں قریب ترین مفہوم ہے۔

۹ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں حج

رسول اللہ ﷺ جب تبوک سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو حج کا ارادہ فرمایا' پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک ابھی تک حج میں مشرکین شریک ہوتے ہیں اور وہ ننگے ہو کر طواف کرتے ہیں' اس لیے اس ماحول میں میں حج کرنا پسند نہیں کرتا یہاں تک کہ یہ عریانی ختم ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس دفعہ حج کے لیے بھیجا اور ان کے پیچھے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (نقیب اسلام بنا کر) بھیجا تاکہ یہ حضرات اس دفعہ حج کریں اور وہاں پر آئے ہوئے مشرکین کو آئندہ سال حج میں شرکت سے منع کریں اور یہ کہ مشرکین کو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے چار ماہ کی مہلت دی جائے' اس مہلت کے بعد پھر مشرکین کے ساتھ جنگ ہوگی۔

امام بخاری نے ''کتاب المغازی'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت

کی ہے کہ بے شک نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس حج میں امیر بنا کر بھیجا تھا، جو حجۃ الوداع سے پہلے کیا گیا تھا، انہوں نے قربانی کے دن لوگوں میں یہ اعلان کر دیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی شخص ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا۔

محمد بن کعب القرظی وغیرہ نے یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ۹ ہجری کے حج میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حج کا امیر بنا کر بھیجا اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو سورۂ براءۃ کی تیس یا چالیس آیات دے کر (نقیب اسلام بنا کر) بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آیات وہاں لوگوں کو پڑھ کر سنائیں ان میں مشرکین کو چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی تاکہ اس دوران وہ زمین میں پھیل جائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آیات بینات یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) کو ان لوگوں پر پڑھیں اور ان کو جو چار ماہ کی معینہ مدت کی مہلت دی گئی وہ آخری بیس دن ذوالحجہ کے، محرم، صفر، ربیع الاول اور ربیع الثانی کی دس تاریخ تک تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان مشرکین کے مختلف گروہوں میں جا کر اور ان کے گھروں میں جا کر یہ آیات ان کو سنائیں اور فرمایا: آج کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ ہی ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف کرے گا۔

امام احمد نے محرز بن ابوہریرہ سے اور انہوں نے اپنے باپ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ کی طرف سورۂ براءۃ کی آیات دے کر بھیجا تو میں ان کے ساتھ تھا۔ حضرت محرز نے اپنے باپ حضرت ابوہریرہ سے پوچھا کہ آپ وہاں کیا اعلان کرتے رہے؟ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: وہاں ہم یہ منادی کرتے رہے کہ جنت میں صرف مؤمن نفوس ہی داخل ہوں گے اور کوئی شخص بیت اللہ کا ننگے ہو کر طواف نہیں کرے گا اور جن کا رسول اللہ ﷺ کے درمیان اگر کوئی معاہدہ ہے تو اس کی مدت صرف چار ماہ ہے، جب یہ چار ماہ کی مدت ختم ہو جائے گی تو اللہ اور اس کا رسول ان مشرکین سے بری الذمہ ہیں اور آئندہ سال بیت اللہ کا حج کوئی مشرک نہیں کرے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اتنی زور زور سے یہ منادی کرتا رہا حتیٰ کہ میرا گلا بیٹھ گیا۔

اللہ تعالیٰ کو جو مقصود تھا' اس کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ (التوبہ:۳)

اور اعلان عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں کے لیے بڑے حج کے دن کہ اللہ تعالیٰ بری ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی' اب بھی اگر تم تائب ہو جاؤ تو یہ بہتر ہے تمہارے لیے اور اگر تم منہ پھیرے رہو تو خوب جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو' اور خوش خبری سنا دو کافروں کو دردناک عذاب کی۝

ابن سعد نے روایت کیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حج کا امیر بنایا تو آپ رضی اللہ عنہ اہل مدینہ کے تین سو افراد کے ساتھ نکلے اور آپ رضی اللہ عنہ نے قربانی کے لیے بیس اونٹ بھی ان کے ساتھ روانہ کیے جن کی گردنوں میں قلادہ پڑا ہوا تھا۔

اسباق ونصائح

مشرکین اور حج میں ان کی رسومات

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حجِ بیت اللہ اُن شعائر میں سے ہے جو عربوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ورثے میں ملے' یہ حج دینِ حنیف کی اُن باقیات میں سے تھا' جن پر لوگ آج تک عمل پیرا تھے' لیکن اب اس میں کثیر تعداد میں جاہلیت کی خرابیاں اور شرک کی خرافات درآئی تھیں' یہاں تک کہ اب یہ حج عقیدۂ توحید پر قائم ایک عبادت سے زیادہ شرک کے مظاہر میں سے ایک مظہر بن چکا تھا۔

ابن عائذ نے ذکر کیا ہے کہ مشرکین بھی مسلمانوں کے ساتھ حج کرتے اور مشرکین مسلمانوں کے آڑے آ کر اونچی آواز سے ان کے تلبیہ کے مقابلے میں کہتے: تیرا کوئی شریک نہیں مگر تیرا ایک شریک ہے جس کا تو مالک ہے اور اس کا بھی جس کا وہ مالک ہے' اور

مشرک مرد اپنے کپڑے اتار کر ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے' وہ اس سے مراد بیت اللہ کی تعظیم لیتے! اُن میں سے ایک مشرک کہتا: میں بیت اللہ کا طواف اُس حالت میں کرتا ہوں جس حالت میں میری ماں نے مجھے جنا' اُس وقت میرے جسم پر دنیا کی ایسی کوئی چیز نہیں ہوگی جس میں ظلم کی آمیزش ہو! (دیکھیے: عیون الاثر ابن سید الناس ج ۲ ص ۲۳۱)

یہ قبیح رسومات ۹ ہجری کے آخر تک رہیں' اس حج کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ پیغام سب مشرکین کو دیا کہ آئندہ کوئی مشرک حج کرنے نہیں آئے گا اور مسجد حرام کو ان پلیدیوں سے پاک کر دیا جائے' اور ان خرافات کو ہمیشہ کے لیے یہاں سے ختم کر دیا جائے۔

جنگ کے اعلان کے ساتھ معاہدہ کی تنسیخ

یہاں پر ایک بات واضح کرنا ضروری ہے کہ مشرکین کی دو اقسام تھیں' جیسے کہ محمد بن اسحاق اور دیگر اصحابِ سیر نے لکھا' مشرکین کی اُن دو اقسام میں سے ایک قسم وہ تھی جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چار ماہ سے کم مدت کا معاہدہ تھا' اس قسم کے مشرکین کو چار ماہ کی مدت تک مہلت دے دی گئی' جب کہ دوسری قسم کے مشرکین جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غیر محدود مدت کا معاہدہ تھا' اس غیر محدود مدت کے معاہدے کو قرآن پاک کی سورۂ براءۃ میں چار ماہ کی مدت تک محدود کر دیا گیا' اور بتا دیا کہ اس مدتِ معینہ کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ ہوگی اور انہیں جہاں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا' سوائے اُن مشرکین کے جو توبہ کر کے اسلام قبول کر لیں۔ اس مدتِ مہلت کی ابتداء یوم عرفہ ۹ ذی الحجہ ۹ ہجری سے ہوئی اور ۱۰ ربیع الثانی ۱۰ ہجری کو اس کی تکمیل ہوئی' کہا جاتا ہے کہ کلبی کی رائے یہ ہے کہ چار ماہ کی مدتِ مہلت ان مشرکین کے لیے تھی جن کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چار ماہ سے کم مدت کے معاہدے تھے جب کہ جن مشرکین کے ساتھ اس سے زیادہ مدت کا معاہدہ تھا' اللہ تعالیٰ نے اُس مدتِ معاہدہ کو مکمل کرنے اور اس کی پاسداری کا حکم دیا' اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْــٴًـا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا

بجز ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا' پھر انہوں نے نہ کمی کی تمہارے

عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ○ (التوبہ:۴)

ساتھ ذرہ بھر اور نہ انہوں نے مدد کی تمہارے خلاف کسی کی تو پورا کرو ان سے ان کا معاہدہ ان کی مدت (مقررہ) تک' بے شک اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے پرہیز گاروں کو○

مذکورہ بالا دونوں اقوال میں سے پہلا قول ہی زیادہ صحیح اور واضح ہے کیونکہ اگر کلبی کی رائے تسلیم کر لی جائے تو اس طرح سورۂ براۃ میں کوئی نئی چیز نہیں رہتی بلکہ اس سے تو اُن معاہدوں کی تاکید کا اظہار ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور مشرکین کے درمیان تھے' نہ ہی اُن میں کوئی تغیر و تبدل ہوا اور نہ ہی کوئی نئی چیز آئی' اگر ایسی بات ہوتی تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سورۂ براءۃ کی آیات پڑھ کر مشرکین کو سنانے کا کیا معنی تھا؟ یا ایسی کون سی نئی چیز تھی جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا؟ اس لیے کلبی کی رائے سے قطع نظر پہلے والا موقف صحیح اور درست ہے۔

جہاد کے معنی کی مزید تحقیق

اس بارے میں آپ مزید تاکید اس بات پر ملاحظہ کریں گے کہ شریعتِ اسلامیہ میں جہاد محض دفاعی جنگ ہی کا نام نہیں جیسے مستشرقین تصور کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ان فرامین پر غور کریں کہ جن میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو اور مکہ کے اردگرد رہنے والے نجد اور دیگر علاقوں کے مشرکین کو خبردار کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ○ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ○ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ

یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا' مشرکوں میں سے○ (اے مشرکو!) پس چل پھر لو ملک میں چارہ ماہ اور جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ

اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍO اِلَّا الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْکُمْ شَیْئًا وَّلَمْ یُظَاھِرُوْا عَلَیْکُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْھِمْ عَھْدَھُمْ اِلٰی مُدَّتِھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَO فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَخُذُوْھُمْ وَاحْصُرُوْھُمْ وَاقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌO (التوبہ:۵۔۱)

رسوا کرنے والا ہے کافروں کوO اور اعلان عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں کے لیے بڑے حج کے دن کہ اللہ تعالیٰ بَری ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی' اب بھی اگر تم تائب ہو جاؤ تو یہ بہتر ہے تو خوب جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور خوش خبری سنا دو کافروں کو دردناک عذاب کی بجز ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا' پھر انہوں نے نہ کمی کی تمہارے ساتھ ذرہ بھر اور نہ انہوں نے مدد کی تمہارے خلاف کسی کی تو پورا کرو ان سے ان کا معاہدہ ان کی مدت (مقررہ) تک' بے شک اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے پرہیزگاروں کوO پھر جب گزر جائیں حرمت والے مہینے تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں اور گرفتار کرو انہیں اور گھیرے میں لے لو انہیں اور بیٹھو ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ' پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ' بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہےO

ان قطعی اور واضح آیاتِ بیّنات میں جہاد کے معنی کی وضاحت کے بعد ذہن میں اس تصور کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ جہاد کو دفاعی جنگ کا نام دیا جائے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سورۂ براءۃ نزول کے اعتبار سے قرآن پاک کی آخری

سورتوں میں سے ہے' اس لیے اس کے احکام' جن میں اکثر جہاد کے متعلق ہیں' ہمیشہ باقی اور قائم ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات نے اُن آیات کو منسوخ کر دیا جن میں دفاعی جہاد کا ذکر کیا گیا' لیکن میری رائے ہے کہ ایسا نہیں۔

وہ آیت جو پہلے نازل ہوئی اور جس میں دفاعی جہاد کا ثبوت ملتا ہے' وہ آیت مندرجہ ذیل ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ O (الحج:۳۹)

اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بناء پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہےO

جہاد کا صحیح مفہوم

بے شک جہاد اپنی اصل مشروعیت کے اعتبار سے نہ تو حملہ کرنے کا نام ہے اور نہ ہی دفاعی جنگ ہے بلکہ جہاد کا اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ' صحیح اسلامی معاشرے کا قیام اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حکومت قائم کرنا ہوتا ہے' اب اس مقصد کے حصول کے لیے کوئی سا بھی وسیلہ اور ذریعہ ممکن ہو' اس کا اختیار کرنا واجب ہے۔

کبھی حالات کے پیش نظر باہمی مصالحت' رہنمائی' وعظ و نصیحت اور تعلیم و ارشاد کے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے تو اس صورتِ حال میں انہی مصالحتی کاموں کو جہاد سے تعبیر کیا جائے گا۔

کبھی حالات کے پیش نظر وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ دفاعی جنگ بھی کی جاتی ہے تو اس صورتِ حال میں بھی اس کوشش کو جہاد کا ہی نام دیا جائے گا۔

بعض اوقات خاص حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اقدامی جنگ کی ضرورت ہوتی ہے تو اس صورت میں یہ جہاد کی بہترین صورت ہو گی۔

حالات و واقعات کا صحیح اندازہ اور ذرائع کا صحیح تعین' مسلمانوں کا معتبر' مدبر' صاحب

بصیرت' اللہ و رسول اور مسلمانوں کے ساتھ مخلص حکمران ہی کرے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کے مجوزہ تینوں ذرائع و وسائل جن کا ذکر پیچھے کیا گیا ہے' حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر مشروع ہیں۔ مخلص مسلمان حاکم ان سے میں سے کوئی ذریعہ بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنا سکتا ہے' جہاد کے ان مختلف ذرائع و اسباب میں سے کسی ایک ذریعہ کو اختیار کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ جہاد کا دوسرا ذریعہ منسوخ ہو گیا ہے' بلکہ حالات کے مطابق ہی کوئی ذریعہ اختیار کیا جائے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں کیے گئے' اس حج میں مسلمانوں کے لیے کئی تعلیمات تھیں' جن میں مناسک حج کی راہنمائی' اور ان مناسک کو ادا کرنے کی کیفیت کا بیان ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ یہ حج اُس حجۃ الاسلام اور حجۃ الوداع کی تمہید ہے' جسے اگلے سال حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں ادا کیا جانا ہے۔

مسجدِ ضرار

امام ابنِ کثیر نے حضرت سعید بن جبیر' حضرت قتادہ اور حضرت عروہ وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں قبیلہ خزرج کا ایک شخص تھا جس کا نام ابو عامر راہب تھا۔ جو جاہلیت کے زمانے میں ہی عیسائی ہو گیا تھا' قبیلہ خزرج میں اس کو بڑا اہم مقام حاصل تھا۔

رسول اللہ ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے تشریف لانے کی وجہ سے یہاں مسلمانوں کی تعداد بھی کافی ہو گئی اور اسلام کا بول بالا ہو گیا تو یہ بات ابو عامر کو سخت ناپسند گزری' جس پر وہ کھل کر آپ ﷺ کے ساتھ اپنی عداوت کا اظہار کرنے لگا' پھر وہ مدینہ سے بھاگ نکلا اور مکہ میں جا کر اُس نے قریش مکہ کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کے لیے اُکسایا' پھر جب اُس نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی شہرت اور آپ ﷺ کے ساتھ لوگوں کا الحاق دن بدن بڑھتا جا رہا ہے تو وہ مکہ سے نکلا اور روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس گیا' اُس نے وہاں جا کر رسول اللہ ﷺ کے خلاف تعاون کا مطالبہ کیا' شاہِ روم نے اُس سے اس کا وعدہ کیا اور اس کو انعام و اکرام سے نوازا' پس ابو عامر وہاں کچھ عرصہ ٹھہر گیا اور مدینہ میں موجود منافقین کی جماعت کو اُس نے ایک خط لکھا' جس میں

اُس نے ہرقل کی طرف سے مدد کے وعدے کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے حکم دیا کہ اس کے خط کے ساتھ جو شخص ان کے پاس پہنچے' اس کے لیے ایک محفوظ مرکز تعمیر کر دیں جو اس کی واپسی کے بعد اس کے لیے اور اس کے ہم خیالوں کے لیے ایک پناہ گاہ ہو گا۔

اس خط کے بعد منافقین نے مدینہ منورہ میں مسجدِ قباء کے قریب ایک مسجد کی بنیاد رکھی' منافقین نے اس مسجد کو جلد تعمیر کیا اور مضبوط عمارت کھڑی کر دی حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کے تبوک کی طرف نکلنے سے قبل یہ منافقین آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست پیش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لیے ٹھنڈی راتوں میں نماز کے لیے مسجد بنائی ہے' آپ تشریف لائیں اور ایک مرتبہ اس مسجد میں نماز پڑھا دیں تاکہ اس کی قبولیت اور اثبات کے بارے میں سب کو معلوم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس مسجد میں نماز پڑھنے سے بچا لیا اور آپ ﷺ نے منافقین سے فرمایا: بے شک ہم سفر پر جا رہے ہیں لیکن ان شاء اللہ جب لوٹیں گے (تو دیکھیں گے)' پھر جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک سے فارغ ہو کر واپس مدینہ منورہ تشریف لا رہے تھے تو ابھی ایک دن یا دن کے کچھ حصے کے برابر سفر باقی تھا کہ حضرت جبریلِ امین مسجدِ ضرار کی خبر لے کر آپ ﷺ پر نازل ہوئے اور اس مسجد کے متعلق خبر دی کہ یہ مسجد مسلمانوں کی جماعت میں تفریق ڈالنے اور کفر کرنے کے لیے بنائی گئی ہے' پس آپ ﷺ نے کچھ صحابہ کو وہیں سے مدینہ منورہ روانہ فرمایا' جنہوں نے آپ کے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی اُس مسجد کو منہدم کر دیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۸۸۔ ۳۸۲' ابن ہشام نے بھی اسے اپنی سیرت میں اس کے قریب قریب الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ج ۲ ص ۳۲۲)

اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیات نازل فرمائیں:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا	اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی ہے مسجد
وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا ۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	نقصان پہنچانے کے لیے' کفر کرنے کے
وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	لیے اور پھوٹ ڈالنے کے لیے مؤمنوں کے
مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا	درمیان اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس
الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ O	کے لیے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ (التوبہ: ۱۰۸-۱۰۷)

رسول سے اب تک اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کا اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ صاف جھوٹے ہیں ○ آپ نہ کھڑے ہوں اس میں کبھی البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، پہلے دن سے وہ زیادہ مستحق ہے کہ آپ کھڑے ہوں اس میں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو، اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے ○

مذکورہ بالا آیات میں جو لفظ ''ضِرَارًا'' استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کا معنی یہ ہے کہ منافقین نے یہ مسجد مدینہ میں موجود مسجدِ قبا کو نقصان پہنچانے کے لیے تعمیر کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ. (التوبہ: ۱۰۸)

وہ مسجد جو روزِ اوّل سے ہی تقویٰ پر قائم کی گئی تھی۔

میں ''مسجد'' سے مراد مسجدِ قباء ہے۔

اسباق ونصائح

مسجدِ ضرار کے اس قصے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے خلاف منافقین کی سازش اور چال بازیاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں، اب یہ معاملہ محض ان کے نفاق تک ہی محدود نہ رہ گیا تھا بلکہ اب یہ مسلمانوں کے خلاف گہری سازش کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

اس لیے اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو نظر انداز کرنے یا ان کو مہلت دینے کی بجائے دوسرا مؤقف اختیار فرمایا جس کا الہام اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے وحی کی صورت میں فرما دیا تھا۔

اب جو موقف اختیار کیا گیا' اس کی رو سے منافقین کی حقیقت کو واشگاف کرنے اور ان کے خطرناک عزائم کی قلعی کھولنے کو ہی وقت کا اہم تقاضا سمجھا گیا' اس لیے اس مسجد کو گرا کر اس کو آگ لگا کر خاکستر کرنے کا حکم دیا گیا' کیونکہ منافقین نے اس عمارت کو مسجد کا نام دے کر دراصل مسلمانوں کے خلاف یہ سازشوں کا ہیڈ کوارٹر تعمیر کیا تھا کہ جس میں ان کا نفاق بھی چھپ جائے اور وہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے مذموم منصوبے بھی بناتے رہیں' اس سے قبل منافقین نے مسلمانوں کے خلاف جتنی بھی سازشیں اور منصوبے بنائے' ان کا وقتاً فوقتاً قلع قمع ہوتا رہا اور اب انہوں نے مسلمانوں کے خلاف جس منصوبے کو عملی شکل دینے کی کوشش کی' اس کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا' ان تمام صورتوں کو یک جا کر کے دیکھا جائے تو ہمارے سامنے منافقین کے حق میں شریعتِ اسلامیہ کے مجموعی احکام کی عملی صورت آ جاتی ہے۔

وہ اس طرح کہ اس سے قبل منافقین جو جھوٹ بولتے رہے یا خلافِ توقع جن باتوں کا اظہار ان سے ہوتا رہا' ان سب چیزوں کو ان کے ظاہری دنیوی معاملات سمجھ کر ترک کیا جاتا رہا اور ان کے دلوں کے اسرار و رموز کو یومِ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کے سپرد ہی کیا جاتا رہا' لیکن اب منافقین نے جو مسلمانوں کے خلاف گہری سازش کا پروگرام بنایا' اس پر رنگے ہاتھوں ان کی گرفت کی گئی اور جو انہوں نے سازشوں کی صورت میں عمارت تعمیر کی تھی اس کو منہدم کر دیا گیا۔

ان سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے منافقین کے ساتھ مجموعی معاملات کس طرح رہے۔ عمومی علماء اور محققین بھی انہی روایات سے استدلال کرتے ہوئے ان سب باتوں پر متفق ہیں کہ منافقین کے ساتھ ہر دور میں ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے۔

منافقین کی جانب سے برپا کی جانے والی اس سازش کے مراحل اس کی کیفیت اور مسائل پر نگاہ ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ نفاق کی فطرت اور طبیعت ہر دور اور ہر زمانے میں ایک جیسی ہی رہی ہے' منافقین کے اسلام دشمنی کے وسائل و ذرائع میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا' یہ ہمیشہ ہر موقع پر حقیر چال بازی اور ذلت آمیز ذہنیت کے ساتھ گھناؤنی سازش اور بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں' روشنی کے نور میں ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اندھیرے میں انہیں

دکھائی نہیں دیتا۔

یہ دشمنانِ اسلام ہر زمانے میں بیرونی استعمار کے قدموں پر سجدے کرتے ہوئے ہی نظر آتے ہیں تاکہ یہ مسلمانوں کے خلاف بیرونی امداد حاصل کر کے اپنے وطن میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جنگ میں استعمال کریں' ان کے خلاف سازشیں کریں' جب یہ اپنے وطن میں موجود مؤمنوں' مسلمانوں کے سامنے آتے ہیں تو اپنے اسلام کا بناوٹی اظہار کرتے ہوئے مسلمانی کا لبادہ اوڑھ کر اپنی طرف دعوت دینے کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جب ان کو کوئی موقع ہاتھ آ جائے تو دینِ اسلام کی حقانیت کو مسخ کرنا یا اس کے مخلص داعیوں کا خاتمہ کرنے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے اور برملا کہتے ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا فریضہ سرانجام دینے والے وہ خود ہی ہیں اور جن لوگوں کا وہ خاتمہ کر رہے ہیں' وہ امت کے دشمن ہیں جو اس کا استحصال کر رہے ہیں۔

المختصر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسجدِ ضرار کے بارے میں یہ عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ معصیت کی ایسی جگہیں اور عمارات جہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کی خلاف ورزی اور سرکشی کی جائے' ان عمارات کو گرا دینا' جلا دینا یا ان کو ویران کر دینا ضروری ہے' اگرچہ ان عمارات کی اسلام دشمنی کی حقیقت پر نیکی اور اچھائی کا پردہ ڈال کر لوگوں کی نظروں سے چھپایا گیا ہو (جیسے کہ مسجد ضرار بظاہر مسجد تھی لیکن حقیقت میں اسلام دشمنی کا مرکز تھا)۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجدِ ضرار کے معاملہ میں ایسی سختی فرمائی تو پھر فواحش اور منکرات والے اُن مقامات اور عمارات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جہاں پر کھلے عام اور اعلانیہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی جائے؟ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے وہ بستی پوری کی پوری جلا دی جہاں پر شراب کی خرید و فروخت ہوتی تھی' اسی طرح رُوَیشد الثقفی کی شراب کی دوکان بھی نذرِ آتش کروا ڈالی اور اس کو ''فویسق'' کا نام دیا۔

(زاد المعاد لابن القیم ج ۳ ص ۱۷)

یہ وہ باتیں ہیں' جن میں علماء اور فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

وفدِ ثقیف کی بارگاہِ رسالت میں حاضری اور قبولِ اسلام

ابن اسحاق علیہ الرحمۃ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہِ رمضان المبارک میں تبوک سے واپس مدینہ تشریف لائے اور اسی مہینے میں قبیلۂ ثقیف کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

بنو ثقیف نے آپس میں یہ مشورہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اُن میں اپنے اردگرد کے عرب قبائل سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں' اس لیے کہ اُن سب نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اور اسلام قبول کر لیا ہے' لہٰذا انہوں نے اپنے آدمیوں کا ایک وفد کنانہ بن عبد یالیل کی سربراہی میں حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا' جب یہ وفد مدینہ منورہ کے قریب پہنچا تو اس وفد کی ملاقات حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے ہوئی' جن کا تعلق بھی اسی قبیلہ کے ساتھ تھا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ان کا استقبال کیا اور ان کو سکھایا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوتے وقت کیسے سلام کریں؟ لیکن انہوں نے بارگاہ رسالت میں حاضری کے وقت جاہلیت کے طریقہ پر ہی سلام کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس وفدِ ثقیف کو مسجد نبوی میں ہی خیمے لگوا کر اُن کو ٹھہرایا تاکہ یہ لوگ قرآن کی تلاوت سنیں اور لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھیں' یہ وفد چند روز تک وہاں ٹھہرا رہا' اس دوران یہ وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتے اور آپ ﷺ بھی ان کے پاس آتے جاتے رہتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۴)

ابن سعد نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ ہر رات نمازِ عشاء کے بعد ان کے پاس تشریف لاتے' ان کے پاس کھڑے کھڑے ان سے گفتگو فرماتے' حتیٰ کہ آپ ﷺ کھڑے کھڑے تھکاوٹ کے باعث کبھی ایک قدم پر بوجھ ڈالتے اور کبھی دوسرے قدم پر بوجھ ڈالتے۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۸)

موسیٰ بن عقبہ نے اپنی کتاب ''مغازی'' میں روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان بن ابو العاص بھی اُسی وفد میں شامل تھے' وہ اپنے وفد میں سب سے کم عمر تھے' جب وفد کے یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں جاتے تو عثمان بن ابو العاص کو اپنے خیمے میں چھوڑ جاتے' جب وفد کے لوگ دوپہر کے وقت قیلولہ کرنے کے لیے واپس آتے تو عثمان بن ابو العاص چپکے سے نکلتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں چلے جاتے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دین کے بارے میں پوچھتے اور قرآن پاک پڑھنا سیکھتے' عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بار بار باتیں پوچھتے حتیٰ کہ آپ نے دین میں کافی سمجھ حاصل کر لی۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم محوِ استراحت ہوتے تو عثمان بن ابو العاص' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اُن سے دین کا علم حاصل کرتے۔ عثمان بن ابو العاص اپنے اس عمل کو اپنے ساتھیوں سے پوشیدہ رکھتے' حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس وجہ سے عثمان بن ابو العاص سے خوش ہوئے اور اُن سے محبت کرنے لگے۔

آخر کار' دینِ اسلام قبیلۂ ثقیف کے ان افراد کے دلوں میں داخل ہو گیا' لیکن کنانہ بن عبد یا لیل سربراہِ وفد' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھنے لگا: زنا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم لوگوں کو کثرت سے سفر کرنا پڑتا ہے' اس لیے یہ ہماری لیے ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: یہ تم پر حرام ہے' بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۲)

اور بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی بُرا راستہ ہے ۝

پھر ان وفد والوں نے پوچھا: سود کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیونکہ ہماری ساری دولت اسی پر منحصر ہے' حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہارے لیے صرف تمہارے اصل مال ہی ہیں' بے شک اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (البقرہ: ۲۷۸)

اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے' اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو ۝

پھر انہوں نے پوچھا: شراب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیونکہ شراب ہمارے علاقے میں کثرت کے ساتھ کشید کی جاتی ہے اور ہمارا شراب کے بغیر گزارا نہیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام قرار دیا ہے اور پھر حرمت شراب کی آیت تلاوت فرمائی۔ (زاد المعاد ج ۳ ص ۲۸۔۲۶)

ابن اسحاق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس وفد کے ارکان نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ہمیں نماز معاف کر دیں' لیکن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاخیر فی دین بلا صلٰوۃ. نماز کے بغیر کسی دین میں کوئی بھلائی نہیں۔

پھر اس وفد کے افراد علیحدہ ہو کر اس معاملہ میں باہمی مشورہ کرنے لگے اور حاضرِ خدمت ہو کر ساری باتوں کو مان لیا' لیکن اب وہ لوگ یہ سوال کرنے لگے کہ ان کا بت ''لات'' جس کی وہ عبادت کرتے ہیں' اس کو تین سال کے لیے نہ گرایا جائے' رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس بات کا انکار کر دیا' وہ لگاتار ایک ایک سال کم کرتے رہے جب کہ آپ مسلسل انکار کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے علاقے میں پہنچنے کے بعد ایک ماہ تک کی مہلت کا مطالبہ کر دیا' حضور ﷺ نے کسی بھی مدت تک لات کو چھوڑ دینے کا انکار کر دیا۔

ابن اسحاق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ وہ افراد لات کو کچھ مدت کے لیے لگا رہنے کا مطالبہ اس لیے کرتے تھے کہ وہ اپنی قوم کے بے وقوف لوگوں' عورتوں اور بچوں کے شر سے بچنے کا ارادہ رکھتے تھے' اور وہ ناپسند کرتے تھے کہ اس کو گرانے سے کہیں قوم کے افراد بگڑ ہی نہ جائیں' وہ چاہتے تھے کہ جب اسلام ان کے دلوں میں داخل ہو جائے تو پھر اس کو گرا دیں گے' پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ہم تو کبھی بھی بتوں کو نہیں گرائیں گے البتہ ان کے گرانے کی ذمہ داری آپ ہی کے سپرد ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں عنقریب تمہارے ساتھ کسی کو بھیجوں گا جو یہ کام کرے گا۔

پھر انہوں نے واپس جانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت مرحمت فرمائی' ان کو عزت بخشی' آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن ابو العاص کو ان کا امیر مقرر

فرمایا کیونکہ آپ کی نظر میں حضرت عثمان اسلام سیکھنے میں دوسروں سے زیادہ حریص تھے آپ نے مدینہ سے نکلنے سے پہلے قرآنِ پاک کی کئی سورتوں کی تعلیم حاصل کر لی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس وفد کے روانہ ہونے کے بعد ان کے پیچھے پیچھے حضرت خالد بن ولید کی سربراہی میں ایک وفد بھیجا جس میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور ابوسفیان بن حرب بھی تھے۔ ان لوگوں نے ''لات'' کو گرانا شروع کیا تو قبیلہ ثقیف کی عورتیں ننگے سر اپنے گھروں سے باہر نکل آئیں اور اس پر آہ و بکا کرنے لگیں اور غمی کے اشعار پڑھتے ہوئے واویلا کرنے لگیں، جب بھی حضرت مغیرہ بن شعبہ بت پر کلہاڑے کی ضرب لگاتے تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے جاتے:

واھًا لك واھًا لك. افسوس! افسوس! ہائے لات! آہ لات!

(سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۷)

اس سے ان کا مقصد اس بت کا تمسخر اڑانا اور ان عورتوں کی نقل اتارنا تھا، جو اس موقع پر رو پیٹ رہی تھیں۔

ابن سعد اپنی کتاب ''طبقات'' میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: اس طرح ثقیف کے تمام افراد کے دلوں میں اسلام داخل ہو گیا اور عرب میں کوئی قبیلہ یا کسی باپ کی اولاد میں نے ان جیسی نہیں دیکھی کہ جن کا اسلام اتنا راسخ ہو اور اس کے عقائد اتنے شفاف ملاوٹ سے پاک ہوں، جتنے اس قبیلے کے تھے۔

(طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۸)

وفودِ عرب کا پے در پے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنا

ابن اسحاق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب مکہ فتح کر لیا اور تبوک سے فارغ ہو کر واپس آ گئے اور قبیلۂ ثقیف نے بھی آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور بیعت کر لی تو اب ہر طرف سے قبائل عرب کے وفود آنا شروع ہو گئے کیونکہ عرب کے قبائل اسلام قبول کرنے کے متعلق اپنی نظریں قبیلہ قریش پر گاڑے ہوئے تھے، کیونکہ قریش، لوگوں کے امام، بیت اللہ اور حرم کے متولی تھے، یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور وہ عرب کے قائد تھے، پس جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا، قریش نے اطاعت قبول کر لی اور اسلام کو

غلبہ حاصل ہو گیا تو عرب کے لوگ جان گئے کہ اب اُن میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت نہیں' چنانچہ اہلِ عرب اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہونے لگے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ○ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا○ (النصر: ۱-۳)	جب اللہ کی مدد آ پہنچے اور فتح (نصیب ہو جائے)○ اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو کہ وہ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج○ تو (اس وقت) اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کیجئے اور (اپنی امت کے لیے) اس سے مغفرت طلب طلب کیجئے' بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے○

ہم طوالت کی وجہ سے یہاں پر ان وفود کی مزید تفصیل بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے' اس لیے اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

اسباق ونصائح

کیا آپ کو یاد ہے جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے طائف تشریف لے گئے تو اہلِ طائف کے انہی لوگوں نے آپ ﷺ کا کیسے بُرے انداز میں استقبال کیا' اپنے گھروں سے انتہائی بدخلقی اور بدسلوکی کے ساتھ نکالا' اہلِ طائف نے اپنے اوباش لڑکوں کو آپ ﷺ کو پتھر مارنے' ایذاء دینے اور تمسخر اُڑانے کے لیے ان کے پیچھے لگا دیا۔ یہ بنوثقیف ہی تھے جنہوں نے ایسی قبیح حرکت کی' لیکن اب اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی ہے اور یہ دینِ اسلام میں سچے دل سے اطاعت قبول کرتے ہوئے داخل ہو گئے ہیں۔

کیا آپ کو یاد ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ طائف سے مکہ تشریف لا رہے تھے تو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے پوچھا: یارسول اللہ! اہلِ مکہ نے تو آپ کو نکال دیا ہے' اب آپ کیسے وہاں داخل ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا:

یا زید ان اللّٰه جاعل لما تری	اے زید! تمہیں جس بات کا خدشہ

فرجا ومخرجا وان اللّٰہ ناصر دینہ ومظهر نبیه.	ہے بے شک اللہ تعالیٰ اس میں کشادگی اور وسعت فرمانے والا ہے' اور بے شک اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی مدد اور اپنے نبی کو غالب فرمانے والا ہے۔

اب جو کچھ ہوا کہ قبیلۂ ثقیف کے لوگ حاضرِ خدمت ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے' یہ سب کچھ اُس کا مصداق ہے جو بات رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید کو فرمائی۔ یہ اہل طائف' یہ اہلِ مکہ اور عرب کے بے شمار قبائل جن سب کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو یہ سب فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔

آیئے! ذرا اس بات پر غور و فکر کریں کہ رسول اللہ ﷺ جب دعوتِ دین کے لیے طائف تشریف لے گئے' آپ ﷺ گھاٹیوں' وادیوں اور پہاڑی سلسلوں سے گزرتے ہوئے ہر طرح کی مشقت اور تکلیف برداشت کرتے ہوئے طائف تشریف لائے' اس امید پر کہ وہ آپ کا استقبال کریں گے اور آپ کی دعوت پر لبیک کہیں گے' لیکن اس کی بجائے انہوں نے جو ایذاء اور دکھ دیا' وہ بھی آپ نے پڑھا۔

ذرا غور کیجئے! کہ اگر کسی انسان کو اس سے ادنیٰ سی بھی تکلیف کسی سے پہنچی ہو تو وہ ضرور انتقام لینے یا بدلہ لینے کے متعلق سوچتا ہے۔

لیکن کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ کے دل میں ثقیف کے متعلق کوئی ایسی چیز پائی ہے؟

وہ بھی دن یاد کریں! جب رسول اللہ ﷺ نے کئی روز تک طائف کا محاصرہ کرنے کے بعد اپنے صحابہ کو واپسی کا حکم دیا تو آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ثقیف کے بارے میں دعائے ضرر کریں' تو آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے انکار فرما دیا اور اپنے ہاتھ مبارک اُٹھا کر ان کے حق میں یہ دعا کی:

اللهم اهد ثقيفا وات بهم مؤمنين.	اے اللہ! بنو ثقیف کو ہدایت عطا فرما اور ان کو ایمان کی حالت میں میرے پاس لے آ۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس دعا کو قبول فرمالیا' پس ثقیف کا وفد جب مدینہ میں قبولِ اسلام کے لیے آیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر آپ ﷺ کو ان کے آنے کی خوش خبری سنائی کیونکہ ثقیف کی ہدایت اور ان کے اسلام لانے کی خبر پر رسول اللہ ﷺ کے خوش ہونے کو یہ دونوں صحابہ جانتے تھے' پھر یہ صحابہ اس وفد کے استقبال کے لیے نکلے۔

آپ ﷺ نے بھی عزت و اکرام سے ان کا استقبال فرمایا اور مدینہ میں ان کے قیام کے دوران آپ ﷺ اپنا زیادہ تر وقت ان کو تعلیم دینے' رشد و ہدایت اور وعظ و نصیحت کرنے میں صرف فرماتے۔

انہوں نے تو ہمیشہ اپنے بغض و عناد کی بناء پر رسول اللہ ﷺ کو تکالیف اور ایذائیں پہنچانے کا ارادہ کیا' لیکن آپ ﷺ ان کے ساتھ بھلائی' خیر اور دنیا و آخرت میں ان کے لیے سعادت و ہدایت کا ہی ارادہ فرماتے تھے' جب وہ آپ ﷺ کی تکلیف اور مشکل میں خوش ہوئے جب کہ آپ ﷺ ان کے لیے خیر اور اسلام کی نعمت پر ہی خوش ہوئے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ کیا ایسے حسنِ اخلاق کا مظاہرہ ہر اُس انسان کی بشری طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے جو اپنے پسندیدہ اصول یا اپنے اختیار کردہ عقیدے کی دعوت دیتا ہو؟

نہیں! ہرگز نہیں! ہر انسان ایسا نہیں کر سکتا یہ تو صرف نبوت کی ہی طبیعت اور مزاج ہے' یہ اثر ہے اُس مقصد کا جس واحد مقصد اور ہدف کی طرف رسول اللہ ﷺ ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے' وہ یہ کہ آپ کی اس دعوت کا ثمرہ دیکھائی دے اور جب آپ ﷺ اپنے رب سے ملیں تو وہ ان سے راضی ہو' اس لیے اس راستے میں بڑی سے بڑی مشکلات اور مصائب و آلام بھی کم تر اور حقیر ہیں اور اُس وقت کتنی بڑی خوشی اور فرحت نصیب ہوگی' جب بندہ اس عظیم کامیابی کو حاصل کرلے گا اور اُس مقصدِ جلیل کو پالے گا۔

یہ اسلام کی شان ہے جو کسی انسان کے ساتھ بُغض' حسد' کینہ رکھنے اور کسی کو نقصان پہنچانے کا درس نہیں دیتا۔ دینِ اسلام جہاد کا حکم دیتا ہے لیکن کینہ اور بُغض کے بغیر' اسلام قوت کے اظہار کی تعلیم دیتا ہے لیکن تکبر و انانیت کے بغیر' اسلام رحم کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن کمزوری اور ضعف کے بغیر' اسلام محبت کی تعلیم دیتا ہے لیکن صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے

لیے اور اس کے راستے میں۔

وفدِ ثقیف اور اس کے بعد دیگر کئی وفود کا مدینہ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنا' اُس وعدے کی تکمیل ہے جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے ''النصر العزیز'' (زبردست فتح) کی صورت میں فرمایا تھا۔

وفود کے ان واقعات سے ہمیں یہی عبرت حاصل کرنی چاہیے' جب کہ ان واقعات سے حاصل ہونے والے دروس واحکام مندرجہ ذیل ہیں:

اوّل: مشرک کو مسجد میں ٹھہرانے کا جواز' جب وہ ہدایت اور اسلام قبول کرنے کا متمنی ہو

آپ کو معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے وفدِ ثقیف کا استقبال فرمایا اور ان کو مسجد میں ٹھہرایا تاکہ ان کے ساتھ بات چیت ہوتی رہے اور ان کو دین کی تعلیم دی جا سکے' جب کسی مشرک کے لیے یہ جائز ہے تو اہلِ کتاب کے لیے یہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہے' جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کو بھی مسجد میں ٹھہرایا' جب وہ حق بات سننے اور دینِ اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔

امام زرکشی علیہ الرحمۃ نے لکھا: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ بے شک امام رافعی اور امام نووی علیہما الرحمۃ نے مطلقاً کہا ہے کہ کسی مسلمان کی اجازت سے کسی کافر کا سوائے حرم شریف کے دیگر مساجد میں داخل ہونا جائز ہے' اس کی کچھ شرائط اور حدود وقیود ہیں:

پہلی: یہ کہ عقدِ ذمہ میں کسی کافر پر مساجد میں عدمِ دخول کی شرط نہ لگائی گئی ہو' اگر ایسی کوئی شرط پہلے سے لگائی گئی ہو تو دخولِ مسجد کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

دوسری: یہ کہ جس مسلمان نے کسی کافر کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی تو وہ مسلمان مکلف اور اس کا اہل ہو۔

تیسری: یہ کہ اُس کافر کا مسجد میں داخل ہونے کا مقصد قرآنِ پاک سننا ہو' یا علمِ دین حاصل کرنا ہو اور اس سے اُس کافر کے اسلام قبول کرنے کی اُمید کی جارہی ہو یا وہ مسجد کی عمارت کی مرمت یا اسی طرح کے کسی اور کام سے اس میں گیا ہو۔

قاضی ابو علی الفارقی کی بحث کے مطابق یہ فیصلہ سامنے آیا کہ اگر کوئی کافر قرآن پاک

سننے کے لیے یا علم حاصل کرنے کی غرض سے داخل ہوا ہو اور اُس کی طرف سے اسلام قبول کرنے کی کوئی اُمید بھی نہ ہو تو اس کو مسجد میں داخلے سے روکا جائے گا اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ اس کو اس صورت میں مساجد میں داخلے کی اجازت دیں' اسی طرح جب کوئی ایسی صورتِ حال ہو کہ جس سے محسوس ہو رہا ہو کہ یہ کافر مسجد کا استہزاء یا کسی خاص مقصد کے لیے سیاسی تعلقات اور ظاہری دکھلاوے کے لیے یوں کر رہا ہے جیسا کہ آج کل اکثر ایسا ہی ہوتا ہے تو اس صورت میں بھی کفار کا داخلہ مساجد میں ممنوع ہے۔

پس اگر کوئی کافر مسجد میں سونے یا کھانے وغیرہ کی اجازت طلب کرے تو ''روضۃ'' میں اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ایسی صورت میں بھی کسی کافر کو ان کاموں کے لیے بھی مسجد میں داخلے کی اجازت نہیں دینی چاہیے' اگرچہ ظاہری طور پر جواز معلوم ہوتا ہے۔ امام نووی کے علاوہ دیگر ائمہ نے کہا ہے کہ اس صورت میں بھی ان کو اجازت دینا جائز نہیں۔ قاضی فارقی نے لکھا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ کسی کافر کو ریاضی یا زبان وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہوا اور اس میں کوئی خفاء نہیں کہ جن صورتوں میں کافر کو مسجد میں داخلے کی اجازت دی گئی ہے' یہ اُسی صورت میں ہے کہ جب اس کی طرف سے مسجد کو کوئی نقصان پہنچانے یا نجاست پھیلانے یا نمازیوں کی طرف سے اس پر کسی تشویش کا کوئی خدشہ نہ ہو۔ (اعلان الساجد للزرکشی ص ۳۲۱۔۳۱۹)

میرے خیال کے مطابق نمازیوں کی تشویش کے فتنے کا خدشہ اُس خدشہ سے بڑا ہے جو ضرر دخل اندازی کی صورت میں پیدا ہوتا ہے' کیونکہ جب نیم عریاں جسموں کے ساتھ غیر مسلم خواتین مسجد میں داخل ہوں گی تو بڑا فتنہ پیدا ہوگا' جیسے کہ مسجد میں سونے اور کھانے وغیرہ کے لیے کفار کا داخلہ ممنوع ہے' اسی طرح فنِ تعمیر اور مسجد کی عمارت کے نقش و نگار وغیرہ دیکھنے کے لیے بھی کفار کے مسجد میں داخلے کی صورت میں فتنہ پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

دوم: وفود اور امان طلب کرنے والوں کے ساتھ حسنِ معاملہ

وفد اور امان طلب کرنے والے کے درمیان فرق یہ ہے کہ وفد ہمیشہ ایک قوم کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور چند افراد پر مشتمل ہوتا ہے' جب کہ مستأمن (امان طلب کرنے والا) اپنی ذات کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اکیلا ہوتا ہے' جو مسلمانوں کے ممالک میں اپنی جان کی امان طلب

کرتا ہے' تا کہ وہ یہاں رہ کر ان سے علم حاصل کر لے یا دینِ اسلام کے متعلق معلومات حاصل کر لے۔ امان طلب کرنے والے (مستأمن) کے حق میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ' حسنِ معاملہ کیا جائے اور اس کی حفاظت کی جائے اور جب تک یہ امان مانگے اس کو امان دی جائے' اور جب وہ واپس جانا چاہے تو بہ حفاظت اس کے علاقے میں پہنچا دیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ. (التوبہ:۶)

اور اگر کوئی مشرک پناہ طلب کرے آپ سے تو پناہ دیجیے اسے تا کہ وہ سنے اللہ کا کلام' پھر پہنچا دیجیے اسے اس کی امن گاہ میں۔

جہاں تک وفود کا تعلق ہے تو اس حکمِ مذکور کے مطابق مستأمن پر قیاس کرتے ہوئے وفود کے حق میں بھی یہی حکم لاگو ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے وفود کے ساتھ حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے وفدِ ثقیف کو خوش آمدید کہا اور ان کو ٹھہرانے اور ان کے ساتھ حسنِ معاملہ کی صورت میں ان کو کیسے عزت بخشی۔

سوم: لوگوں میں سے کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا امارت کا زیادہ حق دار ہے

اسی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے وفد ثقیف کے امیر کنانہ بن عبد یا لیل کی جگہ حضرت عثمان بن ابی العاص کو کم عمر ہونے کے باوجود اس وفد کا امیر مقرر فرمایا' آپ ﷺ کو ان میں کتاب اللہ کی سمجھ حاصل کرنے کی حرص نے متعجب کیا' مدینہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ جتنا عرصہ ٹھہرے رہے' اس کے دوران علمِ دین کی حرص کی وجہ سے اپنے وفد کے ساتھیوں میں سب سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھنے والے اور سب سے زیادہ دین اسلام کی سمجھ رکھنے والے ہو گئے تھے۔

امامت اور حکمرانی دونوں دینی ذمہ داریاں ہیں' جن کا مقصد اللہ کے حکم کے نفاذ اور اسلامی معاشرے کا قیام ہے' اس لیے دونوں عہدوں کے لیے یہ شرط ضروری ہے کہ جو کتاب

اللہ کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو وہ اس کا مستحق ہے۔

چہارم: بتوں اور مورتیوں کو منہدم کرنا واجب

آپ ﷺ نے قبیلۂ ثقیف کے بت توڑنے کا حکم فرمایا' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بتوں اور مجسموں کا توڑنا واجب ہے۔ بتوں اور مورتیوں کے منہدم کرنے کے واجب ہونے میں یہ شرط نہیں کہ ضرور اُن بتوں یا مورتیوں کی عبادت ہو رہی ہو یا ان کی تعظیم و تقدیس کی جا رہی ہو' بلکہ یہ حکم عام ہے اور ہر حالت میں شامل ہے' دلیل کے عموم کی وجہ سے۔ اس امر کی دلیل یہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جو بت کعبۃ اللہ کے اندر سے نکالے گئے تھے' آپ ﷺ نے ان کے توڑنے کا بھی حکم دیا تھا حالانکہ ان اندر رکھے گئے بتوں کی دوسرے بتوں کی طرح عبادت نہیں کی جاتی تھی۔

جو ہم نے ذکر کیا یہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ مختلف انواع و اشکال کی مورتیاں بنانا اور مجسمے بنانا حرام ہیں' خواہ وہ کسی بھی شکل و صورت کے ہوں' اسی طرح مجسموں کو رکھنا بھی حرام ہے خواہ ان کے جو بھی مقاصد و اسباب ہوں۔

یہاں پر ہم وفد ثقیف کی خبر کے ذکر کرنے پر ہی اکتفاء کرتے ہیں اور دوسرے کثیر وفود جو وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے' ان کے بارے زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی اس مقام پر زیادہ ضرورت نہیں۔

اس کے علاوہ جس بات کا جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ بے شک یہ وفود مجموعی طور پر دو گروہوں پر مشتمل تھے' ایک گروہ مشرکین کا تھا اور دوسرا گروہ اہلِ کتاب کا تھا' جہاں تک مشرکین کا تعلق ہے تو مشرکین کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے عموی افراد کے دلوں میں اسلام داخل ہو گیا اور یہ افراد جب اپنے اپنے قبائل میں پہنچے تو وہ ایمان اور توحید کی شمع لے کر گئے' جب کہ اہلِ کتاب کے اکثر افراد اپنے اپنے دین یہودیت یا نصرانیت پر ہی قائم رہے۔

نجران کے عیسائیوں کا نمائندہ وفد جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھا وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس چند دن رہا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور وحدانیت خداوندی کے بارے میں ان کا آپ ﷺ کے ساتھ باہمی مجادلہ ہوتا رہا' آخر میں حضور ﷺ نے اُن عیسائیوں پر اللہ تعالیٰ کی

یہ آیات تلاوت فرمائیں: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ○ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ○ فَمَنۡ حَآجَّکَ فِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمۡ وَ اَنۡفُسَنَا وَ اَنۡفُسَکُمۡ ۟ ثُمَّ نَبۡتَہِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ ○

(آل عمران: ۵۹-۶۱)

بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے، بنایا اسے مٹی سے پھر فرمایا اسے: ہو جا! تو وہ ہو گیا○ (اے سننے والے!) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے، پس تو نہ ہو جا شک کرنے والوں سے○ پھر وہ شخص جھگڑا کرے آپ سے اس بارے میں اس کے بعد کہ آ گیا آپ کے پاس (یقینی) علم تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ! ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی، پھر بڑی عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں، پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر○

جب عیسائیوں نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی، جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا[1]

حضور ﷺ جب مباہلہ کے لیے تشریف لائے تو حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو آپ ﷺ نے اپنی چادر میں لیا ہوا تھا اور حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر نجران کے عیسائیوں کے وفد کے سربراہ شرحبیل بن وداعہ نے مباہلہ سے انکار کر دیا، اور اُس نے اپنے ساتھیوں کو اس کے انجام سے

[1] مباہلہ: یعنی دونوں فریق بارگاہِ الٰہی میں یہ دعا کریں ان میں سے جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

فرمایا' پھر یہ سب عیسائی آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو تجویز دی کہ اسلام قبول کرنے اور مباہلہ کرنے کی بجائے کسی اور چیز کا حکم دیں تو وہ اسے تسلیم کرلیں گے' پس رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ جزیہ پر مصالحت فرمائی اور ان کے لیے ایک دستاویز لکھ دی' اس دستاویز میں آپ ﷺ نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اس متفقہ جزیہ کو ادا کرتے رہیں اور یہ کہ ان کی طرف سے سرکشی یا خیانت نہ ہوتا کہ ان کا کوئی گرجا گھر نہ گرایا جائے اور یہ کہ ان کے دین میں مداخلت نہ کی جائے جب کہ وہ کوئی نئی بات نہ نکالیں اور سود نہ کھائیں تو انہیں ان کے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔[1]

عدی بن حاتم کے اسلام قبول کرنے کی خبر

عدی بن حاتم پہلے ایک عیسائی تھے اور یہ مشہور سخی' حاتم طائی کے بیٹے تھے' یہ اپنی قوم کے ایک معزز فرد تھے اور اپنی قوم سے عرب کے سرداروں کی طرح' جنگوں سے حاصل ہونے والے مال غنیمت کا چوتھا حصہ ''مرباع'' وصول کرتے تھے۔ عدی بن حاتم نے جب رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور آپ کی دعوت کے بارے میں سنا تو اُنہوں نے آپ کی اس دعوت کو ناپسند کیا اور اپنی قوم کو چھوڑتے ہوئے شام کے عیسائیوں سے جا ملے۔ عدی کہتے ہیں: مجھے اپنے قبیلہ میں رسول اللہ ﷺ کے تذکرے سے زیادہ شام میں رہنا ناپسند گزرا' میں نے سوچا کہ میں ان کے پاس جاتا ہوں' اگر تو وہ بادشاہ ہوئے یا کاذب ہوئے تو مجھے صحیح معلوم ہو جائے گا اور اگر وہ سچے ہوئے تو میں ان پر ایمان لے آؤں گا اور ان کی اتباع کروں گا۔

پس میں وہاں سے نکلا یہاں تک کہ میں مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گیا' چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ وہ مسجد میں ہی تھے' میں نے اُن کو سلام کیا تو آپ نے فرمایا: ''من الرجل؟'' کون آدمی ہے؟ میں نے عرض کیا: عدی بن حاتم! رسول اللہ ﷺ اٹھے اور مجھے لے کر اپنے گھر کی طرف گئے' اللہ کی قسم! کہ آپ مجھے اپنے گھر لے

[1] اس روایت کو حاکم نے اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں تفصیلاً نقل کیا ہے' جزیہ پر مصالحت ہونے کا تذکرہ ابوداؤد نے بھی کتاب الخراج' باب اخذ الجزیۃ میں کیا ہے' نیز نصاریٰ نجران کے وفد کی آمد کی تفصیل کے لیے دیکھیے: تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۳۶۹۔۳۶۸۔

جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک کمزور بوڑھی عورت آپ کو ملی' اُس نے آپ کو رکنے کے لیے کہا' آپ اُس کے لیے کافی دیر تک کھڑے رہے' وہ عورت اپنی حاجت کے بارے میں اُن سے بات کرتی رہی۔ میں نے اپنے دل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ بادشاہ نہیں! پھر آپ ﷺ مجھے لے کر چلے حتیٰ کہ مجھے اپنے گھر کے اندر لے گئے' آپ نے چمڑے کا ایک تکیہ لیا' جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی اور میری طرف بڑھایا' فرمایا: "اجلس علی ھذا" اس پر بیٹھو' میں نے عرض کی: بلکہ آپ اس پر تشریف رکھیں' تو آپ ﷺ نے فرمایا: بلکہ تم اس پر بیٹھو' پس میں اُس پر بیٹھ گیا جب کہ رسول اللہ ﷺ خود زمین پر بیٹھ گئے۔

میں نے اپنے دل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ کسی بادشاہ کا طرزِ عمل نہیں ہے' پھر آپ نے فرمایا: اے عدی بن حاتم! کیا تم اللہ کے سوا کسی معبود کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا: نہیں! پھر فرمایا: کیا تم اللہ سے بڑی کسی چیز کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا: نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم رکوسی نہیں تھے؟ (رکوسی ایسی قوم ہے جن کا دین نصاریٰ اور صابیہ کے درمیان ہوتا ہے)' میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم اپنی قوم سے چوتھا حصہ وصول نہیں کرتے؟ میں نے عرض کیا: ایسے ہی ہے! فرمایا: تیرے دین میں تو یہ حلال نہیں تھا' میں نے عرض کیا: بالکل! پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے عدی! شاید مسلمانوں کی غربت تمہیں اس دین میں داخل ہونے سے روکتی ہے' اللہ کی قسم! عنقریب ان میں اتنا زیادہ مال ہو گا کہ اس کو لینے والا کوئی نہ ہوگا اور شاید تمہیں اس دین میں داخل ہونے سے یہ چیز روکتی ہے کہ تم ان کے دشمنوں کی تعداد زیادہ اور مسلمانوں کی تعداد کم دیکھتے ہو' اللہ کی قسم! عنقریب تم ایک عورت کے بارے میں سنو گے جو قادسیہ سے اپنے اونٹ پر اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے نکلے گی لیکن اسے کوئی خوف نہ ہوگا' شاید تمہیں اس دین میں داخل ہونے سے یہ چیز روکتی ہے کہ تم بادشاہت اور غلبہ ان کے علاوہ کسی اور میں دیکھتے ہو' اللہ کی قسم! وہ وقت قریب ہے کہ بابل کی سرزمین میں واقع سفید محلات ان کے لیے کھول دیئے جائیں گے۔ عدی نے کہا: (یہ سب کچھ سن کر) میں مسلمان ہو گیا۔

عدی نے کہا: میں نے دو باتیں تو پوری ہوتی دیکھیں ہیں' پالکی میں سفر کرتی ہوئی عورت کو بھی محفوظ دیکھا اور میں اُن شاہینوں میں تھا جنہوں نے کسریٰ کے خزانوں پر قبضہ کیا' اللہ کی

قسم! تیسری بات بھی پوری ہو کر رہے گی۔[1]

اسباق ونصائح

عدی بن حاتم کا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنا اُسی عرصہ میں ہوا جب تمام اطراف واکناف سے متعدد وفود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام کے شرف سے مشرف ہوئے' اس لیے ہم عدی کے واقعہ کو بھی انہی کثیر وفود کے واقعات میں ہی شمار کر سکتے ہیں' جنہوں نے بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر ہو کر قبولِ اسلام کا اعلان کیا تھا۔ لیکن ہم عدی کے اس واقعہ کو علیحدہ ذکر کر کے اس کی تفصیل پر غور وفکر کرتے ہوئے کچھ اہم اسباق حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں' جو عقیدۂ اسلامیہ کی بنیاد پر اہم تعبیرات ہیں اور اس میں موجود دقیق نکات ہیں' اسی طرح اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کی عملی تصویر واضح ہوتی ہے' آپ کی شخصیت کا وہ پہلو جو عدی بن حاتم کے سامنے کھل کر واضح ہوا' جو شخصیت سرداری' بادشاہی' جاہ ومنصب کی محبت اور فخر ومباہات کی آلائشوں سے پاک اور منزہ تھی' آپ ﷺ کی شخصیت یہی پیغام دیتی ہوئی دکھائی دیتی تھی کہ بے شک یہ رب العالمین کی طرف سے تمام انسانیت کی طرف بھیجے گئے رسول ہیں' یہی وہ چیز تھی جس کی بنیاد پر عدی کو ہدایت نصیب ہوئی اور وہ آپ پر ایمان لے آیا۔

ہمیں بھی انہی باتوں پر غور کرنا چاہیے' عدی جن باتوں سے متاثر ہوئے اور جن باتوں سے عدی نے نصیحت حاصل کی' ہمیں بھی اُن سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت وعظمت پر ہمارا ایمان ویقین بھی زیادہ مضبوط ہو اور یہ کہ ہمیں اس بات کا بھی علم ہو جائے کہ عالمِ اسلام کے خلاف فکری یلغار کرنے والوں کی تحریروں میں کس قدر مکاری اور بُغض موجود ہے' تاکہ ہم اس زہریلے پروپیگنڈے سے بچ سکیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی تھوڑی دیر اُس حیران کن تصویر کو اپنے سامنے لائیں' جس صورتِ حال کو دیکھ کر عدی' رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور ان کے ایمان لانے کی بنیاد بنی۔

---

[1] اس روایت کو ابن اسحاق اور امام احمد نے اور بغوی نے اپنی معجم میں قریب قریب الفاظ میں نقل کیا ہے' اس کے علاوہ دیکھئے: الاصابہ' حافظ ابن حجر ج ۲ ص ۴۶۱' اور ترتیب مسند احمد ج ۲۱ ص ۱۰۸۔

عدی بن حاتم کہتے ہیں: اللہ کی قسم! آپ ﷺ مجھے گھر لے جا رہے تھے کہ ایک کمزور بوڑھی عورت آپ کو ملی' اس نے آپ کو رکنے کے لیے کہا' آپ اُس کے لیے طویل وقت تک کھڑے رہے' وہ اپنے کام کے بارے میں بات کرتی رہی' میں نے اپنے دل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ تو بادشاہ نہیں ہیں۔

جی ہاں! حکومت کا خواہش مند یا سرداری و دنیوی جاہ و منصب چاہنے والا شخص ایسے موقعوں پر اس رویہ کا مظاہرہ نہیں کر سکتا اور اگر وہ بناوٹی طور پر اور تصنع اختیار کرتے ہوئے ایسا کرے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے نفس کو اس پر مجبور کرے یا اپنی طبیعت کے برخلاف کوئی کام کرے تو اس تصنع کا اظہار بے چینی اور اُف وغیرہ کہنے کی صورت میں ہوتا' لیکن ایسا اس جگہ ہرگز نہیں ہوا! کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی عادت اور طبیعت تو ہمیشہ ہر حال میں ایسی متاثر کن ہی رہتی تھی' آپ ﷺ اپنی مجلس میں کبھی بھی اپنے صحابہ سے ممتاز نہیں ہوتے تھے' آپ ﷺ کی معیشت اور معیارِ زندگی فقراء اور مساکین سے بلند نہیں ہوتا تھا' آپ نے کبھی دسترخوان پر کھانا نہیں کھایا' آپ ﷺ نے کبھی اپنے آپ کو ترجیح نہ دی اور صحابہ کرام جس جدوجہد اور مشقت طلب کام میں مصروف ہوتے' آپ ﷺ نے کبھی بھی اپنے آپ کو الگ تھلگ نہیں رکھا' بلکہ اپنے آپ کو اُنہی کے ساتھ منہمک رکھتے تھے۔ آپ ﷺ اپنی حیاتِ طیبہ میں اسی صفت پر کاربند رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

نبوت و رسالت کے علاوہ کون سی ایسی چیز تھی جو آپ کو اس حال پر قائم رکھے ہوئے تھی' حالانکہ آپ ﷺ ایسے فضائلِ حمیدہ سے مزین تھے کہ اگر ان کو اختیار کرتے تو آپ کا طرزِ زندگی اتنا بلند ہو جاتا کہ کوئی دوسرا ان تک نہ پہنچ سکتا۔

حضرت عدی کہتے ہیں: آپ ﷺ جب مجھے اپنے گھر میں لے گئے تو آپ نے چمڑے کا ایک تکیہ پکڑا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی' یہ تکیہ میری طرف بڑھا دیا اور فرمایا:

اس پر بیٹھو' پس میں اُس پر بیٹھ گیا اور آپ ﷺ خود زمین پر بیٹھ گئے' میں نے اپنے دل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ کسی بادشاہ کا طرزِ عمل نہیں۔

عدی جو اپنی قوم میں ایک بلند مقام رکھتے تھے، شاید وہ اس بات کا تصور کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا گھر بھی اُسی طرح کے تعیشات اور سہولیات کی تصویر ہو گا جو وہ اپنے گھر میں رکھتے تھے لیکن اچانک اُس نے آپ ﷺ کے گھر کو اس کے بالکل برعکس پایا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آپ ﷺ بغیر کسی تکلف و تصنع کے ان کے سامنے چار زانو ہو کر خشک زمین پر تشریف فرما ہیں، اور انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا گھر ایسی کسی چیز میں بھی اُن تعیشات کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا جن کی وہ توقع رکھے ہوئے تھے، کیا ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد کوئی تصور کر سکتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی دعوت کے نتیجے میں بادشاہت، دولت و ثروت یا جاہ و منصب کا حصول چاہتے تھے؟

حضرت عدی اس کے بعد مزید رسول اللہ ﷺ کی حدیثِ طیبہ کی وضاحت کرتے ہیں اور اس حدیثِ طیبہ میں موجود اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق غیب کی خبروں کے بارے میں تذکرہ کرتے ہیں۔

آپ ﷺ نے عدی سے فرمایا: اللہ کی قسم! عنقریب مسلمانوں کے پاس اتنا مال ہو گا کہ اس کو لینے والا کوئی نہ ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے گورنر کو زکوٰۃ کے اموال دے کر افریقہ کے گرد و نواح میں غرباء اور مستحقین میں تقسیم کرنے کے لیے بھیجا، لیکن وہ گورنر جلد ہی واپس آ گیا کہ وہاں پر تو زکوٰۃ لینے والا ملا ہی نہیں، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اُس مالِ زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کیے۔

آپ ﷺ نے عدی کو یہ بھی خبر دی:

کہ عنقریب تم ایک عورت کے بارے میں سنو گے جو قادسیہ سے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے نکلے گی مگر اُسے کوئی خوف نہ ہو گا۔ آپ ﷺ کی یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ اسلام کی وجہ سے امن و امان کی صورتِ حال اس سے کہیں زیادہ اچھی ہو گئی اور سفر میں کسی راہ گیر کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور اپنے ریوڑ پر بھیڑیے کے سوا کسی چیز کا خوف و ڈر نہ رہا۔

آپ ﷺ نے عدی کو فرمایا: اللہ کی قسم! وہ وقت قریب ہے کہ بابل کی سرزمین پر

واقع سفید محلات مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا، بلاشبہ ہم نے اس کے بارے میں ایسے ہی سنا اور ایسا ہی دیکھا، اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں! جس نے وہ وعدہ پورا کر دیا جو اُس نے اپنے رسول ﷺ سے کیا۔

حضرت عدی نے آپ ﷺ کی نبوتِ صادقہ کی جھلک آپ ﷺ کے رہن سہن اور آپ کی حیاتِ طیبہ میں پائی اور یہی جھلک اُنہوں نے آپ ﷺ کے کلام اور بات چیت میں پائی، اور پھر اس کے بعد تاریخی واقعات میں اُن باتوں کی سچائی دیکھی۔ یہی سچائی اور حقیقت عدی کے اسلام لانے کا سبب بنی اور ان کی قوم نے عدی کو جن فخر و مباہات کے رنگ میں رنگ دیا تھا، عدی اُس خول سے بھی باہر آ گئے۔

جب کسی مفکر کی عقل کسی بات پر پوری طرح توجہ دے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو غور و فکر کرنے کی بھی کھلی آزادی دی جائے تو پھر قبولِ حق اور قبولِ ایمان کے راستے میں کوئی تنگی، رکاوٹ باقی نہیں رہ سکتی، لیکن جب فکری آزادی مفقود ہو جائے اور عقلِ سلیم کا تقدس پامال ہو، غیر جانب داری اور شفاف عقل کی جگہ بغض و نفرت اور خواہشِ نفس لے لے تو نہ باطل سے چھٹکارا ممکن ہے اور نہ جہالت کا خاتمہ ممکن ہے، اور نہ ہی اندھی تقلید سے کنارہ کشی ممکن ہے بلکہ اندھے پن کو وہ نعمت خیال کرے گا۔

اللہ رب العالمین نے آیاتِ بیّنات میں ایسے لوگوں کی صفات بیان فرمائی ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ۝ (حٰم السجدہ: ۵)	اور ان (ہٹ دھرموں) نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں، اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے تم اپنا کام کرو، ہم اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۝

لوگوں کو مبادیاتِ اسلام کی تعلیم دینے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا تبلیغی وفود کو بھیجنا

جس طرح اطراف واکناف سے مختلف وفود نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا' اسی طرح آپ ﷺ نے بھی مختلف علاقوں میں خاص کر عرب کے جنوبی علاقوں میں تبلیغی وفود بھیجے' تاکہ یہ مبلغین لوگوں کو اسلام کے اصول و مبادی اور احکام کی تعلیم دیں' کیونکہ جزیرہ نما عرب کی مختلف جہات میں اسلام کا پیغام تو پھیل چکا تھا لیکن اب ان لوگوں کو اس بات کی ضرورت تھی کہ کچھ معلمین' مبلغین اور مرشدین ان کے لیے اسلام کے حقائق کی مزید تشریح کریں تاکہ ان کے دلوں میں اسلام داخل ہونے کے بعد صحیح طریقے سے مضبوط اور پختہ ہو جائے۔

پس رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو نجران کی طرف بھیجا تاکہ یہ وہاں جا کر ان کو اسلام کی دعوت دیں اور ان کو اس کے مبادیات و احکام سے متعارف کرائیں' اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا۔[1]

حضور ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دونوں کو بھی یمن بھیجا' آپ ﷺ نے ان دونوں کو یمن کے ایک ایک علاقے کی طرف بھیجا اور آپ ﷺ نے ان دونوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا اور سختی نہ کرنا' انہیں خوش خبری دینا اور متنفر نہ کرنا اور استطاعت کے مطابق کام کرنا۔ (متفق علیہ)

حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا: بے شک تم عنقریب اہلِ کتاب کی طرف جاؤ گے' جب تم اُن لوگوں کے پاس پہنچو تو انہیں اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں پھر انہیں خبر دینا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں' اگر وہ تمہاری یہ بات بھی

[1] طبقات ابن سعد' سیرت ابن ہشام اور بخاری میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید اور حضرت علی بن ابی طالب دونوں کو یمن کی طرف بھیجا تھا۔ دیکھیے: صحیح البخاری ج ۵ ص ۱۱۰۔

مان لیں تو پھر انہیں یہ بات بتانا کہ اُن پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے' جو ان کے امیروں سے لے کر اُن کے غریبوں میں تقسیم کی جائے گی' اگر وہ اس بات میں بھی تمہارا حکم مان لیں تو تم ان کے مال میں سے چھانٹ کر اچھا مال نہ لینا اور مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ (متفق علیہ)

مسند امام احمد میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ 'معاذ بن جبل کی روانگی کے وقت ان کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے اور ان کو نصیحت کرتے ہوئے مدینہ شہر کے باہر تک تشریف لے گئے' اس حال میں کہ حضرت معاذ بن جبل سواری پر سوار تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کے کجاوے کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے' پھر ارشاد فرمایا: اے معاذ! شاید اس سال کے بعد آئندہ تمہاری مجھ سے ملاقات نہ ہو اور شاید پھر تمہارا گزر میری اس مسجد اور میری قبر پر سے ہو۔

یہ سن کر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ' رسول اللہ ﷺ کے فراق اور جدائی کا تصور کر کے رونے لگے۔ (مسند امام احمد ج ۲۱ ص ۲۱۴)

حضرت معاذ بن جبل' یمن میں رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد تک رہے اور آپ ﷺ نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی' وہ بالکل اسی طرح پوری ہوئی۔

اسباق ونصائح

رسول اللہ ﷺ نے مختلف علاقوں میں لوگوں کو اسلام کے بنیادی احکام کی تعلیم دینے کے لیے جو مبلغین اور قاصدین بھیجے' آپ ﷺ کے اس عمل سے ایک مسلمان کو یہ اہم بات سمجھ آتی ہے کہ دین اسلام کو پھیلانے کی ذمہ داری ہر زمانے کے مسلمانوں کے کندھوں پر لاگو ہوتی ہے اور یہ کام آسانی اور سہولت والا نہیں جیسے کہ آج اکثر لوگ سمجھتے ہیں' بلکہ بھرپور جدوجہد کا متقاضی ہے۔

محض یہی کافی نہیں کہ ہم صرف اپنی زبانوں سے ہی اسلام کے دعوے دار بنیں بلکہ اس کے لیے عملی جدوجہد کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بہت جلیل القدر کام ہے۔

اس کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم بعض چھوٹے موٹے کاموں پر ہی اکتفاء کر لیں' ایسے کام جو اپنی اصل کے اعتبار سے تو بڑے اہم تھے لیکن ہماری زندگی میں ان کی حیثیت رسوم و

روایات کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی طرح یہ بھی کافی نہیں ہے کہ ہم اسلام کو اپنی ذات تک محدود رکھیں اور دوسروں کے لیے اس کے دروازے بند کر لیں۔

اسلام کی یہ ذمہ داری مسلمانوں کے کندھوں سے اُس وقت تک نہیں اُٹھ سکتی جب تک کہ مسلمان اس کی بھرپور کوشش نہ کریں' مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اسلام کی دعوت کو پھیلائیں اور اس کی برکات سے لوگوں کو آگاہ کریں' اور اس سلسلے میں مختلف جہات میں شہروں اور دیہاتوں کا سفر کریں۔

یہ وہ امانت ہے جس کی ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے کندھوں پر ڈالی ہے' اور یہ وہ واجب ہے کہ جس سے کسی زمانے میں بھی چھٹکارا نہیں۔ جملہ علماء اور ائمۂ اربعہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اسلام کی دعوت کا کام ہر مسلمان پر اپنے ملک اور بیرونِ ملک میں کرنا' فرضِ کفایہ ہے' اور مسلمان اپنی اس اہم ذمہ داری سے اُسی وقت عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ وہ اس کام کو باقاعدہ سرانجام دینے کے لیے مبلغین کے گروہ اور جماعتیں تشکیل دیں' مبلغین کی یہ جماعتیں ملک کے مختلف علاقوں میں پھیل جائیں اور لوگوں کو دینِ اسلام کی دعوت دیں' اُن پر ایمان و اسلام کے دلائل و براہین پیش کر کے ان کے ذہنوں سے مختلف دسوسے اور شکوک و شبہات دور کریں۔

اس صورت میں مبلغین کی یہ جماعتیں اور گروہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے کفایت کر سکتے ہیں' لیکن اگر کسی علاقے اور شہر سے کوئی بھی مبلغین کا گروہ دعوت الی اللہ کے کام کے لیے نہ نکلا تو وہ سب اہلِ علاقہ اس فرضِ کفایہ پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے۔

جمہور ائمہ اور فقہاء کے مذہب کے مطابق صحیح یہ ہے کہ اس نہایت اہم واجب کی ذمہ داری صرف مسلمان مردوں پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ حکم عام ہے' یہ ذمہ داری مردوں' عورتوں' آزاد لوگوں اور غلاموں پر یکساں عائد ہوتی ہے' جب تک کہ یہ اسلامی احکام کے مکلف ہیں اور دعوت کے کام پر قدرت رکھتے ہیں' حسب توفیق وسائل اور قدرت کے مطابق یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ (مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۱۱' الاحکام السلطانیۃ للماوردی)

پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو روانگی کے وقت جو نصیحت فرمائی' یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک مبلغ اور

داعی الی اللہ کے لیے لوگوں کی تعلیم و تربیت کے دوران بعض ایسے ضروری آداب ہیں' جن کا اپنانا بہت ضروری ہے۔ اُن آداب میں سے یہ ہے کہ (۱) دورانِ تعلیم و تربیت ایک مبلغ کو شدت اور تنگی کی بجائے آسانی اور تیسیر کو ترجیح دینی چاہیے اور یہ کہ (۲) مبلغ کو ڈرانے دھمکانے کی بجائے زیادہ تر خوش خبری اور بشارت سنانے پر توجہ دینی چاہیے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈرانے دھمکانے کی کیفیت کو نفرت دلانے کا نام دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو ایک تطبیقی مثال سے واضح فرمایا' وہ اس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ وہ سب سے پہلے لوگوں کو شہادتِ توحید اور شہادتِ رسالت کی دعوت دیں' اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو پھر انہیں نماز قائم کرنے کی دعوت دیں' اگر وہ اس کو بھی قبول کر لیں تو پھر انہیں زکوٰۃ ادا کرنے کی دعوت دیں' اس طرح آگے بھی ارشاد فرمایا۔

البتہ آسانی اور خوش خبری کے مظاہر سے شریعت کے کسی مباح اور مشروع احکام کی حدود سے تجاوز نہیں کیا جائے گا' اسی طرح تیسیر یا آسانی پیدا کرنے سے مراد احکامِ شریعت کی تبدیلی نہیں اور نہ ہی احکامِ شریعت میں آسانی کے نام پر شرعی امور کو کھلونا بنانا جائز ہے' اس سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ آسانی کے نام پر گناہ اور معصیت کے کام پر قائم رہنے دیا جائے گا' خواہ وہ کسی بھی درجے کی ہو' اگرچہ جائز تیسیر اور آسانی میں یہ بات داخل ہے کہ اس معصیت کی مذمت بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب طریقہ اختیار کیا جائے۔

دعوت الی اللہ کے آداب میں سے یہ بھی ہے اور یہ امارت و ولایت کے آداب میں سے بھی ہے کہ کسی انسان پر ظلم و زیادتی کرنے سے بچنا چاہیے خاص کر کسی انسان پر ظلم کرتے ہوئے ناحق طریقے سے اس کا مال لینا' یہ ظلم و زیادتی کی خطرناک اور بھیانک قسم ہے' بعض اوقات دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں سے یہ کام سرزد ہو جاتا ہے' جب وہ اپنی ذمہ داریوں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے تصور سے غافل ہو جاتے ہیں اور یہ خیال ان کے ذہن سے نکل جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا ہے' اسی طرح بعض اوقات اقتدار اور حکومت کے عہدیداران کی جانب سے بھی یہ ظلم ہونے لگتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو جب یمن کی طرف

ارسال فرمایا تو اُن پر دو ذمہ داریاں تھیں: (۱) دعوت کی ذمہ داری (۲) امارت اور حاکمیت کی ذمہ داری' اور پھر رسول اللہ ﷺ نے سختی کے ساتھ ان کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بچنے کی تلقین فرمائی' اور ارشاد فرمایا:

اتق دعوة المظلوم فانه ليس بينه وبين الله حجاب.

مظلوم کی بددعا سے بچنا کیونکہ اس کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔

حجۃ الوداع اور آخری خطبہ

امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نو سال تک مدینہ منورہ میں رہے اور حج نہیں کیا' پھر دسویں سال یہ اعلان کروا دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ حج کو جانا چاہتے ہیں' چنانچہ مدینہ منورہ میں کثیر تعداد میں لوگ جمع ہونے لگے اور وہ سب رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنا چاہتے تھے' تاکہ حج کے مناسک میں آپ ﷺ کی اقتداء کریں۔ ذی قعدہ کا مہینہ ختم ہونے میں پانچ دن رہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے[1]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہوئے اور اونٹنی کھڑی ہو گئی تو میں نے تاحدِ نگاہ آپ ﷺ کے آگے دیکھا تو مجھے سوار اور پیادے ہی نظر آ رہے تھے' آپ ﷺ کے دائیں بھی ایسے ہی تھا' آپ ﷺ کے بائیں بھی ایسے ہی تھا اور

[1] راویوں کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ سے کس دن نکلے تھے؟ ابن حزم نے بیان کیا ہے کہ وہ جمعرات کا دن تھا' دیگر راویوں کے نزدیک یہ جمعہ کا دن تھا' اور صحیح یہ ہے جسے ابن سعد نے طبقات میں روایت کیا ہے' وہ ہے شنبہ کا دن' اسی کو ابن حجر نے بھی فتح الباری میں قطعیت سے بیان کیا ہے' جمعرات کو یکم ذی الحجہ تھا' اس اعتبار سے ذی قعدہ کا مہینہ انتیس دن کا تھا' جن لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ذی قعدہ کا مہینہ ختم ہونے میں پانچ دن باقی تھے' تب آپ ﷺ مدینہ سے نکلے تھے۔ ان کے قول کو اس گمان پر محمول کیا گیا ہے کہ مہینہ تمیں دن کا ہوگا۔

آپ ﷺ کے پیچھے بھی ایسے ہی تھا' اور رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تھے اور آپ پر قرآن نازل ہو رہا تھا۔

راویوں کا اس بات پر اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کون سا حج کیا' اہل مدینہ کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے "حجِ افراد" کیا' کچھ راوی یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے "حج قران" کیا' اسی طرح بعض راوی یہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے "حج تمتع" کیا۔

رسول اللہ ﷺ مکہ کی اوپری جانب سے "کداء" کے راستے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے یہاں تک کہ آپ باب بنی شیبہ تک پہنچ گئے' آپ ﷺ کی جب بیت اللہ پر پہلی نگاہ پڑی تو آپ نے یہ دعا مانگی:

اللهم زد هذا البيت تشريفاً وتعظيماً وتكريماً ومهابةً وزد من عظمه ممن حجه واعتمره تشريفاً وتكريماً ومهابةً وتعظيماً وبراً.

اے اللہ! اس گھر کے شرف' عظمت' عزت اور ہیبت میں اضافہ فرما اور اس کا حج و عمرہ کرنے والوں میں سے جس نے اس کی تعظیم کی' اس کے بھی شرف' عزت' ہیبت' بزرگی اور نیکی میں اضافہ فرما۔

(رواہ الطبرانی' وابن سعد)

پھر آپ ﷺ اپنے حج کے لیے چلے' پس آپ ﷺ نے لوگوں کو ان کے ضروری مناسکِ حج کی تعلیم دی اور ان کے لیے حج کا طریقہ بیان فرمایا[1]

پھر رسول اللہ ﷺ نے یومِ عرفہ کو اپنے اردگرد جمع ہونے والے تمام مسلمانوں کو ایک جامع خطبہ ارشاد فرمایا' جس کے الفاظ یہ ہیں:

اے لوگو! میری بات غور سے سنو! کیونکہ میں نہیں جانتا شاید اس سال کے بعد اس جگہ میں تم سے کبھی ملاقات کروں' اے لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر اس طرح حرام ہیں جیسے اس شہر اور اس مہینے میں آج کے دن کی حرمت ہے' سنو! زمانۂ جاہلیت کی ہر چیز میرے ان قدموں کے نیچے پامال ہے' زمانۂ جاہلیت کے ایک دوسرے پر خون پامال ہیں اور سب سے پہلے میں اپنا خون معاف کرتا ہوں' یہ ابن ربیعہ بن حارث کا خون ہے' زمانۂ جاہلیت

[1] دیکھیے: حدیث حجۃ رسول اللہ بروایت جابر' صحیح مسلم ج ۴ ص ۳۷

کے تمام سود منسوخ ہیں اور سب سے پہلے میں حضرت عباس بن عبد المطلب کے سود کو چھوڑتا ہوں، ان کا تمام سود چھوڑ دیا گیا۔

اے لوگو! شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ تمہارے علاقے میں اس کی عبادت کی جائے، لیکن اگر اس کی دوسرے معاملات میں اطاعت کی جائے تو وہ ان اعمال کے ساتھ راضی ہو جائے گا، جن اعمال کو تم حقیر جانتے ہو، اس لیے اپنے دین کے معاملات میں شیطان سے محتاط رہو، اے لوگو! بے شک نسیء (قمری مہینوں کو آگے پیچھے کرنا) کفر میں زیادتی ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کافروں کو گمراہ کرتا ہے، وہ لوگ ایک سال ایک مہینے کو حلال قرار دیتے ہیں اور دوسرے سال اُسی ماہ کو حرام قرار دیتے ہیں تاکہ وہ اُن مہینوں کی گنتی پوری کریں جنہیں اللہ نے حرام کیا ہے، پس اللہ نے جس چیز کو حرام کیا ہوتا ہے، وہ اسے حلال کر دیتے ہیں اور جسے حلال قرار دیا ہوتا ہے، اس کو حرام قرار دیتے ہیں، زمانہ لوٹ کر اُسی حالت پر آ گیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ابتداء میں پیدا فرمایا تھا، سال بارہ مہینوں کا ہے، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، تین پے در پے ہیں جو ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہیں اور چوتھا رجب مضر ہے، جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے۔

تم لوگ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ تم نے ان کو اللہ تعالیٰ کی امان کے ذریعے لیا ہے، تم نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ (نکاح) کے ذریعے ان کی شرم گاہوں کو اپنے اوپر حلال کر لیا ہے، بے شک تمہارا بھی اُن پر حق ہے اور ان کا بھی تمہارے اوپر حق ہے، تمہارا اُن پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کا گھر میں آنا تمہیں ناگوار ہو، [1] اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسی سزا دو جس سے چوٹ نہ لگے، اور ان کا تم پر حق ہے کہ تم معروف طریقہ سے ان کو خوراک اور لباس مہیا کرو۔

اے لوگو! میری بات خوب سمجھ لو! بے شک میں نے تمہیں پیغامِ حق پہنچا دیا، میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اس کو پکڑے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔

---

[1] اس سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کا گھر میں آنا شوہر ناپسند کرتا ہو، ایسے لوگوں کو بیوی گھر میں داخل نہ ہونے دے۔ بستر پر آنے دینا' زنا سے کنایہ نہیں ہے جیسا کہ گمان ہوتا ہے۔

اے لوگو! میری بات غور سے سنو! تم پر اگر کوئی حبشی ناک بریدہ غلام بھی امیر مقرر کیا جائے اور وہ تم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے متعلق لے چلے تو اس کی بات غور سے سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ تمہارے غلام، تمہارے غلام، جو کھانا تم خود کھاتے ہو اس سے اُن کو بھی کھلاؤ اور جو لباس تم خود پہنتے ہو اس سے اُن کو پہناؤ، اگر اُن سے کوئی ایسی غلطی ہو جائے جس کو تم معاف کرنا پسند نہیں کرتے تو اُن کو فروخت کر دو، اے اللہ کے بندو! ان کو سزا نہ دو۔[1]

اے لوگو! میری بات غور سے سنو اور اس کو سمجھو! تمہیں یہ چیز معلوم ہونی چاہیے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے مال سے اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز لے، اگر وہ بخوشی کچھ دے دے تو کوئی حرج نہیں، لوگو! ایک دوسرے پر ہرگز ظلم نہ کرو۔ اے اللہ! کیا میں نے پیغامِ حق پہنچا دیا؟

اے لوگو! عنقریب تم اپنے رب سے ملو گے، اس لیے تم میرے بعد گمراہی کی طرف نہ لوٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

خبردار! جو یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں، اس لیے کہ بسا اوقات جس کو بعد میں یہ پیغام پہنچایا جائے وہ آج سننے والوں سے زیادہ اچھی طرح محفوظ کر لیتا ہو، اور تم سے (بارگاہِ الٰہی میں) میرے بارے میں سوال کیا جائے گا تم کیا جواب دو گے؟ اُن سب نے کہا: ہم گواہی دیں گے کہ بے شک آپ نے پیغامِ حق پہنچا دیا، حقِ رسالت ادا کیا اور امت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھایا، پھر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا! اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا! اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا![2]

پھر نبی اکرم ﷺ عرفات میں ہی رہے، حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا تو حضور ﷺ اپنے جملہ صحابہ کو لے کر مزدلفہ کی طرف روانہ ہوئے، آپ ﷺ اپنے دائیں ہاتھ سے

---

[1] یہ دونوں فقرے ابن سعد نے ''طبقات'' میں نقل کیے ہیں۔

[2] ہم نے خطبہ کا یہ متن صحیح مسلم سے نقل کیا ہے، اس کے علاوہ صحیح بخاری، سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد میں بعض جگہوں پر معمولی اضافے منقول ہیں۔

لوگوں کو اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے تھے:

ایھا الناس' السکینۃ السکینۃ. اے لوگو! دھکم پیل نہ کرو بلکہ سکون سے' اطمینان سے چلو۔

مزدلفہ میں پہنچ کر حضور ﷺ نے تاخیر سے مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے پڑھیں اور یہ رات آپ نے مزدلفہ میں ہی گزاری' پھر آپ ﷺ صبح سورج طلوع ہونے سے قبل منیٰ کی طرف روانہ ہوئے' وہاں پہنچ کر آپ ﷺ نے جمرۃ العقبہ پر سات کنکریوں سے رمی جمار کیا' ہر کنکری پھینکتے وقت تکبیر (اللہ اکبر) پڑھتے' پھر آپ ﷺ قربان گاہ کی طرف تشریف لے آئے اور یہاں پر تریسٹھ (۶۳) اونٹوں کو آپ ﷺ نے دستِ مبارک سے ذبح کیا اور چونکہ آپ ﷺ اپنے ہمراہ سو اونٹ لائے تھے' اس لیے تریسٹھ اونٹ ذبح کرنے کے بعد بقیہ سینتیس (۳۷) اونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائے تو انہوں نے یہ سینتیس اونٹ ذبح کیے۔

پھر ظہر سے پہلے سرکارِ دوعالم ﷺ مکہ مکرمہ کی طرف اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر روانہ ہوئے' یہاں طوافِ افاضہ کیا اور مکہ میں ہی ظہر کی نماز ادا کی۔

اس کے بعد حضور ﷺ بنو عبد المطلب کے پاس تشریف لائے اور وہ زم زم پلانے پر مامور تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اے بنو عبد المطلب! پانی کے ڈول نکالو! اگر مجھے تم پر لوگوں کے غلبے کا ڈر نہ ہوتا تو میں بھی تمہارے ساتھ خود پانی نکالتا۔

پس انہوں نے ایک ڈول بھر کر آبِ زم زم پیش کیا تو آپ ﷺ نے اُس میں سے نوش فرمایا۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۷۴)

پھر رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ واپس روانہ ہوئے۔

اسباق ونصائح

اوّل: حج کے فرض ہونے کا زمانہ اور حضور ﷺ کے حجوں کی تعداد

علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا حجۃ الوداع کے علاوہ بھی کوئی حج کیا یا نہیں؟

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت مدینہ سے قبل تین حج کیے تھے۔

حافظ ابن حجر ''فتح الباری'' میں لکھتے ہیں: یہ بات انصار کے وفود کی تعداد پر مبنی ہے' جو وفود حج کے بعد منیٰ میں عقبہ کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملے' انصار کا وفد پہلی مرتبہ آیا تو انہوں نے اگلے سال آنے کا وعدہ کیا' پھر دوسرے سال آئے تو بیعتِ عقبہ اولی ہوئی' پھر تیسرے سال آئے تو انہوں نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کی (اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے تینوں سال حج کیا)۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۷۴)

بعض ائمہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت سے قبل ہر سال حج کیا کرتے تھے۔

بہر کیف جو بھی صحیح ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ حج کی فرضیت کا حکم ہجرت کے دسویں سال نازل ہوا' اس سے پہلے حج فرض نہیں تھا' اور اس حجۃ الوداع کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی دوسرا حج نہ کیا' اسی لیے اکثر صحابہ حجۃ الوداع کو حجۃ الاسلام (اسلام کا حج) یا حجۃ رسول اللہ (رسول اللہ کا حج) کہتے ہیں۔ اس حج کے تذکرہ والی حدیث کا امام مسلم نے بھی یہی عنوان قائم کیا ہے۔

ہجرت کے دسویں سال میں حج کے فرض ہونے پر کئی دلائل ہیں' جن میں سے ایک یہ ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ وفد عبدالقیس' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا' جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وفد میں تشریف لائے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گزارش کی: یارسول اللہ! ہمیں کسی ایسے واضح حکم کی تلقین فرمائیں جس پر ہم کار بند رہیں اور اپنے پچھلے ساتھیوں کو بھی اس کی تلقین کریں جس کی بناء پر ہم جنت میں داخل ہو جائیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

'امرکم باربع وانھاکم عن اربع. میں تمہیں چار چیزوں کا حکم دیتا ہوں اور چار چیزوں سے تمہیں روکتا ہوں۔

اور پھر ان کے لیے اُن چار احکام کی تعداد یوں بیان فرمائی:

میں تمہیں اللہ پر ایمان لانے' نماز قائم کرنے' زکوٰۃ ادا کرنے' رمضان کے روزے

رکھنے کا حکم دیتا ہوں اور یہ کہ تم مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ ادا کرو۔

اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان باللہ کا حکم ان مذکورہ چار احکام سے الگ ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی بات تو اُن سب کے لیے مشہور و معروف تھی' آپ ﷺ نے ایمان کا دوبارہ ذکر تاکید کے لیے اور ان بقیہ چار احکام کی بنیاد کے طور پر فرمایا تھا' یہ وفد آپ ﷺ کی بارگاہ میں نو ہجری کو آیا تھا۔

اگر اُس وقت حج فرض ہوتا تو آپ ﷺ ضرور حج کو بھی ان مذکورہ بالا چار احکامِ شریعت میں ذکر فرماتے۔

دوم: رسول اللہ ﷺ کے حج کا وسیع مفہوم

رسول اللہ ﷺ کے اس حج مبارک کا مضمون دعوتِ اسلامیہ' آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور اسلامی نظام کے عمومی طریقے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

کیونکہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی نماز' روزے' زکوٰۃ اور عمومی عبادات سے متعلق تعلیم حاصل کر لی تھی' حج کی تعلیم حاصل کرنا باقی رہ گئی تھی' حج کے مناسک اور حج کے شعائر کے اداء کی کیفیت اس سفرِ حج میں مسلمانوں نے سیکھی اور اس حج کے موقع پر موروثی جاہلی دور کی رسوم کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

اس سے قبل عرب مشرکین حج کے موقع پر تالیاں بجاتے' سیٹیاں بجاتے اور ننگے ہو کر طواف کرتے تھے' لیکن اب ان تمام فحش رسومات کا خاتمہ کر دیا گیا اور بیت اللہ کو تمام بتوں اور مورتیوں سے پاک کر دیا گیا تھا' اس لیے اب ضرورت تھی کہ شعائر حج کی ادائیگی کا صحیح طریقہ بتایا جائے۔

حجِ بیت اللہ کی دعوت تو قیامت کے دن تک قائم و دائم رہے گی' کیونکہ یہ دعوت اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام انسانیت کو دی' لیکن دورِ جاہلیت کی خرافات اور بت پرستی کی گمراہیوں نے مناسکِ حج کو باطل رسومات کے رنگ میں رنگ کر کفر و شرک کا مظہر بنا دیا تھا۔ دینِ اسلام نے آ کر مناسکِ حج میں ملی ہوئی کفر و شرک کی میل کچیل کو دھو ڈالا' اس کی رونق اور صفائی نورِ توحید سے لوٹ آئی اور اس کی بنیاد مطلقاً اللہ کی عبودیت کی بنیاد پر قائم ہو گئی۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں میں اعلان کروایا کہ وہ بیت اللہ کی طرف حج کرنے کے لیے جا رہے ہیں، یہی وجہ تھی کہ لوگ ہر بستی اور ہر علاقے میں جوق در جوق اس سفر میں شامل ہوئے تاکہ آپ ﷺ کی اتباع کریں اور حج کے صحیح اعمال سیکھیں تاکہ دورِ جاہلیت کی باقی ماندہ رسومات ختم ہو کر رہ جائیں، آپ ﷺ کے اس حج سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ زمین پر جو اہم کام تھا، وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے اور آپ ﷺ نے پیغامِ حق کی امانت آگے پہنچا دی ہے، اور جزیرۂ عرب کی زمین پر جو توحید کا بیج بویا گیا تھا، اُس کا پھل پک چکا ہے، اسلام پھیل چکا ہے اور ہر جگہ لوگوں کے دل جیتے جا چکے ہیں، رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا بھی خیال تھا۔

اب کثیر تعداد میں لوگ جو اطراف و اکناف میں ہیں، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملاقات کا شوق اور آپ ﷺ کی ہدایت و نصیحت سے استفادہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ مزید تعلیمات اور ہدایات کا استفادہ کریں، آپ ﷺ بھی ان سے ملاقات کا شوق رکھتے تھے، خاص طور پر ایسے افراد کا وہ جمِ غفیر جو اسلام تو قبول کر چکے تھے لیکن ابھی زیارت اور صحبت کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا، جب آپ ﷺ نے حجِ بیت اللہ کا اعلان فرمایا تو ایسے نومسلم افراد کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ آپ ﷺ کی زیارت بھی کریں، ملاقات کا شرف بھی حاصل کریں اور حجِ بیت اللہ کی سعادت سے بھی بہرہ مند ہوں اور میدانِ عرفات کے خطبہ سے مستفید ہوں، یہ ملاقات ایک نبی اور اس کے امتیوں کے درمیان اسلام کے ایک بڑے رکن حج کی ادائیگی کی صورت میں ہو رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ بخوبی اس بات کو جانتا تھا کہ یہ آپ ﷺ کا آخری حج ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر الہام کے ذریعے اپنے حبیب کریم ﷺ کو بھی دے دی تاکہ آپ ﷺ اس ملاقات میں مسلمانوں کو الوداعی نصیحت فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ بھی مسلمانوں کے اس جمِ غفیر سے ملنا چاہتے تھے، جو تئیس (۲۳) سال کی مسلسل جدوجہد کا ثمرہ تھا، تاکہ مختصر طور پر جامع الفاظ میں دینِ اسلام اور اس کے نظام کی تعلیمات، ان کو خلاصہ کے طور پر دی جائیں جس میں حقائق، نصائح اور آپ ﷺ کی اپنی امت کے ساتھ محبت کی نشانیاں موجود ہوں، اور آپ ﷺ ان کے چہروں سے ان کی

بعد میں آنے والی نسلوں کی جھلک دیکھیں جن تک یہ پیغامِ حق نسل در نسل اور زمانہ در زمانہ منتقل ہوتا ہوا پہنچے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے حجۃ الوداع کے یہ چھ مضامین تھے' جن کو رسول اللہ ﷺ نے وادیٔ عرفہ میں یومِ عرفہ کے دن اپنے خطبہ میں ان الفاظ کی صورت میں بیان فرمایا۔

سوم: خطبۃ الوداع کے اہم نکات

حضور ﷺ نے میدانِ عرفات میں کتنے شان دار کلمات ارشاد فرمائے' اس خطبے میں آپ ﷺ نے نسلوں اور تاریخ کو خطاب فرمایا' آپ ﷺ نے پیغامِ حق کی امانت پہنچا دی اور امت کو شان دار نصیحت فرمائی' آپ ﷺ نے دعوت الی اللہ کے راستے میں تئیس سال بغیر کسی سستی اور کاہلی کے بھرپور جدوجہد کی' یہ وقت کتنا دلکش اور بابرکت تھا کہ جب آپ ﷺ کے اردگرد ہزاروں مسلمان جمع تھے' سب کے سب عاجزی وانکساری اور خشوع وخضوع کی تصویر بنے ہوئے تھے' یہی وہ لوگ تھے جو اس سے قبل آپ کے خلاف سازشیں کرتے اور آپ کے خلاف جنگ اور خوب لڑائی کرتے۔ یہ ہزاروں مسلمان تاحدِ نگاہ چاروں اطراف نظر آ رہے تھے اور زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ کر رہے تھے:

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ (المؤمن:۵۱)	بے شک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مؤمنین کی اس دنیوی زندگی میں اور اُس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ (گواہی دینے کے لیے) کھڑے ہوں گے ۝

رسول اللہ ﷺ ان ہزاروں افراد کے چہروں کے پیچھے ان کی آنے والی نسلوں کو ملاحظہ فرما رہے تھے' آپ ﷺ اُس عظیم عالم اسلام کو دیکھ رہے تھے جو مشرق ومغرب تک پھیلا ہوا ہوگا' اس عظیم عالم اسلام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے آپ ﷺ یہ الوداعی خطبہ ارشاد فرماتے ہیں: اے لوگو! میری بات غور سے سنو! میں نہیں جانتا کہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ پر تم سے کبھی ملاقات کروں گا۔

پوری دنیا آپ ﷺ کا فرمان سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھی ۔ پتھر صحراء اور کائنات کی دیگر اشیاء خاموشی سے آپ ﷺ کا الوداعی خطاب سن رہی تھیں' جس ذات بابرکات کا وجودِ مسعود تریسٹھ (۶۳) سال تک دنیا کی خوش بختی کا باعث بنا ہوا تھا وہ آج حکم الٰہی کی تکمیل اور زمین پر ایمان کا پودا لگا کر جدائی اور فراق کا اشارہ دے رہے تھے' اور جامع کلمات کی صورت میں دنیا کے سامنے ان اصول و مبادی کا خلاصہ پیش کر رہے تھے' جن کے ساتھ ان کی بعثت ہوئی تھی اور جن کے لیے انہوں نے جہاد کیا۔

خطبے کی پہلی دفعہ

ان میں سے پہلے پیرے میں کیا ارشاد فرمایا؟

سبحان اللہ! کتنے پر رونق اور شان دار کلمات ہیں! گویا کہ آپ ﷺ اپنی اس نصیحت و ہدایت میں اُن خدشات کا اظہار فرما رہے ہیں کہ آپ ﷺ کو محسوس ہو گیا تھا کہ آپ کی امت کے کچھ افراد گمراہی کے گڑھوں میں گرنے والے ہیں اور یہ کہ ایک زمانہ آئے گا جب یہ لوگ دوسروں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگیں گے اور اس روشنی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں گے جسے آپ ان کے درمیان چھوڑ کر جا رہے ہیں' اسی لیے آپ کے خطاب کی پہلی شق یہ تھی:

اے لوگو! بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو' جس طرح تمہارے لیے یہ حرمت والا دن' یہ مہینہ اور یہ حرمت والا شہر ہیں۔

آپ ﷺ نے اپنی اس نصیحت کو اپنے خطبے کے آخر میں دوسری مرتبہ دہرایا' ہر وقت اس کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت پر زور دیا اور تاکید فرمائی کہ تم جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں' کسی آدمی کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی کوئی چیز لے سوائے اس کے کہ وہ اپنی رضامندی سے دے دے' تم اپنے آپ پر ظلم نہ کرنا' کیا میں نے پیغامِ حق پہنچا دیا ہے؟

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں:

بالکل! یا رسول اللہ ﷺ! اللہ کی قسم! آپ نے پیغامِ حق پہنچا دیا ہے۔

آج ہمارے لیے سب سے بہتر یہی ہے کہ ہمیں آپ کو اس کا جواب یہ دینا چاہیے: جی

ہاں! آپ نے پیغامِ حق پہنچا دیا' اگرچہ ہم نے اس ذمہ داری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھایا لیکن ہم کماحقہٗ دعوت کے اس پیغام کو آگے پہنچانے سے قاصر رہے۔

دوسری دفعہ

یہ محض ایک نصیحت نہ تھی بلکہ یہ ایک قرارداد تھی' آپ ﷺ نے اس کا اعلان تمام لوگوں کے لیے فرمایا' ان کے لیے بھی جو آپ ﷺ کے اردگرد تھے اور اُن کے لیے بھی جو ابھی قیامت تک آنے ہیں۔

اس قرارداد کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

خبردار! زمانۂ جاہلیت کی ہر چیز میرے دونوں قدموں کے نیچے باطل ہے' زمانۂ جاہلیت کے خون معاف ہیں اور زمانۂ جاہلیت کا سود باطل ہے۔

اس فرمانِ عالی شان کے الفاظ اپنے اندر کیا مفہوم رکھتے ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی جملہ عادات واطوار جو احساسِ برتری پر مبنی تھیں' عصبی اور قبائلی رسوم ورواج' زبان اور نسل کی تفریق' جھوٹے فخر ومباہات' غلامی کی لعنت' دوسرے لوگوں کا ناحق مال کھانا اور ہر قسم کے ظلم و جبر' آج سب باطل ہو گئے ہیں اور اپنی موت آپ مر چکے ہیں' آج یہ سب کچھ ایک متعفن مُردے کی مانند ہیں' اب شریعت الٰہیہ نے خرافات کے اس مُردے کو زمین میں دھنسا دیا ہے' آج کے دن سے ان غلط رسومات کا کردار مسلمانوں کی زندگی سے ختم ہو کر قصۂ پارینہ بن چکا ہے' بے شک یہ پلیدی تھی جو ختم ہو گئی' ایک گمراہی تھی جو واپس لوٹ چکی اور ایک اندھیرا تھا جو اب چھٹ چکا ہے۔

اب کون خرافات کے اس گڑے ہوئے متعفن مردے پر سے مٹی ہٹا کر اس کو پھر نکالے گا؟ اب کیا کوئی عقل مند ان پلیدیوں سے دوبارہ ملوث ہو گا؟ کون خوددار ہو گا کہ جن بیڑیوں کو وہ کل تک توڑ چکا ہے' انہیں آج دوبارہ درست کر کے اپنے پیروں میں ڈال لے؟

یہ سب دورِ جاہلیت کی غلط رسومات کی پلیدیاں تھیں' جن کو آپ ﷺ نے اس فرمان کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانیت کی فکری وتہذیبی ترقی کے راستے سے دور ہٹا دیا' اور اعلان فرمایا کہ یہ سب کچھ میرے قدموں تلے پائے مال ہو چکا ہے' تاکہ دنیا والوں کے لیے یہ بات ثابت ہو جائے اور آنے والے زمانے اور سب نسلیں اس کو اپنی سماعتوں میں رقم کر

لیں کہ جو بھی مصلح اور قائد جو فکری ترقی چاہتا ہے' اُس پر یہ ضروری ہوگا کہ اس قدیم دفینے کو دوبارہ نہ نکالے' ورنہ وہ پھر انسانیت کی کشتی کو تاریخ کے قدیم تاریک سمندر میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا' اور یہ اس کی ترقی معکوس ہے' وہ اس وہم کا شکار نہ ہو کہ وہ ترقی کر رہا ہے اور اس کے قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔

تیسری دفعہ

رسول اللہ ﷺ نے اس پیرے میں سال کے بارہ مہینوں کے نام ذکر کر کے زمانے کی مطابقت کا اعلان فرمایا' کیونکہ عرب اس سے قبل دورِ جاہلیت میں اور اسلام کے ابتدائی عرصہ میں سال کے اِن مہینوں کے سلسلے میں من مانی کرتے رہے۔ مجاہد وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ عرب لوگ دورِ جاہلیت میں مسلسل دو سال ایک ہی مہینے میں حج کرتے اور پھر اگلے دو سال دوسرے مہینے میں حج کرتے مثلاً وہ لوگ دو سال ماہِ ذی الحجہ میں حج کرتے' پھر اگلے دو سال ماہِ محرم میں حج کرتے' اسی طرح ہر دو سال کے بعد حج کا مہینہ تبدیل کر لیتے' لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے حج کا فریضہ ادا فرمایا تو اُس سال یہ حج ماہ ذی الحجہ میں تھا' تو آپ ﷺ نے وہیں پر یہ اعلان فرمادیا کہ بے شک زمانہ لوٹ کر اُسی حالت پر آ گیا ہے جس حالت پر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پہلے دن پیدا فرمایا تھا۔

یعنی اب تم مہینوں کے تقدم و تاخر کے ذریعے اپنی من مانی نہ کرتے رہنا' اب آج کے بعد حج کی ادائیگی ہر سال اسی ماہِ ذی الحجہ میں ہی ہوا کرے گی۔

بعض مؤرخین نے یہ ذکر کیا ہے کہ مشرکین بارہ مہینے پندرہ دن کو ایک سال شمار کرتے تھے' اسی وجہ سے ہر سال پندرہ دن کا فرق پڑتا اور حج کبھی ذوالحجہ میں آتا' کبھی محرم میں ہوتا اور کبھی رمضان یا شوال میں' غرضیکہ سال کے ہر مہینے میں لوٹ کر آتا' اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب مشرکین بارہ مہینوں سے زائد جو پندرہ دن شامل کرتے تھے' اس حساب سے ہر سال پندرہ دن کا فرق پڑ جاتا۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو ۹ ہجری میں حج کیا' وہ اس حساب سے ماہِ ذی القعدہ میں واقع ہوا تھا' اور اس سے اگلے سال جب رسول اللہ ﷺ نے فریضۂ حج ادا فرمایا تو اس سال حج ماہِ ذی الحجہ میں ہوا' یہ ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن تھے' جو چاند کے حساب کے بھی موافق تھا' تو یہاں پر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ

آج' سال اور مہینوں کے متعلق پرانا حساب کالعدم ہے اور آج کے دن سے صرف بارہ مہینوں کا ہی سال شمار ہوگا' اس میں مزید دنوں کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

امام قرطبی علیہ الرحمۃ نے لکھا کہ نبی اکرم ﷺ کا جو یہ فرمان ہے کہ بے شک زمانہ لوٹ آیا' اس کا مفہوم یہ ہے کہ حج کا زمانہ اپنے اصل وقت کی طرف لوٹ آیا ہے' جو صحیح وقت اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے وقت ہی متعین فرمایا تھا' یہ اپنی صحیح مشروعیت کے ساتھ ہے جس کا علم گزر چکا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن' امام قرطبی' ج ۸ ص ۱۳۸۔۱۳۷)

چوتھی دفعہ

رسول اللہ ﷺ نے اس میں عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت فرمائی' اور مختصر مگر جامع الفاظ میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے دورِ جاہلیت کے مظالم کو ختم کرنے کی تاکید فرمائی' اور شریعتِ اسلامیہ کے احکام کے مطابق جو کرامتِ انسانیت اور عورتوں کو حقوق دیئے گئے ہیں' ان کی وضاحت فرمائی۔

آپ ﷺ نے عورتوں کے حقوق کو تاکید کے ساتھ بیان فرما کر اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ مسلمان جو دورِ جاہلیت کے عہدِ قریب تک ان جاہلی رسوم و روایات کے پابند رہے ہیں' جن میں عورتوں کے حقوق میں کسی قسم کی کوتاہی یا ان کے حقوق کو صحیح طرح ادا کرنے سے راہِ فرار اختیار کیا جاتا تھا' اور اس کے علاوہ آپ ﷺ کے اس فرمان میں اس بات کا بھی اہتمام تھا کہ ہر دور اور ہر زمانے کے لوگ جان لیں کہ شریعتِ اسلامیہ نے عورتوں کو ایسے طبعی اور فطری حقوق عطا کیے ہیں' جو کرامتِ انسانی اور شرافتِ بشری پر محمول ہیں' اور وہ مختلف وسائل و ذرائع کیا ہیں' جنہیں لوگوں نے اس کی عفت و عصمت کی دھجیاں بکھیرنے کے لیے جائز کر لیا ہے' لیکن اسلام انہیں حرام قرار دیتا ہے؟

پانچویں دفعہ

اس بند میں رسول اللہ ﷺ نے ہر زمانے کے تمام انسانوں کو درپیش مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لیے دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے' اور آپ نے انہی دو چیزوں کو مضبوطی سے تھام لینے میں ہی ہر گمراہی اور ضلالت سے نجات کی ضمانت عطا فرمائی' اور وہ دو چیزیں یہ ہیں: کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان مذکورہ بالا جن دو چیزوں کو تھام لینے کا جو عہد اور ضمان لیا تھا' وہ آنے والی نسلوں میں مسلسل منتقل ہو رہا ہے اور یہ کسی ایک زمانے کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ان دو چیزوں کو تھام لینے میں ہر زمانے کے لوگوں کی بھلائی ہے' اور کسی زمانے کی تہذیب وتمدن اور عرفِ زمانی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کتاب اللہ یا سنتِ رسول کے کسی حکم کو بدل ڈالے یا منسوخ کر دے۔ کوئی تہذیب خواہ کتنی ہی ترقی کر لے اور زمانہ کا عرف کیسا ہی ہو لیکن ان دونوں چیزوں کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔

چھٹی دفعہ

رسول اللہ ﷺ نے اس بند میں حاکم ومحکوم اور خلیفہ ورعیت کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کو بیان فرمایا ہے کہ عوام اور رعیت کو اپنے حاکم اور خلیفہ کی ہر حال میں اطاعت وفرماں برداری کرنی چاہیے' جب تک کہ حاکم کتاب اور سنتِ رسول کے مطابق عمل کرتا رہے' چاہے حاکم کسی قبیلہ' کسی نسل یا کسی علاقے سے بھی تعلق رکھتا ہو' اس کی مکمل اطاعت کی جائے گی لیکن اگر وہ حاکم کتاب اللہ اور سنتِ رسول سے منہ موڑتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا تو اس صورت میں اس کی اطاعت کرنا رعایا پر لازم نہیں ہے' حاکم اور خلیفہ کی اطاعت کی بنیاد کتاب وسنت کے دکھائے ہوئے راستے کی اتباع ہے۔ ایسا صالح حاکم اگرچہ ناک بریدہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو' اس سے ایک بال برابر بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی حیثیت میں فرق نہیں آتا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ہم پر واضح کر دیا کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے مقابلے میں کسی حاکم کو کوئی امتیاز حاصل نہیں' اور کسی کی حکمرانی یا حاکمیت احکامِ اسلامی سے ذرہ برابر بھی بالاتر نہیں۔ حقیقت میں نہ وہ حاکم ہے اور نہ اس کی حاکمیت حقیقی ہے بلکہ مسلمانوں کا حاکم مسلمانوں کی طرف سے اس بات کا امین ہے کہ وہ اُن پر اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ کرے' اگر وہ حاکم ایسا نہیں کرتا تو وہ حقیقت سے صرفِ نظر کر رہا ہے' اسی لیے شریعتِ اسلامیہ میں حکومت یا قانون یا فیصلہ کے معاملات میں مسلمانوں میں کسی طبقہ کو تحفظ یا مراعات حاصل نہیں۔

اپنے اس خطبہ کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے جب یہ محسوس فرمایا کہ آپ ﷺ نے دعوت وتبلیغ کی اس بھاری ذمہ داری کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے' اسلام پھیل چکا ہے' دور

جاہلیت کی یہ گمراہیاں اور شرک کی قباحتیں ختم ہو چکی ہیں اور یہ شریعتِ الہیہ کے احکام جو پہنچا دیئے گئے ہیں اور اب یہ وحی الٰہی جو نازل ہو چکی ہے' جس میں اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو مخاطب فرما کر ارشاد فرماتا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا. (المائدہ:۳)

آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین۔

لیکن آپ ﷺ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ اس بات سے بھی مطمئن ہوں کہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جب آپ ﷺ کی امت سے اس بارے میں پوچھا جائے گا تو وہ کیا جواب دے گی' اس لیے آپ ﷺ نے اپنے اس خطبے کے آخر میں سب لوگوں سے یہ سوال کیا:

انکم ستسألون عنی فما انتم قائلون؟

بے شک تم سب سے جب میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟

تو آپ ﷺ کے اردگرد یہ آوازیں بلند ہوئیں:

نشهد انك قد بلغت' وادیت' ونصحت.

ہم گواہی دیں گے کہ بے شک آپ نے پیغامِ حق پہنچا دیا' حقِ رسالت ادا کر دیا اور امت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔

لوگوں کی یہ بات سن کر آپ ﷺ پوری طرح مطمئن ہو گئے۔

آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی نسبت دی گئی اس عظیم گواہی کی توثیق چاہتے تھے۔

تو آپ ﷺ جب پوری طرح مطمئن ہو گئے تو آپ ﷺ کی چشمانِ مبارک خوشی سے چمکنے لگیں' آپ ﷺ نے آسمان کی طرف اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا' پھر تمام لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

اللھم اشھد' اللھم اشھد' اللھم اشھد۔ اے اللہ! گواہ رہنا! اے اللہ! گواہ رہنا! اے اللہ! گواہ رہنا!

سبحان اللہ! یہ کتنی عظیم سعادت تھی! یہ سعادت رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوئی کہ آپ ﷺ نے اپنی ساری عمر جو اپنے رب عزوجل کی شریعت کو پھیلانے میں صرف کی' اب آپ ﷺ جس طرف بھی نظر دوڑاتے ہیں تو آپ کو اپنی جدوجہد اور اس جدوجہد میں گزاری ہوئی عمر کا ما حاصل اور نتیجہ مسلمانوں کے اس جمِ غفیر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر طرف سے توحیدِ الٰہی کے نغمات کی بلند آوازیں سنائی دے رہی ہیں' سب جبینیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں اور ہر دل اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہی دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کے لیے یہ بہت بڑی سعادت ہے اور خوشی و اطمینان کا لمحہ ہے' آپ ﷺ نے ایک لمبا عرصہ اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر اس دین اسلام کی تبلیغ کے راستے میں طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کیا' آپ ﷺ نے دینِ اسلام کی خاطر بھوک پیاس کو برداشت فرمایا' صحراؤں اور ویرانوں میں لمبے لمبے سفر طے کیے' لوگوں کی طرف سے ایذاء اور تمسخر کا سامنا کیا' اب اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندوں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھ کر آپ خود کو کتنا صاحبِ سعادت محسوس کر رہے تھے۔

اے میرے آقا! آج کے دن اس سعادت اور خوشی کو دیکھ کر آپ اپنی چشمانِ مبارک کو ٹھنڈا فرمائیں' آپ کو خوشی اور سرور حاصل ہو' اور آپ کا دل اپنے رب کی حمد سے سرشار اور خوش ہو جائے۔

''یا سیدی یا رسول اللہ!'' اے میرے آقا! اور اے اللہ کے رسول! حجۃ الوداع کے موقع پر آپ کے اردگرد جمع ہونے والے ہزاروں کی شہادت ہی کافی نہیں بلکہ جب تک یہ زمین قائم و دائم ہے' اس پر بسنے والی ہر نسل' ہر زمانے میں زبانِ حال اور زبانِ قال سے یہی گواہی دیں گے:

یارسول اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے پیغامِ حق پہنچا دیا' آپ نے حقِ رسالت ادا کر دیا اور آپ نے امت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے

بہتر جزاء عطا فرمائے' جو بہتر جزاء ایک نبی کو اس کی امت کی طرف سے دی جا سکتی ہے۔

اے اللہ کے رسول! دعوتِ حق کی ذمہ داری آپ کے بعد ہمارے کندھوں پر آن پڑی ہے اور ہم اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی پوری کوشش کریں گے' لیکن ہم اس میں کمزور ہیں' اے ہمارے آقا! کل ہم آپ کو کیا منہ دکھائیں گے؟ کیونکہ ہمارے اوپر سستی و کاہلی اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے' لیکن اے ہمارے آقا! اس سب کے باوجود کل یومِ قیامت آپ کے اردگرد آپ کے ایسے مخلص صحابہ اور نیک اصحاب موجود ہوں گے جن کے ہاتھوں اور جسموں پر شہادت کا خون ہوگا' جو انہوں نے دین کے راستے میں بہایا ہے' انہوں نے کتنی جدوجہد کی ہے' اور اے ہمارے آقا! ان کے پاس آپ کی شریعت کی مدد' آپ کی دعوت کے دفاع اور آپ کی جدوجہد کی اتباع کی صورت میں دنیا کو اپنے قدموں تلے روندنے کی بے نیازی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمام مسلمانوں کے احوال کی اصلاح فرمائے اور ہم سب کو دنیا کے لالچ اور خواہشات و شہوات کے نشے سے بیدار فرمائے' اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے کرم' لطف اور جود و عطا کی چادر میں چھپائے رکھے۔ (آمین)

حضور ﷺ نے اپنا حج مکمل فرمایا' آبِ زم زم سے سیراب ہوئے' لوگوں کو حج کے احکام کی تعلیم دی' پھر مدینۃ المنورہ کی طرف واپس سفر شروع فرمایا تاکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے راستے میں جہاد اور سعی کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

مرضِ وصال اور رفیقِ اعلیٰ سے ملاقات

حضرت اسامہ بن زید کو بلقاء کی طرف بھیجنا

رسول اللہ ﷺ جونہی مدینۃ المنورہ پہنچے آپ نے مسلمانوں کو اہل روم کے ساتھ جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا اور آپ ﷺ نے اس لشکر کی امارت کے لیے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو مختص فرمایا' جنہوں نے ابھی شباب میں قدم رکھا ہی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرمایا کہ آپ اپنے باپ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی جائے شہادت کی طرف سفر کریں اور فلسطین کے علاقہ بلقاء اور داروم کو گھڑ سوار دستے لے جا کر مغلوب کر لیں۔ آپ ﷺ نے یہ حکم اپنا مرضِ وصال شروع ہو جانے کے بعد دیا تھا۔

منافقین اس لشکر کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جلیل القدر عمر رسیدہ مہاجرین وانصار کے اس لشکر پر نوعمر لڑکا امیر مقرر کر دیا ہے۔[1] یہ باتیں سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی طرف باہر نکلے' اُس وقت سر مبارک میں درد کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کپڑا باندھا ہوا تھا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اگر تمہیں اسامہ بن زید کی امارت پر اعتراض ہے تو تم نے اس سے قبل اس کے والد (زید بن حارثہ) کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا' حالانکہ اللہ کی قسم! وہ امارت کے اہل تھے اور اللہ کی قسم! وہ مجھے لوگوں میں سب سے پیارے تھے اور اللہ کی قسم! یہ (اسامہ بن زید) بھی امارت کے اہل ہیں اور اللہ کی قسم! اُس کے بعد اب یہ بھی مجھے لوگوں میں سب سے پیارا ہے' میں تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں' بے شک یہ تمہارے نیک لوگوں میں سے ہے۔[2]

لوگوں نے اس لشکر کی تیاری کر لی اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مہاجرین و انصار میں سے جلیل القدر صحابہ روانہ ہو گئے' حضرت اسامہ اپنے اس لشکر کو لے کر مدینہ منورہ سے باہر ایک فرسخ دور مقامِ جرف پر پہنچے جہاں لشکرِ اسلام نے پڑاؤ ڈالا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ابتدائے علالت

اسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ مرضِ وصال شدت اختیار کر گیا۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر وہیں مقامِ جُرف پر رُکا رہا' وہ سب انتظار کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں کیا فیصلہ فرماتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مرض کی ابتداء کے متعلق ابن اسحاق اور ابن سعد نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام ابومویہبہ سے روایت کیا ہے: حضرت ابومویہبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آدھی رات کو مجھے بلا بھیجا اور فرمایا: اے ابومویہبہ! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس بقیع میں مدفون لوگوں کے لیے استغفار کروں' پس تم میرے ساتھ چلو۔

حضرت ابومویہبہ فرماتے ہیں: میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چل دیا' جب ہم قبروں

---

[1] حضرت اسامہ کی عمر اُس وقت باختلاف روایات اٹھارہ برس یا بیس برس تھی۔

[2] متفق علیہ' الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ ج ۷ ص ۱۳۱

کے درمیان پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے قبروں والو! تم پر سلام ہو! جس حالت میں تم ہو! وہ تمہیں مبارک ہو! کیونکہ تمہاری حالت اس سے بہتر ہے جس حالت میں آج لوگ مبتلا ہیں' فتنے یوں آ گئے ہیں جس طرح تاریک رات ہو کہ جس کا بعد میں آنے والا حصہ پہلے کے پیچھے چلا آ رہا ہوتا ہے اور بعد والا پہلے سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔

پھر آپ ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے ابومویھبہ! مجھے دنیا کے خزانوں کی چابیاں اور اس میں ہمیشہ کی زندگی کی پیش کش کی گئی ہے اور مجھے اس دنیا' اپنے رب کے ساتھ ملاقات اور جنت کے درمیان اختیار دیا گیا ہے۔

میں نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! آپ دنیا کے خزانوں کی چابیاں لے لیجئے! اس میں ہمیشہ رہیے! آخر میں پھر جنت کو اختیار کر لیجئے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! اللہ کی قسم! اے ابومویھبہ! میں نے اپنے رب سے ملاقات اور جنت کو منتخب کر لیا ہے' پھر آپ ﷺ نے اہل بقیع کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور پھر آپ واپس لوٹ آئے' تو آپ ﷺ کو اسی روز سے وہ مرض شروع ہو گیا جس میں آپ کی روح کو قبض کر لیا گیا۔[1]

---

[1] سیرت ابن ہشام' طبقات ابن سعد' مسند احمد' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' سنن ابن ماجہ اور یہ روایت حضرت عائشہ اور حضرت ابوہریرہ سے کی گئی ہے۔

اسی مضمون کی ایک حدیث طیبہ ہے جسے امام مسلم نے اور امام مالک نے ''موطأ'' میں باب الطہارۃ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ قبرستان کی طرف نکلے اور آپ ﷺ نے فرمایا:

السلام علیکم دار قوم مؤمنین وانا	اے جماعتِ مؤمنین! السلام علیکم! ان
ان شاء اللّٰہ بکم لاحقون وددت	شاء اللہ ہم بھی تمہارے پاس آنے والے ہیں'
انی قد رایت اخواننا.	میں نے چاہا کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھوں۔

صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلکہ تم میرے اصحاب ہو۔

بعض محدثین یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ حدیث طیبہ جو حضرت امام مسلم اور امام مالک نے روایت کی ہے' یہ بھی انہیں احادیث طیبات میں سے ہے جو آپ ﷺ کی وفات کے قریب روایت کی گئیں' لیکن ایسی بات نہیں بلکہ آپ ﷺ کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ ہر رات بقیع غرقد تشریف لے جاتے اور ان کے لیے بخشش طلب کرتے۔

حضور ﷺ کی تکلیف کا آغاز دردِ سر سے ہوا، آپ ﷺ اپنے سر میں شدید درد محسوس کرنے لگے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ جب بقیع سے واپس تشریف لائے اور میرا آپ ﷺ سے آمنا سامنا ہوا تو میں اپنے سر میں درد کی وجہ سے کہہ رہی تھی: ہائے میرا سر! تو حضور ﷺ نے فرمایا:

بل انا واللّٰہ یا عائشہ وا رأساہ۔ بلکہ اے عائشہ! اللہ کی قسم! میرے سر میں شدید درد ہے۔[1]

پھر آپ کے درد کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ وقفے وقفے سے سخت بخار ہو گیا، اس مرض کا آغاز ۱۱ ہجری میں ماہِ صفر کے آخری دنوں میں ہوا تھا، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس مرض کے دوران قرآنِ پاک میں سے معوذات پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرتی تھیں۔

امام بخاری و مسلم نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو تکلیف ہوتی تو آپ ﷺ معوذات (''اعوذ باللّٰہ'' والی سورتیں) پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرتے تھے، اور اپنے جسمِ اطہر پر اپنا دستِ مبارک پھیرتے تھے، جب آپ ﷺ مرضِ وصال میں مبتلا ہوئے تو میں معوذات (''اعوذ باللّٰہ'' والی سورتیں) پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرتی اور آپ ﷺ کے جسمِ اطہر پر آپ کا دستِ مبارک پکڑ کر پھیرتی۔

جب ازواجِ مطہرات نے محسوس کیا کہ آپ ﷺ کی رغبت اس میں ہے کہ آپ ﷺ اپنی علالت کے یہ ایام حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں گزاریں اور ان کو اس بات کا بھی علم تھا کہ آپ ﷺ کی محبت اور چاہت کا میلان حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف ہے تو سب ازواجِ مطہرات نے بخوشی آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ آپ ﷺ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی طرف تشریف لائے، علالت کی وجہ

---

[1] یہ روایت سیرت ابن اسحاق، طبقات ابن سعد میں ہے، امام احمد نے بھی ایک طویل حدیث میں اسی کے مثل روایت کیا ہے۔

سے آپ ﷺ حضرت فضل بن عباس اور حضرت علی بن ابی طالب (کے کندھوں) کا سہارا لیے ہوئے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں آپ ﷺ کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا' جب آپ ﷺ نے محسوس فرمایا کہ میرے اصحاب میری اس تکلیف کی وجہ سے پریشان اور غمگین ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اھریقوا علیّ من سبع قرب لم	سات مشکیزے پانی میرے اوپر بہاؤ
تحلل اوکیتھن لعلّی اعھد الی	شاید اس طرح میری حالت کچھ سدھر جائے
الناس.	اور شاید میں لوگوں کو کوئی وصیت کر سکوں۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: پس ہم نے آپ ﷺ کو ایک برتن میں بٹھایا' جو کپڑے دھونے والے ٹب کے مشابہ تھا' اور ہم نے مشکیزوں سے آپ ﷺ کے اوپر پانی ڈالا یہاں تک کہ آپ نے اپنے ہاتھ مبارک کے اشارے سے ہمیں منع فرما دیا' پھر آپ ﷺ لوگوں کی جانب باہر تشریف گئے' پس انہیں نماز پڑھائی اور خطبہ دیا۔ (رواہ البخاری)

آپ ﷺ اس حال میں نکلے کہ آپ ﷺ نے اپنے سرِ انور پر کپڑا باندھا ہوا تھا' پس آپ ﷺ منبر پر جلوہ افروز ہوئے' آپ ﷺ نے سب سے پہلے شہداءِ اُحد کے لیے دعا و استغفار کیا۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو یہ اختیار دیا کہ وہ دنیا کی نعمتیں لے لے یا اللہ کے پاس رہے' اُس بندے نے اللہ تعالیٰ کے پاس رہنا اختیار کر لیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب آپ ﷺ کی اس بات کے مقصد کا پتا چلا تو آپ رضی اللہ عنہ رونے لگے اور آپ ﷺ کو مخاطب کر کے عرض کرنے لگے: ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! توقف کرو! اے لوگو! اپنے مال اور صحبت کے لحاظ سے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والے ابوبکر ہیں اور اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا لیکن اسلام کی اخوت قائم ہے اور بڑھ کر ہے اور ابوبکر کے دریچے کے علاوہ مسجد کا ہر دریچہ بند کر دو[1]

[1] اس سے مراد وہ چھوٹا دروازہ ہے جو دو گھروں کے درمیان ہوتا ہے' یہاں تک کی حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے' الفاظ مسلم کے ہیں۔

پھر فرمایا: بے شک میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا اور میں تمہاری گواہی دوں گا اور اللہ کی قسم! مجھے تمہارے متعلق یہ خدشہ نہیں کہ تم (سب) میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے لیکن مجھے تمہارے بارے میں یہ خوف ہے کہ تم دنیا کی رغبت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو گے۔ (متفق علیہ)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس اپنے گھر تشریف لائے تو آپ کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا اور مرض میں شدت پیدا ہو گئی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھ سے ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرضِ وصال میں فرمایا: اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی کو میرے پاس بلاؤ! تاکہ میں ان کے متعلق ایک مکتوب لکھ دوں کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ کوئی تمنا کرنے والے تمنا کرے گا اور کہنے والا کہے گا کہ میں خلافت کا زیادہ حق دار ہوں' (جب کہ) اللہ تعالیٰ اور (تمام) مؤمنین ابوبکر کے سوا ہر ایک کی خلافت کا انکار کر دیں گے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرض شدید ہو گیا تو اُس وقت کاشانۂ نبوت میں جو لوگ جمع تھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: لاؤ! میں تمہیں ایک تحریر لکھ دیتا ہوں تاکہ میرے بعد تم گمراہی سے بچے رہو۔ بعض حضرات کہنے لگے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدتِ مرض کی وجہ سے ایسا فرما رہے ہیں جب کہ قرآنِ مجید تمہارے پاس موجود ہے تو ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے' پس اہلِ بیت نے اس بات سے اختلاف کیا اور جھگڑا پیدا ہو گیا۔ ان میں سے بعض حضرات کہنے لگے کہ نزدیک جا کر اپنے لیے تحریر لکھوالیں تاکہ تم لوگ بعد میں گمراہی سے بچے رہو۔ بعض حضرات نے کچھ اور رائے پیش کی' جب یہ بے کار اختلاف بڑھ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ (البخاری' باب مرض النبی ووفاتہ' ج ۵ ص ۱۳۸)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرض شدید ہو گیا اور مسجد میں نماز کے لیے جانا ممکن نہ رہا' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مروا ابابکر فلیصل بالناس. ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

---

[1] مسلم' باب فضل ابی بکر' ج ۷ ص ۱۱۰' اسی کی مثل بخاری میں بھی منقول ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! (حضرت) ابوبکر رضی اللہ عنہ رقیق القلب ہیں' جب وہ آپ کی جگہ مصلّی پر کھڑے ہوں گے تو قابو نہ رکھ سکیں گے اور ان کی آواز مقتدیوں تک نہ پہنچ سکے گی' آپ ﷺ نے فرمایا: تم تو یوسف علیہ السلام کے زمانہ کی عورتوں کی طرح ہو' ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ (متفق علیہ)

اس حکم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے' ان ایام کے دوران جب آپ ﷺ نے کچھ افاقہ محسوس فرمایا تو آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھڑے ہو کر لوگوں کو نماز پڑھاتے ہوئے پایا' جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو (مصلّی سے) پیچھے ہٹنے لگے تو نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اشارہ فرمایا کہ آپ اپنی جگہ پر ہی رہیں' پھر رسول اللہ ﷺ' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں تشریف فرما ہوئے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرنے لگے اور لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تکبیرات سن کر نماز پڑھتے رہے۔[1]

---

[1] اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الصلوٰۃ' باب من اقام الی جنب الامام لعلۃ' میں' امام مسلم نے کتاب الصلوٰۃ' باب استخلاف الامام' میں اور امام مالک نے موطأ میں کتاب صلوٰۃ الجماعۃ' باب صلوٰۃ الامام وھو جالس' میں بیان کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیخ ناصر الدین البانی نے شیخ محمد الغزالی کی کتاب ''فقہ السیرۃ'' کی کچھ احادیث کی تخریج کرتے ہوئے اس حدیث کو صرف امام احمد اور ابن ماجہ کی جانب منسوب کیا ہے اور اس کی سند میں ایک راوی ابواسحاق السبیعی کی وجہ سے اسے ضعیف قرار دیا ہے حالانکہ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں بھی ہے اور اس کی جس سند کی تحقیق شیخ البانی نے کی ہے' اس کے علاوہ بھی یہ متعدد اسناد سے مروی ہے۔

البتہ امام احمد اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ جملہ بھی ہے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس آیت تک قراءت کی تھی' آپ ﷺ نے اس سے آگے قراءت شروع کر دی' جب کہ بخاری و مسلم کی روایت میں یہ بات موجود نہیں' بہرکیف واقعہ بھی ایک ہی ہے اور حدیث بھی ایک ہی ہے' اس لیے مناسب نہیں کہ اس کی تخریج کرتے وقت صرف ضعیف سند کو ہی بیان کیا جائے اور صحیح و متفق علیہ سند سے سکوت اختیار کیا جائے' اس لیے کہ یہ چیز ابہام کا باعث بنتی ہے' جس سے علماء حدیث احتراز کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کے اس موقع پر باہر تشریف لانے پر لوگ خوش ہوئے اور خیریت سمجھنے لگے' لیکن پھر تکلیف دوبارہ شدید ہو گئی' یہ آخری موقع تھا جب آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے اور لوگوں کے ساتھ نماز پڑھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا تو آپ ﷺ بخار کی سخت تکلیف میں تھے' میں نے اپنے ہاتھ سے آپ ﷺ کو چھوا' پھر میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کو تو سخت بخار ہے' آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! بے شک مجھے تم میں سے دو آدمیوں کے برابر بخار ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: میں نے عرض کی: اس پر آپ کے لیے کیا دو اجر ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! کسی مسلمان کو مرض کی جو تکلیف پہنچتی ہے' اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کے گناہ اس طرح جھاڑتے ہیں جیسے درخت سے پتے گرتے ہیں۔ (متفق علیہ)

اس تکلیف اور علالت کے دوران آپ ﷺ اپنا چہرۂ مبارک چادر سے ڈھانپ لیتے' پھر جب دل گھبراتا اور تکلیف ہوتی تو چہرۂ انور کو کھول لیتے' اور آپ ﷺ فرماتے: یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو! جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ (متفق علیہ)

گویا کہ آپ ﷺ یہود و نصاریٰ کی اس حرکت سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو متنبہ فرما رہے تھے۔

سکرات الموت اور وصال

اللہ تعالیٰ کا اپنے تمام بندوں کے بارے میں یہ حکم ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ O

بے شک آپ نے بھی (دنیا سے) انتقال فرمانا ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے O (الزمر: ۳۰)

ہجرت کے گیارہویں سال ماہِ ربیع الاول کی ۱۲ (بارہ) تاریخ کی فجر طلوع ہوئی اور لوگ حضرت ابوبکر صدیق کی اقتداء میں مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے دروازے پر لٹکے ہوئے پردے کو ہٹایا اور اس پردے کے پیچھے سے جب آپ ﷺ کی شخصیت نمودار ہوئی تو تمام صحابہ جو صف در صف نماز ادا کر رہے تھے' سب کے سب آپ ﷺ کی طرف دیکھنے لگے' آپ ﷺ دیکھ کر مسرت سے

ہنس پڑے' اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹنے لگے تاکہ پہلی صف میں جا ملیں' ان کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاید نماز کے لیے آنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور دیگر مسلمانوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی خوشی میں اپنی نمازیں توڑنے کا ارادہ کر لیا تھا' پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک سے اشارہ فرما دیا کہ اپنی نمازیں پوری کر لو' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرے میں داخل ہو گئے اور پردہ گرا دیا۔ (رواہ البخاری والمسلم)

لوگ اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو خیال کرنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی بیماری سے افاقہ ہو گیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنے اصحاب کی طرف یہ الوداعی نظر تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف لوٹے اور آپ رضی اللہ عنہا کی گود میں سرِ انور رکھ کر لیٹ گئے' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سرِ انور اپنے سینے سے لگا لیا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر موت کی تکلیف کے باعث غشی طاری ہونے لگی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پانی کا ایک برتن پڑا ہوا تھا' آپ اپنے دونوں دستِ مبارک پانی میں ڈالتے اور اپنے چہرۂ مبارک پر پھیر لیتے اور فرماتے:

لا الٰہ الا اللّٰہ' ان للموت سکرات۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' بے شک موت تکالیف سے بھری ہوئی ہے۔[1]

(رواہ البخاری فی باب مرض الرسول ووفاتہ)

---

[1] اس حدیث کو امام بخاری' باب مرض الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ووفاتہ' اور کتاب الرقاق' باب سکرۃ الموت' ج ۷ ص ۱۹۲ میں بیان کرتے ہیں' اور امام ترمذی' نسائی اور احمد نے اسے دوسری سند سے روایت کیا ہے' جس کے الفاظ یہ ہیں: اے اللہ! موت کے سکرات برداشت کرنے میں میری مدد فرما!
شیخ ناصر الدین البانی نے اس کی تخریج کرتے ہوئے لکھا ہے: یہ ضعیف ہے' اسے ترمذی اور دیگر محدثین نے موسیٰ بن سرجس بن محمد عن عائشہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ الخ
صحیح ہے کہ ان الفاظ میں یہ روایت ضعیف ہے لیکن اصل حدیث امام بخاری نے صحیح سند سے روایت کی ہے' اگر کسی حدیث کی دو سندیں ہوں تو اس کی تخریج کرتے ہوئے صرف ضعیف کو ذکر کرنا اور صحیح کے بارے میں سکوت اختیار کرنا مناسب نہیں۔
جیسا کہ پیچھے بھی بیان کیا جا چکا ہے' اگر واقعہ ایک ہو تو الفاظ کے معمولی اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے جب یہ حالت دیکھی تو کہنے لگیں: ہائے میرے ابا جان کی بے چینی! آپ ﷺ نے انہیں فرمایا:

لیس علی ابیك کرب بعد هذا الیوم. آج کے بعد تمہارے باپ کو تکلیف نہیں ہوگی۔

(رواہ البخاری)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے وصال کے وقت میرے اور آپ کے لعابِ دہن کو ملا دیا۔ ہوا یوں کہ عبدالرحمان میرے پاس آئے اور ان کے ہاتھ میں مسواک تھی اور میں' رسول اللہ ﷺ کو ٹیک دیئے ہوئے تھی' میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ مسواک کی طرف دیکھ رہے ہیں تو میں نے جان لیا کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں' میں نے عرض کی کہ کیا میں یہ آپ کے لیے لے لوں؟ آپ نے سر مبارک سے اثبات کا اشارہ فرمایا' میں نے مسواک لے کر آپ کو پیش کی تو آپ ﷺ پر چبانا دشوار ہوا' میں نے عرض کی: کیا میں اسے آپ کے لیے نرم کر دوں؟ آپ ﷺ نے سر مبارک سے اثبات کا اشارہ فرمایا' پس میں نے اسے چبا کر نرم کر دیا' آپ ﷺ نے مسواک فرمائی' آپ ﷺ کے سامنے پانی کا ایک برتن پڑا ہوا تھا' آپ اپنا ہاتھ مبارک اس میں ڈالتے اور اپنے چہرۂ مبارک پر پھیر لیتے' اور فرماتے:

لا الٰه الا اللّٰه ان للموت سکرات. اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں! بے شک موت سختیوں سے بھرپور ہے۔

پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اُٹھایا اور فرمانے لگے: ''فی الرفیق الاعلٰی'' سب سے اعلیٰ رفیق کے پاس' حتیٰ کہ آپ ﷺ کی روح پرواز کر گئی اور آپ کا ہاتھ ایک طرف جھک گیا۔ (رواہ البخاری ومسلم)

آپ ﷺ کے وصال کی خبر لوگوں میں تیزی کے ساتھ پھیل گئی' اسی وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی رہائش گاہ سنح سے سواری پر سوار ہو کر آئے' کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ اپنی اس رہائش پر چلے گئے تھے' یہ اُمید کرتے ہوئے کہ اب آپ ﷺ کی طبیعت ٹھیک ہو چکی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب آ کر سواری سے اترے تو مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور کسی شخص سے کوئی کلام نہ کیا' یہاں تک کہ سیدھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں پہنچے اور رسول اللہ ﷺ کی جانب بڑھے' آپ ﷺ کو ایک دھاری دار کپڑے کی چادر سے ڈھانپا ہوا تھا' انہوں نے چہرۂ انور سے کپڑا ہٹایا' پھر جھکے' حضور ﷺ کو بوسا دیا اور رونے لگے' پھر کہنے لگے: میرے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں فرمائے گا' آپ کے لیے صرف یہی ایک موت ہے جو لکھی ہوئی تھی اور آپ نے اس کا ذائقہ چکھ لیا ہے۔ (رواہ البخاری)

پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں سے باہر تشریف لائے جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال نہیں ہوا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس اسی طرح چلے گئے ہیں' جس طرح حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام اپنے رب کے پاس گئے تھے' بے شک آپ ﷺ کا وصال اس وقت تک نہیں ہوگا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ منافقین کو فنا کر دے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: اے عمر! رک جاؤ اور خاموش ہو جاؤ! لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلسل گفتگو کرتے رہے' جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت عمر گفتگو سے نہیں رکتے تو آپ رضی اللہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور لوگ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر آپ کی طرف متوجہ ہو گئے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی اور فرمایا: اما بعد! اے لوگو! جو حضرت محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک حضرت محمد ﷺ کا وصال ہو چکا ہے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا بے شک اللہ زندہ ہے جو کبھی فوت نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ. (آل عمران:۱۴۴)

اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول' گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول' تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیے جائیں تو پھر جاؤ گے تم الٹے پاؤں (دینِ اسلام سے)۔

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو لوگوں کو ایسا لگا گویا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے' پھر ہر شخص اسے پڑھنے لگا اور کوئی شخص ایسا نہ رہا جو اس کی تلاوت نہ کر رہا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! مجھے یوں معلوم ہوا کہ گویا میں نے پہلی دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کو اس آیت کی تلاوت کرتے سنا' میں ڈر گیا' میری دونوں ٹانگیں کانپنے لگیں حتیٰ کہ میں زمین پر گر گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ نبی اکرم ﷺ وفات پا گئے ہیں[1]

جملہ راوی اور اہلِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا وصال تریسٹھ برس کی عمر میں ہوا' آپ ﷺ نے اپنی چالیس سالہ حیاتِ طیبہ بعثت سے قبل گزاری اور بعثت کے بعد تیرہ سال حیاتِ طیبہ مکہ مکرمہ میں دعوت الی اللہ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے بسر فرمائی اور پھر ہجرت کے بعد دس سالہ زندگی مدینہ منورہ میں گزاری' آپ ﷺ کا وصال ۱۱ ہجری کے شروع میں ہی ہوا تھا۔

امام بخاری نے حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیا سے بوقتِ رخصت نہ درہم و دینار چھوڑے اور نہ ہی لونڈی یا غلام' ماسوائے ایک سفید خچر کے جس پر آپ سوار ہوا کرتے تھے' اور کچھ ہتھیاروں کے اور کچھ زمین کے' جسے آپ نے مسافروں کے لیے صدقہ کر دیا تھا۔

اسباق و نصائح

سیرتِ مصطفویٰ کے اس آخری مرحلے میں رونما ہونے والے واقعات سے' اس کائنات میں پائی جانے والی ایک بہت بڑی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔

وہ حقیقتِ کبریٰ کہ جس کے سامنے جبابرہ کا جبروت' ملحدین کا عناد اور بڑے بڑے سرکشوں کی بغاوت دم توڑ جاتی ہے۔ اسی حقیقتِ کبریٰ نے کائناتِ ہست و بود کو انتہاء اور فنا کے حصار میں لیا ہوا ہے۔ یہی حقیقت' انسانیت و بشریت کو عبودیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہے اور آسمانوں اور زمینوں کے عظیم خالق کے سامنے سب کو جھکائے ہوئے ہے۔

---

[1] اس کو ابن اسحاق وغیرہ نے روایت کیا ہے' اسی طرح امام بخاری نے بعض الفاظ کے معمولی فرق سے اس کو روایت کیا ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے سرکش' ظالم و جابر حکمران دنیا کے بڑے بڑے خدائی کا دعویٰ کرنے والے سرکش' خدا کے نافرمان باغی اور خدا تعالیٰ کے فرماں بردار انبیاء و رسل' مقربین واصفیاء' اغنیاء و فقراء اور علماء و فضلاء سب کو چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے بھی اس حقیقت کو ضرور تسلیم کرنا پڑا۔

یہ حقیقتِ کبریٰ ہر زمان اور ہر مکان میں اور ہر عاقل و مفکر کے کاموں میں یہ اعلان کر رہی ہے کہ اس کائنات میں اُلوہیت اور خدائی صرف اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی ہے' اس کائنات میں حاکمیت بھی اُسی خالق و مالک کی ہے جو اکیلا ہمیشہ باقی رہے گا' یہ وہ ذات ہے جس کے فیصلے اور حکم کو کوئی بدلنے والا نہیں' جس کی سلطانی کی کوئی حدود نہیں' جس کی حکمرانی سے کوئی خارج نہیں اور جس کا حکم سب پر لاگو ہوتا ہے اور سب پر نافذ ہوتا ہے۔

یہ حقیقت کون سی حقیقت ہے؟ جس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہہ اور جس سے کوئی مفر مقر نہیں! یہ حقیقت' موت اور سکرات الموت کی حقیقت ہے۔ جو واضح الفاظ میں اس کا اظہار کرتی ہے' جب سے اس دنیا کا سورج طلوع ہوا ہے اور جب تک اس دنیا کا سورج غروب ہو گا' اللہ تعالیٰ اس حقیقتِ موت کو دنیا میں رہنے والے جانداروں پر مسلط کرتا رہے گا۔

اس دنیا میں بڑے بڑے لوگ گزرے' بڑی بڑی قوت اور طاقت والے لوگ گزرے' بڑے بڑے علم و فضل والے لوگ گزرے' بڑے بڑے حکیم اور سائنس دان گزرے لیکن اس حقیقتِ موت نے جلد ہی ان کو اپنی آغوش میں لے لیا اور ان سب کو ان کی عبدیت اور بندگی یاد دلائی اور ان سب کو مالک الملک اور خالقِ ارض و سماء کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا سکھایا' پس یہ سب کے سب لوگ اللہ عزوجل کی طرف ایک بندہ کی حیثیت سے سر جھکائے عاجزی و انکساری کی تصویر بن گئے' انہوں نے اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا' کیونکہ یہ اُس کا اعلان ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ. ہر نفس چکھنے والا ہے موت کو۔

(آل عمران:۱۸۵)

یہ مطلق حکم ہے جس میں کوئی قید نہیں' یہ حکم عام ہے جس میں کوئی تخصیص نہیں اور یہ سب کو شامل ہے' تمام دنیا کے لوگ مل کر بھی اس کو محدود نہیں کر سکتے' جدید سائنس کے ماہرین

جدید ترقی کے معمار اور خلاؤں کو تسخیر کرنے کے دعوے دار سب کے سب جمع ہو جائیں، اپنے مختلف وسائل کو بھی جمع کر لیں، اپنی خلائی شٹلز اور مصنوعی سیاروں کو بھی لے آئیں اور اب تک ساری سائنسی ترقی کو اکٹھا کر کے بھی اگر وہ موت سے چھٹکارا حاصل کرنے اور اس کی سختیوں سے کنارہ کش ہونے کی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کریں، جس کا خوف برابر ان پر طاری ہے اور اس الٰہی چیلنج ''کل نفس ذائقة الموت'' ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، اگر وہ اس کا جزوی طور پر ہی توڑ کریں یا اگر وہ موت سے چھٹکارے کی کوئی سبیل تلاش کر لیں، پھر تو ان کے لیے روا ہے کہ وہ اپنی سرکشی و بغاوت، جبروت اور کفر، خدائی دعویٰ اور ناشکری کے بلند قلعے تعمیر کریں، لیکن اگر وہ موت سے بھاگنے کا کوئی راستہ تلاش نہ کر سکیں تو پھر سب کو اپنی اپنی قبروں کے بارے میں ضرور فکر و تامل شروع کر دینا چاہیے، جن قبروں کی گہرائیوں میں ان کو غائب ہو جانا ہے، جن کی مٹی کے نیچے ان کو بسیرا کرنا ہے اور جن کے قبضے سے ان کو کوئی رہائی نہیں دے سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ اپنے حبیب کریم ﷺ کو موت اور اس کی تکالیف سے ماورا رکھتا، لیکن حکمتِ الٰہیہ چاہتی تھی کہ موت کے پیالے سے گھونٹ پینے کا جو اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ جو ہر شخص کے لیے عام ہے، اس کی شدت اور تکلیف ہر ذی روح محسوس کرے خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کتنے ہی قرب کے درجے پر فائز ہو، تاکہ ہر انسان توحید کا معنی اور اس کی حقیقت سے روشناس ہو کر زندگی بسر کرے اور یہ کہ ہر جاندار اس حقیقت کو جان لے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو بھی ہے، وہ ربِ رحمان کی بارگاہ میں ایک عبد اور بندہ کی حیثیت سے ہی پیش ہونے والا ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے گزاری اور اُسی خالق و مالک کی فرماں برداری میں ہی موت کا گھونٹ پیا تو اس کے بعد پھر کسی ذی روح کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو عبدیت کے درجے سے بالاتر سمجھے۔ جب اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ سکرات الموت اور موت کی حقیقت سے ہمکنار ہوئے تو اس کے بعد کسی ایک کے لیے بھی روا نہیں کہ وہ موت اور سکرات الموت کو کثرت سے یاد نہ کرے۔

یہی وہ معنی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ○ (الزمر:۳۰)

بے شک آپ نے بھی (دنیا سے) انتقال فرمانا ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے○

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ○ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَّاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ○ (الانبیاء:۳۵-۳۴)

اور نہیں مقدر کیا ہم نے کسی انسان کے لیے جو آپ سے پہلے گزرا (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنا' تو اگر آپ انتقال فرما جائیں تو کیا یہ لوگ (یہاں) ہمیشہ رہنے والے ہیں○ ہر نفس موت (کا مزہ) چکھنے والا ہے' اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں بُرے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے اور (آخرکار) تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ آنا ہے○

تو اس طرح ہم رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے اس آخری مرحلہ میں دو حقیقتوں کا اپنے سامنے مشاہدہ کرتے ہیں' اور یہ دونوں حقیقتیں ایمان باللہ کی بنیادیں اور ستون ہیں' بلکہ یہ دونوں حقیقتیں پوری کائنات کے نظام کی بنیادیں ہیں:

(۱) توحید الٰہی کی حقیقت' کہ اس کائنات میں اللہ عزوجل کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور بندگی کی حقیقت' جس حقیقت پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو تخلیق فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم اور قانون میں کوئی تبدیلی نہیں۔

اب ہم آپ کی خدمت میں وہ احکام اور دروس پیش کرتے ہیں' جو اس بحث میں پائے جاتے ہیں۔

اوّل: دینِ اسلام میں فضیلت صرف عملِ صالح کی بنیاد پر ہے

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ غلام تھے اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد گرامی تھے' آپ رضی اللہ عنہ اصل میں آزاد کردہ غلام تھے' اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اٹھارہ سے بیس سال کی عمر کے نوجوان تھے' لیکن رسول اللہ ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو ایک اہم اور بڑے غزوہ میں عام صحابہ کرام پر جب امیر مقرر فرمایا تو اس وقت آپ رضی اللہ عنہ کی صغر سنی اور آباء واجداد کی پرانی غلامی اس میں رکاوٹ نہ بن سکی!

اگرچہ منافقین نے حضرت اسامہ کو اس اہم لشکر کے امیر بنائے جانے پر تعجب اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا' لیکن شریعتِ اسلامیہ میں یہ فیصلہ نہ ہی معیوب تھا اور نہ ہی قابلِ نفرت تھا' دینِ اسلام تو آیا ہی اس لیے ہے کہ اس جہان سے دورِ جاہلیت کے جھوٹے معیارِ برتری' ہر قسم کے تفاوت اور بے بنیاد فضیلت و تفاخر کو ختم کرے۔

نبی اکرم ﷺ نے یقیناً حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ میں ایسی خصوصیت پائی جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے اس غزوہ میں لشکر کی قیادت کے لیے ان کو دوسرے جلیل القدر صحابہ کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور اولیٰ سمجھا' ایسی صورتِ حال میں مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ اپنے امیر کی اطاعت وفرماں برداری کریں' خواہ کوئی حبشی غلام ہی اُن پر امیر مقرر کیا جائے۔

اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اُس لشکر کو روانہ کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بذاتِ خود اس لشکر کو رخصت کرنے کے لیے شہر سے باہر تشریف لے گئے' آپ رضی اللہ عنہ خود پیدل چل رہے تھے جب کہ سپہ سالار حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سواری پر تھے' حضرت اسامہ نے آپ رضی اللہ عنہ سے گزارش کی: اے خلیفۂ رسول! یا تو آپ سواری پر سوار ہو جایئے! یا میں سواری سے نیچے اُتر جاتا ہوں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! نہ ہی تم سواری سے اُترو گے اور نہ ہی میں سواری پر سوار ہوں گا' کیا میں اللہ کے راستے میں ایک ساعت کے لیے اپنے قدموں کو خاک آلود نہ کروں؟

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس غزوہ سے کامیاب و کامران ہو کر لوٹے اور اس لشکر کی روانگی سے مسلمانوں کو بہت بڑی کامیابی اور فائدہ حاصل ہوا (کیونکہ اس غزوہ کی وجہ سے مسلمانوں کی دھاک دوسری اقوام پر مضبوط ہوئی)۔ (تاریخ الطبری ج ۳ ص ۲۲)

دوم: دَم کرنے اور تعویذ کرنے کا جواز اور اس کی فضیلت

دَم کرنے کے جواز کی دلیل بخاری و مسلم کی وہ حدیث طیبہ ہے جو ہم نے اس سے قبل نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب تکلیف محسوس ہوتی تو آپ ﷺ معوذات (سورۃ فلق اور سورۃ ناس) پڑھ کر اپنے اوپر پھونک مارتے اور اپنے ہاتھ مبارک پر دَم کر کے اپنے جسم مبارک پر اپنا ہاتھ پھیرتے۔

اس کے علاوہ آپ ﷺ کا یہ بھی معمول تھا کہ کبھی اپنے صحابہ کرام کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر دَم کرتے اور کبھی دیگر اذکار و دعائیں پڑھ کر دَم فرمایا کرتے تھے۔

امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب ہم میں سے کسی انسان کو تکلیف ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اپنے دائیں ہاتھ مبارک کو (درد کی جگہ پر) پھیرتے' پھر یہ دعا پڑھتے:

اذهب الباس رب الناس'	اے لوگوں کے رب! دکھوں کو دور کر
واشف وانت الشافي' لا شفاء الا	دے' شفاء دے' کیونکہ شفاء دینے والا تو ہی
شفاء ك شفاءً لا يغادر سقمًا.	ہے' کوئی شفاء نہیں مگر تیری شفاء' ایسی شفاء عطا فرما جو بیماری کو باقی نہ رہنے دے۔

امام بخاری و مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' آپ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو جب کوئی تکلیف محسوس ہوتی تو آپ ﷺ اپنے اوپر معوذات (سورۃ فلق و ناس) پڑھ کر دَم کرتے تھے' جب آپ کے مرضِ وصال نے شدت اختیار کی تو میں آپ ﷺ پر یہ معوذات پڑھتی اور آپ ﷺ کا ہاتھ مبارک آپ کے جسم پر برکت کے حصول کی اُمید کرتے ہوئے پھیرتی تھی۔

دَم کرنے کے جواز میں سب سے واضح دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ	اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں

وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًاO (بنی اسرائیل:۸۲)

وہ چیزیں جو (باعث) شفاء ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہلِ ایمان کے لیے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لیے مگر خسارہ کوO

دعا کرنے اور دَم کرنے میں فرق یہ ہے کہ دَم کرنے میں دعا کے ساتھ پھونک مارنا اور ہاتھ پھیرنا بھی شامل ہے' دَم کے دوران جو پھونک ماری جائے گی' اس میں تھوک کے ذرات نہیں ہونے چاہئیں' یہی زیادہ صحیح ہے۔

پھر حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ' امام شافعی' امام احمد' اسحاق اور ابوثور علیہم الرحمۃ نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ دَم کرنے اور تعویذ دینے پر اُجرت لینا بھی جائز ہے' جب کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ نے اس سے مختلف مؤقف اختیار کرتے ہوئے قرآن مجید کی تعلیم دینے پر تو اُجرت لینے سے منع کیا ہے البتہ دَم کرنے اور تعویذ دینے پر اُجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے۔

(شرح النووی بر مسلم ج ۱۴ ص ۱۱۸)

اس پر دلیل' بخاری و مسلم کی روایت کردہ وہ حدیث طیبہ ہے کہ کچھ صحابہ کرام سفر پر تھے' دورانِ سفر ان کا گزر عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ پر سے ہوا' ان صحابہ کرام نے اُس قبیلہ والوں کا مہمان بننا چاہا لیکن اُن قبیلہ والوں نے ان کی مہمان نوازی نہ کی' قبیلہ والوں نے ان سے پوچھا: کیا تم میں کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟ ہمارے قبیلے کے سردار کو کسی چیز نے ڈس لیا ہے یا وہ تکلیف میں ہے' تو ان صحابہ میں سے ایک صاحب نے اُن کو کہا: ہاں! (جھاڑ پھونک کرنے والا ہم میں موجود ہے)' وہ صحابی اُس سردار کے پاس آئے اور اُس پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دَم کیا' (اس کی برکت سے) اُس سردار کو شفاء ہوگئی' پس انہوں نے اس صحابی کو بکریوں کا ریوڑ (بطورِ اُجرت) دیا' لیکن اس صحابی نے وہ بکریاں لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں ان بکریوں کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھوں گا' پھر ان کو اپنے پاس رکھوں گا۔ یہ صحابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور یہ ساری بات ذکر کی اور عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! اللہ کی قسم! میں نے صرف سورۂ فاتحہ ہی پڑھ کر دَم کیا' یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسکرائے اور فرمایا: تمہیں کیا معلوم کہ یہی تو جھاڑ پھونک ہے' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: یہ بکریاں اُن سے لے لو اور اپنی ان بکریوں میں سے مجھے بھی حصہ دو۔

امام نووی' حافظ ابن حجر وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ دَم کرنے (اور تعویذ دینے) کے جواز پر اجماع ہے لیکن تین شرائط کے پائے جانے کی صورت میں:

پہلی شرط: وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو یا اس کے ہی اسماء وصفات ہوں' جو پڑھے جائیں۔

دوسری شرط: وہ عربی زبان میں ہو یا اگر کسی دوسری زبان میں ہو تو اس کا مفہوم واضح سمجھا جائے۔

تیسری شرط: عقیدہ یہ رکھا جائے کہ دَم بذاتِ خود کوئی اثر نہیں رکھتا بلکہ اس میں اثر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (النووی علی مسلم ج ۱۴ ص ۱۶۹' فتح الباری لابن حجر ج ۱۰ ص ۱۵۲)

ان مذکورہ بالا شرائط پر احادیث صحیحہ میں ثبوت موجود ہے' مثلاً امام مسلم نے حضرت عوف بن مالک الاشجعی سے روایت کیا ہے' آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم دورِ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے' اسلام قبول کرنے کے بعد ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مجھے اپنے دَم وغیرہ کے کلمات سناؤ! بے شک اُس دَم اور جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں جس میں شرک (کے الفاظ) نہ ہوں۔

جادو اور اس کے توڑ کے لیے جھاڑ پھونک کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو اہم دَم معوذات پڑھ کر اپنے اوپر کیا' یہ اُس جادو کے اثر کو زائل کرنے کے لیے تھا' جو لبید بن الاعصم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کیا تھا۔ مذکورہ بالا حدیث امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔

علماء نے ذکر کیا ہے کہ جمہور مسلمان جادو کے اثبات کے قائل ہیں اور جادو کی حقیقت بھی دیگر ثابت شدہ اشیاء کی حقیقت کی طرح ہے۔ اس کی دلیل مذکورہ بالا بخاری و مسلم کی حدیث طیبہ ہے' اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بھی اس کا ذکر فرمایا ہے' اور یہ کہ جادو سیکھا' سکھایا بھی جاتا ہے' اس لیے اس کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور موجود ہے۔

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ. (البقرہ:۱۰۲)	(اس کے باوجود) لوگ سیکھتے رہے ان دونوں سے وہ منتر جس سے جدائی ڈالتے

تھے خاوند اور اُس کی بیوی میں۔

خاوند اور بیوی کے درمیان تفریق پیدا کرنا' ایک حقیقی چیز ہے جو معروف و مشہور ہے۔
ہم نے جادو کے متعلق جو کچھ ذکر کیا ہے' بعض لوگ اس کو تسلیم کرنے کے بارے میں دو اسباب کی بنیاد پر اشکال کا شکار ہیں:

پہلا اشکال: جب جادو بذاتِ خود ایک حقیقتِ ثابتہ ہے تو بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پھر تو یہ توحید کے قضیے کے منافی ہے کیونکہ اس میں تاثیر کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاتی۔

دوسرا اشکال: یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا گیا' تو بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ کیا پھر اس جادو کا اثر منصبِ نبوت پر بھی پڑا۔ لوگ اس بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔

حقیقتِ حال

اس بارے میں اصولی طور پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

پہلے وہم اور اشکال کا جواب یہ ہے کہ جادو کو ایک ثابت شدہ حقیقت اعتبار کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ جادو بذاتِ خود اثر رکھتا ہے' بلکہ یہ ایسے ہی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ جادو کا اثر ہوتا ہے جیسے کہ زہر کا اثر واقع ہوتا ہے جو حقیقی طور پر ثابت ہے' اسی طرح دوائی کا اثر واقع ہوتا ہے جو حقیقی طور پر ثابت ہے' اس سے پتا چلا کہ جادو کا اثر پذیر ہونا بھی صحیح ہے' جس سے انکار ممکن نہیں لیکن اس میں حقیقی بات یہ ہے کہ جادو کا اثر' زہر کا اثر' دوائی کا اثر جو اُمورِ ثابتہ میں سے ہے' یہ تمام اثر اللہ تعالیٰ کے حکم سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جادو کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ. (البقرۃ:۱۰۲)

اور وہ ضرر نہیں پہنچا سکتے اپنے جادو منتر سے کسی کو بغیر اللہ کے ارادہ کے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے جادو کے ذاتی اثر کی نفی فرمائی ہے' لیکن اس کے اثر پذیر ہونے اور اس کا نتیجہ ظاہر ہونے کو ''باذن اللّٰہ'' ثابت شدہ قرار دیا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے اذن سے جادو کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرے وہم اور اشکال کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ پر جو جادو کیا گیا' اس جادو کا اثر آپ ﷺ کے جسم اور ظاہری اعضاء و جوارح پر ہی ظاہر ہوا' جیسا کہ عام مشہور ہے۔ اس جادو کا اثر آپ ﷺ کی عقل و فہم' دل اور اعتقاد پر واقع نہیں ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر پر اس کا اثر ظاہری طور پر ایسے ہی واقع ہوا تھا جیسے مختلف بیماریوں کے آثار کسی جسمِ بشری پر ظاہر ہوتے ہیں' یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی حفاظت اور عصمت کا جو ذکر فرمایا ہے' یہ عصمت' مختلف امراض اور عوارضِ بشریہ کو شامل نہیں۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں:

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جادو کے اثر سے آپ ﷺ کو ایسا گمان ہوتا ہے کہ آپ نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا' اس سے تبلیغ دین کے معاملے میں آپ ﷺ کی جانب سے کسی نقص یا عیب کا اثبات نہیں ہوتا' اس لیے کہ اس معاملہ میں آپ کی عصمت پر دلیل اور اجماع موجود ہے' یہ چیز ان اُمورِ دنیوی میں سے ہے جن کا دیگر تمام انسانوں کی طرح آپ بھی شکار ہو سکتے ہیں' اور یہ ممکن ہے کہ آپ کے تصور اور خیال میں بعض ایسی چیزیں آئیں جن کی کوئی حقیقت نہ ہو اور پھر یہ خیال زائل ہو جائے۔[1]

مصنف کا موقف

حضور ﷺ پر جادو کا اثر ایسے ہی ظاہر ہوا' جیسے شدید بخار کی حالت میں کسی مریض پر اثرات ظاہر ہوتے ہیں' شدید بخار کے عالم میں ذہن میں مختلف خیالات اور اوہام کا پیدا ہونا' یہ طبعی عوارض میں سے ہے۔ اس قسم کے اثرات اور اس کے مشابہ دیگر عوارضِ بشریہ جس طرح عام لوگوں پر ظاہر ہوتے ہیں' اسی طرح انبیاء و رُسل پر بھی بتقاضائے بشریت ظاہر ہوتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ پر جادو ہونے کی جو خبر ہے' یہ بات بھی اُن خوارق میں شامل ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو سرفراز فرمایا۔ آپ ﷺ پر جادو کا ہونا آپ

1. شرح الشفاء' قاضی عیاض' ج ۴ ص ۲۷۹۔ ۲۷۸' مزید دیکھئے: شرح نووی بر صحیح مسلم ج ۱۴ ص ۱۷۴۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کسی عیب اور نقص کا اظہار نہیں (العیاذ باللہ)' بلکہ اس سارے معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت وعظمت اور تکریم مزید واضح ہوتی ہے' جس تکریم وحفاظت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نوازا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اطہر پر جادو کے کچھ عوارض ظاہر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلسل اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگے' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لبید بن اعصم کی اُس خفیہ چال سے آگاہ فرمادیا جو اس نے جادو کی صورت میں چلی تھی' تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس جگہ تشریف لے گئے' جہاں وہ جادو والی کنگھی اور دیگر اسبابِ سحر موجود تھے' ان سب کو کنویں کی تہہ سے نکلوا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سارے جادو کو باطل کر دیا جیسا کہ حدیثِ طیبہ میں موجود ہے (اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علومِ خاص بھی عطا فرمائے اور باطل کو ختم کرنے کی قوت بھی عطا فرمائی ہے)۔

امام بخاری و مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' آپ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بنوزریق کے ایک شخص لبید بن اعصم نے جادو کر دیا حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیال کرتے کہ آپ نے کوئی کام کیا ہے حالانکہ وہ کام آپ نے نہیں کیا ہوتا تھا۔ ایک دن یا ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب میرے پاس تشریف فرما تھے' آپ نے بار بار اللہ سے دعا کی' پھر آپ نے فرمایا: اے عائشہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے جو پوچھا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتا دیا' میرے پاس دو آدمی آئے' ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کی جانب بیٹھ گیا۔

پھر ایک نے دوسرے سے پوچھا: اس شخص کو کیسا درد ہے؟ اُس نے جواب دیا: ان پر جادو کیا گیا ہے' اُس نے پوچھا: جادو کس نے کیا ہے؟ کہا: لبید بن اعصم یہودی نے (جو بنوزریق سے ہے)' پوچھا: کس چیز میں جادو کیا گیا ہے؟ کہا: ایک کنگھی میں اور کنگھی سے جڑے بالوں میں اور نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں' پوچھا کہ یہ چیزیں کہاں ہیں؟ جواب دیا: ذروان کے کنویں کے اندر' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کچھ اصحاب کو لے کر اُس کنویں پر تشریف لائے۔

جب واپس لوٹے تو فرمایا: اے عائشہ! اُس کنویں کا پانی گویا گوندھی ہوئی مہندی کے

پانی کی طرح تھا اور وہاں اردگرد کی کھجوروں کے اوپری حصے شیطان کے سروں جیسے ہیں' میں نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ نے انہیں نکلوا کیوں نہ لیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے شفاء بخش دی ہے' لہٰذا میں نے ناپسند کیا کہ اس شر کو لوگوں میں مشتہر کروں جس سے شر پھیلے' پھر آپ نے اُس کنویں کو دفن کرنے (بند کرنے) کا حکم دیا۔ (بخاری' مسلم)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ حدیث طیبہ آپ ﷺ پر جادو کے اثبات یا آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کو بتقاضائے بشریت تکلیف پہنچنے کی دلیل سے بڑھ کر اس بات کی دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت وتکریم عطا فرمائی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے حبیب کریم ﷺ کو محفوظ رکھا۔

یہاں کوئی سوال کرنے والا یہ بھی سوال کرسکتا ہے کہ جب جادو ایک حقیقتِ ثابتہ ہے تو پھر جادو اور معجزۂ الٰہیہ میں کیسے تمیز کی جائے گی؟

جواب: بے شک معجزہ نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے اور معجزہ نبی کے دعویٰ نبوت سے منسلک ہوتا ہے' یہ نبی کے دعویٰ نبوت کی سچائی پر دلیل کے طور پر چیلنج ہوتا ہے' جب کہ جادو کی یہ کیفیت نہیں ہوتی' کوئی جادوکرنے والا یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ نبی ہے۔

(النووی بر صحیح مسلم ج ۱۴ ص ۱۷۵)

اس کے علاوہ جادو کا تسلط اور اثر محدود ہوتا ہے' جیسا کہ ہم نے کہا کہ جادو کی ایک حقیقت ہے لیکن یہ حقیقت' معینہ حدود سے تجاوز نہیں کرتی' اس کے ذریعے حقائق کی قلب ماہیت اور اشیاء کے جوہر کی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔

اسی لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرعون کے جادوگروں کے جادو کے کرتب دکھانے کی وضاحت یوں فرمائی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○ (طٰہٰ: ۶۶)

آپ نے فرمایا: نہیں! تم ہی (پہلے) پھینکو' پھر کیا تھا یکا یک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی

ہوں ○

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو دیکھا اور ان جادوگروں کے جادو کو جو کچھ خیال کیا اور سمجھا' یہ اس کی تعبیر ہے۔ یعنی وہ رسیاں' حقیقت میں ان کے جادو کرنے کے نتیجے میں سانپ نہیں بنی تھیں بلکہ اُن جادوگروں نے فقط دیکھنے والوں کی آنکھوں پر جادو کیا تھا نہ کہ رسیوں اور کنکریوں پر۔ یہی وہ بات ہے جس کی وضاحت دوسری آیتِ مبارکہ کرتی ہے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْا بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ○ (الاعراف:١١٦)

تو جادو کر دیا انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر اور خوف زدہ کر دیا انہیں اور مظاہرہ کیا انہوں نے بڑے جادو کا○

ہم نے جو کچھ ذکر کیا' اگر آپ اس میں غور وفکر کریں گے تو آپ جان جائیں گے کہ جادو کی حقیقتِ ثابتہ کے بارے میں جو اس سے قبل لکھا گیا ہے' اس میں اور مندرجہ ذیل سورۂ طٰہٰ کی آیت میں جادو کو "خیال" کہا گیا' ان دونوں میں کوئی نفی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى○ (طٰہٰ:٦٦)

آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں○

اس سے پتا چلتا ہے کہ رسیوں کا سانپ بن کر دوڑنا' یہ صرف خیالی تھا' خیال نے بصارت پر اثر ڈالا تو یہ اُن رسیوں کی حقیقت ملاحظہ کرنے سے قاصر رہے جو سب کچھ جادو کے آنکھوں پر اثر کی وجہ سے تھا' اور جب جادو کا اثر ختم ہوا تو آنکھیں رسیوں کی حقیقت کو رسیوں کی شکل میں ہی ملاحظہ کرنے لگیں۔

جادو' جادو کی حقیقت اور جادو کی اثر پذیری کے متعلق جو ہم نے تحقیق پیش کی' اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جادو کا اثر ظاہر ہونے کی جگہ انسانی جسم' انسانی حواس اور اعضاء و جوارح ہیں' جس سے بعض مرئی اور محسوس چیزیں اپنی حقیقت کے برعکس دکھائی دیتی ہیں۔

سوم: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے مظاہر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کے ذکر کے دوران چار ایسے واقعات رونما ہوئے جن

سے حضرت ابوبکر کی اُس فضیلت اور درجے کا اندازہ ہوتا ہے جو آپ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاصل تھا۔

پہلا واقعہ: جب رسول اللہ ﷺ نے اپنا خطبہ شروع کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو یہ اختیار دیا کہ وہ دنیا کی نعمتیں لے لے یا اللہ کے پاس رہے' تو اُس بندے نے اللہ تعالیٰ کے پاس رہنا اختیار کرلیا۔

حضرت ابوبکر صدیق وہ پہلے شخص تھے' جو آپ ﷺ کی اس بات کے مقصد کو سمجھ گئے' اس لیے وہ یہ سن کر رونے لگے اور عرض کرنے لگے: ہماری مائیں اور ہمارے باپ آپ پر قربان ہوں!

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی صحابی آپ ﷺ کے اس کلام کے مقصد کا ادراک نہ کر سکے۔

یہی حدیث خفیہ بعض دوسرے طرق سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے اس کلام پر حضرت ابوبکر صدیق رونے لگے' تو میں نے اپنے دل میں کہا: یہ بزرگ کیوں روتے ہیں؟ حالانکہ رسول اللہ ﷺ تو ہمیں ایسے شخص کے بارے میں بتا رہے ہیں جس کو یہ اختیار دیا گیا اور اُس نے ایک چیز کو اختیار کرلیا۔

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں: بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخصیت رسول اللہ کی ذات تھی' جن کو ان دو چیزوں میں سے ایک چیز اپنانے کا اختیار دیا گیا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہم میں سے سب سے پہلے اس بات کو سمجھنے والے تھے۔

دوسرا واقعہ: رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ اپنے مال اور صحبت کے لحاظ سے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والے ابوبکر ہیں۔

یہ ایسے ہمیشہ رہنے والے' ان مٹ اور بے مثل کلمات ہیں کہ جو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کے لیے استعمال نہیں فرمائے۔

تیسرا واقعہ: پیچھے ہم نے ذکر کیا کہ امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی کو میرے پاس

بلاؤ تاکہ میں اُن کے متعلق ایک مکتوب لکھ دوں کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہنے والا کہے گا کہ میں خلافت کا زیادہ حق دار ہوں' (جب کہ) اللہ تعالیٰ اور تمام مؤمنین ابوبکر کے سوا ہر ایک کی خلافت کا انکار کر دیں گے۔

یہ حدیث طیبہ اس سلسلے میں بالکل واضح اور صریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بعد حضرت ابوبکر صدیق کو ہی خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔

لیکن شاید حکمت الہیہ کا یہ تقاضا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس بارے میں اپنے اصحاب سے نہ کوئی عہد لیں اور نہ ہی کوئی تحریری دستاویز مرتب کریں' یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ حکومت اور خلافت کا معاملہ آپ کے بعد سنت قرار پاتے ہوئے موروثی حیثیت اختیار نہ کر لے' اور بعد میں آنے والے خلفاء بھی اس کو سنت سمجھتے ہوئے کسی نہ کسی کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کر دیتے۔ اس صورت میں ایک حاکم یا خلیفہ مقرر کرنے کی جو دیگر شرائط تھیں' اُن پر کسی طور بھی عمل نہ ہو پاتا۔ باصلاحیت لوگ کبھی بھی اس منصب پر فائز نہ ہو پاتے' وہ حکمران اپنے بعد اپنے کسی پسندیدہ شخص کو نامزد کر دیا کرتے۔

چوتھا واقعہ: رسول اللہ ﷺ نے اپنی شدید علالت کے ایام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ پر لوگوں کو نماز پڑھانے کے لیے اپنا نائب مقرر فرمایا' اور آپ ﷺ نے جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت ابوبکر صدیق کو نماز پڑھانے کے متعلق ارشاد فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بابا کے بارے میں عذر پیش کیا کہ وہ تو بہت نرم دل ہیں' وہ اس ذمہ داری کے بوجھ کو برداشت نہ کر پائیں گے لیکن آپ ﷺ نے پرزور انداز میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی اپنے مصلے پر نماز پڑھانے پر اصرار فرمایا۔

تو اس طرح ان ساری باتوں کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان صحیح احادیث سے ثابت شدہ یہ فضائل وخصوصیات ہی تھیں' جن کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کے وصالِ اقدس کے بعد مسلمانوں نے خلافت کے منصب کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی ترجیح دی' حالانکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ان خصوصیات اور فضائل کے علاوہ دیگر جملہ صحابہ کرام اور بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی

بھی خصوصیات اور فضائل موجود ہیں' جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں یہ جھنڈا کل اس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہوگا' تو اس رات تمام صحابہ ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ کل یہ جھنڈا کس کو ملے گا؟ اور کون وہ شخص ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں؟ دوسرے دن صبح وہ جھنڈا آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر عطا فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے بغیر کسی بڑے لڑائی جھگڑے کے' محض تھوڑے بہت مذاکرے اور مناقشے کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا قطعی فیصلہ کر لیا' اور یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ دونوں جلیل القدر صحابی ایک دوسرے کی فضیلت کے قائل رہے' اور ایک دوسرے کے درجہ و مقام کا زبان و عمل سے اظہار بھی کرتے رہے' یہ کتنی گھٹیا بات ہے کہ ہم چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد ان دونوں جلیل القدر صحابہ کے نام پر آپس میں لڑائی جھگڑے میں وقت ضائع کر دیں' اس بات کو ثابت کرنے میں کہ خلافت کے زیادہ حق دار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے یا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے' جب کہ ان دونوں جلیل القدر صحابہ کی زندگیوں کو دیکھیں تو ان میں اس مسئلہ پر آپس میں کوئی اختلاف ہوا ہی نہ تھا اور یہ دونوں صحابہ زندگی کے آخری لمحے تک یک جان دو قالب بنے رہے۔

چوتھا: قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت

آپ نے ملاحظہ کیا کہ احادیث طیبات کے الفاظ میں اس عمل سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے اور اس اقدام سے مبالغہ کی حد تک متنبہ کیا گیا ہے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اپنی قبر اور دیگر صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے' اس خوف کی وجہ سے کہ کہیں لوگ اس طرح قبروں کی تعظیم میں مبالغہ نہ کریں اور اس کی وجہ سے فتنہ میں نہ پڑ جائیں' کیونکہ بسا اوقات یہ چیز کفر کی حد تک جا پہنچتی ہے' جیسا کہ گزشتہ امتوں میں ایسا ہوا۔ قبروں کے سجدہ گاہ بننے کی ایک صورت تو اس طرح ہوتی ہے کہ قبر کے اوپر مسجد بنا دی جائے اور قبر کے اردگرد کی جگہ

لوگوں کے نماز پڑھنے کے لیے مختص کر دی جائے (نمازی اور قبر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو) یا یہ صورتِ حال اُس وقت پیدا ہوتی ہے کہ کسی قبر کے پاس نماز پڑھی جائے اور اُس جگہ کو ہی نماز پڑھنے کے لیے مختص کر لیا جائے۔

قبر کے پاس نماز پڑھنے کے حکم کے متعلق علماء میں دو آراء ہیں، بعض علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور بعض علماء نے اس کو مکروہ عمل قرار دیا ہے۔ جن علماء نے اس عمل کو مکروہ قرار دیا ہے، انہوں نے اس صورت میں مزید سختی اختیار کی ہے کہ جب نماز بالکل قبر کے سامنے رُخ کر کے پڑھی جائے یعنی جب نمازی اور قبلہ کے درمیان قبر ہو، لیکن اس صورت میں بھی نماز ہو جائے گی کیونکہ حرمت کسی چیز کے بطلان کو مستلزم نہیں ہوتی، چنانچہ اس نماز کا حکم بھی اُس نماز کی طرح ہوگا جو نماز کسی غصب شدہ زمین میں پڑھی جائے۔

امام نووی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: مسجد نبوی میں جب نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوگئی، صحابہ و تابعین کے اَدوار میں مسجد نبوی کو وسیع کرنے کی ضرورت ہوئی تو اُمہات المؤمنین کے حجرے بھی مسجد میں شامل کر لیے گئے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مبارک جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ انور اور آپ کے دونوں رفیق صحابہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قبریں تھیں، جب یہ حجرہ بھی مسجد میں شامل کیا گیا تو مسجد نبوی کی توسیع کرنے والوں نے ان مبارک قبروں کے اردگرد گولائی میں بلند دیوار تعمیر کر دی تا کہ یہ حصہ مسجد میں شامل نہ ہو بلکہ الگ رہے، اور لوگ اس سے علیحدہ رہیں، اور نماز کے دوران اس طرف رُخ کرنے سے محتاط رہیں، پھر انہوں نے ان قبروں کے شمالاً جنوباً دو دیواریں بنا دیں اور اُن کو آپس میں ملا دیا اور یہ جگہ علیحدہ ہوگئی تا کہ قبر کی طرف رخ کرنا کسی کے لیے ممکن نہ ہو سکے۔ (النووی علی مسلم ج ۵ ص ۱۴ ـ ۱۳)

پنجم: سکرات الموت کے دوران بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امت کے بارے میں تفکر

سکرات الموت کی ان تکلیف دِہ گھڑیوں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ اور امت کے متعلق فکر مند تھے۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ دوشنبہ کے روز (جس دن وصال ہوا) لوگ نمازِ فجر کے لیے صفیں باندھے کھڑے ہیں کہ اچانک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرۂ مبارک کا پردہ ہٹا اور اس کے پیچھے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمودار ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے صحابہ کو کرام کو دیکھا کہ وہ سب صف در صف نماز میں مصروف ہیں' پھر آپ ﷺ مسکرائے اور ہنس پڑے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مصلّی امامت سے پیچھے ہٹے تا کہ پہلی صف میں شامل ہو جائیں' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آپ ﷺ نماز پڑھائیں گے۔ صحابہ کرام' آپ ﷺ کی آمد کی خوشی میں اپنی نماز میں ہی بے قابو ہونے والے تھے کہ آپ ﷺ نے انہیں اپنے ہاتھ مبارک سے اشارہ کیا کہ تم اپنی نماز مکمل کرو' پھر حجرہ میں چلے گئے اور پردہ گرا دیا۔

اس نازک لمحے میں بھی آپ ﷺ کی فکرمندی اپنی امت کے بارے میں ہے اور اس بات میں متفکر ہیں کہ آپ کے بعد امت کا کیا حال ہوگا؟ جب صحابہ بارگاہِ الٰہی میں خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے اُن پر نگاہ ڈالی' آپ ﷺ کی اس پیار بھری نگاہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں اپنے اصحاب کے لیے کتنی زیادہ محبت موجود تھی' بلکہ آپ ﷺ کی اس مسکراہٹ کے اظہار سے یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ آپ ﷺ کے قلب اطہر میں ان کے لیے محبت موجزن تھی' آپ ﷺ ان کے لیے دعا فرماتے رہتے اور ان کی طرف اپنی پوری توجہ سے ان کے حالات سے باخبر رہتے۔

رسول اللہ ﷺ (میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں!) نے چاہا کہ اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں بھی اپنے اصحاب پر الوداعی نگاہ ڈالیں تا کہ وہ مطمئن ہو جائیں کہ دینِ حق' جو انہوں نے اپنے امتیوں کے لیے چھوڑا ہے اور جس راہِ ہدایت کی طرف ان کی راہنمائی فرمائی ہے وہ اُس پر عمل پیرا ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے انہیں وہی منظر دکھایا جو وہ اپنے اصحاب سے دیکھنا چاہتے تھے' جس سے آپ ﷺ کی چشمانِ مبارک ٹھنڈی ہو گئیں' یہاں تک کہ اس منظر کے دیکھنے سے آپ ﷺ کی جسمانی تکالیف مغلوب ہو گئیں اور آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے خوشی' سرور اور رضا چھلکنے لگی' حتیٰ کہ صحابہ نے خیال کیا کہ آپ ﷺ کو تکالیف و آلام سے افاقہ ہو گیا ہے اور آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔

لیکن صحابہ کرام کو بعد میں معلوم ہوا کہ اس نگاہ کے بعد آپ ﷺ کی تکالیف میں

شدت آ گئی اور یہ صحابہ کرام بلکہ آپ کی پوری امت کی طرف آخری منظر تھا' جو آپ ﷺ نے اپنے ذہن میں محفوظ فرمایا تا کہ یہ آخری منظر اِن لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان باقی رہنے والا عہد بن جائے اور دنیا میں اپنی امت سے رخصتی کے وقت اور آخرت میں حوضِ کوثر پر اپنی امت کے استقبال کے وقت کے درمیان ہمزۂ وصل قرار پائے۔

حکمتِ الٰہی چاہتی تھی کہ یہ آخری منظر جسے حضور ﷺ ملاحظہ کریں' یہ نماز کا منظر ہو! اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ یہی منظر آخری عہد قرار پائے۔

اے میرے مسلمان بھائی! دین اور نماز کے اسی عہد پر قائم رہو' جس عہد پر دیکھ کر رسول اللہ ﷺ راضی خوشی مسکراتے ہوئے تجھ سے رخصت ہوئے اور اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

خاتمہ

آپ ﷺ کے بعض اوصافِ حمیدہ اور آپ ﷺ کی قبرِ انور اور آپ کی مسجد کی زیارت کی فضیلت

کفن مبارک

رسول اللہ ﷺ کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا' اس میں قمیص اور عمامہ شریف نہیں تھا۔ آپ ﷺ کو کفن پہنانے کے بعد چار پائی پر رکھ کر چار پائی کو قبر مبارک کے کنارے پر رکھ دیا گیا' پھر لوگ ٹولیوں کی شکل میں وہاں داخل ہوتے جاتے اور نمازِ جنازہ پڑھتے جاتے' کسی نے بھی ان کی امامت نہیں کی۔

سب سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھی' پھر بنو ہاشم نے' پھر مہاجرین نے' پھر انصار نے اور پھر تمام لوگوں نے' رسول اللہ ﷺ کے جسمِ اطہر کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اُسی حجرہ میں دفن کیا گیا' جہاں آپ ﷺ کا وصال ہوا۔

ازواجِ مطہرات

آپ ﷺ کے وصال کے وقت آپ کی نو (۹) ازواجِ مطہرات موجود تھیں:

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا' حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا' حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا' حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا' حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا' حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا' حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا۔ ان میں سے صرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا باکرہ خاتون تھیں' باقی سب شوہر دیدہ تھیں۔

آپ ﷺ کے صاحبزادے

آپ ﷺ کے تین صاحب زادے تھے:

(۱) حضرت قاسم (انہی کے نام پر آپ کی کنیت ابوالقاسم تھی) ان کی ولادت نبوت کے اعلان سے پہلے ہوئی اور یہ دو سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

(۲) حضرت عبداللہ (ان کو طیب اور طاہر کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے) ان کی ولادت نبوت کے اعلان کے بعد ہوئی۔

(۳) حضرت ابراہیم' ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ۸ ہجری میں ہوئی اور وفات ۱۰ ہجری میں ہوئی۔

آپ ﷺ کی صاحبزادیاں

آپ ﷺ کی چار صاحبزادیاں تھیں: حضرت زینب' حضرت فاطمہ الزہراء' حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم۔

حضرت رقیہ کی وفات غزوۂ بدر کے موقع پر ماہِ رمضان ۲ ہجری کو ہوئی' حضرت ام کلثوم کی وفات ماہِ شعبان ۹ ہجری کو ہوئی' ان مذکورہ دونوں صاحبزادیوں کا نکاح یکے بعد دیگرے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔

اخلاق واوصافِ حمیدہ

آپ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے' آپ ﷺ ماہ رمضان میں سب سے زیادہ سخاوت کرتے تھے۔

آپ ﷺ سب سے زیادہ حسین وجمیل اور سب سے زیادہ حسن اخلاق کے مالک تھے' آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک سب سے زیادہ نرم اور آپ ﷺ سے سب سے زیادہ اچھی خوشبو آتی تھی' آپ ﷺ حسن معاشرت میں سب سے بہتر تھے اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے تھے' آپ اپنی ذات کے لیے نہ غصے کا اظہار کرتے اور نہ ہی انتقام لیتے' لیکن جب اللہ تعالیٰ کی حرمات اور حدود کو پامال کیا جاتا تو آپ ﷺ کے جلال کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہرتی' حتیٰ کہ آپ حق کو غالب کر دیتے۔ آپ ﷺ کے اخلاق حمیدہ قرآن پاک کی عملی تصویر تھے' آپ ﷺ سب سے زیادہ تواضع کرنے والے تھے' اپنے اہل وعیال کی حاجات پوری کرتے اور کمزوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتے۔ آپ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ حیاء دار تھے' آپ ﷺ نے کھانے میں کبھی عیب نہیں نکالا' کھانا

اگر پسند آتا تو تناول فرما لیتے ورنہ چھوڑ دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی بھی ٹیک لگا کر کھانا تناول نہ فرماتے اور نہ ہی دستر خوان بچھاتے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حلوا' شہد اور کدو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ ایک ایک دو دو مہینے گزر جاتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی گھر میں بھی چولہا نہ جلتا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تحفہ قبول فرما لیتے لیکن صدقہ نہیں لیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا نعل خود ہی مرمت فرما لیتے اور کپڑے کو پیوند لگا لیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مریض کی عیادت کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر امیر اور غریب کی دعوت کو قبول فرما لیتے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچھونا چمڑے کا تھا' جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے۔ آپ دنیوی ساز و سامان کم سے کم رکھتے' اللہ تعالیٰ نے آپ کو پوری روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں عطا فرمائیں' لیکن آپ نے ان دنیوی چیزوں کو قبول نہ فرمایا بلکہ آپ نے آخرت کو اختیار فرمایا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت سے ذکر الٰہی کرتے اور ہمیشہ غور و فکر کرتے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زیادہ تر ہنسنا صرف مسکراہٹ ہوتا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزاح بھی فرماتے لیکن حق بات ہی فرماتے' آپ اپنے اصحاب کی تالیف قلوب فرماتے اور ہر قوم کے سردار کی عزت و تکریم کرتے اور اس کو اپنی قوم کے معاملات سپرد کرتے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک صحیح حدیث مروی ہے' آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ریشم و دیباج کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتھیلی سے زیادہ نرم و ملائم نہیں پایا' اور نہ آپ کی خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو سونگھی' میں نے دس سال تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی' آپ نے کبھی مجھے اف تک نہیں کہا اور نہ ہی میرے کیے ہوئے کام کے متعلق فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اور نہ ہی میرے نہ کیے ہوئے کام کے متعلق فرمایا کہ اسے تم نے کیوں نہیں کیا؟

قبرِ انور کی زیارت کا جواز

مسجدِ نبوی اور قبرِ نبوی کی زیارت تقرب الی اللہ کے کاموں میں سے سب سے بڑا کام ہے۔ اس پر ہر زمانے کے جمہور مسلمانوں کا آج تک اجماع رہا ہے' کسی نے بھی اس مسئلہ میں مخالفت نہیں کی سوائے ابن تیمیہ کے (اللہ اس کو معاف فرمائے)۔ ابن تیمیہ کا موقف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ انور کی زیارت جائز نہیں۔

ابن تیمیہ کے علاوہ جمہور مسلمین نے اس مسئلہ پر جو اجماع کیا ہے' اس کی متعدد وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: قبور کی زیارت کرنا عام طور پر مشروع اور جائز عمل ہے' ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ نبی اکرم ﷺ ہر رات بقیع میں تشریف لے جاتے' وہاں مدفون لوگوں کو سلام کرتے' ان کے لیے دعا مانگتے اور ان کے لیے استغفار کرتے' یہ بات بہت سی صحیح احادیث طیبات سے ثابت ہے' جن کی تفصیل بہت لمبی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کی قبرِ انور بھی اسی عمومی حکم میں شامل ہے' اس لیے اس پر بھی وہی حکم لاگو ہوگا یعنی زیارت کرنا جائز ہے۔

دوسری وجہ: جملہ صحابہ' تابعین اور ان کے بعد آنے والے تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب بھی روضۂ شریف سے گزرا جائے تو قبرِ نبوی کی زیارت کی جائے اور آپ پر سلام پیش کیا جائے' یہ بات جمہور ائمہ وعلماء نے روایت کی ہے' جن میں ابن تیمیہ بھی شامل ہیں۔

تیسری وجہ: کثیر صحابہ سے آپ ﷺ کی قبرِ انور کی زیارت کرنا ثابت ہے' جن میں ابن عساکر نے صحیح سند سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے متعلق' امام مالک علیہ الرحمۃ نے ''موطا'' میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق اور امام احمد نے حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت کیا ہے' کسی صحابی یا تابعی سے اس بارے میں ناپسندیدگی' انکار یا اس عمل پر تنقید منقول نہیں۔

چوتھی وجہ: امام احمد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف رخصت کرنے کے لیے نکلے تو انہیں فرمایا: اے معاذ! شاید آئندہ سال تمہاری ملاقات مجھ سے نہ ہو اور شاید تم میری اس مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو۔

آپ ﷺ کے اس فرمان کے عربی جملے کے الفاظ پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ اس جملے میں صراحۃً حضرت معاذ بن جبل کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ وہ جب مدینہ واپس لوٹیں تو مسجدِ نبوی اور قبرِ نبوی کے پاس آ کر آپ ﷺ پر سلام پیش کریں[1]

[1] آپ ﷺ کی قبرانور کی زیارت کی فضیلت میں اس کے علاوہ بہت سی احادیث مروی ہیں جن میں سے بعض ضعف سے خالی نہیں' اگرچہ یہ سب روایات مل کر درجۂ قوت کو پہنچ جاتی ہیں لیکن مذکورہ بالا دلائل کے ساتھ ہم نے انہیں ذکر نہیں کیا تاکہ ان میں شذوذ کی وجہ سے ابن تیمیہ کی رائے کو تقویت نہ حاصل ہو۔

جب یہ مسئلہ واضح ہو گیا تو پتا چلا کہ ابن تیمیہ کا ان تمام دلائل کو رد کرنا اور یہ کہنا کہ قبر نبوی کی زیارت غیر مشروع ہے' کسی طور بھی صحیح نہیں۔

ابن تیمیہ نے اس ضمن میں مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے:

(۱) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: رختِ سفر نہ باندھا جائے مگر تین مساجد کی طرف مسجد حرام' میری مسجد اور مسجدِ اقصیٰ۔

(۲) آپ ﷺ کا فرمان ہے: اللہ یہودیوں پر لعنت کرے انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔

(۳) ارشاد ہے: میری قبر کو میلہ نہ بنالینا۔

ان مذکورہ بالا تینوں احادیث میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے استدلال کرتے ہوئے ابن تیمیہ نے ایک منفرد رائے اختیار کی۔

پہلی حدیثِ طیبہ میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد "لاتشد الرحال" اس میں استثناء مفرغ ہے جو معلوم ہے اور "مستثنیٰ منہ" محذوف ہے' مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہونا چاہیے ورنہ استثناء منقطع ہو جائے گا اور یہی استثناء مجازی ہے' اور مجاز کو صرف ضرورت کے وقت مضمر ماننا جائز ہے' جب اس کے ساتھ حقیقت درست نہ ہوتی ہو۔

پس حدیثِ طیبہ کا مفہوم ہوگا: مساجد کی طرف رختِ سفر نہیں باندھا جائے گا مگر ان میں سے تین کی طرف۔ اس میں مستثنیٰ منہ "مساجد" ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ جمیع مساجد کی فضیلت برابر ہے' زیارت واعتکاف اور اس طرح کے دیگر اُمور میں کسی مسجد کو دوسری مسجد پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس حدیثِ طیبہ پر عمل کرتے ہوئے فقہاء نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے ان تینوں مساجد کے علاوہ کسی معین مسجد میں اعتکاف کی نذر مانی تو اس نذر کو پورا کرنے کے لیے اُس مخصوص مسجد کا قصد کرنا اُس پر واجب نہیں' بلکہ دنیا میں کسی مسجد میں بھی اعتکاف کرلے تو اس کی نذر پوری ہو جائے گی۔

جب کہ ہماری یہ گفتگو رسول اللہ ﷺ کی قبرِ انور کی زیارت کے بارے میں ہے' یہ بات نہ تو مستثنیٰ میں داخل ہے اور نہ ہی مستثنیٰ منہ میں داخل ہے۔ حدیثِ طیبہ میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں' یہ ایسے ہی درست نہیں کہ جیسے اس حدیث طیبہ سے یہ استدلال کیا جائے کہ رشتہ

داروں سے ملاقات اور علماء سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے رختِ سفر باندھنا جائز نہیں۔

پھر اس کے بعد ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ ابن تیمیہ نے کلمہ ''شدّ الرحال'' سے حقیقی معنی مراد لیا ہے (کجاوہ کسنا) یا مجازی معنی؟ یعنی کسی چیز کا قصد اور ارادہ کرنا۔

اگر تو انہوں نے اس سے حقیقی معنی مراد لیا ہے تو ان تین مساجد کے علاوہ دوسری مساجد کی طرف رخت سفر باندھنا اسی صورت میں حرام ہوگا جب کجاوہ میں بیٹھ کر اونٹ پر ہو خواہ مسافت کم ہو یا زیادہ' لیکن اگر کسی نے کسی دوسرے ذریعے سے ان کی طرف سفر کیا تو وہ حرام نہ ہوگا' کیا یہ بات کوئی عقل والا کہتا ہے؟ اور اگر ابن تیمیہ نے اس سے مجازی معنی مراد لیا ہے کہ کسی چیز کی طرف قصد اور ارادہ کرنا' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عمل سے اس کی تردید اور مخالفت ہوتی ہے' کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو ہر ہفتے (ایک روایت کے مطابق ہر شنبہ کو) مسجدِ قباء تشریف لے جاتے حالانکہ مسجد قباء مدینہ منورہ سے باہر واقع تھی۔

خلاصہ

حدیثِ طیبہ میں ''مساجد'' مستثنیٰ منہ ہے' رشتہ داروں اور دیگر لوگوں سے ملاقات' قبروں کی زیارت اور تاریخی مقامات کی سیر اس مستثنیٰ منہ میں داخل نہیں ہے' یہ حدیث ان چیزوں کے بارے میں نہیں' بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ تین مساجد ہی زیادہ مستحق اور اولیٰ ہیں کہ دُور دراز مسافتوں سے ان کی طرف سفر طے کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

(۲) دوسری حدیث میں ارشاد ہے: اللہ یہودیوں پر لعنت بھیجے' انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔

اس حدیث کا زیارت کے موضوع سے مطلقاً کوئی تعلق نہیں' کیونکہ اس حدیث میں انبیاء کی قبروں اور ان کے اردگرد کی جگہ کو سجدہ گاہ اور عبادت گاہ بنانے سے منع کیا گیا ہے' جیسا کہ پیچھے قریب ہی اس کا ذکر گزر چکا' اس بات کا علم لفظ ''مساجد'' سے ہوتا ہے' جس کا معنی ہے: نماز پڑھنے کی جگہیں۔ اگر محض زیارتِ قبر سے مراد قبر کو سجدہ گاہ بنالینا ہے تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بقیع کو سجدہ گاہ اور عبادت گاہ بنالیا تھا کیونکہ آپ ہمیشہ بقیع کی زیارت کرتے تھے۔ (معاذ اللہ)

(۳) تیسری حدیث میں ارشاد ہے: میری قبر کو میلہ نہ بنالینا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ میری قبر کی

زیارت کے لیے کوئی وقت مخصوص نہ کر لینا کہ اس وقت کے علاوہ زیارت نہ کی جائے جیسے کہ عید اور میلوں کا وقت متعین ہوتا ہے۔

حافظ منذری اور دیگر علماء حدیث نے اس کی یہی تفصیل بیان کی ہے' اس میں اس بات کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی قبر کے پاس شور و غل' لہو و لعب اور دیگر مظاہر زینت سے روکا ہے جیسا کہ عیدوں اور میلوں پر ہوتا ہے' اس حدیث طیبہ کے کلمات آپ ﷺ کی قبرِ انور کی زیارت کی ممانعت پر دلالت نہیں کرتے۔

نبی اکرم ﷺ کی یہ شان نہیں کہ آپ اپنی قبر کی زیارت کو عید قرار دے کر منع کر دیں اور خود روزانہ بقیع میں تشریف لے جا کر عید کا اظہار کریں۔

قبرِ انور کی زیارت کے آداب

قبرِ انور کی زیارت کے کچھ آداب ہیں' جن کی پیروی ضروری ہے' جب کبھی اللہ تعالیٰ آپ کو قبرِ انور کی زیارت کا شرف عطا فرمائے تو پہلے آپ مسجد نبوی کی زیارت کا عزم کر لیں' پھر اس کے ساتھ آپ ﷺ کی قبر شریف کی زیارت کی بھی نیت کر لیں' پھر مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے تھوڑی دیر پہلے غسل کر لیں' اور صاف ستھرے کپڑے پہن لیں' اپنے دل میں مدینہ منورہ کے شرف اور بزرگی کو تازہ کر لیں' اور تصور کریں کہ آپ اُس خطۂ پاک میں ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق میں سے سب سے بہتر ذات کے وجود سے شرف بخشا ہے' پس جب آپ مسجد نبوی میں داخل ہوں تو پہلے روضۂ اطہر کا قصد کریں' قبرِ انور اور منبر کے درمیان دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کریں' اس کے بعد جب قبر شریف کے نزدیک جائیں تو اس پر اچانک دھاوانہ بول دیں اور نہ ہی اس کی کھڑکیوں سے چمٹیں اور نہ ہی ان کو چھوئیں جیسے کہ بہت سے جاہل کرتے ہیں' یہ ایسی بدعت ہے جو حرام کے درجے تک پہنچنے والی ہے' بلکہ قبرِ انور سے تقریباً چار گز کے فاصلے پر کھڑے ہوں' اپنے سامنے روضہ اطہر کی دیوار کے نچلے حصے کو دیکھیں' ہیبت اور جلال کو محسوس کرتے ہوئے اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں' پھر دھیمی آواز میں رسول اللہ ﷺ پر سلام پیش کریں' یہ کہتے ہوئے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں' یارسول اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے اپنے رب کا بھیجا ہوا پیغام پہنچا دیا' اپنی امت کی

خیر خواہی کا حق ادا کر دیا' اور اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ دعوت دی' اور آخری وقت تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی' اللہ تعالیٰ اَن گنت درود و سلام بھیجے آپ پر' آپ کی آل پر اور آپ کے اصحاب پر' جس طرح ہمارا رب چاہتا ہے اور پسند فرماتا ہے۔

پھر قبلہ کی طرف رُخ کریں اور تھوڑا سا دائیں مڑیں حتیٰ کہ آپ قبر اور اس کے کنارے والے ستونوں کے درمیان ہو جائیں' پھر عاجزی و انکساری سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں' یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بے ادبی ہے' اور یہ کہ دعا تو قبر کی جانب رخ کر کے مانگنی چاہیے' اس لیے کہ دعا میں تو اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے مناجات کی جاتی ہیں اور ان مناجات میں کسی کو شریک کرنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا قبلہ رُخ ہو کر مانگنا بہتر ہے' حالانکہ بہت سے جاہل اور مبتدعین اس کی مخالفت کرتے ہوئے آپ کو دکھائی دیں گے۔

اپنی دعا کا آغاز یہ کہتے ہوئے کریں: اے اللہ! تو نے فرمایا ہے اور تیرا فرمان برحق ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء: ۶۴)	اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنے آپ پر حاضر ہوتے آپ کے پاس اور مغفرت طلب کرتے' اللہ تعالیٰ سے' نیز مغفرت طلب کرتا ان کے لیے رسول (کریم) بھی تو وہ ضرور پاتے اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول فرمانے والا' نہایت رحم کرنے والا ۝

اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں! اپنے گناہوں سے مغفرت طلب کرنے اور تیرے رسول کو تیری بارگاہ میں اپنا شفیع بناتا ہوں! اے اللہ! تو اپنے حبیب کے توسل سے میری مغفرت فرما' جس طرح تو اس کی مغفرت فرما دیتا تھا جو آپ کی حیات میں آپ کو اپنا شفیع بناتا' پھر کثرت کے ساتھ دعا کریں اپنے دین' اپنی دنیا' اپنے بھائیوں اور عام مسلمانوں کے لیے جو آپ چاہیں' اے میرے بھائی! اُس مقام پر مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھنا' اور یہ دعا مانگو: اے اللہ! اُس دن میں کوئی شک نہیں جس روز تو اوّلین و آخرین کو جمع فرمائے گا' تو اپنے گناہ گار بندے محمد سعید بن مُلاّ رمضان کی بہتر طریقے سے پردہ پوشی فرما اور محض اپنے احسان اور

فضل سے اسے بھی اپنے بخشے ہوئے بندوں میں شامل فرما اور اسے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کے حوضِ کوثر سے فرحت بخش جام عطا فرما' اُس دن جب آپ ﷺ مسکراتے ہوئے روشن چہرے کے ساتھ وہاں جلوہ افروز ہوں گے' اور آپ ﷺ ملاقات کے مشتاق ہوں گے' اپنے ان اصحاب سے جن کو آپ نے دیکھا اور جن کو آپ نے پہلے نہیں دیکھا اور ان سب کا آپ استقبال فرمائیں گے' اے اللہ! اسے دھتکارے ہوؤں اور محرومین میں سے نہ بنانا۔

اے میرے مسلمان بھائی! آپ جو کوئی بھی ہوں وعدہ کیجئے کہ جب بھی آپ اس کتاب کو ختم کریں گے تو اپنے اس بھائی (مؤلف اور مترجم) کے لیے بھی دعا کریں گے' میں ایسی خالص دعا کا بہت ضرورت مند ہوں جو میرا بھائی غائبانہ طور پر میرے لیے کرے۔

میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے یہ کتاب مکمل کرنے کی توفیق بخشی اور اس سے لجاجت کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے تھامنے کی توفیق عطا فرمائے' اس کتاب میں مجھ سے جو لغزشیں اور خطائیں ہوئیں' اللہ تعالیٰ اُن سے درگزر فرمائے' اور اس معاملے میں قصد اور نیت کی درستگی اور بھرپور جدوجہد کو میرا اسفارشی بنائے۔

وصلی اللّٰہ علٰی سیّدنا محمد النبی الامی وعلٰی
اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔
واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین!

مؤلف کے حالات زندگی

از: محمد عمران انور نظامی

نام: ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی

والد کا نام: ملّا محمد رمضان البوطی مرحوم۔ آپ کے والد محترم اپنے وقت کے جید عالمِ دین اور پرہیزگار شخصیت تھے۔

پیدائش

آپ ۱۹۲۹ء میں جلیکا نامی بستی میں پیدا ہوئے۔ یہ بستی ترکی کی حدود میں واقعہ جزیرہ بوطان (ابن عمر) میں ہے اور یہ علاقہ عراق کے شمال میں واقع ہے۔

ہجرت

آپ نے اپنے والد محترم ملا رمضان مرحوم کے ہمراہ یہاں سے دمشق کی طرف ہجرت کی، اُس وقت آپ کی عمر چار برس تھی۔

تعلیم

آپ نے سیکنڈری تک تعلیم "معہد التوجیہ الاسلامی" (Institute of Islamic Guidance) سے حاصل کی۔

۱۹۵۳ء میں آپ نے مزید تعلیم کے لیے جامعۃ الازھر کے کلیۃ الشریعۃ (Faculty of Religion) میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں یہاں سے "شہادۃ العالمیۃ" ماسٹر ڈگری حاصل کی۔

پھر ۱۹۵۶ء میں آپ نے جامعۃ الازھر کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ" Faculty of ArabicLanguage" میں داخلہ لیا اور یہاں سے ایجوکیشن ڈپلومہ حاصل کیا۔

۱۹۶۰ء میں آپ کو جامعۂ دمشق کے "کلیۃ الشریعۃ" کا ڈین منتخب کیا گیا۔

لیکن مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کا شوق اب بھی آپ کے دامن گیر رہا۔ آپ اپنی یہ علمی تشنگی بجھانے کے لیے ایک مرتبہ پھر جامعۃ الازھر کے کلیۃ الشریعۃ (فیکلٹی آف ریلیجن) سے ڈاکٹریت کی ڈگری کے حصول کے لیے وابستہ ہو گئے۔ اور ۱۹۶۵ء میں آپ ''اصول الشریعۃ الاسلامیہ'' میں ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

عملی زندگی

۱۹۶۵ء میں آپ کو جامعۂ دمشق کے فیکلٹی آف لاء میں انسٹرکٹر مقرر کر دیا گیا، پھر آپ ڈپٹی منتخب ہوئے اور اس کے بعد ڈین کے عہدے پر فائز ہوئے، بالآخر آپ کو جامعۂ دمشق کے ڈیپارٹمنٹ آف ریلیجنز اینڈ ٹینینس کے ہیڈ کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا گیا۔

آپ نے بے شمار انٹرنیشنل کانفرنسز اور سیمپوزیمز میں شرکت کی اور مختلف موضوعات پر مقالہ جات پیش کیے اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے۔ اب بھی آپ دنیا کے متعدد اسلامی، یورپی، امریکی اور دیگر ممالک میں انٹرنیشنل کانفرنسز میں شرکت کرتے ہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے متعلقہ موضوعات پر اپنی تحقیقات پیش کرتے ہیں۔

☆ آپ عمان، اُردون کی Royal Society of the Islamic Civilization Researches کے ممبر ہیں۔

☆ آکسفورڈ اکیڈیمی، انگلینڈ کی ہائی کونسل کے رکن ہیں۔

☆ آپ ترکی، کُردی، عربی اور انگریزی زبانیں جانتے ہیں۔

آپ روزانہ دمشق کی مختلف مساجد و محافل اور ملکِ شام کے دیگر شہروں میں منعقدہ مختلف مجالس میں دینی موضوعات پر خطبات دیتے ہیں، جن محافل میں ہزاروں کی تعداد میں خواتین و حضرات شرکت کرتے ہیں۔

آپ اہم موضوعات پر لوگوں کے سوالات کے جوابات بھی دیتے ہیں اور فقہی مسائل پر فتاویٰ بھی جاری کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ متعدد اخبارات اور جرائد میں اسلامی و فقہی موضوعات پر مضامین لکھتے ہیں۔ مختلف موضوعات مثلاً علومِ شریعۃ، فلسفہ، تاریخ، سیرت، معاشرت اور تہذیب و ثقافت کے موضوعات پر آپ کی ۴۰ سے زائد کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں:

تالیفات

(۱)لا یاتیہ الباطل (۲)الحکم العطائیۃ شرح وتحلیل (۳)کلمات فی مناسبات (۴)برنامج دراسات قرآنیۃ (۵)مع الناس مشورات و فتاوٰی (۶)ھذا ما قلتۃ امام بعض الرؤساء والملوک (۷)مشورات اجتماعیۃ (۸)یغالطونک اذ یقولون (۹)الاسلام والعصر تحدیات و آفاق (۱۰)اوربۃ من التقنیۃ الی الروحانیۃ (۱۱)کبرٰی الیقیننات الکونیۃ (۱۲)شخصیات استوقفتنی (۱۳)منہج الحضارۃ الانسانیۃ فی القرآن (۱۴)حریۃ الانسان فی ظل عبودیتہ للّٰہ (۱۵)اللّٰہ ام الانسان ایھما اقدر علی رعایۃ حقوق الانسان (۱۶)من روائع القرآن الکریم (۱۷)اللامذھبیۃ اخطر بدعۃ تھدد الشریعۃ الاسلامیۃ (۱۸)تجربۃ التربیۃ الاسلامیۃ فی میزان البحث (۱۹)سلسلۃ ابحاث فی القمۃ (۲۰)فقہ السیرۃ النبویۃ مع موجز (۲۱)ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ (۲۲)سیامند ابن الادغال (۲۳)قضایا فقھیۃ معاصرۃ (۲۴)ھذہ مشکلاتھم (۲۵)وھذہ مشکلاتنا (۲۶)من الفکر والقلب (۲۷)حوار حول مشکلات حضاریۃ (۲۸)علی طریق العودۃ الی الاسلام (۲۹)نقض اوھام المادیۃ الجدلیۃ (۳۰)محاضرات فی الفقہ المقارن (۳۱)الجھاد فی الاسلام (۳۲)المرأۃ بین طغیان النظام الغربی ولطائف التشریع الربانی (۳۳)الانسان مسیر ام مخیر (۳۴)الحوار سبیل التعایش (۳۵)السلفیۃ مرحلۃ زمنیۃ مبارکۃ لا مذھب اسلامی (۳۶)التغییر مفھومۃ وطرائقۃ (۳۷)مموزین (۳۸)ھذا والدی (۳۹)الاسلام ملاذ کل المجتمعات الانسانیۃ (۴۰)عائشۃ امّ المؤمنین (۴۱)مدخل الی فھم الجذور (۴۲)مسألۃ تحدید النسل وقایۃ وعلاجا (۴۳)وفاع عن الاسلام والتاریخ (۴۴)المذھب الاقتصادی بین الشیوعیۃ والاسلام (۴۵)فی سبیل اللّٰہ والحق (۴۶)حقائق عن نشأۃ القومیۃ.

ماخذ ومراجع

(۱) قرآن کریم

(۲) آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی............وہبہ الزحیلی

(۳) الاتجاہات الوطنیہ فی الادب الحدیث............محمد محمد حسین

(۴) اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء............محمد الخضری

(۵) الاحکام............القرافی

(۶) الاحکام السلطانیہ............ماوردی

(۷) احکام القرآن............ابن العربی

(۸) اسد الغابہ............ابن الاثیر الجزری

(۹) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ............ابن حجر العسقلانی

(۱۰) اعلام الساجد فی احکام المساجد............زرکشی

(۱۱) اعلام الموقعین............ابن قیم جوزیہ

(۱۲) الام............محمد بن ادریس الشافعی

(۱۳) الامۃ العربیۃ فی معرکۃ تحقیق الذات............محمد المبارک

(۱۴) بدایۃ المجتہد............ابن رشد

(۱۵) البدایۃ والنہایۃ (تاریخ ابن کثیر)............اسماعیل بن عمر ابن کثیر

(۱۶) بنیۃ الفکر الثی (عربی ترجمہ)............گب

(۱۷) تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری)............محمد بن جریر طبری

(۱۸) تجربۃ التربیۃ الاسلامیۃ فی میزان البحث............سعید رمضان

(۱۹) تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر)............اسماعیل بن عمر ابن کثیر

(۲۰) تہذیب سیرۃ ابن ہشام

(۲۱) جامع الترمذی.........ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی

(۲۲) الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی).........ابوعبداللہ القرطبی

(۲۳) جمع الفوائد

(۲۴) حاضر العالم الاسلامی.........شکیب ارسلان

(۲۵) حیاۃ محمد.........محمد حسین ہیکل

(۲۶) حلیۃ الاولیاء.........ابونعیم اصبہانی

(۲۷) دلائل النبوۃ.........ابوبکر احمد بن حسین بن علی البیہقی

(۲۸) زاد المعاد.........ابن قیم جوزیہ

(۲۹) سبل السلام.........محمد بن اسماعیل الکحلالی

(۳۰) سنن ابن ماجہ.........ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی

(۳۱) سنن ابوداؤد.........سلیمان بن اشعث سجستانی

(۳۲) سنن بیہقی.........ابوبکر احمد بن حسین بن علی البیہقی

(۳۳) سنن نسائی.........احمد بن شعیب النسائی

(۳۴) السیادۃ العربیۃ (عربی ترجمہ).........فان فلوتن

(۳۵) سیرت ابن اسحاق.........محمد ابن اسحاق

(۳۶) سیرت ابن ہشام.........ابومحمد عبدالملک حمیری

(۳۷) شرح الموطا.........زرقانی

(۳۸) شرح الشفا.........قاضی عیاض

(۳۹) شرح اللمع.........ابواسحاق شیرازی

(۴۰) شرح المنہاج.........الاسنوی

(۴۱) شرح مسلم.........ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی

(۴۲) صحیح البخاری.........ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری

(۴۳) صحیح المسلم.........مسلم بن الحجاج القشیری

(۴۴) ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ.........سعید رمضان

(۴۵)الطبقات الکبریٰ..........ابن سعد

(۴۶)طرح التثریب وشرحہ..........حافظ ولی الدین عراقی

(۴۷)الظاہرۃ القرآنیہ..........مالک بن نبی

(۴۸)عیون الاثر..........ابن سید الناس

(۴۹)فتاویٰ..........ابن تیمیہ

(۵۰)فتح الباری بشرح صحیح البخاری..........ابن حجر عسقلانی

(۵۱)الفتح الربانی فی ترتیب مسند الامام احمد..........احمد عبدالرحمٰن البنا

(۵۲)فقہ السیرۃ..........محمد الغزالی

(۵۳)قواعد الاحکام فی مصالح الانام..........عز بن عبدالسلام

(۵۴)کبریٰ الیقینیات الکونیۃ..........سعید رمضان

(۵۵)کتاب الاصنام..........کلبی

(۵۶)کف الرعاع علی ھامش الزواجر..........ابن حجر عسقلانی

(۵۷)ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین؟..........ابوالحسن علی ندوی

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر)

(۵۸)المبسوط..........محمد بن حسن شیبانی سرخسی

(۵۹)المحلی..........ابن حزم

(۶۰)مختصر سیرۃ الرسول..........محمد بن عبدالوہاب

(۶۱)المدوّنہ..........امام مالک

(۶۲)مذکرات..........لورڈ کرومر

(۶۳)مروج الذہب..........مسعودی

(۶۴)مستدرک..........ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم

(۶۵)مسند احمد..........امام احمد بن حنبل

(۶۶)معجم..........بغوی

(۶۷)المغنی..........ابومحمد عبداللہ بن احمد ابن قدامہ

(٦٨) مغنی المحتاج .... محمد الخطیب
(٦٩) الملل والنحل .... شہرستانی
(٧٠) الموافقات .... شاطبی
(٧١) الموطا .... امام مالک
(٧٢) النبأ العظیم .... محمد عبداللہ دراز
(٧٣) نور الیقین .... خضری
(٧٤) النہایۃ فی غریب الحدیث .... ابن الاثیر الجزری
(٧٥) نہایۃ المحتاج .... رملی
(٧٦) نیل الاوطار .... شوکانی
(٧٧) وحی القلم .... مصطفیٰ صادق رافعی
(٧٨) وفیات الاعیان .... ابن خلکان
(٧٩) ہدایہ .... ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی المرغینانی

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

اور آپ کے رب نے حکم دیا کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھی طرح نیکی کرو

(سورۃ الاسراء: ۲۳)

کتاب البر والصلۃ (عربی)

خدمتِ والدین اور صلہ رحمی (مترجم)

قرآن وحدیث کی روشنی میں

والدین کی خدمت، ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد ان سے رابطے کی اہمیت، صلہ رحمی کی اہمیت، رشتے داروں، غریبوں اور یتیموں کو صدقہ دینے کی فضیلت کا بیان

تصنیف

امام علامہ جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن جوزی بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ

(متوفی ۵۹۷ھ)

ترجمہ

مولانا غلام نصیر الدین چشتی

مدرس جامعہ نعیمیہ، لاہور

ناشر

فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار، لاہور

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ
اور ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا کہ آپ لوگوں کو صاف صاف بتا دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا
(النحل: ۴۴)

زُبدۃ الاتقان فی عُلوم القرآن (عربی)

اُصولِ ترجمہ و تفسیر القرآن (مترجم)

قرآن پاک کے ترجمہ اور تفسیر کے جامع اور مفصل
اصول و قواعد کا بیان

تصنیف

السید محمد بن علوی المالکی الحسنی
ڈاکٹر پروفیسر حرم شریف مکہ معظمہ

مترجم

غلام نصیر الدین
جامعہ نعیمیہ لاہور

ناشر

فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار لاہور